خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

ستمبر 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول
CPNE
MEMBER APNS

عنوان	مصنف	صفحہ	تعارف
انشائیہ	جون ایلیا	11	"خود شناسی" پر ایک صاحب دانش و بینش کا افادی تبصرہ
آپ کے خط	مدیرا علیٰ	12	سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے
خلیجیوں کی تباہی	الیاس سیتاپوری	20	ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات
خون کارشتہ	کاشف زبیر	55	مغربی معاشرے میں مجرمانہ کارروائیوں کا منفرد انداز
کشکول	انوار صدیقی	76	اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ
نئی زندگی	تنویر ریاض	109	پچھتاووں کی آگ میں جلنے والے ایک انتقام کی روداد
سعی لاحاصل	مرزا امجد بیگ	120	ناامیدی کے غار میں ایک سعی حاصل کا عبرت اثر احوال
انکشاف	طاہر جاوید مغل	143	ایک فقیر کے بے ربط جملوں میں زندگی کی متلاشی ایک حسینہ کی خوش گمانیاں
انوکھا انتقام	سلیم انور	157	انتقام کی درست سمت پر چلنے والی ایک باشعور فنکارہ کا قصہ
محفلِ شعر و سخن	قارئین	162	آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ
مقابلہ	روبینہ رشید	165	ذہانت کی جنگ میں دو انسانوں کی کیمسٹری کا حیرت انگیز امتزاج
مسافر	ناصر ملک	172	گل و گلزار سے راہِ خار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات
ایک بوری کھجور	ڈاکٹر شیر شاہ سید	215	بے بسی کے دائرے میں محبت و خلوص کی بے مثال کہانی
اشرف الاولیا	ضیا تسنیم بلگرامی	219	درجہ بہ درجہ اوصاف کریمانہ کے حامل اولیائے کرامؒ کا سبق آموز سلسلہ
بزدل	مریم کے خان	231	قید سے رہائی پانے والے ایک پنچھی کا خوشگوار تجربہ
تکمیلِ خواہش	نشور ہادی	248	ہنس ہنس کر دکھ سہنے والے محبت کے ماروں کی سحر انگیز داستان

آئیڈیل پبلک لائبریری
0334-9630911

جلد43 • شمارہ09 ستمبر2013• زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے • پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

انشائیہ

جون ایلیا

بیگانگی

"کیا شام بہت اداس ہے۔ شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام؟"

"ہاں شام بہت اداس ہے، شام، در و بام اور درختوں اور سمتوں کا ابہام"

"پر ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے کہ جب مغرب کا افق دہکتا ہے اور دامان شفق بھڑکتا ہے جیسے شعلے سے پتے ہوئے ہوں، جیسے تنور دھنے ہوئے ہوں اور جب خورشید کا بے کفن جنازہ افق میں تازہ تازہ اترتا ہے تو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مل کے جا رہا ہو، جیسے کوئی یاد آ رہا ہو، جیسے کوئی جا کے بھول جائے، وعدہ ہو مگر کبھی نہ آئے اور جب دونوں وقت ملتے ہیں تو ہم پر کبھی کبھی ایسی حالت کیوں گزرتی ہے جیسے ہم خود اپنے آپ سے بچھڑ رہے ہوں۔ اپنے آپ سے بچھڑ گئے ہوں؟"

"تم جاننا چاہتے ہو کہ کبھی کبھی ہمیں ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ ایسا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دن بھر کی رائگانی کے راستوں سے پلٹ کے جب اپنی تھکن کا اندازہ لگاتے ہیں تو اپنے اندر گھٹتے اور گہناتے چلے جاتے ہیں اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ ایک بیگانگی پاتے ہیں۔"

"بیگانگی...... اور اپنی ذات اور اپنی تھکن کے بیچ!"

"ہاں، بیگانگی اور اپنی ذات اور اپنی ہی تھکن کے بیچ اور وہ یوں کہ تمہاری دن بھر کی تھکن جو کچھ کماتی ہے اسے تمہاری ذات شام کو ہیچ اور پوچ پاتی ہے۔ تم صبح کی خوش حالتی اور شام کی خود ملامتی کے بیچ جو کچھ بھی کرتے ہو اس کا اپنے اندر لمحہ لمحہ تاوان بھرتے ہو۔ تم اس بیچ جو بھی کر کے دکھاتے ہو اس پر پچھتاتے ہو۔ جب تم زبان کھولتے ہو اور بولتے ہو تو اپنے سانسوں کی ترازو میں اپنا گھاٹا تولتے ہو۔ اس لیے کہ تم اپنے منہ میں اپنی زبان نہیں کسی اور کی زبان پاتے ہو، تم اپنے ہونٹوں سے اپنی آواز نہیں کسی اور کی آواز لگاتے ہو۔"

"ہاں بھائی تم نے سچ کہا اور شام کی اس اداسی میں اپنی دانست ہی کا دکھ نہیں میرے دل کا دکھ بھی سہا۔ کوئی بیگانگی سی بیگانگی ہے۔ تم جو ہو میں ہوں۔ ہم اپنی اپنی ذات میں ایک نہیں رہے ہیں۔ ہم میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ہمارے احساس کی سمتیں اجڑ گئی ہیں۔ کرنے والے میں اور اس کی کرت میں بیگانگی، زبان کھولنے والے کے منہ میں اور اس کی زبان میں بیگانگی، ہونٹوں میں اور آواز میں بیگانگی! پھر تو میں زبان کھولنے والا اور بولنے والا، ہاں، میں کچھ کر کے دکھانے والا اور اپنی کرت میں پچھتانے والا تو مارا گیا۔ ہاں، میں مارا ہی ہو گیا۔"

"میرے بھائی تم ہی نہیں، ہم میں سے جو بھی ہے وہ مارا گیا، اس لیے کہ ہم میں سے جو بھی ہے وہ دوسروں کی مرضی پر مارا گیا۔ ہمارے ہاتھ تو ہمارے ہیں پر انگلیاں کسی اور کی ہیں اور وہ یوں کہ ہماری انگلیوں نے جب بھی کچھ لکھا تو وہی کچھ لکھا جو ان سے لکھوایا تھا۔ ہماری انگلیوں میں اور ان کی لکھائی میں بیگانگی ہے۔ ہماری پڑھت میں اور ہماری بینائی میں بیگانگی ہے۔ ہم اس چارسو میں زندہ رکھے گئے ہیں جس میں ہمیں دوسروں کے لیے سانس لینے ہیں۔ سوائے بھائی اس چارسو کی آرزو کر جس میں تو اپنے سینے سے خود اپنے سانس لے سکے۔ کیا میں تجھے ایک واقعہ سناؤں؟"

"ہاں میرے بھائی ضرور سنا۔"

"کل مجھے اسماعیل کتب فروش نے بتایا کہ میرا بھائی الیاس مصوری کرتا ہے۔ وہ پرسوں کبوتر کی تصویر بنا رہا تھا۔ تصویر بنانے کے بعد اس نے اس کے نیچے بائیں طرف اپنا نام لکھا اور پھر تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ وہ کبوتر کی نہیں بلی کی تصویر ہے۔"

"ایں! کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کبوتر کو بلی چبا گئی، ہنرمند اور ہنر کی بیگانگی ہنر کو کھا گئی۔"

* * *

آپ کا خط

عزیز قارئین!

السلام علیکم!

ستمبر 2013ء کا شمارہ...... بدلتے موسم اور عید کے بیتے ہوئے خوش گوار لمحات کا احساس لیے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ستمبر کا مہینا تاریخ میں یوم دفاع اور یوم فضائیہ کے حوالے سے رقم ہے جب قوم کے بہادر سپوتوں نے کسی نمود ونمائش اور حرص وطمع کے بغیر اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہر کوتاہی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بہت اچھا محسوس ہوتا ہے جب حب الوطنی کے تناظر میں خاص لمحات کا اعادہ کیا جاتا ہے مگر آج ایسے جذبات کا اظہار کہیں نظر نہیں آتا...... گو کہ ملک کا نظم ونسق نئے وزیر اعظم کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے لیکن عوام الناس کے لیے اس تبدیلی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ملکی مسائل جوں کے توں ہیں۔ ہوش ربا مہنگائی، بڑھتی ہوئی جرائم کی وارداتیں، دہشت گردی کا نا قابو میں آنے والا سلسلہ، جس میں اب جیلوں کا آسانی سے توڑنا اور ساتھیوں کو آزاد کرا لینا معمول بنتا دکھائی دے رہا ہے۔ عوام کا خیال تھا کہ نئی حکومت کے آنے سے انہیں ریلیف ملے گا کیونکہ پچھلی حکومت کو بدعنوان ترین کہہ کر تمام مسائل کی جڑ قرار دیا جا رہا تھا لیکن بجلی، گیس اور تیل کے نرخوں میں کیے جانے والے حالیہ غیر معمولی اضافے نے نئی حکومت کی ترجیحات کا عندیہ دے دیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہی کہا گیا کہ اس تبدیلی کا بوجھ عوام پر نہیں پڑے گا لیکن کیسے؟ کیا اشیائے خورونوش کی تیزی سے بڑھتی قیمتوں کو روکنے کے لیے کچھ کیا جا رہا ہے؟ پاکستان میں ہر سال مون سون کے موسم میں شدید بارشوں کی وجہ سے سیلاب آتے ہیں...... تیار فصلیں، مویشی اور لوگوں کے گھر بار تباہ ہو جاتے ہیں...... کتنی قیمتی جانوں کا زیاں ہوتا ہے یہ بات ایک عام آدمی بھی جانتا ہے مگر حکومتی حکام کی مستقل مزاجی دیکھیے کہ ہر سال تباہی کے مناظر میڈیا پر شور مچاتے ہیں اور وہ محض تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں...... مون سون کی آمد سے قبل انتظامیہ اور متعلقہ ادارے اپنی تیاریاں مکمل کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں مگر درحقیقت کچھ نظر نہیں آتا۔ پرچے کی تیاری کے دوران ہی ایک نہیں بلکہ دو افسوسناک خبریں ملیں کہ اردو ادب کے درخشندہ ستارے ممتاز نقاد، اسکالر اور ادیب ڈاکٹر فرمان فتح پوری 4 اگست کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے...... جناب کی تحریروں میں حب الوطنی کا احساس ملتا ہے...... آپ نے افسانہ، شاعری، تذکرہ نگاری اور داستان کے حوالے سے اہم کام کیا جبکہ ٹی وی پروگرام ”کسوٹی“ سے شہرت پانے والے معروف اینکر اور دانشور قریش پور بھی اگلے دن ہی وفات پا گئے۔ اللہ رب العزت مرحومین کو غریق رحمت اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) اور اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی بزم کی جانب جہاں کئی محبت نامے ہمارے منتظر ہیں۔

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل کی زینت بنے ہیں ”اگست کا شمارہ دو تین دن دیر سے ملا۔ خوب صورت رنگین، ڈائجسٹ کے نام میں Olivegreen رنگ، سفید حاشیہ برداری کے ساتھ اس لیے بہت پیارا لگا کہ یہ میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ خاتون کا کاجل لگانا یا مسکارہ لگانا عید کی تیاری کی اطلاع ہے۔ رمضان وہ بابرکت مہینا ہے جس کے لیے ہمارے پیارے پیغمبرؐ کی خصوصی ہدایات ہیں لیکن آہ، اس مقدس مہینے میں بھی خونریزی اور مصنوعی مہنگائی۔ ویسے بھی اس ماہ میں اخراجات ڈیڑھ سے دوگنا ہو ہی جاتے ہیں۔ پھر بجلی کا عذاب چاہے افطار ہو یا سحر اگر لوڈشیڈنگ نہ ہو تو نظام کی خرابی کی وجہ سے اندھیرا۔ نئی حکومت کا انتظار رہا لیکن کچھ نہ ہوا بلکہ کچھ مزید ہی برا نظر آ رہا ہے۔ جون ایلیا نے آزادی کے عنوان سے اپنا قلم خون میں ڈبو کر لکھ ڈالا۔ دونوں ممالک کی عوام نہ چاہتے ہوئے بھی نفرت کی دلدل میں گردن تک ڈوب چکے ہیں۔ کیا ہم اپنی مملکت خداداد کو مضبوط بنا کر یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم نے کتنا عظیم اور درست فیصلہ کیا تھا لیکن کیوں ہم اپنے ہی فیصلے کو تاریخ میں غلط فیصلہ ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ چاند سلطان میں ڈاکٹر ساجد امجد نے دکن کی پرانی تاریخ کو اتنی تحقیق سے تحریر کیا ہے کہ پڑھ کر اس خطے کے گوشے گوشے سے واقف ہو گئی۔ رائی کا پہاڑ میں ملک صفدر حیات نے بہت پیاری کہانی تحریر کی، ہمارے دیہاتوں میں دشمنی اور خونریزی کی بہترین مثال ہے۔ کہانی صاف ستھری اور کہیں پر جھول نہیں دکھائی دیا۔ اتفاقات مریم کے خان کی تحریر، کافی ہنگامہ خیز کہانی رہی لیکن پوری کہانی میں کہیں کہیں غیر ضروری طوالت کا احساس ہوا۔ مسافر نے کیا خوب دلچسپ رخ اختیار کیا ہے چندو ماہی کی داستان حیات بڑی سنسنی خیز رہی۔ کہانی میں ہندوستان کی پھولن دیوی کا بڑا عکس پایا جاتا ہے۔ کیا ناصر ملک میڈم شکیلہ بنا کر اس کا انجام بھی پھولن دیوی کا کریں گے۔ تحریر کی دلکشی اور جاذبیت قاری کو باندھ کر رکھتی ہے، اٹھنے ہی نہیں دیتی۔ چادر عائشہ فاطمہ کی دور جدید کی بے ایمانی، لالچ، خود غرضی کی بہترین تصویر ہے۔ جہاں معاشرہ میں بیٹیوں کی شادی سنگین مسئلہ بن رہی ہے۔ وہاں ہزاروں بے ایمان، عورتوں اور مردوں نے میرج بیورو کے ذریعہ بچیوں کی شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی بہت سے گھرانوں کو زندہ درگور کر رکھا ہے۔ خالد میاں کے ہاں ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر تھی، جو ایک ریڈیو پروگرام حامد میاں کے ہاں سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ سلیم انور کی تحریر تعاقب ایک اچھوتی تحریر ہے۔ ولیم کی عجیب وغریب عادت کہ میلوں تک کسی خاتون کا تعاقب۔ شاید پیٹرول مفت ملتا ہو۔ ہم پاکستانیوں سے پوچھو کیا قدر ہے، ہمارے ہاں پیٹرول اور گیس کی۔ بہرحال اچھی، مزیدار تحریر ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریریں، روح کو تسکین ہوتی ہے جب ہم ان بزرگان دین کی زندگی کو پڑھتے ہیں۔ انہوں نے مذہب اور انسانیت کی کیا خوب خدمت کی۔ کترنیں ہمیشہ ہی لاجواب رہتی ہیں۔ توصیف احمد کراچی اور احسان سحر میانوالی کی خوب صورت باتیں اور نصیحتیں لاجواب۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور کا خط بہت تفصیلی اور کھلی تحریر والا تھا، پسند آیا۔ ماہا ایمان صاحبہ تبصرہ بھی لکھتی ہیں تو جامن کے درخت کے نیچے جو دھوپ اور بارش دونوں سے زیادہ محفوظ نہیں رکھتا۔ ان کی تحریر بہت بے ساختہ ہے اور کھل کر اظہار کر دیتی ہیں، لکھتی رہیں اچھا لگتا ہے۔ نجمہ سودی نے تنگ ویلیٹ کی بہت پیاری کہانی تحریر کی ہے۔ ایک بامقصد کام کو بہت ٹیڑھے انداز سے قابل عمل بنایا گیا ہے۔ تنگ ویلیٹ نے بہت ذہانت سے بہت جلد اپنا کام کر ڈالا اور حقیقت سے پردہ بھی اٹھ گیا۔ ش م جمیل نے چکنی مچھلی میں ایک انتہائی شاطر مجرم کو پکڑوا دیا لیکن کہانی بڑی ہلکی رہی اور ایک بے حقیقت کہانی کو خوبصورت پیرائے میں تحریر کر کے پڑھنے کے لائق بنایا۔ کاشف زبیر نے بڑی دلچسپ کہانی تحریر کی۔ اس میں محبت کو مذہب، علاقہ اور تعصب سے بالاتر ثابت کیا۔ پاک وہند کی غلط فہمی اور دشمنی جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہے، اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس کے باوجود کہانی میں کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے۔ خاص کر کمپیوٹر کی جادوگری کو کچھ زیادہ بڑھا کر کہانی میں میل تال پیدا کیا گیا اور لیپ ٹاپ کو فلش کرنا۔ سرینا بڑی بی کا فوراً حالات کو سمجھ لینا اور ایکشن میں آنا تھوڑا سا مصنوعی لگا۔ لیکن کہانی بہت عمدہ اور دل کو چھوتی ہے۔ آپ کے دیرینا کارکن جناب رضی الدین کے انتقال پر دلی تعزیت قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین) میری جانب سے آپ کو اور آپ کی تمام ٹیم کو رمضان کی برکتیں حاصل ہوں اور عید الفطر کی ڈھیروں مبارک باد قبول ہوں۔“

✠ **زویا اعجاز**، لاہور سے شریک محفل ہیں ”کٹھن انتظار کروانا سسپنس ڈائجسٹ نے اب اپنا معمول بنا لیا ہے۔ اس مرتبہ تو حد ہی ہو گئی۔ بیس جولائی کو خدا خدا کر کے ڈائجسٹ کا دیدار نصیب ہوا۔ مگر جب ٹائٹل دیکھا تو انتظار کی ساری کوفت ہوا ہو گئی۔ میں اسے بے حد دلکش، لاجواب اور سال رواں کا بہترین ٹائٹل قرار دوں گی۔ انشائیہ فکر انگیز تھا۔ ہمیں آزادی کی نہیں انفرادی اور اجتماعی کوتاہیوں کی سزا مل رہی ہے۔ آفتاب احمد کا تبصرہ بہت زبردست تھا۔ اعجاز احمد راحیل اور ماہا ایمان نے بھی اچھا لکھا۔ اکثر ممبران میرے بارے میں ناکام اندازے لگاتے نظر آئے۔ سب سے پہلے مسافر کی ہمراہی اختیار کرنی چاہی لیکن کاشف زبیر کی بازگشت سنائی دی تو کہیں اور قدم ٹھہر ہی نہ سکے۔ بازگشت کی بازگشت مدتوں سنائی دیتی رہے گی۔ ایک ان دیکھا سحر تھا جس نے اپنے حصار میں لیے رکھا۔ نسل در نسل منتقل ہوتی نفرت، متعفن بھارتی سیاست اور ہندووانہ تعصب کی عکاس بہت خوب صورت منظر نگاری اور مثبت اختتام کے ساتھ یہ کہانی اسٹوری آف دی ایئر کہلانے کی حق دار ہے۔ ویلڈن کاشف صاحب۔ اب پلیز یوم دفاع کے حوالے سے طاہر جاوید مغل سے کوئی شاہکار تخلیق کروائیے۔ عائشہ فاطمہ نے بہت عمدگی سے میرج بیوروز کی گھناؤنی حقیقت آشکار کی۔ ملک صفدر حیات کا کیس کافی دلچسپ تھا۔ ماجد کا انجام بہت افسوس ناک تھا۔ تاریخ کے جھروکے میں اس بار احمد نگر کا چاند طلوع ہوا۔ بہت متاثر کن کردار تھا چاند بی بی کا۔ کشکول میں آکٹوپس قانون کو خوب تگنی کا ناچ نچا رہا ہے۔ آکٹوپس کی فرعونیت اور قانونی اداروں کی بے بسی عروج پر ہے۔ مسافر میں چندو ماہی کی آبلہ پائی بالآخر اختتام کو پہنچی۔ ہوس کاروں نے نزاکت ودلکشی کے پیکر کو روند کر زہر وبارود میں ڈھال دیا۔ شہریار کے والدین کا ماضی بھی کافی روایتی لگ رہا ہے۔ منظر امام نے ہلکے پھلکے پیرائے میں بہت کاری وار کیا۔ پوسٹ کارڈ کی چوری اور اتفاقات بس ایوریج رہیں۔ تعاقب میں کیرولین نے کمال ذہانت سے اپنی ممتا بچالی۔ چکنی مچھلی میں ایک غلطی مجرم کو لے ڈوبی۔ ابو خلیفہ القاسم بھی اچھی تھی۔ محفل شعر وسخن میں شہلا خان، جنید احمد ملک اور یونس خان روغانی کا انتخاب بہت خوب صورت تھا۔ بشیر احمد بھٹی اور طالب حسین طلحہ کے مراسلات بیسٹ رہے۔ آخر میں ادارے اور سب ہم وطنوں کو عید الفطر اور جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو۔“ (شکریہ)

✠ **محمد صفدر**، خانیوال سے تشریف لائے ہیں ”سرورق بہت ہی پیارا ہے، ماڈل شاید عید کے آنے کا سوچ رہی ہے کہ مہنگائی میں کیا بنے گا۔ جون ایلیا کا تبصرہ پڑھا، دکھ ہوا کہ واقعی ہم آج تک آزاد نہ ہو سکے، ہم جہاں سے 66 سال پہلے چلے تھے ابھی بھی وہیں ہیں، ہندوؤں اور سکھوں نے جو ہمارے ساتھ کیا وہی آج ہمارے اپنے لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ میں کر رہے ہیں۔ بندہ کس کا رونا روئے۔ پھر ہم آئے خطوط کی محفل میں اور کرسی پر آفتاب احمد نصیر نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ مبارکاں جی! مجھے سمجھ نہیں کہ قیصر بھائی کیا کرتے ہیں ان کا خط ہر بار شائع ہو جاتا ہے لیکن تبصرہ ہمیشہ ہی جاندار کرتے ہیں۔ مظہر سلیم نے بھی اچھا تبصرہ کیا، خصوصاً آج کل کے حالات بارے میں جو حال پاکستان میں چل رہا ہے آخر میں گل مروت نے بھی خوب کھینچا تانی کی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ اس مرتبہ قسط بہت ہی جاندار تھی، مزہ آ گیا گڑ کھا کے۔ اس کے بعد کشکول کا لگتا یوں ہے کہ یہ اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ بازگشت نے تھوڑا دکھی کر دیا کہ ہندو آج بھی ہمارے خون کے پیاسے ہیں جبکہ وہ پاکستان آئیں تو ہم بڑی عزت دیتے ہیں، وہ تو دشمنی میں بہت آگے جا رہے ہیں۔ تاریخی کہانی چاند سلطان اچھی رہی اگر ہمارے مسلمان حکمران اپنے جھگڑوں میں نہ پڑتے تو آج ہر جگہ مسلمانوں کا راج ہوتا۔ مریم کے خان کی اتفاقات نہایت ہی دلچسپ کہانی تھی، کس طرح رشتوں کو جوڑ دیا۔ اس کے علاوہ چکنی مچھلی، رائی کا پہاڑ، تنگ ویلیٹ کی انٹری، چادر اور باقی سب بھی اچھی تھیں۔ خلیفہ ابو القاسم کے بارے میں پڑھا۔ دل کو سکون سا محسوس ہوا۔ محفل شعر وسخن میں راشد حبیب تابش، نبیلہ بشیر منگی، مریم کائنات کے شعر اچھے لگے۔ پوری ٹیم کو عید مبارک۔“

✠ **قیصر اعوان**، شیر ہرل، قیدی سزائے موت، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے جولائی کے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں ”مسلسل تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ محفل میں حاضر ہوں۔ اس ماہ کا شمارہ کافی جدوجہد کے بعد 25 جون کی خوشگوار صبح کو ملا۔ پچھلے تین ماہ کے شمارے خصوصاً محفل یاراں کے خط اور سلسلہ وار کہانیاں پڑھیں اور تینوں ماہ کے خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا کہ میری غیر حاضری پر محفل کے کسی دوست نے نہیں پوچھا کہ کیوں شامل محفل نہیں ہو رہا جیسے کسی کو یاد ہی نہ ہوں۔ بہناں زویا اعجاز گلاب کے اور گوبھی کے پھول میں زمین آسمان کا فرق ہے گلاب کا پھول محبت کی اور گوبھی کا پھول (؟) نشانی ہے؟ ذرا غور کریں۔ برادر قیصر اقبال کچھ لگتا ہے آپ بھی کسی خوش فہمی کا شکار ہیں؟ بہناں تصویر العین مجھے آپ کی کم بولنے والی عادت پسند آئی، خاموشی بھی ایک عبادت ہے مگر کبھی کبھار حسِ مذاق شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے نہ کہ بگاڑ اور بہناں اگر ہو سکے تو ہمارے لیے خصوصی دعا کیا کریں، احسان ہوگا۔ برادر محمد ہمایوں سعید یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ صنف نازک جذباتی طور پر کمزور اور بے وقوفوں کی حد تک معصوم ہے؟ ذرا دوبارہ ریسرچ کریں آپ کی ریسرچ غلط ہے۔ مظہر سلیم برادر سسپنس کی تاخیر کا رونا روتے نظر آئے وہ بھی شاید دوسروں کو شکر کا مشورہ اور خود سرخ مرچ چبا کر لکھا اس لیے موصوف کا دماغ حاضر محفل نہیں تھا؟ بھائی یار ہم قیدیوں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آپ کا خط پڑھ کر خصوصاً ماہین کا سن کر دلی خوشی ہوئی۔ برادر عبد المنصور موڈ کو آف نہیں بلکہ اسٹینڈ بائی رکھا کریں ویسے بھی گرمی بہت ہے۔ برادر سید محی الدین اشفاق آپ کے والد مرحوم کا سن کر دکھ ہوا، اللہ ان کو

اور آپ کی والدہ ماجدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی دے، آمین۔ برادر رمضان پاشا لگتا ہے کہ آپ کو لڈو کے نام سے چڑ ہو گئی ہے تبھی سسٹر تصویر العین کو آنکھیں دکھا رہے ہو مسٹر لڈو کیا کہو گے اس بارے میں؟ برادر رضوان تنولی پہلے میں سمجھا تھا کہ آپ کا کستوری کا کاروبار ہے تبھی بات بے بات کستوری کا ذکر کرتے ہیں مگر اب شک ہوتا ہے کہ آپ کی پکوڑوں کی بھی دکان ہے کیا کہتے ہیں کستوری لگا کے؟ اور ہاں کوشش کریں اپنی دم کی جتنی حفاظت کر سکتے ہیں کریں، مجھے خطرہ ہے کچھ لوگ آپ کی دم کے پیچھے پڑ گئے ہیں کستوری لگا کے؟ برادر ابرار وارث کوشش کرتے رہیں ایسی پھبتی مارنے کی آپ کو بھی یہ زبان سمجھ آ جائے گی اور اگر نہ آئے تو قیصر اقبال، رضوان تنولی میں سے کسی کی شاگردی اختیار کر لیں انشاءاللہ افاقہ ہوگا؟ سسٹر ماہا ایمان، سسٹر طاہرہ یاسمین اینڈ طاہرہ گلزار سب کہاں غائب ہیں، اپنی حاضری لگوائیں جلد از جلد اور ماریہ فاروق آپ کے رزلٹ کا کیا بنا اور تمام قارئین کے لیے اطلاع ہے کہ عمران حیدر بلوچ کی سزائے موت ہائی کورٹ لاہور نے تبدیل کر کے 25 سال قید میں بدل دی ہے وہ لاہور کے اسپتال میں ہی ایڈمٹ ہے اور برادر حسنین بلوچ لگتا ہے شادی کے بندھن میں جکڑے جا چکے ہیں تبھی ان کو فرصت نہیں۔“

✠ **بابر عباس اینڈ فیملی**، گلیانہ روڈ کھاریاں سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سر جی سسپنس کا نیا شمارہ ماہ اگست کی صورت میں آج مورخہ 17 جولائی کو ملا ہے اور 21 جولائی کو میری 70 ویں سالگرہ بھی۔ چلیں اب جلدی سے مجھے مبارک باد دیں اور ایک مبارک باد میں بھی آپ کو دیتا ہوں یعنی جشن آزادی کی مبارک باد! اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی ایک نعمت ہے اور ہم ایک آزاد اور خود مختار ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ سر جی! آپ سے ایک شکایت ہے، آپ میرے خط کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ بے شک آپ پیارے سسپنس کی قیمت دس روپے بڑھا دیں مگر خطوط کے معاملے میں نرمی کریں۔ اس بار کرسی صدارت پر اپنے سسرالی شہر لاہور سے آفتاب احمد تفسیر اشرفی صاحب براجمان تھے۔ اشرفی صاحب آپ تو بڑے ہو گئے ہیں، حیرت ہے مجھے پتا ہی نہیں چلا کب بولنا شروع کیا تھا، آپ نے مجھ سے۔ رابطہ ضرور کریں چند نادر قسم کے مشورے دوں گا آپ کو۔ ابرار وارث پتر جی کیا بات ہے آج کل امن کی آشا جوائن کر لی ہے۔ قیصر اقبال گچھ صاحب کیا بات ہے بھایا مجھ سے ناراض ہو۔ محمد جاوید گل چندا توری چاندنی میں جیا جلا جائے رے۔ آپ آئے تو محفل میں خزاں آئے رے! توصیف احمد صاحب آپ نے بیٹی کی مبارک باد دی بہت بہت شکریہ۔ حسیب احمد چنائے صاحب جن رے جھوٹ مت بولو، خدا کے پاس جانا ہے عمر نہیں چھپائی سچ بتاتا ہے۔ عزیزم راحیل صاحب میرے پاس دماغ ہے تو کھپاتا ہوں آپ کے پاس کیا ہے اسے بھی کر تھیں۔ رضوان تنولی عزیزی اگر رمضان پاشا صاحب میرے پیچھے پڑ کر خوش ہونا چاہتے ہیں تو ان کو منع مت کریں۔ بی بی ماہا ایمان آپ کو بی بی کہوں یا بی یا کہوں خود ہی بتا دیں مجھے اور یہ آپ جگہ تبدیل کر کے خط کیوں لکھتی ہیں کبھی اوکاڑہ کبھی حافظ آباد اور کبھی سیالکوٹ کیا کسی سے خطرہ ہے؟ باقی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ مظہر سلیم صاحب یہ سب سمجھنے کی باتیں ہیں سمجھا کریں اگر کچھ سمجھ میں آ جائے، باقی میرے خط کو بیوی سنسر کرتی ہے پھر پوسٹ کرتا ہوں۔ طاہرہ گل زار، طاہرہ یاسمین، حمیرا رضا اور ایسی بہت سی صنف نازک سے تعلق رکھنے والی ہستیاں میرے ڈر سے غائب ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے حسب معمول مسافر پڑھی آخر خدا خدا کر کے چندو ماہی کی کہانی پوری ہوئی اور مسافر اپنی اصل ڈگر کی طرف واپس آ گئی۔ انوار صدیقی صاحب کی تحریر کشکول کو میں ٹائم پاس ہی کہوں گا۔ آخری صفحات پر کاشف بھائی کی زبردست تحریر بازگشت، سسپنس نے اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہم قارئین کو ایک زبردست تحریر پڑھنے کو دی۔ ویل ڈن کاشف بھائی، آپ کی تحریر کردہ بازگشت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ منظر امام صاحب کی تحریر خالد میاں کے ہاں ہلکا پھلکا انداز مزاح لیے ہوئے اچھی لگی۔ ویسے سر جی، اچھی کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ تاریخ کی سیر کرواتے ہوئے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر چاند سلطان زبردست تحریر تھی، بہت اچھے ڈاکٹر صاحب۔ عائشہ فاطمہ کی چادر سلیم انور کی تعاقب، نجمہ مودی کی مغرب سے درآمد شدہ پوسٹ کارڈ کی چوری، مریم کے خان کی اتفاقات، ش م جمیل کی چکنی مچھلی اچھی اور خوب صورت تحریریں تھیں جبکہ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب کی ہر تحریر اتنی خوب صورت اور معیاری ہوتی ہے کہ اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھلانے والی بات ہوتی ہے۔ محفل شعر و سخن میں اپنے شعر دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کسی غریب آدمی کو گیس ملنے کی ہوتی ہے۔“

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے چلے آ رہے ہیں ”رمضان المبارک کی مناسبت سے ہمیں امید تھی کہ ذاکر انکل کسی روزہ ہولڈر بچی کو سرورق پہ سجائیں گے۔ مگر ذاکر انکل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ خیر ہمیں کیا۔ ہم تو ویسے بھی رمضان میں نامحرم خواتین کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ آفتاب احمد اشرفی صاحب! غور فرمائیے گا ہماری اور آپ کی پسند میں بس ذرا سا فرق ہے۔ آپ کو ہر وہ شخص پسند ہے جو خواتین کو پسند کرتا ہے اور ہمیں ہر وہ پسند ہے جو خواتین کی عزت کرتا ہے۔ تصویر العین صاحبہ واقعی بہت کم گو، مہذب اور دلنشین گفتگو کرنے والی شخصیت ہے۔ آپ کو ان سے ملنے کے بعد کسی ڈیپرین کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ ضرورت پڑے گی خواب آور گولیوں کی۔ اعجاز احمد صاحب! رضوان تنولی صاحب آپ کے استاد محترم اور بگ باس ہیں؟ کیا آپ نے یہ بات بقائمی ہوش و حواس کہی ہے؟ احسان میاں! آپ کی یہ حاسدانہ فطرت آپ کی صنف کو مشکوک بنا رہی ہے۔ بھئی اگر توصیف چھیڑ گیری کرتا بھی ہے تو آپ کو کسی پل قرار کیوں نہیں آ رہا۔ زویا اعجاز صاحبہ! صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر انہی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کے ہم خیال، ہم ذوق اور ہم مزاج کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ ان پر بھی ذرا روشنی ڈال دیتیں تو مہربانی ہوتی۔ تفسیر صاحب! بابر عباس صاحب تو پچھلے چالیس سال سے محفل میں شریک ہوتے ہیں تو ان کی شرکت خصوصی کیسے ہو گئی؟ کہانیوں میں سب سے پہلے سب سے آخری صفحات پہ بچھی خوب صورت احساسات اور نازک جذبوں کی خوب صورت ترین کہانی بازگشت پڑھی۔ کاشف زبیر صاحب کو شاہکار کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ محبت کا کوئی موسم نہیں محبت کا کوئی مذہب نہیں۔ محبت کی کوئی سرحد نہیں۔ سارہ اور سرینا کی لازوال محبت نے محبت کے مفہوم میں انوکھا اضافہ کیا۔ ملک صفدر حیات نے ایک جاندار کیس کی مدد سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ رائی کا پہاڑ کیسے بنتا ہے۔ منظر امام کی کہانی خالد میاں کے ہاں تو سر کے اوپر سے گزر گئی۔ تعاقب مکمل طور پر غیر متاثر کن رہی۔ عائشہ فاطمہ کی چادر ایک سبق آموز کہانی تھی۔ بے شک انسان کو چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ مریم کے خان کی کہانی اتفاقات میں اتفاقات کو بہت بھونڈے طریقے سے ایک دوسرے میں ضم کیا گیا تھا۔ بہر حال انجام خوشگوار تھا۔“

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”اگست 2013ء کا سسپنس ملا اور جلد ہی پڑھ لیا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر آزادی کا المیہ بیان کیا جا رہا تھا اور شاید عشروں تک یہ سلسلہ چلتا رہے مگر یہ بھی کھلی حقیقت ہے کہ ہر تاریک رات کے بعد سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ اسی امید پر جیے جا رہے ہیں۔ دن، ہفتے، مہینے، سال ہا سال گزرتے جا رہے ہیں مگر آس کا پنچھی امید کے موتی پروئے بیٹھا ہے کہ کبھی تو وہ دن آئے گا جب دلوں میں شک و بغض کے سانپ نہیں لہرائیں گے۔ جب جنگ کے مہیب بادل نہیں گرجیں گے۔ انشائیے سے آگے بڑھ کر اپنی محفل میں شریک ہوئے، جہاں نئے و پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور ان کے تبصروں سے مستفید ہوئے۔ اپنا نام بھی نظر آیا مگر مختلف انداز میں۔ محفل سے آگے بڑھے اور مسافر کی منزل کی جانب بڑھتے قدموں کے ہم قدم ہوئے جہاں چندو کی کہانی ختم ہوئی اور دوسری کہانی شروع ہوئی جو کہ شہریار کے ماں باپ اور خاندان کی ہے۔ دوسری کہانی کشکول تھی جو حسب سابق دلچسپی سے پڑھی گئی۔ اس کے بعد چاند بی بی سلطانہ جیسی جری اور بہادر خاتون کی تاریخی کہانی جس کے مصنف ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ کے اوراق سے پردے اٹھا رہے تھے۔ اتفاقات میں کائل ایڈگر کے باپ ولیم نے تدبر سے کام لے کر کائل کو غیر یقینی حالت سے نکال لیا اور کسی کو جسمانی نقصان بھی نہیں ہوا۔ چکنی مچھلی میں ہاروے نے انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا اور ایک قاتل کو ایک غیر اہم ثبوت کی وجہ سے بے نقاب کر دیا۔ پوسٹ کارڈ کی چوری میں نک ویلوٹ نے سمنتھا کی سازش کو طشت ازبام کر دیا۔ محفل شعر و سخن معیاری شعروں نے مزہ دیا۔ چادر نے بھی اچھا سبق دیا کہ چادر دیکھ کر ہی ہر انسان کو پیر پھیلانے چاہئیں۔ پرائی چادر سارے عیب کھول دیتی ہے۔ خالد میاں کے ہاں ہنسی مسکراتی تحریر تھی۔ اللہ کے ولیوں کے حالات میں خلیفۃ القاسم کے حالات پیش کیے گئے، جو اکبر آباد کے برگزیدہ ولی تھے۔ اللہ کے ولی دنیا چھوڑتے ہیں تو دنیا اپنے ہاتھ باندھے ان کے دربار میں حاضر ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح آخری صفحات کی کہانی کاشف زبیر کی زبانی بازگشت تھی جو کہ متعصب ہندوؤں کے متعصب ذہن کی عکاسی کرتی ہوئی بہترین کہانی تھی۔ وہیں دوستی کی ایک داستان بھی رقم کی اور سرینا نے اپنے پوتے کی جان کی پروا بھی نہیں کی اور دوستی کی لاج رکھ لی۔ اس کے ساتھ ہی جشن آزادی مبارک۔ عیدالفطر مبارک۔“

✠ **سید اکبر شاہ**، اوگی مانسہرہ سے تشریف لائے ہیں ”اگست کا شمارہ 19 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے یاروں کی محفل میں پہنچے۔ آفتاب احمد صاحب کو وکٹری اسٹینڈ پر براجمان پایا۔ شاندار تبصرہ تھا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ کہانیوں میں ابتدا مسافر سے کی۔ اس بار راوی کی کٹھنائیوں کا رخ شہریار کی ذات کی طرف روانہ ہوا۔ خاصا غمگین پس منظر تھا۔ پھر ملک صاحب کی رائی کا پہاڑ پر پڑاؤ ڈالا جس میں رائی پہاڑ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، معاشرتی مسائل کے گرد گھومتی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ اس کے بعد اختتامی صفحات پر موجود کاشف زبیر کی بازگشت پڑھی۔ شروع میں تو بوریت محسوس ہوئی البتہ بعد میں دلچسپی شروع ہوئی۔ خاص کر سرینا کا کردار پسند آیا۔ مختصر فن پاروں میں چادر اور پوسٹ کارڈ کی چوری پڑھی۔ دونوں بہترین کہانیاں تھیں۔“

✠ **ہارون رشید**، مردان سے محفل میں حاضری لگا رہے ہیں ”ایک طویل اور سخت جاں انتظار کے بعد ماہ اگست کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا۔ سرورق اور دیگر اشتہارات کو دھڑکتے دل کے ساتھ پھلانگ کر سیدھا اپنی محفل میں پہنچا، لیکن یہ کیا...... ادھر میرا خط تو کیا بلیک لسٹ میں بھی میرا نام نہیں تھا۔ بقول تصویر العین کے دل کے موسم بہار پر ایسی خزاں آئی کہ ساری فصل اجڑ گئی۔ خیر ہم بھی پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ اب ماہ ستمبر کے لیے خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ اس بار سرورق بڑا دلکش اور جاذب نظر تھا۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والی سادہ سی لڑکی آنکھوں میں سلائی سے سرمہ لگا رہی تھی۔ بہت اچھے ذاکر انکل۔ اپنی محفل کی صدارت اس بار آفتاب احمد اشرفی کے ہاتھ میں تھی۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ آفتاب صاحب! یہ راحیل صاحب تو شاعر ہیں نا اور شاعر حضرات کے خیالات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ ابرار وارث! میں اور آپ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ آپ کو بھی شمارہ بڑی مشکل سے ملتا ہے اور ہمیں بھی۔ قیصر اقبال صاحب! ویسے اگر سسپنس کے بجائے آپ کا محبوب کوئی انسان ہوتا تو پھر کیا حال ہوتا آپ کا۔ یقیناً دیوانے ہو جاتے۔ یار توصیف! ویسے آپ کتنی تنخواہ پر راج صاحب کے ہاں کام کرتے ہو؟ ماریہ فاروق صاحبہ! مرچیں کم کھایا کرو اور یہ غصہ چھوڑو، خط شامل اشاعت نہ ہوتا تو اتنی بڑی بات نہیں۔ پاشا صاحب! آپ محفل سے ترک تعلق کر رہے ہو یا سسپنس پڑھنے سے۔ مجھے اپنے آپ پر 100 پرسنٹ یقین ہے کہ سسپنس نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ تو پرانے قاری ہو۔ کیا حال ہے بابر صاحب! میسج کا جواب بھی نہیں دیتے، لگتا ہے چھوٹی ماہین بابر سے جان نہیں چھوٹتی۔ کہانیوں کی ابتدا مسافر سے کی جہاں میڈم شکیلہ کی رام کہانی ختم ہو گئی۔ دوسری طرف شہریار نے رنگو کو زیر کر لیا ہے۔ بس شوٹ کرنا باقی ہے۔ ویسے کہانی کے مصنف ناصر ملک صاحب کہانی میں مختلف قسم کے گاڑیوں کے نام بڑے خوب صورت پیرائے میں سمو لیتے ہیں۔ کشکول میں کوبرا نے سارے پولیس والوں کو خوب پریشان کیا ہے۔ آخری صفحات پر اس بار کاشف زبیر بازگشت لے کے آئے۔ ان کی یہ کہانی مجھے نسیم حجازی کی شہرۂ آفاق تصنیف خاک اور خون کی طرح لگی۔ کہانی زبردست تھی۔ آخر تک سرینا نے دوستی کا حق ادا کیا۔ اس بار ملک صاحب ایک بے گناہ مقتول ماجد کا کیس لے کے آئے۔ کہانی کے درمیان ہنسے بھی اور آخر میں افسردہ بھی ہوئے۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر میں ملک صاحب نے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ عائشہ فاطمہ صاحبہ کی کہانی چادر اسٹوری آف دی منتھ تھی۔ نادر صبح کا بھولا تھا جو شام کو لوٹ آیا۔ ایک بات انکل یہ جو کہانی کے اوپر تمہید لکھی ہوتی ہے یہ مصنف خود لکھتا ہے یا ادارے کا کوئی فرد لکھتا ہے۔“ (یہ ایڈیٹر کا کام ہوتا ہے)

سعدیہ بخاری، ضلع اٹک سے محفل کی زینت بنی ہیں ''اگست کا سسپنس 21 تاریخ کو بہت لیٹ ملا ساون کا مہینا، بارش، رمضان المبارک اور جشن آزادی کا حسین امتزاج لیے سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ آزادی کے سال کے حوالے سے حسینہ جدید وقدیم طرز زندگی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا آزادی کے پس منظر میں پاک انڈیا تعلقات اور سود و زیاں کے حساب کتاب میں مصروف نظر آئے۔ اداریے میں ایڈیٹر نے بہت خوب صورتی سے تمام موضوعات کو سمیٹا اور خاص طور پر ان کی یہ بات کہ اردگرد ضرورت مندوں کا بھی خیال رکھیں، دل کو چھوگئی۔ اللہ رب العزت تمام امیر و غریب کو عید کی خوشیاں نصیب کرے، آمین۔ چونکہ عید اور سسپنس ایک ساتھ آئیں گے اس لیے تمام قارئین اور ادارے کے تمام لوگوں کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک۔ اپنی محفل خطوط میں آئی تو کیا دیکھا ''بلی گئی چوہوں کی بن آئی'' والی بات نظر آئی اب تمام صنف مخالف ادھر ادھر ہو جاؤ، کونے کھدروں میں گھس جائیں۔ پہلے نمبر پر آفتاب نصیر ویلکم بیک 40 سال بعد سسپنس کی سالگرہ کے موقع پر دوبارہ حاضری دے کر آپ نے سسپنس سے سچی محبت کا ثبوت دیا ہے، بہت بہت مبارک کرسی صدارت، تبصرہ اے ون تھا۔ ابرار وارث اپنے خط کو دیکھ کر دل میں میٹھی سی لہر کا اٹھنا چہ معنی، میاں یہ آپ کا اپنا محفل سسپنس کا خط ہے کسی کا لو لیٹر نہیں۔ قیصر اقبال صاحب قوم کے معمار ہو کر یہ حال ہے آپ کا تو ان مستقبل کے معماروں کا کیا بنے گا جو آپ کے سامنے بیٹھ کے پڑھتے ہیں، حساب کتاب کے اتنے کورے، زویا 13 سال سے سسپنس پڑھ رہی ہے اور میٹرک کلاس سے تو اندازہ لگانا مشکل ہے کہ میٹرک کس سن میں کیا؟ احسان سحر آپ کے دل کی وجہ کیا ہے؟ زویا ڈیئر کیا جواب دیا ہے تفسیر انکل کو، ویلڈن۔ رمضان انکل اتنی سی بات پر آپ خفا ہو گئے اٹ از ناٹ فیئر اپنا فیصلہ واپس لیں۔ قدرت اللہ نیازی بھائی واللہ بالکل بھی نہیں لگا کہ محفل سے جاوید بلوچ غیر حاضر ہیں آپ کی موجودگی سے، اب آپ نے افواہیں پھیلانا شروع کر دیں، اپنی نام نہاد ہمدردی ابھی سنبھال کے رکھیں۔ گل مروت، ماہا ایمان اور تفسیر انکل کی نوک جھونک اس لیے ٹھنڈی پڑ گئی تھی کہ بیچارے تفسیر انکل کی چونچ زخمی تھی۔ کہانیوں میں پہلے بات کرتے ہیں مسافر کی، میڈم شکیلہ کی داستان اختتام پذیر ہوئی اس کی دکھ بھری کہانی سن کے تو ہمیں بھی ہمدردی ہو چکی ہے، شہریار ایک بار پھر ایکشن میں کم بیک کر چکا ہے۔ قسط اے ون رہی۔ دوسرے نمبر پر پڑھی رائی کا پہاڑ، کافی عرصے بعد اس قدر دلچسپ اور اپنی نوعیت کا انوکھا کیس ملک صاحب لائے کہ بہت زیادہ تعریف کے مستحق ٹھہرے، کیس الجھا ہوا نہ ہونے کے باوجود مجرموں کی تلاش اور وہ بھی اسکیچ کی مدد سے بہت مشکل کام تھا۔ تیسرے نمبر پر پڑھی بازگشت، آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی کاشف زبیر کی بہترین کاوش تھی۔ ایسی کئی کہانیاں تقسیم کے وقت وجود میں آگئیں۔ دوستی کا جذبہ ذات پات، مذہب سے ماورا ہوا کرتا ہے اور سارہ اور سریتا بھی ایسا ہی کردار ہیں، اختتام خوشگوار رہا۔ چوتھے نمبر پر پڑھی چاند سلطان، علی عادل کے واقعات تو تین بار پہلے پڑھے جا چکے ہیں البتہ چاند بی بی کا تفصیلی احوال کہانی میں اضافہ تھا۔ چاند بی بی کی فہم و فراست، دوراندیشی نے اسے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ رسالہ لیٹ ملنے اور مصروفیت کے باعث ابھی تک یہی کہانیاں پڑھ سکی۔ باذوق قارئین کی عمدہ محفل شعر و سخن میں معیاری انتخاب پڑھنے کو ملا۔''

قیصر اقبال گجھ، کلوال، ضلع بھکر سے تبصرہ کر رہے ہیں ''گزرے ماہ و سال میں دنیا نے اتنی ترقی کی کہ ایک گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر گئی، دنیا کو گلوبل ولیج بنانے میں جہاں سائنس، ٹیکنالوجی اور میڈیا نے اپنا کردار ادا کیا ہے وہاں ہمارا پیارا سسپنس بھی پیچھے نہیں رہا۔ سسپنس نے لوگوں کو قریب لانے، رابطے بحال کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبتیں بانٹنے میں اپنا کردار خوب ادا کیا ہے۔ سسپنس نے ہمیں ایسے ان دیکھے دوست عطا کیے ہیں جن کی محبت دیکھ کر ان کو دیکھنے اور ملنے کو دل کرتا ہے۔ میں نے اپنی اس خواہش کو عملی شکل دی اور سیدھی اڑان ماری ساہیوال کے تبصرہ نگار اعجاز احمد راحیل کے پاس، محبتوں کا سفیر اعجاز احمد راحیل نہ صرف خوب صورت انسان ہے بلکہ دوستی کے قابل بھی ہے۔ یہ خط میں اعجاز کے خوب صورت گھر کے سامنے بہنے والے دریا سکھ بیاس کے کنارے بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ یہاں آ کر مجھے بے انتہا محبت ملی ہے اور اس کے لیے میں اپنے پیارے سسپنس کا جتنا شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ اگست کے شمارے میں ہر چیز سے نظر چرا کر دوستوں کی محفل میں داخل ہوئے، جہاں آفتاب احمد پہلے انعام میں ملنے والی پاکستانی کرنسی کو اشرفیوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ تبصرہ اچھا، مگر مکمل جھکاؤ صنف اوئی اوئی کی جانب۔ یہ علامات خطرناک ہیں، فوراً سے پہلے اپنے حکیم خان سلامت پوری سے رجوع کریں۔ حسیب احمد جن ماہی، کسی کی تعریف سن کر منہ ٹیڑھا نہیں کرتے یار۔ رضوان بھیا، محفل میں ہمیں لالہ کہہ کر بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ ہم ان شاء اللہ اس کی لاج رکھیں گے۔ زویا اعجاز صاحبہ، بابر عباس کے ذہن کے جالے صاف مت کرو کیونکہ اب صرف جالے ہی تو رہ گئے ہیں۔ ماہا جی کو مصالحت کی پالیسی پر گامزن ہیر دیکھا تو اندازہ لگایا کہ موصوفہ آج کل شاید ٹھنڈا کر کے کھا رہی ہیں۔ پاشا صاحب، منفی کردار کو مارو گولی اور اپنے نام کی لاج رکھو بس۔ نیازی بھیا، ہمایوں سعید کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے تو ''بھینس کے آگے بین بجانے'' والا محاورہ یاد آگیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ انسان نما بھیڑیوں کے ہاتھوں سے گزرتے گزرتے چندو ماہی کا میڈم شکیلہ بننے کا سفر مکمل ہوا۔ کشکول میں شیخ حامد آنکھوں سے اوجھل ہونے کے باوجود اپنی منفی کارروائیوں میں مصروف۔ روشنا کے ساتھ جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا۔ تاریخ کے اوراق سے دشمنوں کی چالوں اور اپنوں کی سازشوں کا شکار ہونے والی چاند بی بی کے واقعات سے معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ ملک صفدر حیات نے رائی کا پہاڑ میں ماجد کے قاتلوں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر اپنے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ایک اور ایمان افروز تحریر خلیفہ ابوالقاسم، اللہ تعالیٰ کے ولی کامل کے دلوں کو منور کرنے والے ایمان افروز واقعات۔ آخری صفحات پر سجی کاشف زبیر کی شاہکار تحریر بازگشت، گم گشتہ حالات و واقعات کا تانا بانا اور پھر ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر کے منصور اور سارہ کی پاکستان آمد۔ آزادی کے مہینے کا بہترین تحفہ ثابت ہوئی۔ نجمہ صدیقی نے پوسٹ کارڈ کی چوری کی صورت میں تک ویلیوٹ کا ایک اور کارنامہ پیش کیا، سراغ رسانی سے بھرپور مریم کے خان کی اتفاقات بہترین تحریر تھی۔ ش جمیل کی چکنی مچھلی میں ہاروے کی بے پناہ ذہانت کے سامنے کولمین کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ معاشرتی مسائل اجاگر کرتی منظر امام کی تحریر خالد میاں کے ہاں بھی اچھی تحریر تھی۔ عائشہ فاطمہ اس وقعہ اندرونی صفحات میں چادر کے عنوان

سے تحریر لے کر آئیں، اچھی کاوش تھی۔ نسیم انور کی تعاقب بھی ٹھیک ہی رہی۔ محفل شعر و سخن میں کنول زریں، رابعہ ملک، تابش اور عادل خان کا انتخاب اچھا لگا۔ ادارہ سسپنس اور تمام قارئین کو عید مبارک۔'' (خیر مبارک)

بشریٰ افضل، بہاولپور سے محفل کی زینت بنی ہیں ''23 جولائی کو سسپنس کافی لیٹ ملا۔ ٹائٹل کی صنف نازک پورے ٹائٹل پر طمطراق سے جلوہ افروز نظر آئیں۔ ذاکر انکل آنکھوں میں سرخ ڈورے کیوں تیر رہے ہیں۔ بے چارے صنف کرخت تو جل بھن کر کباب بن چکے ہوں گے کہ ہمیں ٹائٹل سے غائب ہی کر دیا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے جون ایلیا کا انشائیہ آزادی پڑھا، جون ایلیا مرحوم ہمیشہ اپنی تحریر میں زندہ نظر آتے ہیں۔ اپنی محفل میں قدم رکھا، تمام ساتھیوں اور اہل اراکین کو میری طرف سے عید مبارک ہو۔ میں کافی عرصے بعد محفل میں واپس آئی ہوں۔ (خوش آمدید) دیکھیں کون کون ساتھی ویلکم کرتے ہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کرسی صدارت مبارک ہو، تبصرہ واقعی قابل ستائش تھا۔ آفتاب صاحب چار خواتین آپ سب پر بھاری پڑیں گی ذرا بچ کر رہنا ان سے! مظہر سلیم میرے خیال میں آپ تو پڑھنے کے لیے فاران چلے گئے تھے۔ بابر عباس، مسز عباس آپ نے ہمیں جولائی 2013ء سے یاد رکھا بہت شکریہ۔ آپ کو تو علم ہے کہ مابدولت میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ آپ کے گھر میں رحمت اتر آئی، بیٹی کی مبارک بھی اور روزوں کی، دونوں مبارکیں۔ ابن مقبول جاوید ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ دیکھیں ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ پرانے تمام لکھنے والوں کو واپس آنا چاہیے کافی بلکہ سارے نئے نام ہیں۔ واپڈا والوں کو کوئی پوچھتا! توصیف احمد آپ تو شاعر بھی ہیں۔ کہانی ایک ہی پڑھ سکی ہوں، خالد میاں کے ہاں۔ منظر امام کی کہانی برجستہ جملے پوری کہانی نے اپنی گرفت قائم رکھی، ہنسی بھی بڑی آئی، مزاح سے بھرپور شاہکار کہانی تھی۔ عائشہ فاطمہ کی چادر میں نصیحت کا پہلو نمایاں تھا۔ رخسانہ نے حسن سلوک سے شوہر کا دل جیتا اور سلویٰ خسارے میں رہی۔'' (کہانیوں پر تبصرے میں آپ نے شاعروں والی بات کی۔ ایک کا کہہ کر دو کہانیوں پر تبصرہ کر دیا)

حسیب احمد چنائے، الگڈی کرک سے محفل میں حاضر ہیں ''سسپنس کا دیدار 20 جولائی کو ہوا چونکہ رمضان شروع ہوا ہے اس لیے سرخ لباس میں آنکھ پر مسکارا لگاتے والی حسینہ کو بالکل بھی نہیں دیکھا (یہ تو اچھا کیا۔ عید پر دیکھ لیجیے گا) اس سے کہیں زیادہ چاند تارا اور جشن آزادی مبارک لکھا ہوا بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے بعد جون ایلیا کی آزادی پڑھی اور پھر خطوط میں جھانک کر دیکھا تو آفتاب احمد نصیر اشرفی براجمان تھے، مبارک ہو بھئی۔ توصیف برادر آپ کا سر نیم احمد میرا بھی احمد کہیں آپ ہمارے خاندان سے تعلق تو نہیں رکھتے (مسلمان ہونے کے ناتے۔ ہم سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں) رضوان تنولی آپ کے خط کو ہم نے بھی پڑھا چشمہ لگا کے، کچھ خاص نظر نہیں آیا سوائے کستوری لگا کے۔ ماریہ فاروق بہت بہت مبارک۔ خط شائع ہونے پر بہن مبارکباد تو بنتی ہے، کلول انکل آپ کے الفاظ سے دوسرے ہرٹ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کا دل توڑنے پر ناراض ہوتا ہے۔ ہمایوں اور تصویر الیقین ویسے تو آپ دونوں ہی محفل کی زینت بنے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اس مرتبہ تم دونوں غائب ہو۔ سب خیریت تو ہے؟ پاشا انکل اشعار پسند کرنے کا شکریہ، بابر انکل آپ جو زبردستی اپنی وائف کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں تو یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ماہا آنٹی ویلکم بیک آپ کے بغیر محفل سونی سونی لگتی ہے۔ آخر میں میری طرف سے رمضان پاشا، قدرت اللہ نیازی، ہمایوں سعید، تصویر الیقین، ماریہ فاروق، ماہا ایمان، طاہرہ یاسین، تفسیر عباس ان سب کو اسپیشل عید مبارک اور باقی دوستوں کو بھی عید مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ لیاقت حسین کو ہوئی رہائی اور افضل نے کر دی جیرو کی پٹائی۔ شیخ حامد نے روشنا کو بنایا ہوس کا نشانہ، اس کا شوہر دارا اب بھی ہے اس کا دیوانہ۔ مسافر میں میڈم کا ہوا انکاؤنٹر اور بالآخر میڈم بن گئی گینگسٹر، رنگو قسائی کی زبانی شہریار کے والدین کی کہانی۔ منظر امام کی خالد میاں کے ہاں متاثر نہ کر سکی۔ رائی کا پہاڑ میں ایوب نے کیا 500 روپے کی خاطر ماجد کا قتل۔ تک ویلیوٹ کا کارنامہ کارڈ بھی چوری کر لیے بلیک میلر کا سراغ بھی لگا لیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چاند سلطان اور ضیا تسنیم بلگرامی کی خلیفہ ابوالقاسم بھی خوب رہیں۔ عائشہ فاطمہ کی چادر میں نادر نے اچھا فیصلہ کر دیا۔ روشناس کو ساتھ لیا اور سلویٰ کو طلاق دی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر نادر ان کے کاروبار کا راز فاش کرتا۔ کاشف زبیر کی بازگشت دونوں سہیلیاں 60 سال بعد ملیں۔ مکیش ہی نے دونوں خاندانوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ہندو ہمیشہ سے مسلمان کو اپنا دشمن کیوں سمجھتا ہے۔''

تابی اور بالو، صفدر آباد سے محفل کی زینت بنے ہیں ''محفل میں ایک دھماکا کرنا چاہتا ہوں بس اجازت چاہیے آپ کی؟ (اجازت ہے) تو خواتین و حضرات دل تھام کے سنتا ذرا، ہیٹ نیوز ہے ''آسان زبان بولنے والوں کو بلڈ پریشر کے خطرات کم ہوتے ہیں، مشکل زبان بولنے والوں کی صحت جلد خراب ہو جاتی ہے۔'' مشکل الفاظ بولنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ..... تھوڑا ٹائٹل پر تبصرہ ہو جائے۔ حسینہ ہاتھوں میں لال، کالی کانچ کی چوڑیاں پہن کر کالج کے خوابوں میں کھوئی نظر آئی۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب جون کے ماہ میں مشکل الفاظ میں اپنی خواہش بیان کر رہے تھے۔ اختر عباس! نواب صاحب کے اتنے ہی دیوانے ہیں تو جیب خالی کریں فی الحال تو کشکول اور مسافر جاری ہے۔ توصیف احمد کو اب پتا چل گیا کہ عورت بے رحم اور خطرناک حد تک سفاک ہو سکتی ہے تو اب کیا ارادہ ہے۔ محمد ہمایوں سعید! آپ کی ناقص رائے صرف لڑکیوں کے گرد گھومتی ہے یا..... سید محی الدین آپ کے والد کے انتقال پر افسوس ہوا۔ جاری و ساری کہانیوں کے متعلق بات ہو جائے تو کشکول معذرت کے ساتھ بہت بور جا رہی ہے۔ کرداروں کی بھرمار ہے، پچھلے ماہ جو پڑھا ہوا اگلے ماہ تک بھول جاتا ہے۔ ناصر ملک کی مسافر نے اپنی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ میڈم شکیلہ عرف چندو ماہی کی سرگزشت نے ہم جیسے حساس لوگوں کو رلا دیا ہوگا۔ شہریار کی زندگی میں شامل سارے گدھوں سے چندو کا واسطہ پڑ چکا ہے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ، ہاں عائشہ فاطمہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔''

رانا منشی حماد فرہاد اینڈ قیصر گل، قیدی سزائے موت سینٹرل جیل ساہیوال سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ''جولائی 2013ء کا

شمارہ رات 9 بجے 21 جون کو موصول ہوا۔ گرمی کی شدت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نقطۂ عروج پر ہے اور آج کے دن میری 25 ویں سالگرہ بھی تھی (مبارکاں) اور آج جیل آئے ہوئے تین سال بھی مکمل ہو گئے جن میں دو سال سزائے موت کے۔ سو میں نے اپنی سالگرہ کو سسپنس کے ساتھ شیئر کیا۔ چونکہ میں ایف اے کی تیاری میں مصروف ہوں (اللہ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے! آمین) اس لیے رسالے کی کہانیاں پڑھنے سے محروم ہوں، صرف دوستوں کے خطوط اور محبت بھری باتوں سے جی بہلا لیتا ہوں۔ سسپنس میں یہ میرا دوسرا خط ہے اگر ہمایوں سعید اور کچھ صاحب کی بے تکی باتوں سے خطوط والے خانے پر نہ ہو چکے ہوں تو بندۂ ناچیز کو بھی پیر اٹکانے کے لیے تھوڑی سی جگہ مل جائے گی۔ شاید دنیا میں کم ہی جگہیں رہ گئی ہیں جہاں لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے اکٹھے ہونے کا موقع ملتا ہے اور پاکستان میں تو ایسی جگہ کہیں بھی میسر نہیں ہے (ارے ارے ایسا نہ کہیں...... سسپنس پاکستان کا ہی ماہنامہ ہے) ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے پاکستان بھر سے لوگ ایک دوسرے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، محفل یاراں میں چند ایک دوست ایسے ہیں جنھیں میں بہت پسند کرتا ہوں، خاص طور پر ماہا ایمان، اعجاز احمد راحیل، ہمایوں سعید اور تصویر العین صاحب اگر میں آزاد ہوتا تو آپ سے ملنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایڈیٹر صاحب کو بلی کے تھیلے سے باہر آنے کے انتظار میں مصروف عمل پایا، آپ کی سادگی پر بے اختیار ہنسی آگئی، ایڈیٹر صاحب بلی تو دوسری طرف سے نکل بھی چکی انتظار لاحاصل ہے، صدارت کا تاج اپنے ہی شہر ساہیوال کی نمائندگی کرنے والے اعجاز احمد کے سر پر دیکھا تو جی کھل اٹھا۔ آپ ساہیوال میں کہاں رہتے ہیں۔ زویا اعجاز آپ نے میٹرک کس سن میں کیا تھا؟ آپ کی خوش فہمی قابل داد ہے۔ قیصر اقبال کچھ...... ہاہاہا آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو رسالہ کی آمد سے پانچ دن پہلے ہی خواب میں رسالہ پڑھ لیتے ہیں...... جاوید شبیر صاحب آپ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ وہ کون سا گر ہے جس کی وجہ سے رسالہ آپ کے جسم میں ٹھنڈ ڈال دیتا ہے؟ ہمیں بھی بتا دیں جیل میں باہر کی نسبت زیادہ لوڈ شیڈنگ کی جاتی ہے کیا ہم بھی رسالہ اوڑھ کے سو لیا کریں؟ تصویر العین صاحب ایوں تو آپ ہماری پڑوسن ہیں مگر جھوٹ بولنے میں ماہر...... صنف نازک اور گم گو...... ہے نا سفید جھوٹ۔ ہمایوں سعید بھائی آپ کے بقول آپ کی ناقص رائے کافی ناقص محسوس ہوئی۔ بابر عباس "چاندی کرا یار" اس کانٹوں کے سفر میں بے چاری بھابی کو کیوں گھسیٹ رہا ہے؟ ادریس احمد خان صاحب جلدی جلدی لکھ کر جان چھڑواتے نظر آئے۔ تقی عباس یار خدا کا خوف کر اللہ اللہ کیا کر اور نماز پڑھا کر رب توں جان دیتی ایں۔ عبدالغفور خٹک نے بھی اچھا لکھا۔ زیڈ اے نیازی افسوس ہوا آپ کے بارے میں جان کر، بہت لمبی قید ہے آپ کی۔ اللہ تعالیٰ سب سزائے موت کے قیدیوں کو معاف کرے۔ زارا خان آپ نے پہاڑی وادیوں سے انٹری دی اور ایک ایسے صاحب کی فین نکلیں جو کہ خود گھگے ہیں۔ چودھری احمد خان چکری آپ شاید بالا چکری آف انوکھا لاڈلا کے قریبی عزیز ہیں۔ آپ وہ چکری ہیں جو خود کو چکر دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ فضا جی خیر تو ہے، بہت میٹھا بول رہی ہیں آپ؟ بڑی گل اے جی تہاڈی۔ محی الدین اشفاق اللہ آپ کے والد صاحب کو جنت میں جگہ دے۔ رمضان پاشا، رضوان کریزا، ابرار وارث اور تفسیر عباس آپ کو بھی پسند کیا۔"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے تشریف لائے ہیں "اگست کا شمارہ رمضان کے مبارک مہینے میں موصول ہوا۔ سرورق کو یوم آزادی کے پس منظر میں بنایا گیا جو بہت اچھا لگا، حسینہ رمضان میں ہی عید کی تیاریوں میں مصروف نظر آئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ پولیس اور خفیہ اداروں کی کوششوں کے باوجود شیخ حامد اپنے ناپاک عزائم جاری رکھے ہوئے ہے۔ روشنا کی نازیبا ویڈیو بنا کر دارا کو بے بس کرنے کے لیے وہ پھر کامیاب رہا۔ مسافر کا سفر مختلف سمتوں میں جاری ہے۔ میڈم شکیلہ کی آپ بیتی ختم ہوئی تو سوہنا خان کی جگ بیتی شروع ہو گئی یارن خان ہی آخر شہریار کے والدین کا قاتل نکلا۔ رنگو قسائی کی حد درجہ دلیری ہضم نہیں ہوئی کیونکہ کہا جاتا ہے ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی بازگشت یوم آزادی کے حوالے سے تحفہ ثابت ہوئی، ضلع گورداسپور کے بارے میں کافی عرصہ پہلے پڑھا ہوا ہے کہ مسلمان اکثریت کا علاقہ ہندوستان کو دے دیا گیا تھا تاہم درست پس منظر اب جا کر علم میں آیا۔ انگریز کے ازلی شاطرین نے مسلمانوں کو عظیم نقصان سے دوچار کیا۔ سرینا اور سارہ کی دوستی بے مثال تھی۔ مہیش جیسے شخص کے ساتھ جو ہوا وہ اسی کا حق دار تھا تاہم سرینا کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اب تو ہر پاکستانی کو بھارت جاتے ہوئے یہی خوف رہتا ہے کہ کہیں باقی زندگی وہاں جیلوں میں ہی نہ کٹ جائے۔ ڈاکٹر ساجد امجد چاند بی بی کی داستان حیات لے کر آئے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان آپس کی نااتفاقیوں اور مخالفتوں نے پہنچایا۔ یہی سبب چاند بی بی کی داستان میں بھی نمایاں رہا (اور آج بھی یہی سب ہو رہا ہے۔ اس سازش کے پیچھے کون ہے یہ کوئی نہیں جاننا چاہتا) عائشہ فاطمہ کی چادر میں نادر آخر کار درست فیصلہ کرنے میں کامیاب رہا۔ شادی دفتروں کے مذموم کردار سے آگاہی اس داستان کا اضافی سبق رہا۔ منظر امام معاشرتی مسائل سے روشناس کراتے نظر آئے۔ لاڈلے میاں بھولے بن کر سب کو بے وقوف بناتے نظر آئے ہیں۔ تعاقب میں کیرولین کی چالاکی نے ولیم کو خوب پھنسایا اور وہ اسے ایک ابنارمل شخص ثابت کرنے میں کامیاب رہی۔ اب ذرا بات ہو جائے محفل خطوط کی۔ ہوا سے بجلی بنانے اور جونیئرز اسکواش ٹیم کی کامیابی کی خوش کن خبریں اداریہ میں پڑھنے کے بعد کرسی صدارت پر موجود آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ پڑھا، کافی جامع تبصرہ تھا، مبارک قبول ہو۔ آفتاب احمد! خواتین کے بارے میں گستاخیاں اچھی نہیں لگیں۔ قیصر اقبال! راحیل صاحب شاعر ہیں، ان کے جذبات کو آپ زنانہ گفتگو سے ہرگز نہ ملائیں۔ جاوید گل چندا! اعجاز راحیل کی دریافت ہے محفل میں موجود ہیں، ویلکم جی۔ توصیف احمد! گرمی اور لوڈ شیڈنگ نے قوم کا جو حشر کیا ہوا ہے ذاکر انکل نے حسینہ کو اسی سے تشبیہ دی ہے۔ حبیب احمد! مغربی کہانیوں میں اسلامی نام کیسے لکھے جا سکتے ہیں کہ وہ کہانیاں جس معاشرے اور ماحول میں لکھی جاتی ہیں وہ اسلامی ناموں کی گنجائش نہیں دیتے۔ عباسہ مغل! رضوان کے تبصرے پر ہنسی آئی تو تبصرہ میٹھا ہوا آپ کڑوا کیوں بول رہی ہیں؟ ابن مقبول بھائی شیر علی کو شادی کی مبارک بہت لیٹ کر دی آپ نے، اب تو ان کی آنکھیں کھل چکی ہوں گی اور آپ کی مبارک ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہو گی۔ اعجاز صاحب! سعدیہ بخاری کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا کہ بقول شاعر "یہ زباں بندی ہے کیسا، تیری محفل میں" زویا اعجاز ٹائٹل پر ایک نہیں دو خلائی مخلوقات موجود تھیں آپ نے ہی غور نہیں کیا۔ ماہا ایمان گھر کے صحن کو مری کا ہوٹل سمجھ کے ادھر ادھر کی ہانکتی نظر آئیں، بڑھاپے میں انسان شاید ایسے ہی الوژن کا شکار ہو جاتا ہے۔ گل مروت لگتا ہے مروت میں محفل میں آ گئی ہیں صرف زویا اعجاز کی عمر کا حساب کرنے۔ تفسیر عباس بھی زویا اعجاز کی عمر کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف نظر آئے۔ اف مظہر سلیم آپ بھی؟ بھئی زویا نے میٹرک کا کہہ کر کیا تصور کر ڈالا اور کہاں سے ثابت ہوا کہ 1973ء میں میٹرک کیا، ہو سکتا ہے میری طرح 1995ء میں کیا ہو۔ کترنوں کی تعداد اس بار کافی زیادہ تھی۔"

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے شریک محفل ہیں "پچھلے ماہ مجھ سے ایک کھلی غلطی ہوئی، سسپنس سے بائیکاٹ کا اعلان کر بیٹھا، اس کے جواب میں آپ کی جانب سے تفصیلی وضاحت پڑھ کر بہت خجل ہوا، مارے شرمندگی کے پسینا پسینا ہو گیا۔ معافی کا خواستگار ہوں (چلیں معاف کیا آپ بھی کیا یاد کریں گے) آج سے میں سرورق پر تبصرہ نہیں کروں گا، اہل محفل کو معلوم ہو گیا کہ میں ضعیف ہو گیا ہوں، اب میں سرورق پر تبصرہ کروں گا تو میرا مضحکہ اڑایا جائے گا۔ خاص کر بابر عباس اور گل مروت سے مجھے خطرہ ہے، موصوفہ پہلی بار محفل میں تشریف لائی ہیں اور آتے ہی مجھ پر ایک میٹھا طنز کیا، شکریہ۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب کو مبارکباد، اشرفی صاحب آپ نے میرے شعر کو سراہا، شکریہ۔ بھائی حبیب احمد چنائے آپ کے چچا کے پاس 1980ء کا سسپنس ہو تو مجھے بھجوا دیجیے، پیشگی شکریہ۔ بابر عباس میں اتنا پرانا اور بوسیدہ تو نہیں جو مجھے آثار قدیمہ سے تشبیہ دی، مجھ سے بھی پرانے ایک صاحب محفل میں اکثر آتے رہتے ہیں، ان کا اسم گرامی ہے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی۔ ماہا ایمان اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں آپ کے دادا کے برابر ہوں۔ تاریخی کہانی چاند سلطان کافی گنجلک اور بہت زیادہ گڈمڈ ہونے کی بنا پر داستان کو سمجھنا دشوار ہو گیا۔ اتفاقات کہانی سسپنس سے بھرپور تھی، اختتام میری خواہش کے مطابق ہوا۔ کشکول پچھلے ماہ کی بہ نسبت اس ماہ کی قسط بہت دبنگ تھی۔ تعاقب پسند نہیں آئی جبکہ چیکی مچھلی بہت اچھی لگی۔ رائی کا پہاڑ اس بار صفدر حیات کو اپنا کیس نمٹانے کے لیے ایک مصور اور اعلیٰ حکام سے مدد لینی پڑی۔ پوسٹ کارڈ کی چوری ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی نک ویلوٹ نے اپنا کیس آسانی سے نمٹا دیا، ساتھ ہی ایک پیچیدہ مسئلے کا حل نکال لیا، کہانی میں لطف آ گیا۔ عائشہ فاطمہ کی چادر بہت عمدہ تھی لیکن اختتام پسند نہیں آیا۔ مسافر کی یہ قسط کافی پھڑکدار تھی، چندو ماہی کا ماضی کا ذکر ختم، شہرے کے ماضی کی داستان شروع۔ خالد میاں کے ہاں یہ کوئی کہانی نہیں تھی۔ فقط ایک طویل لطیفہ، مصنف نے خوب ہنسایا۔ بازگشت قدیم و جدید کا امتزاج لیے ہوئے یہ معرکتہ الآرا...... کہانی مدتوں یاد رہے گی۔ اشعار کی محفل میں خانیوال والے محمد صفدر کا انتخاب پسند آیا، مریم کائنات کا چناؤ بھی بہت اچھا تھا، حسنین عباس کا قطعہ بھی من پسند تھا۔"

✠ **مہر اختر عباس تھراج**، کوڑے والا روڈ، کبیر والا سے محفل میں شامل ہوئے ہیں "اس دفعہ کا سسپنس رمضان کے بابرکت ماہ کی شب اور آٹھویں روزے کو میرے آنگن میں ہنستے کھیلتے بچے کی طرح آیا۔ میری ایک شکایت ہے حضور والا کہ میں نے بارہا اپنے کئی محفل کے دوستوں سے پوچھا کہ آپ اپنے خط میں میرا ذکر کیوں نہیں کرتے تو سب کا جواب ایک ہی آیا کہ سب کچھ قینچی کا کمال ہے، آپ کی قینچی میرا نام ہی کیوں نگل لیتی ہے۔ آفتاب احمد نصیر صاحب! اے لوٹ آف تھینکس۔ آپ نے بجائے جیلسی کے ہمیں چھوٹ دی۔ ہمارے کچھ دوست ایسے بھی ہیں جو ہماری ٹانگ پکڑ کر خود ہیرو بن جاتے ہیں۔ جاوید گل چندا صاحب! خوش آمدید! توصیف صاحب آپ کیوں دوسروں کی شادی کروانے میں محو ہیں۔ حبیب احمد چنائے! پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں جو خودکش دھماکے کروا کے ملک کا امن اور چین تباہ کر رہے ہیں میں اکثر سوچتا ہوں یہ وہ ملک تو نہیں ہے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا (درست فرمایا! یہود و نصاریٰ سے دوستی ہو گی تو یہی حال ہو گا۔ کچھ معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے بھیس میں یہ کون سی قوت ہے جو ہمیں آپس میں لڑا رہی ہے) احسان سحر! اگر اعجاز بھیا ساتویں کا چاند تھے تو ساڑھے تین دن کا چاند تو میں بھی بنتا تھا کیونکہ میں اس ماہ ان کا شیر خاص تھا۔ اعجاز احمد راحیل! آپ سے ایک ہی گزارش ہے شادی کر لو۔ کب تک دل کا روگ لیے بیٹھے رہو گے۔ رضوان تنولی کریزی دی پلس ریوڑی بھائی۔ یار ہماری تصویر العین کی اتنی لمبی تو زبان نہیں ہے کہ آپ نے جنتی بنا دی ہے۔ زویا اعجاز! اگر آپ لفظوں کے کھلاڑی کا مقابل نہیں ہیں تو پنگا شنگا مت لیا کریں نا ان سے۔ ماہا ایمان! آپ کے لیے خصوصی دعوت خدمت ہے۔ کبھی ہمارے دیہات بھی تشریف لائیں۔ آپ کو پکے پکے جامن، امرود، کینو اور بہت کچھ کھانے کو ملے گا اور محترمہ کی خوب خاطر تواضع کی جائے گی۔ میرے اپنے شہر قریبی سے قدرت اللہ نیازی صاحب! اگر آپ کو طاہر نیوز ایجنسی سے رسالہ لیٹ ملتا ہے تو ہمیں بتاتے میں ادھر سے لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتا۔ ہمارے شہر میں مجاہد کتاب گھر والے 17 تاریخ سے زیادہ کبھی لیٹ نہیں کرتے۔ گل مروت! خوش آمدید۔ ہمارے لڑکپن کے یار اور بچپن کے دوست مہر اے ڈی سیال صاحب کہاں ہو جناب؟ سب سے پہلے کاشف زبیر کی آخری کہانی بازگشت پڑھی۔ ویل ڈن کاشف زبیر۔ دونوں سہیلیوں نے خوب عہد و پیمان نبھائے۔ مسافر میں میڈم شکیلہ کی داستان زندگی پڑھی، اس کی جگہ جگہ آبرو ریزی کی گئی اور ہمیں بہت دکھی کر گئی۔ کشکول بھی اے ون جا رہی ہے۔ کشکول کو میں نے حال ہی میں پڑھا ہے اس کے کرداروں کی ابھی سے سمجھ نہیں آ رہی مگر بہت جلد آنے والی اقساط میں ان کو سمجھ جاؤں گا۔ انگریزی ترجمے والی کہانیاں میں نہیں پڑھتا۔ تاہم اس دفعہ مریم کے خان کی پڑھی ہے۔ اس نے بہت ہنسایا ہے۔ مجموعی طور پر اس دفعہ کا سسپنس بہت اچھا تھا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

احسان سحر، میانوالی۔ عبدالغفور خان خٹک میاں ڈھکی، مچھب اٹک۔ حافظ شاہد عمران، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ چودھری احمد خان چکری، راولپنڈی۔ ماہا ایمان، پنجاب۔ صرین ناز، حیدرآباد۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ عادل خان، چارسدہ۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ احمد خان توحیدی، الطوارقی اسٹیل، کراچی۔ محمد جاوید، تحصیل تلی پور۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور۔

الیاس سیتاپوری

خلجیوں کی تباہی

اجتماعی یا انفرادی طور پر عروج ہو یا زوال... اس کا دارومدار صرف اور صرف گہری نظر اعمال اور فیصلوں کے معیار پر ہوتا ہے... خواہ کوئی انسان صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچے یا کوئی بادشاہ اپنی سلطنت اور رعایا کے بارے میں فیصلہ کرے... تدبر اور حکمتِ عملی سے ہی آنے والے کل کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ترقی و تنزلی کے حالیہ آئینے میں دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عہدِ گزشتہ میں سلطنتوں کی تباہی کے اسباب کیا رہے تھے... ماضی پر نظر ڈالی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مرکزی کردار کی پستی یا بلندی... اس کے پورے عہد کو تاریخ میں سنہرے لفظوں میں رقم کرتی ہے یا انارکی کے شکار انتہائی تاریک گوشے میں محفوظ کردیتی ہے۔ خلجیوں کا عروج وزوال بھی انہی تاریخی اوراق کا ایک اہم قصہ ہے اور اگر ان کرداروں کو دہرانے کا مقصد سمجھ آجائے تو گویا تاریخ کا حق ادا ہوجائے... کیونکہ عہدِ گزشتہ ہو یا حالیہ... سلطنت کے اصول اور میزان وہی صدیوں پُرانے ہیں... حق دار کو حق ملے... مظلوم کو انصاف، رعایا کو سکھ اور بادشاہت کو دوام... مگر افسوس جیسے ماضی میں بھی کسی نے ان اصولوں پر عمل کیا اور کسی نے نظرانداز... ایسے ہی آج بھی... نظر کے اندازوں میں غلطی ہے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ آنے والا کل ہمیشہ ماضی کی زنجیر میں شامل ہوکر اسے دراز کرتا آیا ہے... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سلطنت کے آئینے میں نام اپنے کرداروں کے خدوخال سے پہچانے جاتے رہے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

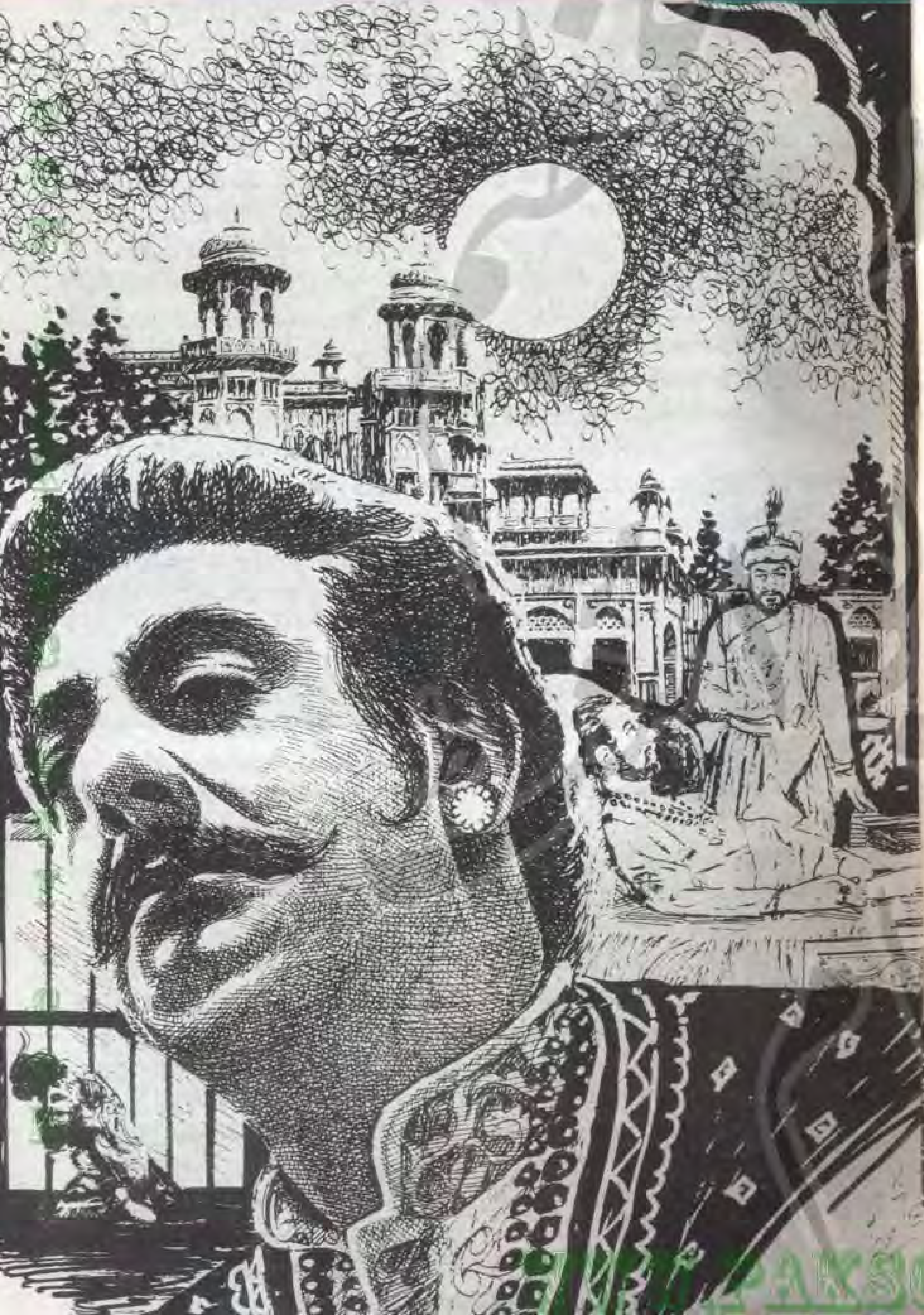

علاء الدین خلجی کو مرض استسقا نے عاجز اور حواس باختہ کر دیا تھا۔ مزاج میں سخت گیری تو پہلے ہی سے تھی، لیکن اس مرض نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا، وہ اپنی اولاد میں بڑے بیٹے خضر خان سے بڑی محبت کرتا تھا لیکن زندگی کے آخری دنوں میں وہ خضر خان سے بھی بیزار ہو گیا اور اسے جلاوطن کر کے امروہہ بھیج دیا۔ کہتے ہیں خضر خان سے متنفر کرانے میں اس کے نائب الملک (ملک کافور) کا بڑا ہاتھ تھا۔ ملک کافور کی بڑی حیثیت تھی، وہ بیک وقت بادشاہ کا نائب بھی تھا اور محبوب بھی۔ چنانچہ خاص خاص مواقع پر کھائی جانے والی چغلیاں اور پیش کی جانے والی درخواستیں بھی بے کار نہ جاتیں، ملک کافور اپنی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر سمجھدار اور بالغ خضر خان بادشاہ بن گیا تو ملک کافور کی حیثیت صفر ہو جائے گی اور وہ چونکہ اپنی چہیتی بیوی اور محبوبہ دیول دیوی کا عاشق زار شوہر ہے، اس لیے اس کی شہوانی اور نفسانی خواہشات کو کسی اور طرف موڑ دینا بڑا مشکل کام ہوگا اور وہ خود عمر کے جس حصے میں داخل ہو چکا تھا، اس میں اس کے پرانے عاشق علاء الدین خلجی کے لیے تو کشش اور وارفتگی اب بھی موجود تھی لیکن خضر خان جیسے نوجوان کے لیے وہ بالکل بے کار تھا۔

ان حالات میں ملک کافور کی نظر انتخاب پانچ چھ سالہ شہزادہ شہاب الدین پر پڑی۔ وہ خضر خان کی جگہ نا سمجھ شہاب الدین کو بادشاہ بنا کے اپنی بادشاہت کا خواب پورا کر سکتا تھا۔ خضر خان اور شہاب الدین کے علاوہ علاء الدین کے دو بیٹے اور بھی تھے شادی خان اور قطب الدین لیکن علاء الدین کی نظر میں سب سے زیادہ حقیر اور احمق قطب الدین تھا۔ بادشاہ کی نظر کرم خضر خان اور شادی خان پر تو غیر معمولی رہی اور انہیں وقتاً فوقتاً اعزاز و اکرام بھی حاصل ہوتے رہے لیکن قطب الدین کو اس سے محروم ہی رکھا گیا۔ بادشاہ کے آخری دنوں میں جب کہ خضر خان اور شادی خان کو ملک کافور کی سازشوں کے زیر اثر جلاوطن یا قید کر دیا گیا تھا۔ قطب الدین کا ستارہ چمکا اور علاء الدین کے دل میں اس بدنصیب، کم عقل اور احمق شہزادے کی محبت عود کر آئی، ایک دن اس نے ملک کافور کو حکم دیا۔

”ملک کافور! شہزادہ قطب الدین کو حاضر کیا جائے۔“

ملک کافور چونک پڑا، اس نے اس طرح سوال کیا گویا اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں ہے۔ ”حضور والا کی طبیعت کیسی ہے، شہزادہ قطب الدین کو یا شہزادہ خضر خان کو؟ حضور کس کو یاد فرما رہے ہیں؟“

بادشاہ نے ملک کافور کو جھریوں دار بھاری پپوٹوں والی آنکھوں سے دیکھ کر جواب دیا۔ ”خضر خان کو نہیں، شہزادہ قطب الدین کو بلا رہا ہوں، کیونکہ خدا نے اسے اتنی عقل ہی نہیں دی کہ وہ ہمارے خلاف کوئی سازش کر سکے، اس لیے آج مجھے اپنا یہ احمق شہزادہ بہت زیادہ یاد آ رہا ہے۔“

ملک کافور نے عرض کیا۔ ”حضور والا کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن شاید حضور کے حافظۂ مبارک سے یہ بات نکل گئی کہ شہزادہ قطب الدین بھی قید خانے میں پڑا ہوا ہے۔“

بادشاہ نے ناگواری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیں اور کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ شہزادہ قطب الدین زندانی ہو گیا ہے، لیکن ملک کافور، ذرا یہ تو سوچ کہ اس احمق شہزادے پر یہ ظلم نہیں ہے کہ جسے ہم بے وقوف قرار دے چکے ہیں، وہ خدا اور انسان کی دُہری سزا کاٹے۔“

ملک کافور نے ادب سے عرض کیا۔ ”میں حضور والا کی بات نہیں سمجھ سکا۔ خدا اور انسان کی دُہری سزا سے حضور کی کیا مراد ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”خدا نے اسے عقل کی دولت سے محروم رکھ کر حماقت کی سزا دی ہے اور ہم نے اس احمق کو قید خانے میں ڈلوا دیا، کیا یہ دُہری سزا نہیں ہے؟“

ملک کافور نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”اب حضور کی طبیعت کیسی ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”اچھا ہوں، لیکن زیادہ دنوں کے لیے اچھا نہیں ہوا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے چند دنوں کے لیے طبیعت سدھر گئی ہے، جسم کا ورم بڑھتا جا رہا ہے، یوں لگتا ہے گویا جسم میں خون کی جگہ پانی دوڑ رہا ہے، اس بے بسی اور مایوسی میں مجھے اپنا احمق شہزادہ قطب الدین بے اختیار یاد آ رہا ہے، اسے جلد از جلد میرے پاس لے آ تا کہ میں اسے اپنے سینے سے بھینچ کر اچھی طرح پیار کر سکوں۔“

ملک کافور کے لیے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس نے شہزادہ قطب الدین کو بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اس وقت شہزادہ قطب الدین بادشاہ کی غیر متوقع طلبی سے خوفزدہ ہو گیا تھا اس نے پوری قوت ارادی اس کوشش میں صرف کر دی کہ بادشاہ کے سامنے اپنی خوفزدگی کو ظاہر نہ ہونے دے لیکن ناکام رہا، اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بادشاہ اسے پلک جھپکائے بغیر بڑی شفقت سے تادیر دیکھتا رہا۔ شہزادے نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

بادشاہ نے کہا۔ ”مبارک خان (قطب الدین کا دوسرا نام) یہ تو کانپ کیوں رہا ہے، میرے قریب تو آ۔“

شہزادہ کانپتا کپکپاتا باپ کے قریب چلا گیا، بادشاہ نے اسے اپنے روبرو بٹھا لیا، بولا۔ ”مبارک خان تیری یہی ضعیف العقلی اور کم ہمتی تیری ترقی اور اقبال کی راہ میں پتھر بن گئی ہے، تجھے ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔“

شہزادے نے آہستہ سے عرض کیا۔ ”ایک میں کیا، کون ہے جو حضور سے آنکھیں ملا سکے، میں نے پوری کوشش کی کہ ہمت اور حوصلے سے کام لوں، لیکن سامنے آپ کی موجودگی کا احساس دہشت اور خوف بن کر میری رگ و پے میں خون کے دوران کو منجمد کیے دے رہا ہے۔“

بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ”شہزادے مبارک خان! آج میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھے بھی وہی تعلیم اور مرتبہ عطا کروں جو ایک شہزادے کے شایان شان ہو سکتا ہے۔“

قطب الدین نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ ”قبلۂ عالم! کسی انسان کی دی ہوئی تعظیم اور بخشے ہوئے مرتبے پر میں یقین نہیں رکھتا، جو کچھ دینا ہے مجھے میرا خدا دے گا اور جو کچھ ملنا ہے خدا سے ملے گا۔“

اس جواب نے بادشاہ کو خوفزدہ کر دیا، اس نے ملک کافور کو حکم دیا۔ ”اس نالائق اور احمق کو محل سرا میں بھیج دو تا کہ عورتوں میں رہ کر عورتوں ہی جیسا بن جائے، میں دیکھتا ہوں وہاں خدا اسے کیا کچھ عطا فرماتا ہے۔“

ملک کافور نے اسے محل سرا میں داخل کر دیا اور نگراں خواجہ سرا کو ہدایت کر دی کہ اس پر سختی کی جائے اور اسے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

جب ملک کافور بادشاہ کے پاس دوبارہ واپس پہنچا تو بادشاہ نے شکایتاً کہا۔ ”ملک کافور! تو نے اس ناشکرے شہزادے کا جواب سنا، بخدا جی میں تو یہ آیا تھا کہ ایک ہی وار میں شفقت پدری کو کاٹ دوں۔“

ملک کافور نے جواب دیا۔ ”حضور کے بیٹے ہی تو کسی وقت تاج و تخت کے لیے بلائے جان بن سکتے ہیں۔ جب حضور کو اپنے شہزادوں پر ہی اعتبار نہیں رہا تو اور کس پر کیا جا سکتا ہے۔“

بادشاہ نے شدت یاس میں اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ ”ملک کافور! میں نے چھوٹی بڑی چوراسی جنگیں لڑیں اور ان میں سے کسی ایک میں بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا، لیکن آج اپنے گھر میں، محل سرا میں، میں خود کو ایک ناکام انسان تصور کر رہا ہوں، میرے بعد یہ اتنی بڑی سلطنت کا بوجھ کون اٹھائے گا۔“

ملک کافور نے عرض کیا۔ ”حضور چھوٹے شہزادے شہاب الدین کو ولی عہد نامزد فرما دیں، میں اس کا اتالیق بن کر اس وقت تک حکومت کا انتظام و انصرام کرتا رہوں گا جب تک کہ شہزادہ جوان ہو کر اس لائق نہ ہو جائے کہ تاج و تخت خود سنبھال سکے۔“

بادشاہ نے ملک کافور کے ایما پر اسی وقت ایک وصیت تیار کی جس کی رو سے پانچ چھ سالہ شہزادے شہاب الدین کو ولی عہد قرار دے دیا گیا۔ اسی دوران بادشاہ کو یہ اطلاع ملی کہ شہزادہ خضر خان امروہہ سے دہلی آ چکا ہے اور چونکہ خضر خان بادشاہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر دہلی آیا تھا اس لیے بادشاہ خوش نہیں ہوا۔ بہ ظاہر تو بادشاہ نے اسے چمٹا کر پیار کر کے محل سرا بھیج دیا لیکن بعد میں ملک کافور کے مشورے پر خضر خان کو قید کر لیا گیا۔ ملک کافور نے شہزادے خضر خان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گوالیار کے قلعے میں پہنچا دیا اور قلعہ دار کو ہدایت کر دی۔ ”خبردار جو تو نے اس کو شہزادہ سمجھا، تو یہ سمجھ لے کر خضر خان علاء الدین کا بیٹا نہیں دشمن ہے اور اس کی اس طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح کسی سخت ترین دشمن کی، کی جا سکتی ہے۔“

بعد میں اس قلعے میں بادشاہ کے دوسرے دو بیٹوں شادی خان اور ابوبکر خان کو بھی قید کر دیا گیا۔ قطب الدین کو اس لیے نظر انداز کر دیا گیا کہ وہ کم ہمت اور احمق مشہور تھا اور اس کی کسی بات سے بھی بغاوت یا جاہ طلبی کی بو نہیں محسوس ہوتی تھی۔

جب میدان صاف ہو گیا تو ملک کافور نے اطمینان کی سانس لی کہ اب بادشاہت اس سے زیادہ دور نہیں رہ گئی ہے۔

اس دوران خلاف توقع بادشاہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ ملک کافور ڈر گیا کہ اگر بادشاہ صحت یاب ہو گیا تو اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اس نے بادشاہ کو زیر کرنے کا ایک شاندار منصوبہ تیار کیا۔

اس نے غسل کیا۔ گالوں پر غازے کی تہ چڑھائی، رنگ برنگے زنانے کپڑے پہنے اور جسم کو زیورات سے آراستہ کر کے خوشبویات سے معطر کیا۔ مغرب کے بعد جبکہ شمعیں روشن کی جا چکی تھیں۔ علاء الدین قصر ہزار ستون کی بالائی منزل سے دریائے جمنا کا نظارہ کر رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں پورا ماحول خوابیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس عالم میں ملک کافور بادشاہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا، بادشاہ نے آہٹ جو محسوس کی تو پیچھے گھوم کر دیکھا۔ اپنے سامنے ملک کافور کو ایک

خاص وضع میں دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ پوچھا۔ ”ملک کافور! کیا بات ہے؟ یہ وضع نشاط انگیز کس کے لیے؟“

ملک کافور نے جواب دیا۔ ”میرے پاس جو کچھ ہے حضور پر فدا اور قربان ہے اس وقت میں اس لیے اس وضع خاص میں حاضر ہوا ہوں کہ حضور کی طبیعت کچھ بحال کرسکوں۔“

بادشاہ مضطرب ہوگیا، اس نے ملک کافور کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے قریب بلالیا، بولا۔ ”ملک کافور، تو بڑا موقع شناس ہے، حالانکہ اتنا خیال محل کی ان عورتوں کو ہونا چاہیے جنہیں میں نے فرش سے عرش تک پہنچا دیا اور جو سالہا سال مجھ سے حظ اور تلذذ حاصل کرتی رہی ہیں لیکن انہیں میری کوئی پروا نہیں، وہ اپنے حال میں مگن ہیں۔ شاید انہیں یہ احساس بھی نہیں کہ میں بستر علالت پر پڑا کرب و اذیت جھیل رہا ہوں۔“

کچھ دیر بعد بادشاہ نے مقویات کا حریرہ طلب کیا جو ایک بڑے پیالے میں پیش کیا گیا لیکن بادشاہ اسے پورا نہیں پی سکا۔ معمولی سا کھانسی کا دورہ پڑا اور بادشاہ نے بے دم ہوکر اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا لیا اور رک رک کر بہ مشکل ملک کافور سے کہا۔ ”آج رات تو یہیں میرے پاس رہے گا، ہوسکتا ہے تجھ سے کوئی ضروری کام پیش آجائے۔“

ملک کافور نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”ایک رات کیا ہزار راتیں حضور پر قربان، جب تک حضور جانے کی اجازت نہیں دیں گے، میں یہیں موجود رہوں گا۔“

رات کو بادشاہ کی نیند ہی اڑ گئی۔ وہ کبھی لیٹ جاتا اور کبھی کھلے آسمان تلے کھڑے ہوکر کائنات کی وسعت اور عظمت پر دہلنے لگتا، اس نے چوراسی جنگیں لڑی تھیں اور ان سب میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن اس وسیع و عریض کائنات میں اس کی ان چوراسی جنگوں کی حیثیت ہی کیا تھی، بالکل وہی جیسے کسی انسان کی نظر میں کسی چیونٹی کا یہ کارنامہ کہ اس نے چوراسی بار زمین سے کسی بلند و بالا چھت تک سفر کیے ہوں، چیونٹی کی نظر میں یہ سفر کتنے ہی دقیق اور قابل فخر ہوں لیکن انسان کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسی طرح اس لامحدود اور لامتناہی کائنات کے کرۂ ارض نامی مختصر ترین دھبے پر یہ چوراسی کارنامے ایک تمسخر سے زیادہ اہم نہیں تھے اور جب یہ حقیقت بھی واضح ہوجائے کہ کرۂ ارض نامی دھبے میں موجود ہندوستان نامی مختصر ترین دھبے پر یہ چوراسی کارنامے انجام دیے گئے ہوں تو ان کی اہمیت اور بھی کم ہوجاتی ہے، بادشاہ کے دل پر کائنات کی عظمت اور دہشت کا یہ اثر ہوا کہ وہ خوفزدہ اور دل شکستہ اپنے بستر پر جاگرا اور ملک کافور کو آواز دی۔ جب وہ آگیا تو بادشاہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ملک کافور! شہزادہ خضر خان کہاں ہے؟“

ملک کافور نے جواب دیا۔ ”گوالیار کے قلعے میں، حضور ہی کے حکم سے تو شہزادے کو قید کیا گیا ہے۔“

بادشاہ نے سرد آہ بھری اور کہا۔ ”ملک کافور! میرا خیال ہے اب شہزادے کو معاف کر دینا چاہیے، میں ولی عہدی خضر خان کے نام دوبارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ شہاب الدین ابھی بچہ ہے اور پتا نہیں وہ اتنی عمر لے کر آیا بھی ہے یا نہیں کہ وہ بادشاہت کر سکے۔“

ملک کافور نے کہا۔ ”اگر حضور کی یہی مرضی ہے تو یہ غلام شہزادہ خضر خان کو واپس بلالے گا اور ولی عہدی خضر خان ہی کے نام کر دی جائے گی۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اسی وقت آدمی روانہ کر دیے جائیں جو شہزادے کو گوالیار کے قلعہ سے لے کر فوراً واپس آجائیں، کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب میں زیادہ دن نہیں جیوں گا۔“

ملک کافور نے عاجزی سے کہا۔ ”خدا نہ کرے۔ حضور کو میری عمر بھی لگ جائے۔“

بادشاہ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ وہ صبح تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش آیا تو سب سے پہلا سوال یہ کیا۔ ”کیا خضر خان واپس آگیا؟“

ملک کافور نے جھوٹی تسلی دی، بولا۔ ”بس شہزادہ پہنچنے ہی والا ہے، حضور ذرا توقف فرمائیں۔“

اب بادشاہ کے لیے ایک ایک پل بھاری تھا۔ وقت بڑی مشکل سے گزر رہا تھا، غنودگی کے دورے پڑنے لگے، لیکن جب بھی بادشاہ کو ہوش آتا تو یہی پوچھتا۔ ”کیا خضر خان آگیا؟“

اور ملک کافور یہی جواب دیتا۔ ”بس حضور، آیا ہی چاہتا ہے، شہزادہ پہنچنے ہی والا ہے۔“

بادشاہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا، ملک کافور وقت ٹالتا رہا۔ آخر سہ پہر کو بادشاہ نے گوالیار کے قلعہ دار کے نام ایک خاص پروانہ لکھوایا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ پروانہ پاتے ہی خضر خان کو بحفاظت دہلی روانہ کر دیا جائے۔

ملک کافور نے یہ پروانہ اپنے قبضہ میں کرلیا اور بادشاہ سے کہہ دیا۔ ”شاہی پروانہ روانہ کیا جاچکا ہے۔ شہزادہ خضر خان صبح و شام میں پہنچنے ہی والا ہے۔“

رات کو بادشاہ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ ملک کافور اب مزید بادشاہ کی موت کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ نصف شب سے ذرا پہلے وہ بادشاہ کی حالت دیکھنے اندر داخل ہوا، بادشاہ ابھی تک نہیں سویا تھا۔ ملک کافور کی آہٹ سن کر دریافت کیا۔ ”کون ہے؟“

ملک کافور نے جواب دیا۔ ”آپ کا غلام ملک کافور۔“

بادشاہ نے شکایت کی۔ ”ملک کافور مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ کیا شاہی طبیب کے پاس ایک بھی ایسا نسخہ نہیں جس سے میں پرسکون رات بسر کرسکوں۔“

ملک کافور نے جواب دیا۔ ”حضور کی اس پریشانی کا غلام کو اندازہ تھا۔ اس لیے میں طبیب سے چند ایسی دوائیوں کا مرکب لے آیا ہوں، جس کو پی کر حضور کے دل و دماغ ایک خاص قسم کا سکون محسوس کریں گے۔ کیونکہ شاہی طبیب نے کہا ہے کہ یہ ادویات مسکن دل و دماغ ہیں۔“

بادشاہ نے دواؤں کا لیوب ہونٹوں سے لگالیا اور بڑے بے صبرے پن سے ساری دوا پی گیا۔

ملک کافور فوراً باہر چلا گیا اور باہر سے دروازہ بند کرلیا، پہرے پر موجود خدمت گاروں کو یہ کہہ کر ہٹا دیا کہ ”بادشاہ سلامت استراحت فرما رہے ہیں اور انہیں قدموں کی آہٹ تک سے پریشان نہ کیا جائے۔“

کچھ دیر بعد ملک کافور دوبارہ اندر گیا۔ اس وقت بادشاہ پر جاں کنی کا عالم طاری تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے ملک کافور کی طرف دیکھا اور سینے کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”ملک کافور! یہ کیسی دوا تھی، اس سے تو میرا سارا جسم سن اور بے حس ہوا جارہا ہے۔“

ملک کافور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ! تردد نہ فرمائیں، یہی تو اس دوائی کی خوبی ہے کہ بتدریج سارے جسم کو سن اور بے حس کر دے گی اور جب یہ بے حسی دل و دماغ پر طاری ہوجائے گی تو پھر کسی قسم کے کرب و اذیت کا کوئی احساس باقی ہی نہ رہے گا۔“

اب بادشاہ کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی، پوچھا۔ ”خضر خان کہاں چلا گیا؟“

ملک کافور نے بادشاہ کے بے تکے بلکہ الٹے سوال سے اندازہ لگالیا کہ بادشاہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہے، اس کے خیال میں بادشاہ کے کسی بھی سوال کا جواب دینا اب ضروری نہیں رہ گیا تھا۔ وہ بڑی بے پروائی سے بادشاہ سے ذرا دور جا بیٹھا، حالانکہ اس عالم میں بادشاہ کی خواہش یہی تھی کہ ملک کافور اس کے قریب ہی رہے، جب تک بادشاہ میں ذرا سا بھی دم رہا وہ کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب زہر نے اپنا کام پورا کرلیا تو وہ بے بس اور ساکت و خاموش ہوگیا۔

صبح ہوتے ہوتے ملک کافور نے تمام امرا اور شاہی خاندان کے جملہ افراد کو مطلع کر دیا کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔

جب تمام امرا اور ارکانِ سلطنت قصر ہزار ستون کے دیوان خاص میں جمع ہوگئے تو ان سب کے سامنے اس نے مرحوم بادشاہ کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جس میں مختصر لکھا تھا۔

”میں اپنے بڑے بیٹے خضر خان کو ولی عہدی سے معزول کر کے اس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں، جب تک شہاب الدین بالغ نہیں ہوجاتا، اتالیق اور نگراں ملک کافور رہے گا۔“

پانچ چھ سالہ شہاب الدین کو بادشاہ بنا دیا گیا اور ملک کافور اس کا نائب السلطنت بن بیٹھا۔

ادھر سے فارغ ہوکر ملک کافور نے باربک ملک سنبل کو طلب کیا اور اسے کم سن شہاب الدین کی طرف سے حکم دیا کہ شہزادہ خضر خان، شادی خان اور ابوبکر خان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا جائے۔

ملک سنبل یہ فرمان لے کر گوالیار روانہ ہوگیا اور تینوں شہزادوں کو اندھا کر دیا گیا۔

شہزادہ قطب الدین محل سرا میں ہی موجود تھا، اس کا خوف سے برا حال تھا کہ معلوم نہیں کب اس کو بھی نابینا کر دیا جائے، شہزادے کی ماں ماہک بھی ڈری ہوئی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قطب الدین کو کہاں چھپا دے؟

وہ چوری چھپے مشہور صوفی شیخ نجم الدین کی خدمت میں پہنچی اور رو رو کر درخواست کی۔ ”حضرت! میرے بیٹے کو بچا لیجیے، دشمن اسے اندھا کر دینا چاہتے ہیں۔“

شیخ نجم الدین نے جواب دیا۔ ”بی بی تو فکر نہ کر، غیبی مدد کا انتظار کر۔“

اس کے بعد شیخ صاحب نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور اسے الٹا کر کے دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا۔ ”جا بی بی! ملول نہ ہو، اب یہ ٹوپی اس وقت سیدھی ہوگی جب تیرا بیٹا تخت حکومت پر بیٹھ جائے گا۔“

شہزادے کی ماں تو یہاں کچھ اور مانگنے آئی تھی اور اسے بشارت بادشاہت کی دے دی گئی۔

ملک کافور اب مستقلاً قصر ہزار ستون ہی میں رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنے لیے ہزار ستون کی بالائی منزل پر خیمہ نصب کرالیا تھا۔ یہیں وہ دوسرے خواجہ سراؤں کو بلالیتا اور ان کے ساتھ چوسر کھیلتا رہتا۔ چونکہ ملک کافور خود بھی ایک ہندو خواجہ سرا تھا اس لیے اسے خواجہ سراؤں سے بڑی محبت

اور ہمدردی تھی، اس نے کئی خواجہ سراؤں کو اپنا مشیر بھی بنالیا تھا اوران سے مفید مشورے بھی لیتا رہتا تھا۔

بادشاہ کی موت کے بتیسویں دن ملک کافور نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا کہ شہزادہ قطب الدین کو بھی قتل کردیا جائے کیونکہ شہزادہ کم ہمت اور احمق ہی کیوں نہ ہو امرا تو کم ہمت اور احمق نہیں، وہ اس کے اس کمزور پہلو پر کسی وقت بھی حملہ کرسکتے ہیں۔

اس نے ان چند خواجہ سراؤں کو اپنے خاص اعتماد میں لیا جو محل سرا کے اندر پہرے دیا کرتے تھے، ملک کافور نے کہا۔ ”اگر تم لوگ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کسی طرح قطب الدین کو قتل کردو گے تو اس کا تمہیں شاندار صلہ دیا جائے گا۔“

خواجہ سراؤں نے وعدہ کرلیا، وہ رات گئے تک شہزادے کے آس پاس پھرتے رہے، اس وقت شہزادہ مجلس جمائے بیٹھا تھا، لیکن رات کے پچھلے پہر جب سب چلے گئے اور شہزادہ تنہا رہ گیا تو خواجہ سرا شہزادے کے پاس پہنچے اور کہا۔ ”حضور جب تک جاگتے رہتے ہیں، ہم خدمت گاروں کو بڑی پریشانی رہتی ہے۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میرے باپ نے تم سب پر جو مہربانیاں کی ہیں۔ میرا خیال ہے تم انہیں بھولے تو نہیں ہوگے۔“

ایک خواجہ سرا نے نظروں ہی نظروں میں شہزادے کو تولا۔ شہزادے کو کچھ شبہ ہوا، اس نے انہیں حکم دیا۔ ”تمہیں ہماری نجی مجلس میں نہیں آنا چاہیے۔ آخر میں شہزادہ ہوں۔“

دوسرا خواجہ سرا اچانک جھپٹ پڑا اور شہزادے کو زمین پر گرادیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا، شہزادہ اس کی چمک دیکھ کر سہم گیا، عاجزی سے بولا۔ ”آخر تم لوگ مجھے قتل کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

خواجہ سرا نے جواب دیا۔ ”ہمیں کچھ پتا نہیں کہ ہم آپ کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں، ہمیں تو اس کام پر ملک کافور نے متعین کیا ہے۔“

شہزادے نے کہا۔ ”اگر تم لوگ مجھے قتل کردو گے تو ملک کافور اس کا تمہیں صلہ کیا دے گا۔ میرا خیال ہے کچھ بھی نہیں، لیکن اگر تم لوگ مجھے معاف کردو گے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں گراں مایہ انعامات سے تمہیں نواز دوں گا، تم لوگ میرے باپ کے احسانات بھولے تو نہ ہوگے۔“

اس کے بعد شہزادے نے اپنے گلے سے جڑاؤ گلوبند اتار کر ان کے حوالے کردیا اور کہا۔ ”لو اسے اپنے پاس رکھ لو اور دوبارہ پھر ملنا، میں اور بہت کچھ دے دوں گا۔“

خواجہ سراؤں کو جڑاؤ گلوبند لینے میں تامل ہوا لیکن شہزادے نے اسے زبردستی تھما دیا، جس خواجہ سرا نے شہزادے کو دبوچ رکھا تھا، اس نے چھوڑ دیا۔ بڑی تشویش سے پوچھا۔ ”اگر ہم آپ کو قتل نہیں کریں گے تو واپس جا کر ملک کافور کو کیا جواب دیں گے، وہ تو ہمیں دیکھتے ہی کہے گا کہ شہزادے کا سر کہاں ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”کہہ دینا آج موقع نہیں تھا، دو ایک دن میں کام ہوجائے گا۔“

خواجہ سراؤں نے اس وقت تو شہزادے کی بات مان لی، لیکن ملک کافور کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہے تھے، چنانچہ یہ لوگ اسی وقت اپنے دو سرداروں کے پاس پہنچے، خواجہ سراؤں کے بشیر اور مبشر نامی دو سردار تھے اور جملہ خواجہ سرا اپنے اعمال اور افعال میں انہی دونوں کے سامنے جواب دہ تھے، یہ لوگ بشیر اور مبشر سے ملے اور پورا واقعہ بتا کے شہزادے کا جڑاؤ گلوبند انہیں دکھایا، کہا۔ ”سردارو! اب ہم کیا کریں؟ کیا ہم ملک کافور کا کہنا مان لیں اور شہزادے کو قتل کردیں؟“

دونوں سردار کسی سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں ملک کافور کے اختیارات اور حیثیت کا اندازہ تھا۔ بشیر نے کہا۔ ”تم لوگ جاؤ اور ہمارے حکم کا انتظار کرو۔“

ایک خواجہ سرا نے کہا۔ ”ہم ملک کافور کو کیا جواب دیں گے؟“

بشیر نے کہا۔ ”کہہ دینا کام اتنا آسان نہیں ہے، موقع پاتے ہی انجام دے دیا جائے گا۔“

خواجہ سرا چلے گئے۔ بشیر اور مبشر کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے آخر وہ دونوں اٹھے اور پہرے دار خواجہ سراؤں کی دیکھ بھال کی غرض سے قصر ہزار ستون کے اوپر نیچے گھومنے پھرنے لگے، جس خواجہ سرا کو سوتا پایا قمچیوں سے پٹائی کردی، یہ دونوں گھومتے پھرتے قصر ہزار ستون کی اس منزل میں داخل ہوگئے جہاں ملک کافور خیمہ لگائے پڑا تھا۔ خیمے کے در پر دو محافظ گھٹنوں میں سر دیے سو رہے تھے، بشیر اور مبشر نے ایک ساتھ ان دونوں کی جھکی ہوئی گردن پر بھرپور وار کیا، دونوں کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگئے۔ اس کے فوراً بعد دونوں خیمے میں گھس گئے اور ملک کافور تک پہنچ گئے، ملک کافور بھی بے خبر سویا ہوا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر اس کے چند ساتھی محو خواب تھے اور یہ وہ ساتھی تھے جو ملک کافور کے پاس زیادہ رات تک رک جانے کی وجہ سے واپس نہیں جاسکے تھے۔ بشیر اور مبشر نے پہلے تو ان ساتھیوں کو قتل کیا، ان میں سے ایک پر اچٹتا ہاتھ لگا اور وہ چیخ پڑا، اس کی چیخ سے ملک کافور بیدار ہوگیا، وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی تلوار تلاش کرنے لگا، لیکن مبشر نے اس کا موقع نہیں دیا، اس نے اپنی تلوار کی نوک ملک کافور کے پیٹ میں اتار دی اور بشیر نے اس کی گردن پر وار کیا۔

ملک کافور نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا غداری ہے؟“

مبشر نے جواب دیا۔ ”غداری یہ نہیں، وہ تھی جو تو کر رہا تھا اور شہزادہ قطب الدین زندہ ہے اور اللہ نے چاہا تو وہی حکومت کرے گا۔“

ملک کافور اور اس کے ساتھی کچھ دیر تڑپتے رہے، آخر وہ بے حس ہوگئے۔

مبشر اور بشیر نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شہزادہ قطب الدین کو بیدار کیا اور ملک کافور کے قتل کی خوش خبری سنائی، شہزادہ خوشی سے سجدے میں گر گیا۔ یہ خبر صبح تک چھپائی گئی لیکن جب تمام امرا اور ارکان سلطنت حسب معمول حاضر ہوئے تو مبشر اور بشیر نے انہیں ملک کافور کے قتل کا واقعہ سنایا اور پھر یہ حال ہوگیا کہ جس نے بھی یہ خبر سنی، خوشی سے پاگل سا ہوگیا۔ ملک کافور کا سر کاٹ کر نیچے پھینک دیا گیا، شہزادہ قطب الدین کو باہر لایا گیا اور اسے شہاب الدین کا نائب بنادیا گیا۔

اب پانچ چھ سالہ شہاب الدین بادشاہ تھا اور سولہ سترہ سالہ قطب الدین اس کا نائب۔

مبشر اور بشیر بڑا شور وغل کرتے پھرتے تھے کہ ہم نے ملک کافور کو قتل کیا ہے۔ ہم نے اس ذلیل انسان سے علائی خاندان کو بچایا ہے، ہم جسے چاہیں تخت پر بٹھا دیں جسے چاہیں اس کے منصب سے محروم کردیں۔

ان دونوں کے بڑبولے پن اور شیخی سے شہزادہ قطب الدین عاجز تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا کیا علاج کرے؟ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر مبشر اور بشیر اس سے ناراض ہوگئے تو ملک کافور کی طرح اس کا بھی کام تمام کردیں گے، اپنے اس معاملہ میں اس نے چند امرا سے صلاح مشورے کیے اور طے یہ پایا کہ پہلے شہزادہ اپنی حیثیت بدلے، پانچ چھ سالہ شہاب الدین کو معزول کرکے خود اقتدار سنبھال لے، اس کے بعد ان سرکشوں سے نمٹنا چاہیے۔

چنانچہ شہاب الدین کی حکمرانی کے چوتھے مہینے امرا اور ارکان سلطنت کے ایما اور مشورے پر اسے معزول کردیا گیا اور قطب الدین نے تاج وتخت پر قبضہ کرکے قطب الدین مبارک شاہ خلجی نام اختیار کیا۔ پانچ چھ سالہ شہاب الدین کو گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا اور ایک دن قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا ایک خاص فرمان گوالیار کے قلعہ دار کے پاس پہنچا، جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس فرمان کو دیکھتے ہی پانچ چھ سالہ شہزادہ شہاب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی جائیں۔

ننھے شہزادے کو جب اپنے حشر کا علم ہوا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا، لیکن شاہی فرمان کی تعمیل کرنے والوں نے اسے زبردستی چت لٹادیا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے دبا کے آگ میں دہکی ہوئی سرخ سرخ سلائیاں دونوں آنکھوں میں پھیر دیں۔ اس کے بعد اس شہزادے کو بھی اس کے بڑے بھائی خضر خان، شادی خان اور ابوبکر خان کے پاس چھوڑ دیا گیا اور اب چاروں نابینا بھائی ایک ساتھ رہنے لگے۔

قصر ہزار ستون کی بالائی منزل پر سترہ سالہ قطب الدین مبارک شاہ نے ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں سلطنت خلجیہ کے نامی گرامی امرا نے شرکت کی، اس میں اس کے باپ علاء الدین خلجی کے نائب خاص حاجب ملک شادی خان نے بھی شرکت کی، تمام امرا ہاتھ باندھے مودب کھڑے تھے۔ شادی خان کے ساتھ ایک خوب صورت اور خوش رو نوجوان بھی آیا تھا۔ مبارک شاہ کی نظریں جیسے ہی اس پر پڑیں وہ پریشان ہوگیا، ایسا لگا کہ گویا مبارک شاہ اپنے قابو ہی میں نہیں۔ وہ کچھ دیر حواس باختہ اور پریشان ہوکر اس نوجوان کو دیکھتا رہا۔ درباری اور شادی خان نوجوان بادشاہ کی اس کیفیتِ وارفتگی کو دلچسپی سے محسوس کررہے تھے۔

مبارک شاہ نے ملک شادی سے پوچھا۔ ”شادی خان! تیرے ساتھ یہ خوب صورت نوجوان کون ہے؟ اس کی تعریف؟ یہ کس فن میں کمال رکھتا ہے؟“

شادی خان نے عرض کیا۔ ”حضور والا! یہ میرا فرزند معنوی حسن ہے، یہ گجرات کی ہندو قوم پروار سے تعلق رکھتا ہے، شاید حضور کو اس کا علم ہوگا کہ ملک کافور کا تعلق بھی ہندوؤں کی اسی قوم پروار سے تھا۔“

مبارک شاہ نے سرور آمیز آواز میں کہا۔ ”اچھا تو اس کا ہندوؤں کی پروار قوم سے تعلق ہے، اسے ذرا میرے پاس تو بھیجنا۔“

شادی خان نے حسن کو حکم دیا۔ ”حسن! آگے بڑھ اور کورنش بجالا، بادشاہ کی تعظیم کر اور ان کی خوشنودی حاصل کر۔“

بادشاہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا، اس نے حسن کو مخاطب کیا۔ ”حسن! اب تو ہندو ہے یا مسلمان؟“

حسن نے شرما کر جواب دیا۔ ”مسلمان۔“

مبارک شاہ نے بے اختیار کہا۔ ”جزاک اللہ، خدا تجھے مسلمان رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“ پھر ملک شادی خان سے کہا۔ ”شادی خان! کیا تو اس ہونہار اور سمجھ دار نوجوان کو میرے حوالے کردے گا۔“

شادی خان نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس ناچیز کے پاس جو کچھ ہے حضور کے والد محترم کا بخشا ہوا ہے، اس حقیر نوجوان کی بساط اور حیثیت ہی کیا، اسے تو جبراً اور حکماً حاصل کرسکتے ہیں۔“

اس دربار میں بادشاہ نے اپنے خطاطی کے استاد قاضی ضیاء الدین کو قاضی خان کا خطاب دے کر محل کی کنجیاں اس کے حوالے کردیں، بادشاہ چونکہ خود قید کی سختیاں جھیل چکا تھا، اس لیے برسراقتدار آتے ہی اس نے ان سترہ اٹھارہ ہزار قیدیوں اور جلاوطنوں کی رہائی کا فرمان جاری کردیا، جنہیں مبارک شاہ کے باپ علاء الدین نے یہ سزائیں دی تھیں، لیکن ان معافی یافتگان میں اس کے بھائی خضر خان، شادی خان، ابوبکر خان اور شہاب الدین شامل نہیں تھے، اس کے علاوہ مبارک شاہ نے اپنے برسراقتدار آنے کی خوشی میں اپنے جملہ لشکریوں کو انعام کے طور پر چھ ماہ کی تنخواہ تقسیم کی، اس کے علاوہ ان کی تنخواہوں میں اضافہ بھی کردیا گیا، ملک کی ساری زمینیں اور مواضع جنہیں علاء الدین نے ان کے مالکوں سے چھین کر سرکار میں شامل کرلیا تھا، مبارک شاہ نے انہیں ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیا، لوگوں کو نئے وظیفے جاری کیے گئے۔ خراج کی زیادتی اور مطالبوں کی سختی کو ختم کردیا گیا۔ سزاؤں، جرمانوں، لاتوں اور زنجیروں کی تعذیب ختم کردی گئی۔ تختہ بندی اور لکڑی کے استعمال کو دیوان وزارت سے یکسر دور کردیا گیا، ان کارروائیوں سے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگ اس نوجوان بادشاہ کے حق میں دعائیں کرنے لگے، لیکن دوسری طرف اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کے ان احکامات سے علاء الدین کے وہ تمام ضابطے اور احکامات ختم ہوگئے جن سے لوگوں کی برائیاں اور سرکشیاں دبی رہتی تھیں اور اشیا اس حد تک ارزاں ہوگئی تھیں کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد اس ارزانی کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

تاجر من مانے نرخوں پر اپنی چیزیں بیچنے لگے۔ یہی تاجر دن رات علاء الدین کو کوستے رہتے تھے لیکن اب لوگ مبارک شاہ کی درازیٔ عمر کی دعائیں کرنے لگے تھے نوجوان بادشاہ کے ان احکامات اور نرمیوں کے پیچھے جو عزائم کارفرما تھے، وہ خالص ذاتی اور نفسانی تھے، اس طرح وہ اپنے عیش وعشرت کو ملکی معاملات اور حالات کی دخل اندازی یا اثر پذیری سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ناتجربہ کار ذہن میں یہ خیال سما گیا تھا کہ وہ پورے ملک اور ملک کے ہر طبقے کو خوش اور مطمئن کردے گا تو اس سے کم سے کم ہنگامے کھڑے ہوں گے اور ملک اور معاشرے کا ہر طبقہ اپنے حال میں مگن رہ کر اس کے حق میں دعاگو رہے گا۔

لیکن دربار کے بعض امرا جنہوں نے مبارک شاہ کے سخت گیر باپ کا دور دیکھا تھا وہ اس نوجوان بادشاہ کی ان کارروائیوں اور اصلاحات سے خوش نہیں تھے، ان میں بادشاہ کا استادِ خطاطی قاضی خان بھی شامل تھا۔ قاضی خان نے جب بھرے دربار میں پردار قوم کے خوبرو نومسلم حسن پر بادشاہ کو مائل دیکھا تو وہ بے چین ہوگیا۔ اس نے تخلیے میں بادشاہ سے ملاقات کی اور سمجھایا کہ بادشاہ کو جملہ فرامین اور احکامات کو جاری یا نافذ کرنے سے پہلے غور وفکر کی کسوٹی پر کس کر ان کے کھوٹے کھرے کا اندازہ لگانا چاہیے، نوجوان بادشاہ یہ کڑوی کسیلی نصیحت سن کر بے مزہ ہوگیا اور اس نے نہایت ادب اور احتیاط سے قاضی خان کو منع کردیا کہ وہ آئندہ شاہی اصلاحات کے اجرا یا بحالی پر کسی قسم کا اعتراض یا مخالفت نہ کریں، لیکن قاضی خان بھی باز آنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے ذرا سختی سے کہا۔ ”بادشاہ سلامت اس ناچیز کے شاگرد ہیں اس لیے میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ نوجوان بادشاہ میری موجودگی میں کوئی غلط راہ اختیار کرے۔“

بادشاہ نے ناگواری سے منہ ٹیڑھا کرلیا، پوچھا۔ ”استادِ محترم! آپ کے خیال میں میں نے کون سی غلط راہ اختیار کررکھی ہے؟“

قاضی خان نے کہا۔ ”حضور ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار ہیں، کیا آپ اس بات سے واقف ہیں کہ ملک کافور قوم پروار سے تعلق رکھتا تھا اور حضور کا مصاحبِ خاص حسن بھی اسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں یہ نہیں جانتا تھا لیکن آپ کے ذریعے اب جان گیا ہوں۔“

قاضی جان نے مزید کہا۔ ”اور یہ کہ ملک کافور نمک حرام تھا اور شبہ کیا جاتا ہے کہ اس نے آپ کے مرحوم باپ کو زہر دے کر ہلاک کردیا تھا۔“

بادشاہ نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات بھی مجھ پر آپ ہی کے ذریعہ منکشف ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔“

قاضی خان نے پھر کہا۔ ”اور یہ کہ ملک کافور کے ہندو دوستوں اور ساتھیوں نے حسن کے آس پاس جمع ہونا شروع کردیا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں، میں اس بات سے بھی واقف نہیں، لیکن اب میں اس کی تحقیقات کراؤں گا۔“

قاضی نے بڑے جوش میں کہا۔ ”اور حضور کو یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اور یہ کہیں نہیں کہا کہ مرد، مرد کا لباس ہے اور عورت، عورت کا لباس ہے۔“

بادشاہ کا چہرہ سرخ ہوگیا، غضب ناک لہجے میں بولا۔ ”بس استادِ محترم! بہت ہوچکا، آپ کے ذمے جو خدمات کی گئی ہیں انہیں بخیر وخوبی اور دیانتداری سے انجام دیجیے، اس کے علاوہ دنیا میں کیا ہورہا ہے، آپ کو اس فکر اور اندیشے سے دور رہنا چاہیے۔“

قاضی خان یہ آسانی ماننے والا شخص نہیں تھا، بولا۔ ”حضور والا! نصیحتوں اور اچھی باتوں کو دوسروں تک پہنچانا کارِثواب ہے اور میں اس ثواب سے محروم نہیں رہ سکتا۔“

مبارک شاہ نے سختی سے کہا۔ ”استادِ محترم! اگر آپ اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو میں آپ کو اپنے خلوت کدے میں آنے کی اجازت نہیں دیا کروں گا اور یہ فرمان جاری کردوں گا کہ قاضی خان کو میری اجازت اور طلبی کے بغیر کبھی بھی میرے پاس نہ آنے دیا جائے۔“

قاضی خان ہمت ہار بیٹھا، مایوس اور دل شکستہ ہوگیا، بولا۔ ”جیسی حضور کی مرضی۔ لیکن آخری بار یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ حضور نے حسن کو قربت بخش کر جو قدم اٹھایا ہے وہ قعرِ مذلت کی طرف پہلا قدم ہے اور میری عمر رسیدہ اور کمزور نگاہیں ایک ایسا نظارہ کررہی ہیں جس میں خلجی خاندان کی شمع اقتدار جھلملاتی نظر آرہی ہے۔“

نوجوان بادشاہ آپے سے باہر ہوگیا۔ غصے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ”استادِ محترم بحالت اشتعال بدشگونی کے کلمات نکال رہے ہو، میں نے اپنے حسن تدبر سے پورے ملک میں شاندار اصلاحات نافذ کرکے اپنے باپ کے ظالمانہ اور سفاکانہ نظام کو ختم کردیا ہے، رعایا مجھ سے بے حد خوش ہے، اب میں رعایا کو عظیم الشان اور گراں مایہ خوشیاں دینے کے بعد اگر عیش وعشرت کی چند گھڑیاں اور چند ساعتیں گزارنا چاہتا ہوں تو تم کیوں پریشان ہورہے ہو؟ تم کیوں جل رہے ہو؟ تم کیوں حسد کررہے ہو؟“

قاضی خان نے دعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔ ”اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اب خدا ہی آپ کی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہِ آزادی کے رنگوں سے ہم آہنگ
اگست 2013ء کے شمارے کے دل فریب آہنگ

مٹھی میں ریت ● جستجو محنت اور مسلسل جدوجہد کسی مقام تک ضرور لے جاتی ہے۔ لیکن عزم مسیحائی کوششوں کا احوال۔ وطن اور مٹی کی خوشبو سے معطر کاشف زبیر کی حساس تحریر

گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز وانجام اسما قادری کا سلسلہ

جواری ● احمد اقبال کے شہر بار قلم سے ایک ناقابل فراموش تہلکہ خیز سلسلے کا آغاز

مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی پروردہ ناقابل فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● زندگی کے رنگ نرالے ہیں...... کوئی انہیں سنوارتا ہے اور کوئی بگاڑ دینے کو جیت سمجھتا ہے زندگی کی ہار کر جیت جانے والوں کا ماجرا۔ ساحر جمیل سید کی شاہکار تحریر

دوسری کہانی ● زن وزر کی شناسائی جتنی پرانی ہے...... اتنی ہی جان لیوا بھی...... شاہ اور مصاحبوں کا کھیل...... سلیم فاروقی کا تیز رفتار ہنگامہ

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

اصلاح کرے گا، میں تو چلا۔ اور کبھی اس غرض سے حاضر نہیں ہوں گا۔"

بادشاہ نے قاضی خان کو رخصت کر دیا، اس کے بعد خواجہ سراؤں کو حکم دیا۔ "دیکھو آئندہ اس شخص کو اندر نہ آنے دیا جائے۔"

اس وقت سورج مغرب میں جھکتا جا رہا تھا اور آسمان پر پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف محوِ پرواز تھے، قاضی خان کی گفتگو نے بادشاہ کی طبیعت میں تکدر پیدا کر دیا تھا، اس نے حکم دیا۔ "حسن کو حاضر کیا جائے۔"

کچھ دیر بعد حسن کو حاضر کر دیا گیا، مبارک شاہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "حسن، آج سے میں تیرا نام بدلتا ہوں، تو بلا کا خوش رو ہے، اب تو خوش رو خان کہلائے گا۔"

حسن نے شرما کے عرض کیا۔ "یوں تو حضور والا اس ناچیز کو جو نام بھی عطا فرمائیں گے، کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس نام خوش رو خان میں ذرا سا ابتذال کا پہلو نمایاں ہے اور پھر کانوں کو بھی یہ نام اچھا نہیں لگتا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا...... اچھا پھر اس میں کیا تبدیلی لائی جائے، تو کون سا نام پسند کرتا ہے؟"

حسن نے جواب دیا۔ "خوش رو خان کے بجائے خسرو خان اچھا رہے گا۔ حضور والا کا کیا خیال ہے؟"

بادشاہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "واہ، سبحان اللہ کیا اچھا نام تجویز کیا ہے تو نے، خوشرو خان کو ذرا سے تصرف سے کام لے کر خسرو خان کر دیا، سبحان اللہ یعنی خدا نے تجھے دولتِ عقل بھی وافر مقدار میں عطا فرمائی ہے۔"

حسن نے شرما کر جواب دیا۔ "حضور کی ذرہ نوازی اور بندہ پروری ہے ورنہ میں کیا ہوں، خوب جانتا ہوں۔"

بادشاہ کی وارفتگی بڑھتی جا رہی تھی، بے اختیار اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، بولا۔ "واللہ! ان خوبیوں اور برائیوں کے ہوتے ہوئے یہ عاجزی اور انکساری تیرا ہی حصہ ہے، ورنہ لوگ تو اپنی ذرا ذرا سی خوبیوں کو پہاڑ بنا کے پیش کرتے ہیں۔"

حسن جواب خسرو خان بن چکا تھا، ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے خود کو بادشاہ کے حوالے کر دیا تھا۔ بادشاہ کو اس کی یہ معصومانہ ادا بھی پسند آئی، بولا۔ "تجھ میں جو عقل اور دانش موجود ہے اس کا یہ تقاضا ہے کہ میں وزارت کا عہدہ تجھے تفویض کر دوں، ایسے عقل مند لوگ بار بار کہاں ملتے ہیں؟"

خسرو خان فرط خوشی میں بادشاہ کے سینے میں دبکنے لگا، اس کے دونوں ہاتھ بادشاہ کی بغلوں سے گزر کر پشت پر جا چکے تھے اور وہ پوری قوت سے بادشاہ سے یوں چمٹ گیا، گویا وہ ایک ایسا بچہ تھا، جسے جن بھوت سے ڈرا سہما دیا گیا ہو اور وہ بادشاہ کی آغوش میں دبک سمٹ کر اپنے دل کا خوف دور کر رہا ہو۔

بادشاہ نے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو سقراط اپنے چہیتے شاگرد افلاطون سے روا رکھتا تھا۔

اس خلوت کدے اور گوشۂ عیش و عشرت میں جب معاملات من و تو سے گزر گئے اور بے تکلفی اور بے احتیاطی نے اچھے برے کی تمیز ہی اٹھا دی تو خسرو خان نے ناز و نخرے دکھانا شروع کر دیے، اس نے بادشاہ کے زانو پر سر رکھ دیا اور سسکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا، بادشاہ نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "خسرو خان عزیز از جان! کیا بات ہے، ان پرمسرت لمحات میں رونے کا سبب؟"

خسرو خان نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "جیسا کہ حضور ابھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ خدا نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور قابلیت دوسروں سے کچھ زیادہ ہی عطا کر دی ہے، اس لیے حضور کی مہربانیوں اور عنایتوں سے میں بہت پریشان اور خوفزدہ ہو گیا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "مہربانیوں اور عنایتوں سے خوفزدہ ہونے کا سبب؟ تجھے تو اس پر خوش ہونا چاہیے۔"

خسرو خان نے جواب دیا۔ "بے شک مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں دربار کے جو حالات ہیں، ان میں خوش ہونا بالکل ممکن نہیں۔"

بادشاہ نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ "خسرو خان! تیری اداسی مجھے بھی اداس کر دیتی ہے، تو روتا ہے تو میرا دل رونے لگتا ہے، تیری آزردگی مجھے آزردہ کر دیتی ہے اور تیری پریشانی میری پریشانی کا باعث بن جاتی ہے، تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے، صاف صاف کہہ۔"

خسرو خان نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میرے حال پر حضور کی غیر معمولی مہربانی اور نوازش نے درباری امرا کی بڑی تعداد کو حسد میں مبتلا کر دیا ہے اور میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ لوگ میرے خلاف سازشوں میں مشغول ہو گئے ہیں۔"

بادشاہ ہنسنے لگا، بولا۔ "جانِ من، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی، میرے خیال میں اول تو یہ تیرا وہم ہے اور اگر بفرضِ محال اسے درست بھی مان لیا جائے تو میں تجھ

سے اتنا خوش اور تجھ پر اتنا وارفتہ ہوں کہ تجھے کسی سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ لوگوں کو تجھ سے ڈرنا چاہیے، تجھ سے خوفزدہ ہونا چاہیے۔"

خسرو خان بہ دستور ٹھنکے جا رہا تھا، بولا۔ "حضور کا ارشاد بجا، فرمانا درست۔ لیکن کسی عقلمند انسان کو کہنے سننے کی طاقت سے بے پروا نہیں ہونا چاہیے، بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح بار بار پھونکنے سے گیلی لکڑی تک جل اٹھتی ہے، اسی طرح کہنے سننے کی گرمی سے پتھر تک کو پگھلایا جا سکتا ہے۔"

بادشاہ کو خسرو خان کی باتوں میں بڑا مزہ آ رہا تھا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تیرے خلاف کسی بھی امیر یا کسی بھی شخص کی کوئی شکایت نہ سنوں گا اور انہیں واضح لفظوں میں مطلع کر دوں گا کہ وہ تیرے خلاف لب کشائی نہ کریں۔"

خسرو خان نے عرض کیا۔ "یہ مجھے یقین ہے کہ حضور جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر ضرور عمل کریں گے لیکن اس دربار میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے عہدوں اور مناصب سے بالاتر ہیں، اصل ڈر تو انہی لوگوں سے ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تیرا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟ میں سمجھا نہیں۔"

خسرو خان نے جواب دیا۔ "سردست میری مراد قاضی خان سے ہے، قاضی خان حضور کا استاد خطاطی ہے، اس تعلق کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ وہ امرا میں غلط فہمیاں پیدا کر رہا ہے کہ چونکہ میں ہندوؤں کی پروار قوم سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے میرا اسلام مشتبہ ہے اور میں اندر سے اب بھی ہندو ہوں۔ قاضی خان لوگوں میں اس بات کا بھی چرچا کر رہا ہے کہ میں نے حضور کو اپنے عشق میں اندھا اور دیوانہ کر دیا ہے اور میری قوم والے آپ کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔"

بادشاہ نے اس کی پیشانی چوم لی، بولا۔ "بس اتنی سی بات، تو ملول نہ ہو اور ذرا بھی فکر نہ کر، میں نے آج ہی قاضی خان کو ڈانٹ دیا ہے، وہ واقعی اس قسم کی باتیں کر رہا ہوگا کیونکہ اس نے آج تیری آمد سے پہلے مجھ سے کچھ اسی قسم کی باتیں کی تھیں لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا اور سختی سے منع کر دیا ہے کہ میں آئندہ اس کے منہ سے خسرو خان کے خلاف کوئی بات نہ سنوں گا اور اس معاملے میں، میں نے یہاں تک سختی اختیار کی کہ میں نے خدمت گاروں اور خواجہ سراؤں کو سختی سے ہدایت کر دی ہے کہ جب تک میں قاضی خان کو خود نہ طلب کروں اسے نہ آنے دیا جائے۔"

کیوں اولاد
نہ ہونے سے مایوس ہیں؟
ہم نے برس ہا برس تحقیق سے ایسا کورس تیار کیا ہے جس سے اولاد کا نہ ہونا اب ناممکن نہیں رہا خوبصورت بیٹے کی خواہش کے ساتھ گھر بیٹھے کورس منگوا کر اولاد کی نعمت پائیں۔

تو پھر دیر کس بات کی؟
سستی، غنودگی، خون کی کمی لو بلڈ پریشر، جسمانی اعصابی و ذہنی تھکاوٹ اور کمزوری سانس چڑھنا جسم میں دردیں کمر میں درد، یادداشت، حافظہ کی کمزوری، گھر بیٹھے کورس منگوا کر اعصابی کمزوری سے جان چھڑائیں۔

یہ بھی کوئی زندگی ہے؟
مرچ، گرم مصالحے والی تلی ہوئی اشیاء نہ کھا سکنا بدہضمی، گیس بھوک نہ لگنا، کھانا ہضم نہ ہونا سینے میں جلن، تیزابیت، ہاتھ پاؤں میں جلن گھر بیٹھے کورس منگوا کر سب کچھ مزے مزے سے کھائیں۔

الرحمٰن غوثیہ دواخانہ فیصل آباد
0315-7615449
0322-6506989

خسرو خان نے کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں مطمئن ہوا جاتا ہوں لیکن پھر بھی ایک بار حضور سے یہ گزارش کروں گا کہ لوگوں کے اس وار سے ہوشیار رہیں ورنہ میں بے گناہ مارا جاؤں گا۔“

بادشاہ نے جوش و خروش سے جواب دیا۔ ”خسرو خان عزیز از جان! پہلے میں مارا جاؤں گا اس کے بعد تو۔ ایسا کبھی بھی نہ ہوگا کہ پہلے تو مارا جائے اور بعد میں، میں۔“

بادشاہ کو خسرو خان پر والہ و شیدا دیکھ کر لوگوں کے حوصلے پست ہو گئے جو نوجوان بادشاہ کو عورتوں کے عشق میں مبتلا کر کے کام نکالنا چاہتے تھے، ان لوگوں میں دربار کا بہاء الدین دبیر بھی شامل تھا، بہاء الدین کوئی عقلمند انسان نہیں تھا، ہاں چالاک ضرور تھا، یہ شخص انشا اور مراسلت میں ایک خاص مقام رکھتا تھا، یہ ناتجربہ کار اور نوجوان بادشاہ کو اپنے ڈھب پر لانا چاہتا تھا، اس نے بادشاہ کے مزاج میں عمل دخل حاصل کرنے کے لیے بڑی مغز زنی کی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ بادشاہ کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت دے اور اس ضیافت کے آخر میں بادشاہ کی خدمت میں چند چیدہ اور چنیدہ حسین ترین لڑکیاں پیش کی جائیں، اسے یقین تھا کہ تقرب اور رسوخ حاصل کرنے کا یہ دلکش طریقہ رائگاں نہیں جائے گا، لیکن ابھی وہ اپنے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات پر غور ہی کر رہا تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ حسن نے خسرو خان بن کر یہ معرکہ سر کر لیا ہے، بہاؤالدین کو ایک جھٹکا سا لگا لیکن وہ ہمت نہیں ہارا، اس نے اپنی دولت کا بیشتر حصہ حسین لڑکیوں کی خریداری پر خرچ کر دیا، اس نے خسرو خان سے بھی تعلقات استوار کیے، وہ اس ہندو بچے کو چوٹ دینا چاہتا تھا، لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ خسرو خان کو ہلانا آسان کام نہیں ہے لیکن بہاؤالدین بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ دیوان رسالت کا اہم دبیر تھا اور اس کی انشا کی دھوم تھی، بادشاہ کو جب بھی کسی کو خاص مراسلہ یا تحریر بھیجنا ہوتی تو وہ بہاؤالدین ہی کو طلب کرتا۔

ان دنوں گجرات میں بڑی گڑبڑ تھی اور باغیوں نے حکومت کے عہدے داروں اور کارندوں کو قتل کر کے صوبے پر قبضہ کر لیا تھا۔ بادشاہ نے مشہور جرنیل عین الملک ملتانی کی سرکردگی میں ایک لشکر گجرات کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا، لشکر کی روانگی کے بعد بادشاہ کو ایک خاص مراسلہ لکھوانے کی ضرورت پیش آئی، اس نے بہاؤالدین دبیر کو طلب کیا اور اس نے عین الملک ملتانی کے نام ایک خط لکھوایا۔ خط جس مقصد کے لیے لکھوایا گیا تھا بہاؤالدین کی انشا پردازی نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے، بادشاہ اس سے بے حد خوش ہوا اور کہا۔ ”بہاؤالدین میں تجھے کوئی انعام دینا چاہتا ہوں، بول کیا مانگتا ہے؟“

بہاؤالدین نے انکساری سے جواب دیا۔ ”بندہ پرور! اس ناچیز نے کون سا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جس کے عوض آپ مجھے کوئی انعام دینا چاہتے ہیں کیا میرے لیے یہ اعزاز کم ہے کہ میں دیوان رسالت کا ایک خاص دبیر ہوں اور حضور میری انشا پردازی کو بطور خاص پسند فرماتے ہیں۔“

اس لچھے دار گفتگو نے بادشاہ کو بہت متاثر کیا، بولا۔ ”بلاشبہ تو ایک قابل انسان ہے اور میں تجھے کوئی نہ کوئی انعام ضرور دینا چاہتا ہوں، بول، مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“

بہاء الدین نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔ ”اگر حضور میری دلی خواہش جاننا چاہتے ہیں تو میں اسے اس خوف سے نہیں ظاہر کر رہا ہوں کہ حضور میری درخواست رد فرما دیں گے، اس لیے میں اظہار مدعا کر کے شرمسار ہونا نہیں چاہتا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”تو مت ڈر، جو کچھ دل میں ہے، صاف صاف کہہ دے۔ میں تیری خواہش ضرور پوری کروں گا۔“

بہاؤالدین نے عرض کیا۔ ”حضور والا! اگر آپ مصر ہی ہیں تو سن لیجیے، اس ناچیز کی خواہش ہے کہ حضور کسی دن میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر میری دعوت قبول فرمائیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”بس، یہ کون سی بڑی بات ہے، جس دن کہہ، تیری دعوت ضرور کھاؤں گا۔“

بہاؤالدین نے عرض کیا۔ ”حضور کل شام کو قدم رنجہ فرمائیں، میں تو ایک عرصے سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔“

دوسرے دن شام کو بادشاہ خسرو خان کو ساتھ لے کر بہاء الدین کے گھر پہنچ گیا۔ بہاؤالدین کا مکان ایک چھوٹے موٹے محل سے کم نہیں تھا۔ مکان کے پیچھے ایک باغیچہ بھی تھا، بہاؤالدین نے اس دعوت کا انتظام باغیچے میں کیا تھا یہاں چھوٹے بڑے درختوں کی ایک برات سی کھڑی ہوئی تھی۔ کہیں مہندی کے جھنڈ تھے کہیں فالسے کی جھاڑیاں۔ آم اور جامن کے درخت بھی تھے۔ املی بھی موجود تھی، پھولدار درختوں کی روشیں الگ تھیں۔ لیموں کے درختوں سے کھٹاس کی بو آ رہی تھی، ایک جگہ فوارے کی پھوار سے ساون بھادوں کا گمان ہو رہا تھا۔ یہیں ایک گوشے میں بادشاہ اور خسرو خان، بہاؤالدین کا دل رکھنے کے لیے دعوت کھانے آ گئے تھے، بادشاہ نے اپنی آمد کو امرا اور دوسرے درباریوں سے راز میں رکھا تھا۔

بہاؤالدین نے اپنی بساط سے کچھ زیادہ ہی اہتمام کر دیا تھا، اب وہ اس شش و پنج میں تھا کہ خسرو خان کی موجودگی میں منتخب لڑکیوں کی قطار کس طرح پیش کرے۔

بادشاہ اور خسرو خان مزے لے لے کر دعوت اڑاتے رہے، کھانے کے بعد شراب کا دور چلا اور وہ دونوں اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہے، بدمستی میں چہلیں کرنے لگے۔ خسرو خان بار بار بادشاہ کی آغوش میں گر رہا تھا اور بادشاہ اسے ہر بار دھکا دے کر الگ کر دیتا تھا کہ کیا تو اندھا ہو گیا ہے، دیکھ نہیں رہا کہ بہاؤالدین ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر خسرو خان چڑ کر بادشاہ سے دور جا بیٹھا۔

بادشاہ نے اسے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور دریافت کیا۔ ”بہاؤالدین کیا یہ گستاخی نہیں ہے؟ کیا میں بادشاہ نہیں ہوں؟ کیا خسرو خان کو میرے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیے تھا؟“

بہاؤالدین نے عرض کیا۔ ”حضور بادشاہ ہیں اور ایک خسرو خان کیا، کسی کی بھی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ اس طرح حضور کو غمزے دکھائے اور پھر یہ غمزے عورتوں میں اچھے لگتے ہیں۔“

بادشاہ نے بہکنے کے انداز میں کہا۔ ”عورت! کون سی عورت؟ کس کی عورت؟ کہاں ہے عورت؟ بخدا اس وقت تو اس کی بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

بہاؤالدین کی باچھیں کھل اٹھیں، بولا۔ ”حضور کا حکم سر آنکھوں پر، میں حضور کی پوری تواضع کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد وہ چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ساتھ حسین لڑکیوں کی قطار بھی چلی آ رہی تھی۔ باغیچے میں بڑی بڑی روشن مشعلوں کی روشنی میں ان خوب صورت لڑکیوں کے چہروں پر بھوت سے رقصاں نظر آتے تھے۔ خسرو خان نے دور سے لڑکیوں کو آتے جو دیکھا تو گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا بادشاہ کے پاس آیا اور بڑی بے تکلفی سے بادشاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا، بادشاہ اس سے ناراض تھا، اس نے خسرو خان کو دھکا دیا اور بہکی بہکی آواز میں کہا۔ ”جا، اس وقت دفعان ہو جا میرے پاس سے، میں تجھ سے نہیں بولوں گا۔“

خسرو خان نے ٹھنک کر جواب دیا۔ ”حضور یہی دم بھرتے تھے اپنی محبت کا، کہاں گئی آپ کی وہ محبت جس کا لوگوں نے خوانخواہ بڑا چرچا کر رکھا تھا۔“

بادشاہ نے خسرو خان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خوب صورت لڑکیوں کے حسن و شباب کا جائزہ لینے لگا، ہر لڑکی شباب کا ایک مثالی نمونہ تھی۔ بادشاہ انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا، اس کا اضطراب بتاتا تھا کہ وہ اس سیلِ حُسن کو دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا ہے، خسرو خان بادشاہ کی بے چینی دیکھ دیکھ کر رشک و حسد کی آگ میں جلا جا رہا تھا۔

بادشاہ نے ان لڑکیوں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے بہاء الدین سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بہاء الدین، تو نے یہ حسن و جوانی کے ترشے ہوئے پیکر کہاں سے اکٹھا کیے ہیں، میں دیکھ رہا ہوں، تیرے مذاق کی لطافت جس طرح تیری انشا میں جلوہ گر ہوتی ہے، اسی طرح ان مہ پاروں کے انتخاب میں بھی ظاہر ہو رہی ہے، واللہ تو حسن و لطافت کا ایک معیاری اور مثالی مذاق رکھتا ہے۔“

بہاؤالدین خسرو خان کی بے عزتی اور اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا، اس نے انکساری سے جواب دیا۔ ”اس ناچیز کا انتخاب حضور کو پسند آ گیا۔ غلام کے لیے یہی کافی ہے۔“

بادشاہ نے ایک لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اسے چٹکی سے مسل دیا، لڑکی کی سسکی نکل گئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”لڑکی تیرا نام؟“

لڑکی نے پرشوق نظروں سے بادشاہ کو دیکھا، بولی۔ ”سنبل!“ اور گردن جھکا لی۔

بادشاہ نے دوسری لڑکی کا داہنا رخسار وحشیانہ انداز میں مسل دیا، جس سے مسلا ہوا حصہ سرخ ہو گیا، لڑکی تلملا گئی اور اس کے منہ سے آہ نکل گئی، بادشاہ نے ایک خاص سرشاری کیفیت میں کہا۔ ”لڑکی! یہ تیرے رخسار ہیں یا سیب؟ تو نے ان کی سرخی اور حلاوت کہاں سے خریدی؟“

لڑکی شوخ و شریر تھی، فوراً جواب دیا۔ ”جہاں سے حضور نے یہ سلطنت خریدی ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں نے تو یہ سلطنت کہیں سے نہیں خریدی، میرا باپ بادشاہ تھا، میں بھی بادشاہ بن گیا، مجھے یہ جو کچھ ملا ہے، ورثے میں ملا ہے۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”اسی طرح میرے پاس جو کچھ ہے، میری ماں کی طرف سے ورثے میں ملا ہے، میری ہی طرح میری ماں بھی بہت خوب صورت تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ اس کے رخسار کسی سیب سے زیادہ سرخ و سفید اور شیریں تھے۔“

بادشاہ نے بے ساختہ کہا۔ ”واللہ تو بڑی حاضر جواب اور شوخ و شریر ہے، میں نے تجھے پسند کیا۔“

اس کے بعد وہ تیسری لڑکی کی طرف بڑھا اور اس کے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”لڑکی! کیا تو یہ بتا سکتی ہے کہ یہ انبۂ شیریں کس کے لیے ہیں؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”حضور والا! میرے انبۂ شیریں اپنے خریدار کی تلاش میں ہیں، پتا نہیں وہ خریدار خود

حضور والا ہی ہیں یا کوئی اور۔“

بادشاہ نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔ ”خوب خوب! تو بھی بلا کی حاضر جواب نکلی، میں نے تجھے بھی پسند کرلیا۔“

اس کے بعد وہ چوتھی لڑکی کی طرف بڑھا۔ یہ لڑکی ان تینوں سے زیادہ گدرائی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا گویا شباب اس کے کپڑوں سے باہر نکل پڑے گا، بادشاہ نے اس کی ران پر چٹکی لینی چاہی لیکن وہ اتنی سخت تھی کہ بادشاہ چٹکی نہیں لے سکا، بادشاہ نے اف اف کرتے ہوئے کہا۔ ”واللہ یہ ران ہے یا پتھر کی کوئی سل؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میری ران گوشت پوست کی ہے بندہ پرور، اور رہا اس میں فولاد یا پتھر جیسی سختی کا سوال، تو اس میں بھی اتنی ہی سختی ہے جتنی میرے دل میں، جس دن میرا دل نرم ہوجائے گا میرا جسم بھی نرم پڑ جائے گا۔“

بادشاہ نے لڑکی کے ہونٹ پر موجود تل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے علم قیافہ کے ماہرین سے سنا ہے کہ جس کے ہونٹ پر تل ہوتا ہے وہ غضب کا زبان دراز اور لڑاکا ہوتا ہے، میرا خیال ہے تو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی۔“

لڑکی نے کہا۔ ”درست فرمایا حضور نے، میں نے کسی شخص کو سوال جواب میں کبھی بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور نہ ہی مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اور مجھ پر سبقت لے جائے۔“

بہاالدین نے دبے لہجے میں کہا۔ ”یہ ساری لڑکیاں حضور کے لیے ہیں، ناچیز کی رائے میں حضور کو درخت نہیں گننا چاہئیں، آم کھانا چاہئیں، حسن وشباب کی تعریف اور مدح سرائی بادشاہوں کو زیب نہیں دیتی، یہ شاعروں یا ان عاشقوں کا کام ہے جن کے پاس عشق کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حضور بادشاہ ہیں اور بادشاہ کسی تکلف اور رعایت کے بغیر خوشہ چینی شروع کردیا کرتے ہیں۔“

یہ سب کچھ خسرو خان کے لیے بالکل ناقابل برداشت تھا، اس نے منہ پھلا کے عرض کیا۔ ”کیا حضور مجھے چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں، میرا حکم ہے کہ جب تک میں یہاں موجود ہوں تو بھی یہیں موجود رہ۔“

بہاالدین نے عرض کیا۔ ”حضور والا، اس ناچیز کی رائے میں خسرو خان کو رخصت کردینا چاہیے، کیونکہ عیش وطرب کی محفل میں رقیب نام کا سایہ تک گراں گزرتا ہے ورنہ حضور مجھ سے زیادہ عقل رکھتے ہیں، جو مناسب سمجھیں، کریں۔“

بادشاہ نے گدرائی اور گداز لڑکی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور پھر بہاالدین کو حکم دیا۔ ”بہاؤالدین، تو باہر چلا جا۔“ اور خسرو خان سے کہا۔ ”اور تو یہیں میرے پاس موجود رہ۔“

بہاالدین فوراً باہر چلا گیا لیکن خسرو خان کو اندر روک کر بادشاہ نے بہاالدین کو ذہنی تکلیف پہنچائی تھی اور اسے یوں محسوس ہوا گویا خسرو خان نے اسے ایک بار پھر شکست دے دی تھی اور وہ خسرو خان کے مقابلے میں ایک بار پھر خوار ہوگیا تھا۔

خسرو خان کو اتنا موقع جو ملا تو وہ پھر سے اپنے آپ میں توانائی اور حوصلہ محسوس کرنے لگا۔ وہ بادشاہ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خسرو خان! تو بھی ان میں سے کوئی ایک پسند کرلے۔“

لیکن خسرو خان نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سر جھکائے رو رہا تھا۔ بادشاہ نے فکروتشویش سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا بات ہے خسرو خان! تو رو کیوں رہا ہے، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔“

خسرو خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”حضور مجھے میرے حال پر رہنے دیں۔“

بادشاہ نے خسرو خان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا تو ناراض ہوگیا؟“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”ایک غلام اپنے آقا سے کس طرح ناراض ہوسکتا ہے۔“

بادشاہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”تو خود کو غلام کہتا ہے، حیرت ہے...... حالانکہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تو غلام نہیں میرا آقا ہے، میں تیرا عاشق ہوں، تو میرا محبوب ہے۔“

خسرو خان نے طنز کیا۔ ”ہوسکتا ہے حضور صحیح فرمارہے ہوں، لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے حضور نے بہاء الدین دبیر کے سامنے مجھے جس طرح ذلیل وخوار کیا ہے، کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔“

بادشاہ نے خسرو خان کو بڑی محبت کی نظر سے دیکھا، کہا۔ ”تو اس کا برا مان گیا۔ واللہ وہ میں نے کسی بری نیت سے نہیں کیا تھا۔ حقیقتاً اس وقت بہاء الدین کو میں یہ یقین دلا دینا چاہتا تھا کہ میں تیری طرف اتنا راغب بھی نہیں ہوں، جتنا لوگوں نے چرچا کر رکھا ہے، رہا میرے دل کا معاملہ تو وہ تجھے نہیں معلوم لیکن میں ایک بار پھر یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ تیرے ساتھ ہے۔“

خسرو خان کسی قدر مطمئن ہوگیا اور وہ لڑکیوں کو حرص وہوس کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

لڑکیاں بھی بادشاہ اور خسرو خان کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ بادشاہ اپنے ہاتھوں سے خسرو خان کو شراب پلانے لگا۔ خسرو خان نہ نہ کرکے نخرے دکھا رہا تھا، لیکن بادشاہ نے اپنا جام زبردستی خسرو خان کے ہونٹوں سے لگا دیا، بولا۔ ”پی لے میری جان! ضد یا نخرے نہ کر، مجھے ان نازنینوں اور مہ پاروں کے سامنے شرمندہ نہ کر۔“

خسرو خان نے شراب کا جام اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، بولا۔ ”حضور والا بات تو جب ہے کہ اس وقت میں جتنا ذلیل وخوار ہوا ہوں، اتنا ہی بہاالدین کو میرے سامنے ذلیل وخوار ہونا چاہیے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

خسرو خان نے کہا۔ ”وہ میں بتاؤں گا۔“

اس کے بعد بادشاہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ادھر قصر ہزار ستون میں بادشاہ کی گمشدگی سے تہلکہ مچا ہوا تھا۔ لوگ بادشاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے اور چونکہ خسرو خان بھی اپنی جگہ پر موجود نہ تھا، اس لیے قصر والوں اور درباری امرا کا عام خیال یہ تھا کہ بادشاہ خسرو خان کے ساتھ کہیں روپوش داد عیش دے رہا ہوگا۔

لڑکیوں کی وجہ سے بہاء الدین نے بادشاہ کے مزاج میں خاصا دخل اور رسوخ حاصل کرلیا تھا۔ دوسری طرف خسرو خان برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح بہاء الدین کے اثر ورسوخ کو بالکل ہی زائل کردے۔ اس کے علاوہ وہ بہاء الدین کو ذلیل وخوار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد گجرات کی بغاوت کو بھی کچل دیا گیا اور عین الملک ملتانی سرکش باغیوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کرنے کے علاوہ گرفتار بھی کرلایا اور اب مبارک شاہ کو گجرات کی صوبے داری پر کسی ایسے شخص کو روانہ کرنا تھا جو بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا منتظم اور سیاسی بھی ہو، اس منصب کے لیے اس کی نظر انتخاب علائی امیر ملک دینار پر پڑی۔ ملک دینار علاء الدین خلجی کے مشہور اور لائق ترین امرا میں شمار کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کو ملک دینار کی بابت یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس کی لڑکی بہت خوب صورت ہے، بادشاہ نے ملک دینار کو بلوا کر اسے گجرات کی صوبے داری کا مژدہ سنایا اور ساتھ ہی اپنی یہ خواہش بھی ظاہر کردی کہ وہ ملک دینار کی خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

ملک دینار کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، اس نے بڑی آسانی سے ہامی بھر لی اور بادشاہ سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔

گجرات کے قیدیوں میں پروار قوم کے ہندو بھی شامل تھے، انہی میں خسرو خان کا ماموں راندھول بھی شامل تھا اور ایک سوتیلا بھائی بھی۔ خسرو خان کے بھائی نے ذہانت اور چالاکی سے کام لے کر اپنا نام حسام الدین رکھ لیا تھا حالانکہ وہ ہندو تھا۔ خسرو خان اور حسام الدین کی ماں ایک تھی اور باپ دو، خسرو خان کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو اس نے اپنے ماموں اور بھائی کی بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے کسی پس وپیش کے بغیر انہیں آزاد کردیا۔ خسرو خان نے ان دونوں کا بادشاہ سے تعارف کرایا، بادشاہ کو حسام الدین کے حسن نے خاصا متاثر کیا اور اس نے ان دونوں ماموں بھانجے کو قصر ہزار ستون ہی ایک کے حصے میں ٹھہرا دیا۔

بادشاہ کی شادی سے خسرو خان بہت ملول ہوا۔ وہ کئی دن تک بادشاہ کے سامنے نہیں گیا اور بادشاہ ملک دینار کی بیٹی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس دوران اسے خسرو خان بھی بے حد یاد آتا رہا۔

شادی کے بعد بادشاہ نے اپنے خسر ملک دینار کو ظفر خان کا خطاب دے کر گجرات کی صوبے داری پر روانہ کردیا اور خود اپنی نئی نویلی بیوی کی ناز برداریوں میں مشغول ہوگیا۔

دوسری طرف خسرو خان عاجز اور بے زار الٹے سیدھے معلوم نہیں کیسے کیسے منصوبے بنا رہا تھا، جب وہ بہت زیادہ تھک گیا تو اس نے حرم شاہی میں بادشاہ کو پیغام بھیجا۔

”حضور کو خوشیاں اور عیش کوشیاں مبارک، غلام کہیں نہیں جاکر مر کھپ رہے گا، اب تاب ہجر اور یارائے صبر نہیں۔“

بادشاہ کو خسرو خان کا یہ پرزہ جو ملا تو اس نے فوراً اس ہندو بچے کو بلایا۔ وہ آیا تو...... بادشاہ نے بڑی محبت سے خسرو خان کی زلفوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں ہاتھوں میں لے کر ناک سے لگا لیا، بولا۔ ”خسرو خان! تو تو ہی ہے، کسی اور کا تجھ سے کیا مقابلہ؟“

اس کے بعد بادشاہ نے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس سے خسرو خان کو خوش کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت بادشاہ کی وارفتگی کا عجیب حال تھا، وہ اس والہانہ انداز میں خسرو خان کو خوش کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ خسرو خان کی ساری شکایتیں، ساری کدورتیں دور ہوگئیں اور وہ بے اختیار بادشاہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہنے لگا۔ ”جان خسرو! اب میں برداشت نہیں کرسکتا، آپ شادی کرتے ہیں تو یہ شوق کریں، لیکن مجھے فراموش نہ کریں، میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

بادشاہ نے اسے بھینچ لیا، بولا۔ ”مت گھبرا، مت پریشان ہو، پوری دنیا چھوٹ سکتی ہے لیکن تو نہیں چھوٹ سکتا،

یہ میرا وعدہ، میرا قول ہے، تو اس پر یقین کر۔“

خسرو خان نے درخواست کی۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ گجرات سے آنے والے قیدیوں میں میرا ایک بھائی اور ماموں بھی شامل ہیں اور اب وہ حضور کی مہربانی سے قصر کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اب ان پر اتنی مہربانی اور کی جائے کہ وہ اپنے ان عزیز رشتہ داروں کو بھی گجرات سے منگوالیں جو ان کی جدائی میں آنسو بہاتے پھر رہے ہیں۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”یہ کون سا مشکل کام ہے، اپنے بھائی اور ماموں سے کہہ کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی ایک فہرست تیار کردیں، میں یہ فہرست گجرات کے صوبے دار کو روانہ کردوں گا، وہ ان سب کو ایک ساتھ دہلی روانہ کردے گا۔“

خسرو خان نے بے اختیار بادشاہ کا ہاتھ چوما، بولا۔ ”حضور والا! آپ کتنے اچھے ہیں، میں کس زبان سے حضور کی تعریف کروں۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”اس میں شکر گزاری یا مدح سرائی کی کیا بات ہے، میں تجھے عزیز از جان رکھتا ہوں اس لیے تیرے عزیز میرے ہیں، اس میں مہربانی کی کیا بات ہے؟“

خسرو خان نے بادشاہ سے جدا ہو کر اپنے بھائی اور ماموں کو یہ خوش خبری سنائی اور انہیں ہدایت کی کہ وہ دونوں گجرات کے ان تمام ہندوؤں کو اپنے رشتہ داروں میں شامل کرلیں جو بہادر، عقلمند اور مدبر ہوں کیونکہ اب خلجی دربار میں ایرانیوں، تورانیوں کے بجائے مقامی ہندوؤں کا غلبہ ہونا چاہیے اور یہ ایک نہ ایک دن ہو کر رہے گا۔

ادھر کچھ دن سے یہ شکایتیں آرہی تھیں کہ دیوگیر کا راجا باغی ہوگیا ہے، بادشاہ نے ایک لشکر جرار تیار کیا اور خسرو خان کو ساتھ لے کر دیوگیر روانہ ہوگیا، وہاں کا راجا بادشاہ کی فوج دیکھ کر بدحواس ہوگیا اور جنگ سے پہلے ہی ہمت ہار بیٹھا، بادشاہ نے اسے گرفتار کرکے کھال کھنچوادی اور اس میں بھوسا بھروا کر اس کے محل کے در پر لٹکوادیا۔

دیوگیر کی تسخیر نے بادشاہ کو ایک بار پھر غافل اور بے پروا کردیا، وہ پھر خسرو خان میں ڈوب گیا، اس سفر میں خسرو خان کا بھائی حسام الدین بھی بادشاہ کے ساتھ تھا۔ بادشاہ اس پر بھی مائل تھا لیکن اسے خسرو خان پر ترجیح نہیں دی گئی۔ خسرو خان اور اس کے بھائی نے مل جل کر بادشاہ کو یہ خبر پہنچائی کہ دہلی سے گجرات کے صوبے دار ظفر خان کو ان دونوں کے ماموں نے اپنے رشتہ داروں کی جو فہرست بھیجی تھی اس پر صوبے دار نے یہ عمل کیا کہ ان سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل اور قید کررہا ہے۔ خسرو خان نے بادشاہ کو مزید یہ سمجھایا کہ اگر ظفر خان نے یہ روش جاری رکھی تو پورے گجرات میں ایک بار پھر بغاوت پھوٹ پڑے گی۔

بادشاہ نے ظفر خان کو دیوگیر طلب کرلیا۔ کچھ دنوں بعد ظفر خان اپنے معمولی لشکر کے ساتھ دیوگیر پہنچ گیا۔ چونکہ بادشاہ اس سے ناراض تھا، اس لیے ظفر خان کو اس کے اپنے خیمے میں قید کردیا گیا، ظفر خان حیران رہ گیا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے، بادشاہ کی یہ روش ان امرا کو پسند نہیں آئی جو بادشاہ اور خسرو خان کے تعلقات پر متفکر یا کبیدہ خاطر ہو رہے تھے۔

بادشاہ نے خسرو خان کو بغل میں بٹھا کر ظفر خان کو طلب کرلیا۔ ظفر خان کو چند فوجی تلواروں کے سائے میں لیے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، ظفر خان کو غیر مسلح کردیا گیا تھا، وہ زردی مائل سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا، کمر میں ایک قیمتی پٹکا بندھا تھا، جس میں سچے موتیوں کی ایک لڑی لپٹی ہوئی تھی۔ سر پر پگڑی تھی اور پگڑی کو موتیوں کی بندش میں قید کیا ہوا تھا۔

ظفر خان بادشاہ کے روبرو ہاتھ باندھ کر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے خسرو خان کو بادشاہ کے پہلو میں جس ناشائستہ انداز میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس نے ظفر خان کو مشتعل کردیا۔

بادشاہ نے حقارت سے ظفر خان کو مخاطب کیا۔ ”آئیے گجرات کے بادشاہ سلامت، کیسے بادشاہی میں کچھ مزہ آیا۔“

ظفر خان نے جواب دیا۔ ”حضور والا! میں گجرات کا بادشاہ نہیں، صوبیدار ہوں اور یہ صوبے داری بھی حضور ہی کی مرحمت کردہ ہے، میں تو حضور کا موروثی غلام ہوں۔“

بادشاہ نے کرخت آواز میں کہا۔ ”زیادہ باتیں بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خوب جانتا ہوں کہ تو گجرات کا بادشاہ تھا یا صوبیدار، تو گجرات کا خود مختار حکمران تھا۔“

ظفر خان نے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات درست ہوتی تو میں اس وقت یوں غیر مسلح، ہاتھ باندھے ہوئے حضور کی خدمت میں نہ حاضر ہوتا، میں حضور کے ذرا سے پروانے پر مودبانہ حاضر ہوگیا ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اگر تو حاضر نہ ہوتا تو میری افواج تجھے قید کرکے میرے پاس لے آتیں۔“

خسرو خان نے طنزاً کہا۔ ”حضور والا! یہ آپ کے پدر نسبتی ہیں، کم از کم ان سے تو اس لہجے میں بات نہ کیجیے۔“

ظفر خان نے خسرو خان کو ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ مابون، زیر خسپ مفعون......“

بادشاہ کے پاس ایک چھڑی رکھی تھی، اس نے ظفر خان کو دو چار چھڑیاں رسید کردیں اور لال پیلے ہو کر کہا۔ ”غدار، باغی، دغاباز، تجھے یہ سب کہنے کی ہمت کیونکر ہوئی، تو نے میری نافرمانی کی ہے، شاہی احکامات کی حکم عدولی کی ہے اور ان جرائم اور نافرمانیوں کی ایک ہی سزا ہے، یعنی سزائے موت۔“

ظفر خان کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ بادشاہ کو اتنا انتہا پسند نہیں سمجھتا تھا۔

خسرو خان نے عرض کیا۔ ”حضور، سزا میں انتہا پسندی سے کام لے رہے ہیں، کیا اس سزا میں تخفیف نہیں کی جاسکتی۔“

ظفر خان نے خسرو خان کی سفارش کو کوئی اہمیت نہیں دی، بادشاہ سے کہا۔ ”بہادروں کے لیے موت کوئی چیز نہیں، یہ میدان جنگ میں آئے یا جلاد کے روبرو، بات ایک ہی ہے لیکن میری موت کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ میں بے گناہ مارا جارہا ہوں اور ایک انتہائی ذلیل، نامرد اور زنانہ خو شخص کے لیے ہلاک کیا جارہا ہوں۔“

خسرو خان عورتوں کی طرح رونے لگا۔ ”حضور والا! میں نے تو اس کا کبھی بھی برا نہیں چاہا پھر یہ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟“

ابھی ظفر خان پھر کچھ کہنے والا تھا کہ بادشاہ نے جلدی سے تالی بجا کر آواز دی۔ ”ارے کوئی ہے؟ اس شریر کو لے جا کر کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔“

خسرو خان نے درخواست کی۔ ”بندہ پرور! اگر بار خاطر نہ ہو تو اس دریدہ دہن کو میرے حوالے کردیا جائے، میں جلاد کے ذریعا اسے اس کے آخری سفر پر روانہ کردوں۔“

اس دوران کئی خدمت گار بھی حاضر ہوچکے تھے، بادشاہ نے انہیں حکم دیا۔ ”ظفر خان کو اسی وقت قتل کردیا جائے۔“ اس کے بعد خسرو خان سے کہا۔ ”ان کے ساتھ تو بھی چلا جا، اس حکم پر اپنی نگرانی میں عمل کروا۔“

ظفر خان نے بادشاہ کو رحم آمیز نظروں سے دیکھا اور بڑی بے باکی سے کہا۔ ”حضور والا، ظاہر ہے کہ تھوڑی دیر بعد میں اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہوں گا لیکن مرنے سے پہلے میں چند باتیں تیرے گوش گزار کروں گا، اب نہ تو میں تیرا خسر ہوں اور نہ تو میرا داماد اور اسی طرح اب نہ تو، تو میرا بادشاہ ہے اور نہ ہی میں تیرا ملازم۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تو نے خسرو خان کے جن رشتہ داروں کی فہرست روانہ کی تھی کہ انہیں بحفاظت دہلی روانہ کردیا جائے، وہ سب خسرو خان کے رشتہ دار نہیں تھے اور ان میں بیشتر وہ لوگ شامل تھے جو دہلی کی حکومت کے باغی ہیں، میں انہیں کس طرح دہلی روانہ کرسکتا تھا۔ مبارک شاہ! میں مرجاؤں گا لیکن تو ہمیں یاد کرے گا کہ میں تیرا کتنا مخلص ملازم تھا، میں اس مابون، زیر خسپ کے سامنے یہ انکشاف کررہا ہوں کہ یہ وہی کام انجام دینا چاہتا ہے جو تیرے باپ کا نائب ملک کافور انجام دینا چاہتا تھا، یہ بھی ملک کافور ہی کی قوم سے تعلق رکھتا ہے، اس کا بھی تجھ سے اسی قسم کا تعلق ہے، جو تعلق ملک کافور کا تیرے باپ سے تھا، ملک کافور کے سارے لوگ خسرو خان کے آس پاس جمع ہوچکے ہیں اور وہ تجھ سے ملک کافور کی موت کا بدلہ لینے پر تلے ہیں، یہ وہ حقائق ہیں جن سے میں تو واقف ہوچکا ہوں لیکن تو بالکل لاعلم ہے، اب تو مجھے موت کے گھاٹ اتروادے، میں اف بھی نہیں کروں گا۔“

خسرو خان نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”حضور والا! یہ مجھ پر الزام ہے، یہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانا چاہتا ہے اور اگر میں موت سے بچ گیا تو اس کے خیال کے مطابق میں اور میرا خاندان حضور کی نظر سے اتنے گر چکے ہوں گے کہ ہم لوگ حضور کی خصوصی مراعات اور نوازشوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”خسرو خان! تو کس غدار کی باتوں پر ملول ہورہا ہے، تو ذرا بھی فکر نہ کر، میں جانتا ہوں کہ ظفر خان نے جو کچھ کہا ہے حسد اور بدنیتی سے کہا ہے، اس کا ضمیر صاف نہیں ہے۔“

بادشاہ کے آدمی ظفر خان کو لے جانے لگے تو ان کے ساتھ خسرو خان بھی ہولیا، باہر نکلتے ہی ان کا سامنا اس جلاد سے ہوگیا جو ظفر خان کے قتل پر مامور ہوا تھا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، خسرو خان اسے دیکھ کر مسکرایا، بولا۔ ”یہ رہا تیرا شکار، تلوار کی ضرب لگاتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ ہاتھ اچٹتا ہوا نہ لگے، بھرپور لگے، اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

جلاد نے یقین دہانی کرادی کہ ”ڈرنے یا فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ نے چاہا تو ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا ہوجائے گا، دوسرے ہاتھ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

خسرو خان، جلاد اور دوسرے لوگ ظفر خان کو املی کے ایک درخت کے نیچے لے گئے، املی کے سائے میں لکڑی کا ایک مڈھا رکھا گیا، جلاد نے ظفر خان کو حکم دیا۔ ”او نابکار!

اپنی گردن اس پر رکھ دے۔"

ظفر خان نے مشتعل ہو کر جواب دیا۔ "ادب سے بات کر او سفاک اور ذلیل انسان۔"

خسرو خان نے شاہی ملازموں کو حکم دیا کہ وہ ظفر خان کو زبردستی لکڑی کے منڈھے پر گرادیں۔ ان لوگوں نے ظفر خان کو مضبوطی سے قابو میں کرلیا اور اسے اس طرح بے قابو کرکے زمین پر گرا دیا جس طرح قسائی گائے بیل گرا لیا کرتے ہیں، شاہی ملازمین نے ظفر خان کو منہ کے بل لکڑی کے مڈھے پر گرادیا۔

جلاد نے ازراہ طعن پوچھا۔ "او نیم پاگل انسان! اب تو یہ بتا کہ کیا تجھے کچھ قرآنی آیات یاد ہیں؟"

ظفر خان نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟"

جلاد نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں، یہ کون کہتا ہے کہ تو مسلمان نہیں ہے۔ اب جبکہ موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے تو بہتر ہے کہ تو ان چند لمحوں میں آیات قرآنی کا ورد کرتا رہ۔"

ظفر خان نے بہ آواز بلند سورۃ الناس کا ورد شروع کردیا۔ ابھی وہ من الجنۃ والناس تک پہنچا بھی نہ تھا کہ جلاد کی تلوار ہوا میں لہرا کر ظفر خان کی گردن پر پڑی۔ سرتن سے جدا ہو کر ایک طرف لڑھک گیا اور کٹے ہوئے حصے سے خون اس طرح ابلا اچھلا کہ آنکھیں یہ روح فرسا منظر دیکھنے کی تاب ہی نہ لاسکیں اور لوگوں نے اپنے منہ پھیر لیے۔

کچھ دیر بعد ظفر خان کا سر بادشاہ کی خدمت میں پہنچا دیا گیا، بادشاہ اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر گیا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔ "اے میرے پروردگار، جس کا یہ سر میرے قدموں میں پڑا ہے، یہ میرا کتنا بڑا دشمن تھا، تو خوب جانتا ہے۔ اب میں بے خطر ہو گیا ہوں۔"

خسرو خان نے بادشاہ سے سرگوشی میں کہا۔ "قبلۂ عالم! ظفر خان کے قتل کی خبر بہت جلد پھیل جائے گی، اس لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ گجرات کو کسی صوبے دار کے بغیر ہی نہ چھوڑ دیا جائے، کسی نہ کسی کو اسی وقت گجرات کی صوبیداری پر روانہ کردینا چاہیے، ورنہ بغاوت کا اندیشہ رہے گا۔"

پھر اس خلوت کدے میں بادشاہ اور خسرو خان ناز و نیاز میں مشغول ہو گئے، خسرو خان کو اس وقت بھی گجرات کی صوبے داری کی بڑی فکر تھی اور وہ عورتوں کی طرح کہہ رہا تھا۔ "پھر حضور کسی کو گجرات کی صوبے داری پر آج ہی روانہ فرما دیں تو بہتر رہے گا۔"

بادشاہ نے بدمزگی سے کہا۔ "خسرو! تو کیسا بدمذاق نوجوان ہے، یہ اس وقت گجرات کی صوبے داری کا ذکر کیوں کررہا ہے۔"

لیکن خسرو خان پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، بولا۔

"حضور والا! میں گجرات کا باشندہ ہوں اور گجرات کی حالت سے اچھی طرح واقف ہوں، میں خوب جانتا ہوں کہ اگر گجرات والوں کو یہ پتا چل گیا کہ ان کا صوبے دار قتل کیا جاچکا ہے اور ہنوز کسی اور کو صوبے دار نہیں بنایا گیا ہے تو گجرات پر حکومت کرنے کی طمع میں وہ آپس ہی میں لڑنے مرنے لگیں گے اور میں اپنے گجرات کی تباہی اور بربادی کے خیال ہی سے کڑھنے لگتا ہوں۔"

بادشاہ کا مزہ کرکرا ہو رہا تھا، بولا۔ "اچھا، اب تو ہی بتا، گجرات کے صوبے داری پر کسے روانہ کیا جائے؟"

خسرو خان نے جواب دیا۔ "حضور جس کو مناسب سمجھیں، روانہ فرما دیں۔"

"نہیں تو بتا، کسے گجرات کا صوبے دار بنادیا جائے؟"

خسرو خان نے کہا۔ "حضور والا! اگر میں کسی کا نام لوں گا تو کیا حضور اس پر واقعی عمل کریں گے؟"

بادشاہ نے کہا۔ "تو کہہ تو دیکھ میری جان خوش رو، تو نہیں جانتا، میں تیری ایک ادا پر اپنی اتنی بڑی سلطنت نچھاور کرسکتا ہوں۔"

خسرو خان نے شرما کر نظریں جھکالیں، ایک ادائے خاص سے پوچھا۔ "کیا سچ؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "تو کہہ کر تو دیکھ، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟"

خسرو خان نے عرض کیا۔ "تب پھر حضور میرے بھائی حسام الدین کو گجرات کی صوبے داری تفویض فرما دیں۔"

بادشاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بس اتنی ذرا سی بات، کمال کردیا تو نے، یہ بھی کوئی سفارش ہوئی؟ وہ بھی مجھے کچھ کم عزیز نہیں ہے۔"

خسرو خان نے عاجزی سے عرض کیا۔ "یہ بھی حضور کی ذرہ نوازی اور خسرو پروری ہے، ورنہ میں کیا ہوں، حسام الدین کیا ہے، اس کا علم ہم دونوں کے سوا کسی تیسرے کو کیا ہوگا۔"

بادشاہ نے اسے روکا اور شوخی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "بس بند کر اپنی یہ بکواس، اب چپ رہ اور آئندہ بھی خبردار جو تو نے کسی ایسے موقع پر بے سروپا باتیں کیں۔"

خسرو خان چپ ہوگیا۔ بادشاہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے حسام الدین کو بلوا کر اسی وقت گجرات کی صوبے داری پر پروانہ کردیا۔

ظفر خان کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس نے بڑے بڑے امرا کو منفی اندازِ فکر عطا کردیا، ہر امیر اپنے آپ کو غیر محفوظ اور مقتول سمجھنے لگا۔ امرا اس سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خسرو خان کے اشارے پر ہو رہا ہے، وہ اپنی فکر کے اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے تھے کہ اگر مبارک شاہ کا کچھ دن اور یہی حال رہا تو دہلی کے تخت پر مبارک شاہ نہیں خسرو خان بیٹھا دکھائی دے گا۔

اس لشکر میں بادشاہ کا چچازاد بھائی اسدالدین بھی سفر کررہا تھا، امرا بادشاہ کی لاعلمی میں اس سے ملے اور خسرو خان کے تعلق اور ظفر خان کے قتل پر تفصیلی باتیں اسدالدین سے کر ڈالیں اور سب سے آخر میں کہا۔ "اب تم بتاؤ کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟"

اسدالدین بادشاہ سے بہت ڈرتا تھا، بولا۔ "جناب اس پورے واقعے میں مجھے کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی جس سے میں یہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟"

ایک امیر نے عرض کیا۔ "پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ میں ہمت کتنی ہے؟"

اسدالدین نے پوچھا۔ "کس قسم کی ہمت؟"

کسی دوسرے امیر نے کہا۔ "اصلاح کی ہمت، حالات کا دھارا موڑ دینے کی ہمت، حکومت بدل دینے کی ہمت۔"

اسدالدین نے جواب دیا۔ "یہ کام میرے اپنے بس کا نہیں ہے، یعنی یہ کام کوئی بھی شخص تن تنہا نہیں انجام دے سکتا، اس کے لیے بہتوں کے تعاون کی ضرورت ہے اور میرا اپنا یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے اس قسم کے مشورے تو دے سکتے ہیں لیکن زیادہ دیر مدد نہیں دے سکتے۔"

پہلے امیر نے کہا۔ "جب ہم مشورے دے رہے ہیں تو مدد بھی کرسکتے ہیں لیکن ابتدا میں ضروری ہے کہ لائحہ عمل طے کرلیا جائے اور یہ بھی کہ جو لوگ اس کام میں آپ کی مدد کریں گے، بعد میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؟"

اسدالدین نے جواب دیا۔ "اگر میں کسی طرح بادشاہ بن گیا تو اس وقت تمہی لوگ میرے دست و بازو ہوگے، تمہیں لوگ میرے آنکھ کان ہوگے، تمہی لوگ میرے دل و دماغ ہوگے، اس سے زیادہ ممکن نہیں۔"

کئی امرا ایک ساتھ بولے۔ "تب پھر ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے اور خلجی حکومت کو اس نامبارک شاہ اور ناہنجار خسرو خان سے نجات دلا کر رہیں گے۔"

اسدالدین بادشاہت کی امید میں ایک بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ دھڑکا بھی محسوس کررہا تھا کہ اگر کسی طرح اس سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تو اس کا اپنا انجام کیا ہوگا؟

اسی دوران بادشاہ کو خبر ملی کہ معبر میں بغاوت ہوگئی ہے، بادشاہ خود تو دہلی واپس جانا چاہتا تھا، اس نے خسرو خان کو وزارت کے ساتھ ہی چتر بھی عطا کردیا جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس نے خسرو خان کو ایک لشکرِ عظیم دے کر معبر روانہ کردیا اور ہر طرح کے اختیارات دے کر حکم دیا کہ اس بغاوت کو نہایت سفاکی اور ظلم کے ساتھ کچل دینا ہے۔ خسرو خان تو کسی ایسے موقعے کی تاک ہی میں تھا۔ اس نے ایک دن ضائع لیے بغیر معبر کا رخ کرلیا۔ اس وقت اس کے آس پاس وہ ہندو امیر اور مشیر موجود تھے جو کبھی نائب ملک کافور کے ساتھی اور مشیر رہ چکے تھے۔ ان کے دل مبارک شاہ کی طرف سے صاف نہیں تھے۔ اب جو انہوں نے خسرو خان کو اس غیر معمولی منصب پر فائز دیکھا تو انہیں یہ امید ہوئی کہ اب وقت آگیا ہے جب نائب ملک کافور کا قطب الدین اور خاندان خلجی سے بدلہ لے لیا جائے اور اپنے ہم مذہب اور ہم قوم خسرو خان کو بادشاہ بنا دیا جائے، ان میں جاہریا نامی گجراتی بڑا جذباتی اور سفاک تھا، جاہریا کی خسرو خان سے رشتہ داری بھی تھی، شاید اسی وجہ سے وہ سب سے زیادہ بے باک تھا اور جب بھی غصے یا جوش میں آتا، آنکھیں بند کرکے منہ کھول دیتا اور جو جی میں آتا سناڈالتا۔

خسرو خان کا ارادہ تھا کہ اب جبکہ اسے ایک لشکر جرار مل ہی چکا ہے، وہ اس کی مدد سے معبر کی بغاوت کچل کر اپنی خودمختاری کا اعلان کردے اور اگر بادشاہ اس کی گوشمالی کو آئے تو خسرو خان اس سے بھی دو دو ہاتھ کرلے اور ہر ممکن اور جائز و ناجائز طریقے سے بادشاہ کو شکست دے کر کوئی بڑا قدم اٹھائے۔ جاہریا خسرو خان کو تذبذب اور فکرمند دیکھ رہا تھا۔ وہ خود زیادہ غور و فکر کا قائل نہیں تھا، جب یہ لوگ معبر کی حدود میں داخل ہوگئے تو جاہریا نے خسرو خان سے دریافت کیا۔ "خسرو خان تو وزیر ہوگا تو بادشاہ کا ہوگا، تو سپہ سالار ہوگا تو شاہی افواج کا ہوگا، اسی طرح اگر تو معشوق ہوگا تو قطب الدین خلجی کا ہوگا لیکن میرے لیے تو تو میرا بھائی، میرا ہم وطن اور میرا ہم قوم ہے اور اسی رشتے سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تو ان دنوں پریشان سا کیوں نظر آتا ہے؟"

خسرو خان کو جاہریا کی یہ جاہلانہ بے تکلفی سخت ناگوار گزری لیکن وہ مصلحتاً برداشت کرگیا، جواب دیا۔ "جاہریا تو

نے بالکل صحیح اندازہ لگایا، میں ان دنوں واقعی بہت پریشان اور بے چین ہوں۔"

جابریا نے پوچھا۔ "آخر تو چاہتا کیا ہے؟ یہ بھی تو معلوم ہو۔"

خسرو خان نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ چاہتا ہوں اگر بتادوں تو مملکتِ خلجیہ میں بھونچال سا آجائے گا۔"

جابریا نے بڑی بے مروتی اور سنگدلی سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ میں ذرا صاف گو انسان ہوں، اگر میں اپنی عادت سے مجبور ہوکر صاف صاف بات کروں گا تو تو بھی مجھ سے ناراض ہوجائے گا۔"

خسرو خان نے کہا۔ "نہیں جابریا! میں برا آدمی نہیں ہوں۔ اگر تو سچی باتیں کرے گا تو میں امرت کا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اتارلوں گا۔"

جابریا نے جواب دیا۔ "خسرو خان! میں رہوں یا مرجاؤں لیکن میں تیری بابت یہ پیش گوئی کر رہا ہوں کہ تیرے جیسا انسان دنیا کے جس حصے میں بھی ہوگا، پریشانیاں اور فکرمندیاں اس کے ساتھ رہیں گی، انسان جو مقام اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں سے حاصل کرتا ہے ان کو زوال ذرا مشکل سے آتا ہے لیکن جو تیری طرح کے لوگ ہیں انہیں کسی بھی وقت معزول اور معتوب کیا جاسکتا ہے۔"

خسرو خان نے چڑ کر کہا۔ "یہ آج تو مجھ سے کس قسم کی باتیں کررہا ہے۔"

جابریا فرطِ جذبات سے مغلوب ہوگیا، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "خسرو خان! میں اپنے آقا اور ولی نعمت نائب ملک کافور کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا اور اس جگہ کو بھی نہیں جہاں نائب ملک کافور کو قتل اور سر کاٹ کر نیچے پھینک دیا گیا تھا۔"

خسرو خان نے کہا۔ "میں یہ کب کہتا ہوں کہ تو انہیں بھول جا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ کوئی ایسی تدبیر کر جس سے ہم سب اپنے اپنے منصوبوں اور خواہشوں میں کامیاب ہوجائیں۔"

جابریا پھر مشتعل ہوگیا، بولا۔ "خسرو خان! میں عورتوں کی طرح باتیں کرنے سے رہا، میں مرد ہوں اس لیے مردوں ہی کی طرح بات کروں گا، میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ کچھ بھی ہو، میں ایک بار دہلی ضرور جاؤں گا اور اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ بادشاہ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کردوں۔"

خسرو خان کو جابریا کے اندازِ گفتگو سے بڑی کوفت ہو رہی تھی اور بڑی اذیت پہنچ رہی تھی، اس نے کہا۔ "جابریا! میرا مشورہ مان، ابھی ابھی جو کچھ تو نے صاف صاف کہہ ڈالا ہے، آئندہ اس قسم کے خیالات اپنے دل میں رکھنے کے باوجود تو اپنی زبان بند رکھے گا، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو اپنی زبان کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھے۔"

جابریا نے جواب دیا۔ "خسرو خان! تو کس موت سے مجھے ڈرارہا ہے، میں مرنے سے بالکل نہیں ڈرتا، جب میں یہ دیکھوں گا کہ میں اپنی آزاد زبان سے جان گنوا رہا ہوں، زیادہ جرأت سے کام لے کر جلاد کی تلوار ہی سے جلاد کا کام تمام کردوں گا۔"

خسرو خان جابریا کی کٹھ حجتی سے تنگ آچکا تھا، بولا۔ "اچھا بھائی اب تو خدا کے لیے چپ ہوجا، اور جو تیرے جی میں آئے کرتا رہ، مجھے کوئی اعتراض کیوں ہونے لگا۔"

جابریا نے کہا۔ "دیکھ خسرو! تو کیا کوئی بھی مجھے منع کرکے دیکھ لے، میں کروں گا وہی جو میرا دل کہے گا۔"

خسرو خان نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے، بولا۔ "میری توبہ ہے جو آئندہ میں تجھ سے کوئی بحث کروں، میں تو بھر پایا۔"

ادھر یہ مشورے جاری تھے دوسری طرف بادشاہ دہلی واپس جارہا تھا، اسد الدین اور اس کے مشیروں اور مددگاروں نے یہ منصوبہ تیار کرلیا کہ جب بادشاہ آگے کی منزل گھٹی ساگون میں قیام کرے تو وہ حسبِ عادت عیش و عشرت میں مشغول ہوجائے گا، انہیں بادشاہ کے معمولات کا یہاں تک علم تھا کہ وہ کہاں کہاں اپنے ساتھ محافظین کے دستے رکھتا ہے اور کہاں محافظوں کے بغیر ہی رہتا ہے، دیوگیر کی بغاوت پر قابو پاکر اور معبر کے لیے خسرو خان کو روانہ کرکے بادشاہ اتنا خوش اور مطمئن ہوگیا تھا کہ اب گویا عیش و عشرت کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا، اس نے بے تحاشا اور بے حساب شراب شروع کردی اور اپنے آس پاس حسین لڑکیوں اور عورتوں کا جمگھٹا لگالیا۔ ان میں بھی خسرو خان کی ہم وطن اور ہم قوم عورتوں کی اکثریت تھی۔

بادشاہ نے حسبِ منصوبہ گھٹی ساگون میں پڑاؤ کیا اور میلوں حدِ نظر تک خیموں کا ایک جنگل سا اگ آیا۔ بادشاہ کا اپنا خیمہ اور اس سے متعلق خیمے بیچوں بیچ تھے، ان میں اس کا وہ مخصوص خیمہ بھی موجود تھا، جس میں بادشاہ حسین ترین لڑکیوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں شراب نوشی کیا کرتا تھا۔ اس خیمے کی آرائش اور زیبائش ان نام نہاد ماہرین کے سپرد تھی جنہیں بزعم خود یا بعض بڑوں کے بقول جنسِ لطیف کا وسیع تجربہ یا علم حاصل تھا، ان ماہرین نے بادشاہ کے اس خیمے کو اندر سے حسین ترین رنگ برنگے پردوں سے سجادیا۔ ان پردوں پر مصوروں نے اپنی قوتِ متخیلہ اور تجربوں کے امتزاج سے ایسی فحش اور عریاں تصویریں بنارکھی تھیں کہ آدمی انہیں دیکھ کر ہی بے قابو اور جذبے مشتعل ہوجاتے تھے، ان تصویروں میں انسانوں اور جانوروں کو بحالتِ طمث ان تمام شکلوں اور طریقوں میں دکھایا گیا تھا، جس حد تک ان مصوروں کے خیال میں...... ممکن ہوسکتا تھا۔ بادشاہ اس خیمے میں داخل ہوا تو اس کی حالت ہی غیر ہوگئی، اس نے حکم دیا کہ ان مصوروں اور ماہروں کو حاضر کیا جائے، جن کی بے مثال قوتِ متخیلہ، تجربات اور اعلیٰ درجے کے ذوقِ حسن نے یہ شاندار مجموعی کارنامہ انجام دیا ہے لیکن افسوس کہ مصوروں میں سے ایک بھی موجود نہ تھا۔ ہاں خیمہ سجانے کے ماہرین البتہ موجود تھے، بادشاہ نے مزید لطف اٹھانے کی خاطر ایک ادھیڑ عمر ماہر سے پوچھا۔ "اس وقت تیری کیا عمر ہوگی؟"

اس نے جواب دیا۔ "قبلۂ عالم چوالیس سال۔"

بادشاہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، وہاں جھریوں کا نام و نشان تک نہ تھا اس نے اپنی ڈاڑھی مختصر کر رکھی تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند جیسی کیفیت پائی جاتی تھی، گٹھا ہوا جسم، لیکن پیٹ ذرا بھی نہیں نکلا تھا۔

بادشاہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے تو نے اپنی عمر چودہ پندرہ سال زیادہ بتادی ہے، ذرا سوچ کر بتا، اس وقت تیری صحیح عمر کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "غلام پرور! میں حضور سے جھوٹ بولنے کی ہمت تک نہیں کرسکتا، کیا کوئی انتیس تیس سالہ مرد عورتوں کا اتنا وسیع تجربہ رکھتا ہوگا جتنا مجھے حاصل ہے؟"

بادشاہ کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آرہا تھا، اس نے اسے اپنے روبرو بیٹھ جانے کا حکم دیا، دوسرے ماہرین دست بستہ کھڑے رہے۔

بادشاہ نے اس سے سوال کیا۔ "تیرے آباؤ اجداد کی مالی حالت کیسی تھی؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضور والا! بالکل ناگفتنی، اور میں نے بچپن میں بڑے فاقے کیے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "حیرت ہے کہ ایک مفلس اور تہی دست کس طرح حرص و طمع کی ماری عورتوں کا وسیع تجربہ حاصل کرسکتا ہے؟"

اس نے کسی قدر رک رک کر عرض کیا۔ "حضور والا! میں نے دولت کی کمی کو ذہانت اور اپنی پرکشش صورت اور مخمور آنکھوں سے غیر موثر کردیا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "ارے میں نے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "یوں تو میرا خاندانی نام ابوالحسن ہے لیکن عورتوں اور حسینوں میں جانم کے نام سے مشہور ہوں۔"

بادشاہ کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آرہا تھا، مسکراتے ہوئے بولا۔ "واللہ تو تو بڑا دلچسپ انسان ہے، میں تجھ سے دیر تک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد اس نے اپنے سامنے مودب کھڑے ہوئے دوسرے ماہرین کو باہر چلے جانے کا حکم دیا اور ان سب سے کہا۔ "تم لوگ اپنے اپنے خیموں میں اپنے حصے کے انعام و اکرام کا انتظار کرو، میں محروم کسی ایک کو بھی نہ کروں گا۔"

بادشاہ کا حکم پاتے ہی سارے ماہرین خیمے سے نکل گئے۔ بادشاہ نے اطمینان کی سانس لی اور دلچسپ ماہر ابوالحسن کو مخاطب کیا۔ "ہاں، تو کیا کہہ رہا تھا تیرا نام تو ابوالحسن ہے مگر تو عورتوں اور حسینوں میں جانم کے نام سے مشہور ہے، میں تیری ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! کچھ ایسی باتیں ہیں کہ میں انہیں اگر کھل کر ذرا تفصیل سے بیان کروں گا تو میرا یہ فعل سوء ادبی میں شمار کیا جائے گا۔"

بادشاہ نے بے تابی سے کہا۔ "ارے احمق! جب میں تجھے خود ہی بے تکلفی کی اجازت دے رہا ہوں تو تو کیوں پریشان ہورہا ہے؟"

ابوالحسن نے بادشاہ کو رحم طلب نظروں سے دیکھا، کچھ سوچ کر بولا۔ "اگر حضور اجازت دیں گے تو میں اپنے خرافاتی تجربات میں سے چند حضور کے بھی گوش گزار کردوں گا۔"

بادشاہ بہت بے چین تھا، بولا۔ "ہاں، شروع کر۔"

ابوالحسن نے بالکل غیر متعلق سوال کردیا۔ "حضور والا! اس وقت خیمے کے باہر کون کون موجود ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "پچاس عریاں شمشیر بردار میری حفاظت پر اس وقت مامور ہیں۔"

ابوالحسن نے پوچھا۔ "ہماری آوازیں ان کے کانوں تک تو نہیں پہنچ رہی ہیں؟"

بادشاہ نے کہا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! جب میں دس سال کا تھا اور مجھے پیٹ کے علاوہ اپنے برے بھلے کی ذرا بھی تمیز نہ تھی، ہر وقت کھانے کی فکر میں رہتا تھا، کیونکہ میرے گھر کی معاشی حالت بہت خراب تھی، میرے باپ کو عسرت اور تنگ

دیتی نے اتنا عاجز کر دیا تھا کہ وہ گھر سے منہ چرانے لگا تھا، جو کچھ کماتا اس کا بیشتر حصہ اپنی ذات پر خرچ کر دیتا، میں اپنے تین بھائیوں، دو بہنوں اور ماں کے ساتھ بڑی بے بسی اور مایوسی سے کسی ایسے ناگہانی معجزے کا منتظر رہتا، جس سے میرا گھر اچانک کھانے پینے کی چیزوں سے بھر جاتا اور ہم سب اچھی طرح پیٹ بھر بھر کے کئی کئی وقت کھانا کھاتے......"

بادشاہ نے اکتائے ہوئے کہا۔ "یہ تو کہاں کی غیر دلچسپ داستان لے کر بیٹھ گیا، میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ تو عسرت اور مفلسی میں حریص اور طامع عورتوں کو کس طرح رام کرتا رہا اور یہ کہ تو ابوالحسن سے جانم کس طرح بن گیا؟"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! میں نے اپنی داستان جہاں سے شروع کی ہے اس کا آپ کے سوالوں سے بنیادی تعلق ہے، حضور اس ناچیز کی ذرا سی سمع خراشی گوارا فرما لیں، ذرا سی دیر میں آپ کا تکدر دور ہو جائے گا۔ ساری الجھن دور ہو جائے گی۔"

بادشاہ نے اجازت دے دی اور کہا۔ "اچھا اچھا سنا، جہاں سے جی چاہے سنا، میری طرف سے اجازت ہے۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "تو حضور والا! ان دنوں میری معاشی حالت اتنی ابتر تھی کہ ہماری حالتِ زار پر ہمارے پڑوسیوں تک کو رحم آنے لگا تھا اور ان پڑوسیوں میں ایک تیس بتیس سالہ بیوہ بھی شامل تھی، یہ بیوہ اپنے باپ کے تنہا گھر میں بڑی آسودہ حال زندگی گزار رہی تھی، وہ ہم سب کی جب تب مدد کر دیا کرتی تھی۔ حضور والا! وہ مجھ پر بطورِ خاص مہربان رہتی تھی اور میری طرف اشارہ کر کے میری ماں سے ہنس کر کہا کرتی تھی۔ "بہن! اسے خوب کھلا پلا کر جلدی جوان کر دے تاکہ تم لوگوں کے کچھ کام آ سکے۔"

میری ماں بے بسی سے کہتی کہ "اگر ایسا کرنا میرے بس میں ہوتا تو اسے چند ہی دنوں میں جوان کر دیتی، لیکن افسوس کہ یہ تو اپنے وقت ہی سے جوان ہوگا۔"

پڑوسن بیوہ نے بناوٹی غصے سے کہا۔ "یہ فاقے کر کر کے کیا خاک جوان ہوگا، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ فاقوں کی کثرت سے اسے لو کے مارے آم کی طرح زرد اور سکھو کر دے گی اور بہن جس جوانی کا تم انتظار کر رہی ہو وہ کبھی بھی نہ آئے گی۔"

میری ماں نے کہا۔ "غیب کا علم خدا کو ہے، میں اپنے بچوں کے لیے جو کچھ کر سکتی ہوں، ضرور کرتی ہوں۔"

پڑوسن بیوہ نے کہا۔ "تیرے پاس ہے ہی کیا جو تو اپنے بچوں کے ساتھ کچھ کرے گی، اچھا تو ایسا کر کہ ابوالحسن کو میرے حوالے کر دے، میں اسے بڑے پیار سے رکھوں گی، کسی قسم کی پریشانی نہ ہونے دوں گی اور یہ لڑکا ہمیشہ بہن تیرا ہی رہے گا۔"

شاید میری ماں کو پڑوسن کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "میں ابوالحسن کو اگر بہن تمہارے حوالے کبھی کر دوں تو یہ تمہارے کس کام آئے گا۔ بس روٹیاں توڑتا رہے گا۔"

پڑوسن نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کر لیا اور کہا۔ "بہن! تو ابوالحسن کی طرف سے بے فکر رہ، بس بقیہ کی فکر کرتی رہ۔"

ماں نے میرا بوجھ ہلکا ہوتے دیکھا تو سکون محسوس کیا، بولیں۔ "لیکن بی پڑوسن میں اسے جب چاہوں گی، بلا لیا کروں گی اور جب چاہوں گی تم سے واپس لے لوں گی۔"

بیوہ نے جواب دیا۔ "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، چیز تمہاری ہے جب چاہنا واپس لے لینا۔"

پڑوسن بیوہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لیے چلی گئیں اور اس دن پہلی بار میں نے اچھے اچھے کھانے کھائے، حضور والا! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوس میں، میں اتنا زیادہ کھا گیا تھا کہ مجھے ہیضہ ہو گیا تھا اور میری پڑوسن بیوہ کو میرے لیے طبیب کو بلانا پڑا تھا۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! ایک ماہ کے اندر میں فکر معیشت سے آزاد ہو گیا اور معلوم نہیں میں کیا کچھ سوچنے لگا، میری ماں کا یہ خیال تھا کہ پڑوسن مجھ سے گھر کے کام لیتی ہوگی لیکن حضور والا! وہ میرا کام تو کر دیتی تھی لیکن لیتی نہیں تھی پہلے میں الگ سوتا تھا لیکن ایک رات جب میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر چیخ پڑا تو اس نے مجھے اپنے پاس سلانا شروع کر دیا، وہ بعض اوقات مجھے بڑی گرم جوشی سے چمٹا لیتی اور بڑا پیار کرتی، میں اس کی ان حرکتوں کو بھی اس کی مہربانی اور نوازش ہی سمجھتا رہا۔ وہ مجھے دن میں بھی بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی، لیکن جب اس کا باپ گھر میں موجود ہوتا تو وہ بڑی احتیاط کرتی۔"

بادشاہ نے فرطِ جوش سے کہا۔ "بخدا تو تو داستان گو بھی ہے، کتنے پرلطف پیرائے میں اپنی داستان سنا رہا ہے۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! وہ واقعات ہی کچھ ایسے پُراثر اور چونکا دینے والے تھے کہ میں انہیں زندگی بھر نہیں بھلا سکتا اور انہی بنیادی واقعات اور تجربات پر میری پوری زندگی کی تعمیل اور تشکیل ہوئی۔"

بادشاہ نے مضطربانہ حکم دیا۔ "اپنی داستان جاری رکھو، مزہ کرکرا نہ کر۔"

ابوالحسن نے کہنا شروع کیا۔ "وہ میری آنکھوں کو بطور خاص چومتی رہتی تھی، ایک دن جب میں سو کر اٹھا اور ہم دونوں کی نظریں اتفاقیہ ٹکرائیں تو وہ بے قابو ہو گئی اور اس نے بے اختیار مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور جانم جانم کہہ کر میری آنکھ، رخسار اور گلے کے بوسے لینے لگی، اس وقت میں خود بھی بڑی لذت محسوس کرنے لگا۔ پھر حضور والا! میں نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اس کی ہر بات گوارا کر کے گویا اسے اس کی اجازت دے دی کہ اس کا جو جی چاہے کرے، میں کچھ نہ کہوں گا بس ایک معمول کی طرح خاموش رہوں گا، اب وہ بہت زیادہ بنی سنوری رہنے لگی تھی اور اب بھی میں اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لے کر اس کے پرکشش، گداز اور قیامت خیز جسم کی حقیقی یعنی، ہو بہو تصویر کشی کر سکتا ہوں۔ حضور والا! گستاخی معاف! میں آج اس عمر میں بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ پھر میں نے اس جیسی عورت نہیں پائی، وہ مزہ کسی اور میں نہیں ملا، اس وقت وہ میری استاد تھی اور میں ناسمجھ شاگرد، بعد میں میں استاد ہو گیا اور دوسری عورتیں میری شاگرد ہو گئیں۔"

بادشاہ پر اس وقت کیفیت ہی کچھ اور طاری تھی، پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "ابوالحسن! تو اپنی داستان مکمل کر، اب میں برداشت نہیں کر سکتا، میں تجھے رخصت کر کے فوراً ہی پری پیکروں اور چاند کے ٹکڑوں سے اپنے اس عشرت کدے کو آراستہ کر دوں گا اور تیری داستان نے میری رگ و پے میں جو ایک آگ سی لگا دی ہے میں اسے ان کے آتشیں شباب سے بجھانے کی کوشش کروں گا۔ گرمی گرمی کو مارے گی، لوہا لوہے کو کاٹے گا، خدا نے تجھے جو قوت بیان عطا کی ہے میں اس سے آئندہ بھی لطف اندوز ہونے کی کوشش کروں گا۔"

ابوالحسن بہت خوش تھا کہ اس نے اپنی زبان کے جادو سے بادشاہ کو زیرِ اثر کر لیا۔ اس نے مزید کہنا شروع کیا۔ "بندہ پرور! اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کسی سے ہرگز ذکر نہ کروں۔ وہ اکثر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کرتی کہ جانم! جب تو پندرہ سال کا ہوگا، میں چالیس کی ہو چکی ہوں گی، اس وقت تو معلوم نہیں میرا خیال بھی کرے گا یا نہیں لیکن میں اس کی کسی بات کا بھی جواب نہ دیتا۔ جب میں واقعی پندرہ سال کا ہو گیا تو میری ماں نے مجھے طلب کیا اور میرا باپ بھی اس پر مُصر رہنے لگا کہ میں فوج کی ملازمت کر لوں لیکن وہ عورت مجھے واپس کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی کہ تم لوگ اس کی ملازمت کی فکر نہ کرو، میں اسے خود ہی فوج میں اچھا عہدہ دلوا دوں گی۔ شاید اس کا باپ بڑا رسا تھا اور شاہی فوج کو رسد پہنچانے پر مامور تھا، اس عورت نے میری ماں اور باپ کی زبان بندی کے لیے پورے گھر کا خرچا پورا کرنا شروع کر دیا لیکن میرا باپ اس سے بھی مطمئن نہ ہوا۔ وہ برابر میری واپسی کا مطالبہ کرتا رہا، پھر دوسرے پڑوسیوں کو بھی اس پر اعتراض ہونے لگا کہ آخر جوان لڑکے کو یہ بیوہ اپنے گھر میں کیوں رکھے ہوئے ہے، لیکن وہ تو میری دیوانی تھی اور اسے کسی کی بھی پروا نہ تھی۔

جب پاس پڑوس کی عورتوں نے اسے بہت زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا تو اس نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا، اس کے لیے میں اب بھی وہی دس سالہ جانم تھا جس پر اسے پورا پورا اختیار حاصل تھا، جسے وہ اپنی ملکیت سمجھتی تھی اور جب اور جس طرح چاہتی تھی اپنے تصرف میں لاتی تھی، ایک دن اس نے مجھے اچھی طرح بنایا سنوارا اور خود بھی بن سنور گئی، مجھ سے بولی۔ "جانم! آج سے میں ایک نیا سلسلہ شروع کر رہی ہوں، اگر میں ایسا نہیں کروں گی تو پڑوس کی حاسد عورتیں تجھے میرے ساتھ نہیں رہنے دیں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کون سا نیا سلسلہ، اس میں مجھے بھی کچھ کرنا ہوگا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس میں بڑا اور اہم کام تو تجھی کو انجام دینا ہے، میں تو تیری رہنمائی کروں گی۔"

اس کے بعد اس نے مجھے ایک کمرے میں چھپا دیا اور کہا کہ جب تک میں نہ کہوں تو دم سادھے چپ چاپ بیٹھا رہے گا، اس کے بعد سارا کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ پڑوس سے ایک پچیس چھبیس سالہ عورت کو اپنے گھر لے آئی، وہ اسے میرے کمرے سے متصل دوسرے کمرے میں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ یہ عورت مجھ سے سب سے زیادہ خار کھاتی تھی۔ اس عورت نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بہن! کیا تم تنہا ہو اس وقت؟"

اس نے سرد آہ بھری اور جواب دیا۔ "آج ہی کیا میں ایک عرصہ سے تنہا ہوں۔"

مہمان عورت نے طنزیہ کہا۔ "یہ تو تم غلط کہتی ہو، وہ لڑکا کہاں گیا جسے تم جانم کہتی ہو؟"

اس نے اس طرح مایوسی سے کہا۔ "وہ واقعی جانم ہے، میں اسے پسند کرتی ہوں، میں اس سے محبت کرتی ہوں اور میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتی کہ یہ الہڑ اور ناتجربہ کار نوجوان میرا خوشہ چیں ہے، میں نے اس کے مزے لوٹے

ہیں، تم سب کے اعتراض اور شکوک غلط نہیں تھے اور آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں فرداً فرداً تم سب سے معافی مانگوں اور درخواست کروں کہ خدا کے لیے مجھے میرے حال پر رہنے دو، میرے عیش کے پانچ سال اور رہ گئے ہیں، انہیں ویران نہ کرو۔"

حضور والا! اس مہمان عورت کا نام مہ پیکر تھا، شاید اس کا نام اور کوئی بھی ہو اور جس طرح میرا نام جانم پڑ گیا، اس طرح اس حسن کے ٹکڑے کا نام مہ پیکر رکھ دیا گیا ہو، وہ اس سے صاف صاف باتیں سن کر دانتوں میں انگلی دے کر بیٹھ گئی، بولی۔ "بہن! یہ بے غیرتی، یہ سینہ زوری، تم نے تو کمال ہی کر دیا ہے اس وقت۔"

میری محسنہ نے کہا۔ "مہ پیکر! تم اسے میری بے حیائی کہو یا کچھ اور، لیکن میں تمہیں دعوت دوں گی کہ ایک دن تم اس کو اپنے سامنے بٹھا کر دیکھو، اس کی خمار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو اگر تم میں نشہ نہ دوڑ جائے تو میرا ذمہ، تمہاری ہی طرح مہ پیکر وہ بھی مہ پیکر ہے، میں اس عورت کو مان جاؤں گی جسے اس کا قرب حاصل ہو اور وہ وضع احتیاط پر قائم رہے۔"

مہ پیکر نے کھسیا کر کہا۔ "بس بہن بس کرو۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تو نہیں ہے، بس اسی طرح دوسروں سے تعریف ضرور سنی ہے۔ اب ایسا بھی کیا کہ اسے دیکھا اور ہوش و حواس گنوا دیے۔"

اس نے کہا۔ "افسوس کہ تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا کیا میں تمہارا امتحان لے لوں۔"

مہ پیکر نے پوچھا۔ "تم میرا کس طرح امتحان لو گی؟"

اس نے جواب دیا۔ "اگر تم اجازت دو گی تو میں تم سے اسے ملوا دوں گی پھر میں دیکھوں گی کہ تمہیں اپنے دل اور طبیعت پر کتنا قابو حاصل ہے؟"

مہ پیکر نے ہنس کر کہا۔ "بہن! میں تمہاری طرح مرد کو ترسی ہوئی، دیوانی تو ہوں نہیں، میرا شوہر ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ سال چھ ماہ میں ایک آدھ ماہ کے لیے آجاتا ہے لیکن وہ جب بھی آتا ہے مجھے راضی کر کے جاتا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "اِدھر وہ کب سے نہیں آیا؟"

مہ پیکر نے جواب دیا۔ "کوئی دس ماہ سے، بس آج ہی کل میں آنے والا ہے۔"

اس نے کہا۔ "تب پھر مہ پیکر تم اس سے ضرور ملو، میں ایک عرصہ سے بیوگی کی زندگی گزار رہی ہوں اور اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ میری زندگی میں کوئی مرد داخل ہوگا، لیکن اتفاق کی بات کہ جب میرے خالی اور تنہا پہلو میں ایک چاند اچانک اتر آیا تو میں برداشت نہیں کر سکی اور اس چاند کو اپنے سینے سے لگا لیا، اس سے بھی جی بھر کے مزہ اٹھایا، اسے اپنا سب کچھ دے ڈالا، اب اس پر لوگ مجھے کچھ بھی کہیں مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، تم کہتی ہو کہ تم اپنے شوہر سے دس ماہ سے جدا ہو، میں اپنے جانم کو بلواتی ہوں، تم دو چار بار تنہائی میں اس کے پاس بیٹھ کر وضع احتیاط قائم رکھنا، پھر میں دیکھوں گی اور تمہیں مان لوں گی۔"

مہ پیکر نے آہستہ سے کہا۔ "گو امتحان دینا ضروری تو نہیں، لیکن اگر تم مُصر ہی ہو تو میں تیار ہوں۔"

اب اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، شرارتاً ہنستے ہوئے بولی۔ "مہ پیکر ایک بات میں بھی نہیں چھپانا چاہتی، جانم نے تمہیں معلوم نہیں کہاں اور کس طرح دیکھ لیا ہے اور جب سے تمہیں دیکھا ہے میری طرف اس کا التفات کم ہو گیا ہے، بس تمہارا ہی ذکر کرتا رہتا ہے، ان حالات میں یہ عین ممکن ہے کہ تم خود تو وضع احتیاط پر قائم رہو مگر جانم بے قابو ہو کر پیش دستی کر بیٹھے۔ اس صورت میں کیا ہوگا؟ تم مجھے ملامت کرو گی، مجھے برا بھلا کہو گی لیکن میں بے گناہ ہوؤں گی، کیونکہ میں نے سب کچھ تمہیں پہلے ہی سے بتا دیا ہے۔"

مہ پیکر نے متذبذب آواز میں کہا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو، تم نے مجبور کیا ہے تو میں اس آزمائش سے پاک صاف گزر کر دکھاؤں گی۔"

بادشاہ نے مداخلت کی۔ "ابوالحسن! تو نے غضب کا حافظہ پایا ہے اور سب کچھ اس طرح سنا رہا ہے گویا انہیں اب بھی تیری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور تو انہیں دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر بیان کیے چلا جا رہا ہے۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! میری انہی خصوصیات نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ میں کیا اور میری حیثیت ہی کیا؟"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا اب اپنی داستان کا بقیہ حصہ سنا دے تاکہ میرے شوقِ تجسس کی تسکین ہو۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! اب میں داستان کے اس حصے میں داخل ہو رہا ہوں جہاں شرم و حیا اور حضور کا ادب و احترام مانع آئیں گے۔ میں خوفزدہ ہوں کہ وہ سب کچھ حضور کی طبع نازک پر گراں گزرے گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ابوالحسن! میں نے تجھے خلوت میں شرفِ ہم کلامی بخشا ہے اور اس بات کی اجازت دی ہے کہ تو کسی تکلف اور احترام کا خیال کیے بغیر جو کچھ سنانا چاہتا ہے سناتا چلا جا۔"

ابوالحسن نے کہنا شروع کیا۔ "تو حضور والا! وہ مہ پیکر کو آمادۂ امتحان کر کے میرے پاس چلی آئی اور سرگوشیوں میں کہنے لگی۔ "جانم، میں نے جو باتیں کی ہیں تو نے بھی سن لی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ میں اس شوخ و شریر اور فطین کی زبان کو قفل لگا دوں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں مہ پیکر کو لے کر یہیں تیرے پاس آرہی ہوں، وہ اپنے شوہر سے دس ماہ سے جدا ہے اور میں نے اپنے طور پر یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان دنوں مہ پیکر پر تشنگی کا شدید غلبہ ہے اور ذرا سی ترغیب یا تحریص اس کے پندارِ اعتماد اور وضع احتیاط کو چکنا چور کر کے رکھ دے گی اور میں اس کو اپنے رنگ میں رنگ لینے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔"

حضور والا! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، میں ...... خوش ہو گیا کہ چلو ایک اور سہارا مل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مہ پیکر کو میرے کمرے میں لے آئی، چونکہ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھی اس لیے وہ میرے کمرے میں بڑی بے پروائی سے داخل ہوئی تھی، اس کا دوپٹا کسی عالم کی طیلسان کی طرح ایک ہی کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے یک لخت ...... جھپٹ کر مہ پیکر کو دبوچ لیا۔ اس نے کچھ زیادہ مزاحمت نہیں کی، میں نے اسے بھینچ لیا اور بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "مہ پیکر! بخدا جب سے میں نے تیری جھلک دیکھی ہے، تیرے ہجر و فراق میں آہیں بھرتا رہتا ہوں، تیرا حسن، تیرا شباب، تیرے اعضائے جسمانی کا ہوشربا تناسب، تیری آنکھوں سے غیر مرئی کیف کی کہر، میری آنکھوں سے داخل ہو کر پورے جسم کو مست اور بے خود کیے دے رہی ہے، عورتیں میری تمنا کرتی ہیں اور میں تیری آرزو رکھتا ہوں۔"

میں نے اچانک یہ محسوس کیا کہ میری مدح سرائی نے اس کی مزاحمت کو ایک دم ختم کر دیا، اس نے جواب میں کہا تو کچھ بھی نہیں لیکن اپنی کوئی چیز مجھ سے چھپائی بھی نہیں۔

میں نے اس کا رخسار مسل دیا، وہ سی کر کے اچھل پڑی، میں ہنس دیا، کہا۔ "میں تو یہ سمجھا تھا کہ تو قوتِ گویائی سے محروم ہے، لیکن تیری "سی" سے پتا چلا کہ تو بول بھی سکتی ہے۔"

پھر مہ پیکر ہر خوف اور ہر اندیشے سے بے نیاز اور نڈر ہو کر میرا ساتھ دینے لگی، مہ پیکر کی اچانک حصول یابی اور اس پر پورا پورا دسترس اور اختیار میرے لیے ایسا تھا کہ جیسے کسی فاتح کو کوئی شہر یا قلعہ بغیر کسی امید یا کوشش کے ہی حاصل ہو جائے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "ظاہر ہے اس کے بعد مہ پیکر سے بھی تیرے تعلقات استوار ہو گئے ہوں گے۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "جی بندہ پرور! میں نے تقریباً تین سال تک مہ پیکر کی بھی خوشہ چینی کی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اور تیری محسنہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! بالکل نہیں، بلکہ بعد میں میری محسنہ اور مہ پیکر نے میری ملاقاتیں کئی دوسری عورتوں سے کرائیں، اس طرح وہ دونوں معترض اور زبان دراز عورتوں کو چپ کرا دینا چاہتی تھیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تیرے پاس تو داستانوں کا طویل سلسلہ موجود ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں سنا جائے گا تو اس کے لیے کئی ماہ درکار ہوں گے۔"

"بالکل حضور والا بالکل، میں نے عورت اور تسخیر عورت کا علم اپنے تجربے سے حاصل کیا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اور آخر کار تو کس نتیجے پر پہنچا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! یہ ساری باتیں جوانی دیوانی کی ہیں۔ جب رگوں میں آتشِ سیال دوڑ رہا تھا تو ہر طرف سرگرمی ہی سرگرمی نظر آتی تھی، اب میں بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہانپ رہا ہوں، ولولے، امنگیں اور آرزوئیں اب بھی ہیں، خواہشیں اب بھی سر اٹھاتی رہتی ہیں، لیکن حضور والا! اب ان میں تسلسل برقرار نہیں رہا، سب کچھ وقتی، عارضی اور ہنگامی ہوتا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "عورتوں کی عام کمزوری اور اس کی تسخیر کا مختصر سے مختصر لفظوں میں تیرے تجربوں اور علم کی روشنی میں نچوڑ کیا ہو سکتا ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "بندہ پرور! اگر آدمی کے پاس اقتدار ہے اور حکومت ہے تو اسے عورتوں کی تسخیر کے سلسلے میں کس علم یا تجربے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر آدمی کے پاس نہ تو اقتدار ہے نہ دولت تو اس کے لیے عورتوں کی تسخیر کا بندھا ٹکا اصول ہے، عورت کی حد سے زیادہ مدح سرائی، لیکن مدح سرائی نہایت ہوشیاری اور دانائی سے ہونا چاہیے جس سے عورت اپنے بارے میں واقعی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے اور جب وہ کسی مرد کی مدح سرائی کے بوجھ تلے دب جاتی ہے تو وہ گویا اس مرد کی ہر جا اور بے جا خواہش کا احترام اور اپنے

تعاون کو اخلاقی فریضہ سمجھنے لگی ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اور اگر کوئی عورت مرد کے اس حربے کو بھی غیر موثر اور بے کار کردے تو؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "تب پھر مرد کو اپنی جرأت اور جسارت پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اگر اپنی مدح سرائی کو بے اثر ہوتے دیکھے تو اسے فوراً ہی دوسرے لمحے انجام کی پروا کیے بغیر عورت کو زبردستی فتح کرلینا چاہیے۔ اگر کوئی مرد عورت کے جذبات مشتعل کرسکتا ہے تو وہ اسے بہ آسانی اس کی مرضی اور خواہش سے فتح بھی کرسکتا ہے اور جب کوئی عورت ایک بار مسخر کرلی جائے تو بار بار وہ مسخر ہوتی رہے گی...... کیونکہ ساری مزاحمت اور ساری جدوجہد حیاؤ کے زیر اثر ہوتی ہے اور جب حیاؤ ہی ختم ہوجائے تو پھر مزاحمت کون کرے گا؟"

بادشاہ ابوالحسن کی باتوں سے محظوظ بھی ہوا تھا اور کچھ عاجز بھی آگیا تھا، بولا۔ "اب تو ایک بات اور بتا، اس کے بعد تیری بقیہ داستان کو کسی اور دن پر چھوڑ دیا جائے گا۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا ارشاد فرمائیں، میں کوشش کروں گا کہ حضور کے ہر سوال کا جواب دیا جائے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تجھے امرد پرستی کا بھی کوئی تجربہ ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! امرد پرستی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں اور عورتوں کی موجودگی میں کسی اور طرف رجوع ہونا خلافِ عقل بات ہے۔"

بادشاہ کو غصہ آگیا، اس نے جوش غضب میں کہا۔ "تو اے دروغ گو بلکہ دنیا کے سب سے جھوٹے داستان گو! اپنے بارے میں میری رائے بھی سن لے، میں نے تجھے اس سے زیادہ نہیں سمجھا کہ تو نے مجھے جو کچھ سنایا اس کا بیشتر حصہ جھوٹ پر مشتمل ہے۔"

ابوالحسن نے گھبرا کر پوچھا۔ "حضور نے اس کا کس طرح اندازہ لگایا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "اس طرح کہ تو نے اپنے بچپنے سے جوانی تک کی داستان منظر کشی اور مکالموں کے ساتھ اتنی تفصیل سے سنائی ہے کہ دنیا کا کوئی انسان انہیں اس طرح یاد رکھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اگر میں ابھی تجھے دوبارہ یہ حکم دوں کہ اپنی اس داستان کو ایک بار پھر من وعن سنا دے تو تو اسے سنانے سے عاجز آجائے گا۔"

ابوالحسن ڈر کر خاموش ہوگیا کہ کہیں اسے اپنی یہ داستان دوبارہ نہ سنانی پڑ جائے۔

بادشاہ نے کہا۔ "اب تو جاسکتا ہے، تو نے اپنی داستان سرائی سے میرے جذبات میں ایک آگ سی لگادی ہے، اب تو دفعان ہوجا تاکہ میں اپنی اس آگ کو بجھانے کی کوشش کروں۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "حضور والا! یہ غلام حسب الحکم دفعان بھی ہوجائے گا لیکن اس کے دفعان ہوتے ہی حضور پر موت حملہ آور ہوجائے گی، آپ اس وقت تک محفوظ ہیں جب تک میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "یہ کیا بکتا ہے، تیرا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا کہیں؟"

ابوالحسن نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "حضور! اس ناچیز کی بات مانیں، اس وقت میں نے جو داستان حضور کو سنائی ہے، اس کے علاوہ ایک داستان اور ہے، جسے میں اس وقت سناؤں گا جب مجھے یہ یقین دلا دیا جائے گا کہ حضور کے محافظ آس پاس اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ وہ سازشیوں کے کسی بھی حملے کو ناکام بنادیں گے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو عجیب وغریب انسان ہے، اس طرح تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! میں حقیقتاً آپ کے رشتے کے چچازاد بھائی اسدالدین کا ملازم ہوں، آپ کی بے پروائی اور اپنے اعزا پر بے پناہ نوازش وعنایات نے اسدالدین کو بادشاہت کی طمع میں مبتلا کردیا ہے اور اس نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ آپ جب اپنے اس خیمے میں عیش وعشرت میں مشغول ہوں گے اور باہر محافظ بھی نہیں ہوں گے تو اسدالدین اپنے شریک سازش امرا اور سپاہیوں کو لے کر اس خیمے میں گھس آئے گا اور حضور کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

بادشاہ بدحواس ہوگیا، پوچھا۔ "یہ سب تجھے کس طرح معلوم ہوا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "میں خود بھی ان کی سازش میں شریک ہوں اور مجھے یہاں بھیجا ہی اسی لیے گیا تھا کہ میں یہاں کے حالات اور کیفیات سے انہیں مطلع کروں، اس کے بعد وہ اپنے منصوبے پر عمل کریں گے۔"

بادشاہ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ "اگر یہ بات غلط ہوئی تو؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "تو حضور والا! میں قتل ہونے کو تیار ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "شرکائے سازش کے نام بتا سکتا ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں بتا سکتا۔"

اس کے بعد اس نے ان تمام امرا کے نام لکھوا دیے جو اس سازش میں شریک تھے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "جب تو خود بھی اس سازش میں شریک تھا تو اس وقت یوں اس کا بھانڈا کیوں پھوڑ دیا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "حضور والا! اس کا کوئی اتنا بڑا سبب نہیں ہے، جب حضور نے اچانک مجھ پر توجہ دی، مجھ سے گفتگو کی اور مجھے اپنی داستان سنانے کا شرف بخشا تو میں نے ایک دم یہ سوچا کہ اتنے اچھے بادشاہ کو یوں سازش میں نہیں مارا جانا چاہیے، میرے دل میں حضور کی عقیدت اور محبت کی شمع روشن ہوگئی اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور زندہ وپائندہ رہیں تاکہ میری عقیدت اور محبت کی شمع بھی روشن رہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا تو اس وقت میرے پاس، اس خیمے ہی میں رہے گا جب تک کہ میں نمک حرام اسدالدین اور اس کے سازشی امرا کو گرفتار نہ کرلوں۔"

ابوالحسن نے عرض کیا۔ "بندے کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟"

بادشاہ نے اسی وقت کئی دستے الگ الگ اسدالدین اور شریکِ سازش دوسرے امرا کے خیموں کی طرف روانہ کردیے اور انہیں حکم دیا کہ جو جس حال میں ہو قید کرکے حاضر کیا جائے اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو وہیں ہلاک کردیا جائے۔

چند گھنٹوں میں یہ کارروائی مکمل ہوگئی اور اسدالدین اور شریکِ سازش امرا کو گرفتار کرکے بادشاہ کے روبرو حاضر کردیا گیا، بادشاہ کے حکم سے ان پر جرح کی گئی۔ ابوالحسن کو گواہ بنا کے پیش کیا گیا اور چند گھنٹوں کے اندر ہی اس سازش کی حقیقت بادشاہ کے سامنے آگئی، بادشاہ کے غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی جگہ ان کی گردن زنی کا حکم دے دیا۔ اسدالدین اور اس کے ساتھیوں کو قتل کردیا گیا، جب یہ خون خرابا ہو رہا تھا اور غصے میں بادشاہ کی آنکھیں اور رخسار سرخ ہو رہے تھے، ابوالحسن اپنی جگہ کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا اور اسے یہ یقین نہیں رہا تھا کہ بادشاہ اسے معاف کردے گا، وہ اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ اس نے کیا کردیا۔

جب یہ سب قتل ہوچکے تو بادشاہ نے پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی فوج دہلی روانہ کردی اور اسے حکم دیا کہ اسدالدین کے سگے سوتیلے بھائیوں کی املاک کو لوٹ کر انہیں قتل کردیا جائے، چنانچہ یہ دستہ دہلی گیا اور بادشاہ کے حکم پر اس فرمانبرداری سے عمل کیا کہ اسدالدین کے انتیس چھوٹے چھوٹے بھائیوں تک کو ذبح کردیا، حالانکہ ان کا اس سازش سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی انہیں اس کا کوئی علم تھا۔

ابوالحسن کو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا جب بادشاہ اسدالدین اور اس کے ساتھیوں کو قتل کراچکا تو وہ ابوالحسن سے مخاطب ہوا، پوچھا۔ "تو کیوں ڈر رہا ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "میں نے حضور کا جمال تو دیکھا تھا لیکن جب جلال دیکھا تو ناچیز کو تھرتھری لگ گئی۔"

بادشاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تو اس سازش میں خود بھی شریک تھا؟"

ابوالحسن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے، ہاں اور نہ دونوں ہی مشکل تھے۔

بادشاہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "تو خاموش کیوں ہے، جواب کیوں نہیں دیتا؟"

ابوالحسن نے کپکپاتے ہوئے جواب دیا۔ "بیشک یہ گناہ گار بھی اس سازش میں شریک تھا۔"

بادشاہ نے غصے میں ایک تھپڑ ابوالحسن کے بھی رسید کردیا، بولا۔ "بدبخت انسان! عورتوں کی تسخیر کرتے کرتے بادشاہ کی تسخیر میں لگ گیا، تو نے عورتوں کو مسخر کرنے کے مکروفریب سیکھے ہیں، لیکن مردوں کو کس طرح فتح کیا جاتا ہے، تو نہیں جانتا نہ کہ کسی بادشاہ کی تسخیر، بول تجھے کیا سزا دی جائے؟"

ابوالحسن کا بہت برا حال تھا، وہ اپنی غلطی پر سخت نادم تھا۔

بادشاہ نے ڈانٹا۔ "تو بولتا کیوں نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تیری زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔"

ابوالحسن نے کپکپائی آواز میں جواب دیا۔ "حضور وہی سزا اس گناہ گار کو بھی دے سکتے ہیں جو سازش کے جملہ شرکا کو دی گئی ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو گویا تو اپنی خوشی سے قتل ہونا چاہتا ہے؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "اپنی خوشی سے قتل ہونا کون پسند کرے گا؟ میں تو بادشاہ کی خوشی پر جان دینا خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔"

بادشاہ نے کچھ تامل اختیار کیا، پھر سر جھکالیا، کہا۔ "تو واقعی داستان گو ہے، تجھے باتوں کا فن آتا ہے، میں نے تجھے

معاف کیا لیکن اب تو میرے ملازمین خاص میں شمار کیا جائے گا۔ میں جب تب تیری داستان سرائی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کروں گا۔''

اس کے بعد بادشاہ نے ایک شاندار محفل جمائی، حُسن وجمال کے شہ پارے یکجا ہوگئے، کمسن اور خوبرو چاند کے ٹکڑوں نے صراحی اور جام سنبھالے، بادشاہ نے مے نوشی شروع کی، گاؤ تکیے کی جگہ عورتوں اور لڑکیوں کو استعمال کیا گیا اور رقص وسرود، نازوانداز، شوخی وشرارت۔ جس کی طرف بادشاہ رجوع ہوجاتا، وہ کچھ زیادہ ہی ناز وانداز دکھانے لگتی۔ اب بادشاہ بالکل بے فکر تھا، اس نے جی بھر کے دادِعیش دی، لیکن یہاں بھی اسے خسرو خان یاد آتا رہا۔

بادشاہ کو عیش وعشرت کے بعد جو ذرا ہوش آیا تو وہ پھر اسدالدین کی سازش پر غور کرنے لگا، وہ اسدالدین اور اس کے خاندان کو بری طرح تباہ وبرباد کر چکا تھا لیکن اس کا دل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ شاہی خاندان کے ان تمام افراد کی ایک فہرست تیار کرتا رہا جو کسی وقت بھی اسدالدین کی طرح کوئی بھی سازش کر سکتے تھے، اب اس فہرست میں کل تین نام نظر آتے تھے، خضر خان، شادی خان اور چھ سات سالہ شہاب الدین۔ بدقسمتی سے یہ بادشاہ کے بھائی تھے اور انہیں پہلے ہی اندھا کیا جا چکا تھا۔ بادشاہ نے اپنے داستان گو ابوالحسن سے پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے، کیا خضر خان، شادی خان اور شہاب الدین کسی وقت میرے خلاف بغاوت یا سازش کر سکتے ہیں؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''حضور والا! جہاں تک میں جانتا ہوں یہ تینوں شہزادے پہلے ہی اندھے کیے جا چکے ہیں، اب یہ اندھے آپ کے خلاف کس طرح کوئی سازش یا بغاوت کر سکتے ہیں؟ اور ان میں ایک تو چھ سات سال کا ناسمجھ بچہ ہے۔''

بادشاہ نے ابوالحسن کا مذاق اڑایا، بولا۔ ''اگر تو میری جگہ بادشاہ ہوتا تو یہ بات اچھی طرح تیری سمجھ میں آجاتی کہ اندھے اگر خود کوئی سازش یا بغاوت نہیں کر سکتے تو دوسروں کی تیار کردہ سازش اور منصوبہ بغاوت میں شریک تو ہو سکتے ہیں۔''

ابوالحسن نے خوفزدہ ہو کر عرض کیا۔ ''بجا فرمایا جہاں پناہ نے، بھلا ایک غلام اپنے آقا کی عقل کی کیا برابری کرے گا؟''

بادشاہ نے شادی کتبہ نامی ایک امیر کو راستے ہی سے گوالیار روانہ کر دیا اور اسے ایک فرمانِ خاص دیا جس میں لکھا تھا کہ خضر خان، شادی خان اور کمسن شہاب الدین کو فوراً قتل کر دیا جائے اور ان کی ماؤں اور بیویوں کو دہلی روانہ کر دیا جائے۔ شادی کتبہ نے اس فرمان پر پوری طرح عمل کرایا، تینوں نابینا شہزادے قتل کر دیئے گئے اور خضر خان کی بیوی دیول دیوی کو بادشاہ کے حرم پہنچا دیا گیا، جسے اس نے اپنی بیوی بنا لیا۔

اسی دوران گجرات کے وفادار اور نمک حلال امرا نے خسرو خان کے بھائی حسام الدین کو قید کر لیا، کیونکہ ان امرا کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ حسام الدین گجرات میں بغاوت کی سوچ رہا ہے اور یہ فتنہ کسی وقت بھی کھڑا ہو سکتا ہے، ان امرا نے حسام الدین کو قید کر کے بادشاہ کے حضور روانہ کر دیا، لیکن بادشاہ نے اس کا الٹا اثر لیا، وہ خسرو خان سے عشق کرتا تھا اور حسام الدین خسرو خان کا بھائی تھا اور یہ بھی بادشاہ کی عنایتِ خاص سے متمتع ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے حسام الدین کو فوراً ہی رہا کر دیا اور جن وفادار امرا نے اسے قید کیا تھا انہیں لعنت ملامت کی گئی اور بعض کو قید میں ڈال دیا گیا۔

خسرو خان کو معبر گئے ہوئے جب کچھ عرصہ گزرا تو بادشاہ کی بے چینی بڑھنے لگی، اس نے خسرو خان کو ایک فرمان خاص روانہ کر دیا اور اس میں یہ تاکید کر دی گئی کہ فرمان کے ملتے ہی خسرو خان دہلی کے لیے روانہ ہوجائے، کیونکہ بادشاہ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اس نے خسرو خان کی بہ سرعت واپسی کے لیے ایک خاص انتظام کیا۔ دہلی سے معبر تک پالکیوں اور تیز رفتار کہاروں کا جال سا پھیلا دیا گیا اور کہاروں کو حکام دیا گیا کہ جیسے ہی ان میں سے کسی پالکی میں خسرو خان بیٹھے اس کے کہار پالکی اٹھا کر آگے روانہ ہوجائیں۔ دوسری طرف بادشاہ کے اندیشوں اور خواہشاتِ نفسانی نے بڑا اسرا اٹھا رکھا تھا، وہ تلملایا تلملایا پھر رہا تھا، اسی عالم میں بادشاہ کی نظر بہاؤالدین دبیر پر پڑ گئی اور یاد آیا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے حسین وجمیل لڑکیوں اور عورتوں سے اس کی ضیافت کی تھی۔ بادشاہ نے اسے بلایا اور پوچھا۔ ''کیوں بہاؤالدین! تو نے ایک عرصے سے شاہی ضیافتِ طبع کا انتظام نہیں کیا؟''

بہاٗالدین نے جواب دیا۔ ''حضور نے اس عاجز اور انکسار پر جو نظر کرم فرمائی تھی اس کی حلاوت اور لذت میں ابھی تک یاد کرتا رہتا ہوں، حضور ارشاد فرمائیں میں حضور کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے بے شرمی سے جواب دیا۔ ''جب تک خسرو خان واپس نہیں آتا، میں اسی طرح بے چین اور آشفتہ سر رہوں گا۔''

بہاء الدین نے کہا۔ ''حضور والا! چند منتخب حسین لڑکیاں اور بہترین شکل وصورت کی زبان دراز عورتیں اب بھی میرے قبضے میں موجود ہیں، حضور والا! ارشاد فرمائیں تو انہیں اسی وقت یہاں حاضر کر دیا جائے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''نہیں بہاء الدین نہیں، میں چوروں کی طرح تیرے گھر چلنا چاہتا ہوں اور پائیں باغ کے اسی گوشے میں غرق مے ومستی ہونا چاہتا ہوں جہاں ایک بار پہلے بھی میں اسی کیفیت کا شکار ہو چکا ہوں۔''

حکم حاکم مرگ مفاجات، بہاء الدین دبیر ایک بار پھر بادشاہ کو اپنے گھر لے گیا اور پائیں باغ کے سابقہ گوشے میں اسے ایک بار پھر رنگ رلیاں منانے کا موقع دیا گیا۔ اس بار بادشاہ کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ وہ ایک عجیب وغریب شرارت پر آمادہ ہوگیا۔ جب بادشاہ عیش وعشرت میں مشغول تھا، بہاء الدین اسے چھوڑ کر اندر چلا گیا، بادشاہ نے ایک لڑکی سے پوچھا۔ ''اے لڑکی! کیا تو بتا سکتی ہے کہ یہ بہاؤ الدین مجھے چھوڑ کر اندر کیوں چلا گیا؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ! میں زبان سے کیا عرض کروں، بہتر یہی ہے کہ حضور اچانک اندر تشریف لے جائیں اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیں۔''

بادشاہ نے لڑکی کو اپنی آغوش میں لیا اور بہاٗالدین دبیر کے زنان خانے میں داخل ہوگیا، وہاں ایک گوشے میں بہاٗالدین دبیر بھی بزم عشرت جمائے بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کی آغوش میں جو عورت تھی۔ بلاشبہ ان سبھوں سے اچھی تھی جنہیں بادشاہ کی نذر کیا گیا تھا۔ بہاٗالدین اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھ کر بوکھلا گیا۔ عورت کو پرے دھکیلا اور احتراماً کھڑا ہوگیا، پوچھا۔ ''حضور کے قدم رنجہ فرمانے کا سبب؟ غلام کو وہیں یاد فرما لیا ہوتا۔''

بادشاہ نے اس حسین عورت کی طرف اشارہ کیا جسے بہاء الدین نے اپنی آغوش سے دور کر دیا تھا، پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے بہاء الدین؟''

بہاء الدین سٹپٹایا ہوا تھا، بولا۔ ''حضور والا، یہ میری بیوی ماہ رخ ہے۔''

بادشاہ نے ترشی سے جواب دیا۔ ''نہیں بہاٗالدین نہیں، تیری لکنت زدہ آواز اور گھبرائی ہوئی کیفیت یہ بتا رہی ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے، یہ تیری بیوی ہرگز نہیں۔'' پھر اس نے عورت سے پوچھا۔ ''ماہ رخ! اگر بہاٗالدین سچ نہیں بول رہا تو تو ہی سچ بول دے اور مجھے بتا کہ تو کون ہے؟''

عورت بہت ڈر گئی تھی، بولی۔ ''جہاں پناہ! میں بھی وہی ہوں جو پائیں باغ کی عورتیں اور لڑکیاں ہیں۔''

بادشاہ نے غضب ناک ہو کر دریافت کیا۔ ''اگر تو بھی وہی ہے تو بہاٗالدین نے یہ منتخب اور معیاری چیز اپنے لیے کیوں الگ کر لی؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''حضور والا! اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

بادشاہ نے بہاٗالدین سے کہا۔ ''میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں بہاٗالدین، میرے ہر سوال کا تو جواب دے گا، صرف تو۔''

بہاء الدین بادشاہ کے قدموں میں گر گیا، روتے ہوئے کہا۔ ''حضور! اس پر میرا دل آ گیا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے لیے الگ کر لیا تھا۔''

بادشاہ نے خفگی سے کہا۔ ''یہ تو نے ایک سنگین جرم کیا ہے، اس نوعیت کا جرم، جو جنگل کا کوئی بھی جانور شیر کے خلاف کر سکتا ہے، جنگل کے جانوروں کو پس خوردہ کھانے کا حق تو ہوتا ہے لیکن یہ حق قطعی نہیں ہوتا کہ وہ شیر سے پہلے اپنے حصہ الگ کر لیں، اگر کوئی جانور غلطی سے ایسا کرتا ہے تو شیر اسے اس کی اس جسارت کی بدترین سزا دیتا ہے، میں بھی تجھے سزا دے سکتا ہوں، بول تجھے کیا سزا دی جائے؟''

بہاٗالدین نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''حضور والا رحم، جہاں پناہ رحم۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''بہاؤالدین! اب میں اس گھر میں نہیں رکوں گا مجھے یہاں بوئے بے وفائی اور ریاکاری محسوس ہو رہی ہے، اب میں واپس قصر ہزار ستون جانا چاہتا ہوں۔''

بہاٗالدین نے عرض کیا۔ ''حضور بادشاہ ہیں، میں حضور کے ارادوں میں کس طرح مخل ہو سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''یہ عورت میرے ساتھ جائے گی، صبح دربار میں تیری حاضری ضروری ہے، میں وہاں تیرا......''

بہاء الدین نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''جناہ پناہ! جو سزا دینا ہے یہیں دے لیجیے، محل کے اندر سزا دینے کا مقصد یہ ہوگا کہ حضور مجھے......''

بادشاہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''مقصد میں متعین کروں گا یا تو کرے گا۔ میں بادشاہ ہوں اور تو میرا حقیر دبیر۔''

بہاٗالدین رونے لگا اور بادشاہ اتنا مکدر ہوا کہ وہ ماہ

رخ کو لے کر اسی وقت قصر ہزار ستون چلا گیا۔ ماہ رخ ایک حسین ترین عورت تھی اور بادشاہ کو رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ آخر بہا الدین کو اتنی جرأت کیونکر ہوئی کہ اپنے لیے ماہ رخ کو الگ کرلے، اس نے فیصلہ کرلیا کہ بہا الدین کو اتنی عبرتناک سزا دی جائے گی کہ بہتوں کو نصیحت حاصل ہو۔

☆☆☆

خسرو خان کو پالکیوں میں بٹھا کر سات دن میں دہلی پہنچا دیا گیا۔ بادشاہ اس کے فراق میں تڑپ رہا تھا۔ ابھی وہ پالکی سے اترا بھی نہ تھا کہ بادشاہ کو اس کی آمد کی خبر ہوگئی۔ وہ ننگے پیر بھاگتا ہوا خسرو خان کی پالکی تک پہنچ گیا۔ ایک خواجہ سرا نے بادشاہ کی جوتیاں اٹھائیں اور دوڑ کر بادشاہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

خسرو خان پالکی سے اتر کر بادشاہ سے چمٹ گیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

بادشاہ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور بڑی محبت سے پوچھا۔ ”یہ رونا کیسا خسرو خان، اب تو دور جدائی بیت گیا۔ مجھے دیکھ آج میں کتنا خوش ہوں۔“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”حضور والا! میں اس لیے نہیں رو رہا کہ مجھے جدائی نے عاجز اور پریشان کردیا تھا بلکہ رونا اس بات کا ہے کہ حضور کی مہربانیوں اور نوازشوں کا مجھے لوگ یہ صلہ دے رہے ہیں کہ میں تمام چھوٹے بڑے امرا کا محسود ہوگیا ہوں اور لوگ حضور کو میری طرف سے بدظن کر رہے ہیں، ان حالات میں، میں کب تک جیوؤں گا، کب تک اپنی جان بچاؤں گا۔“

بادشاہ نے خواجہ سرا سے جوتی لی اور اسے پہنتے ہوئے بولا۔ ”یہ ساری باتیں اندر چل کر ہوں گی اور اطمینان سے ہوں گی اور میں تیری جملہ شکایات کا ازالہ کروں گا، تو کیوں گھبراتا ہے؟“

خسرو خان اب بھی رو رہا تھا، بادشاہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”خسرو خان! تو ناحق رو رہا ہے، جب میں تجھے یہ یقین دلا رہا ہوں کہ تیری جملہ شکایات کا ازالہ کر دیا جائے گا، تب پھر اس رونے دھونے کا فائدہ؟“

خسرو خان نے عرض کیا۔ ”میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک حضور یہ وعدہ نہیں کریں گے کہ جن جن امرا نے مجھے ستایا ہے اور مجھے ذہنی اور روحانی اذیتیں دی ہیں حضور انہیں معاف نہیں کریں گے۔“

بادشاہ نے خوشامد کی۔ ”لے بھائی خسرو خان! میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں اب تو من جا، اب تو راضی ہوجا۔“

خسرو خان نے کہا۔ ”حضور والا! اس وقت تک میری طبیعت قابو میں نہیں آئے گی جب تک حضور میری پوری روداد نہ سن لیں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اچھا تو میرے ساتھ اندر تو چل، وہیں ساری باتیں ہوجائیں گی۔“

خسرو خان بادشاہ کے ساتھ قصر ہزار ستون کی بالائی منزل پر چلا گیا۔

بادشاہ ایک عرصہ سے خسرو خان کے فراق میں جل رہا تھا اور اب جبکہ خسرو خان اس کے خلوت کدے میں موجود تھا، اس کے لیے صبر و تحمل بے معنی تھا۔

خسرو خان بادشاہ کی آغوش میں دبک کر عورتوں کی طرح ناز و نخرے دکھانے لگا، آنسو بہاتے اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”جانِ خسرو! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کردیجیے، کیونکہ اس سے یہ بہتر ہے کہ دوسرے قتل کردیں، ان سے پہلے آپ ہی کیوں نہ ہلاک کردیں۔“

بادشاہ نے نشہ کی کیفیت میں جواب دیا۔ ”تجھے قتل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں خودکشی کرلوں، آخر بات کیا ہے، ذرا تفصیل سے بتا تاکہ میں ان کی شکلیں دیکھ لوں جو تیرے درپے آزار ہیں۔“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ مملکت کے جو امیر علائی عہد سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنی جاں نثاریوں اور وفاداریوں پر کچھ زیادہ ہی نازاں ہیں، انہی میں ملک تمر اور ملک تلیغہ کا بھی شمار ہوتا ہے، ان دونوں نے میری زندگی دوبھر کردی۔ ان دونوں امرا کا چونکہ فوج پر بھی خاصا اثر ہے اس لیے ان دونوں نے میرے بیشتر احکامات کو بے اثر بنا دیا۔ فوج ان کے احکامات مانتی رہی اور مجھے بالکل بے کار اور نکما کر کے رکھ دیا۔ اگر حضور مجھے یاد نہ فرما لیتے تو یہ دونوں مجھے قید میں ڈال دیتے اور اس کے بعد معلوم نہیں میری کیا درگت بناتے۔“

بادشاہ نے کیف و مستی میں پوچھا۔ ”اب تو کیا چاہتا ہے؟“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”صرف دو باتیں۔“

”کون کون سی؟“

”پہلی تو یہ کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ایک فوج تیار کروں، شاہی فوج میری پروا نہیں کرتی اور نہ ہی میں اسے اپنے حکم پر چلا سکتا ہوں، لیکن اگر میری فوج میں میری قوم گجرات کے لوگ ہوں گے تو وہ میرے ہر حکم کی بخوشی تعمیل کریں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اچھا جا، میں نے اس کی اجازت دے دی، دوسری بات؟ دوسری خواہش؟“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”دوسری خواہش یہ ہے کہ میں چونکہ کئی کئی دن اور راتیں حضور کے عشرت کدے میں گزارتا ہوں اور حضور کے تصرف اور تعیش فرمانے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا، اس لیے حضور میرے بعض ہم وطنوں اور رشتہ داروں کو محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں، اس طرح مجھے یہ سہولت حاصل ہوجائے گی کہ وہ جب بھی مجھ سے ملنا چاہیں گے مل لیا کریں گے، کیونکہ ان میں سے اکثر ہفتوں میری ملاقات کو ترستے رہتے ہیں۔“

بادشاہ نے ترنگ میں جواب دیا۔ ”جا تیری یہ دوسری خواہش بھی منظور، محل کا ایک حصہ ان لوگوں کے لیے خالی کردیا جائے گا۔“

چند دنوں بعد ملک تمر اور ملک تلیغہ اپنی افواج سمیت دہلی میں داخل ہوگئے، بادشاہ نے ان دونوں کو اپنے روبرو طلب کیا اور درشت لہجے میں پوچھا ”تم لوگوں نے خسرو خان کی اطاعت کیوں نہیں کی؟“

ملک تمر نے ملک تلیغہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حضور والا! ملک تلیغہ سے پوچھ لیا جائے، خسرو خان بغاوت کے منصوبے بنا رہا تھا اور اگر ہم لوگ باخبر نہ رہتے تو آج یہ شخص دہلی سے پشاور تک اور پشاور سے دریائے ہنگلی تک بے خطر حکومت کر رہا ہوتا۔“

بادشاہ نے غصے میں ملک تمر کی ساری جائداد خسرو خان کے حوالے کردی اور اس کا عہدہ کم کردیا لیکن ملک تلیغہ کو خسرو خان سے تھپڑ لگوائے اور اس کی ساری جائداد ضبط کر کے ملک تلیغہ کو قید میں ڈال دیا۔

خسرو خان کو جب یہ معلوم ہوا کہ بہا الدین دبیر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے تو اس نے بہا الدین کی سفارش کی اور اسے رہائی دلوا کر اس کے گھر روانہ کردیا۔ بہا الدین نے خسرو خان کا بڑا احسان مانا اور وعدہ کیا کہ زندگی میں جب کبھی خسرو خان کو بہا الدین کی ضرورت پیش آجائے گی وہ اپنی جان دے کر اس کی مدد کرے گا۔

دوسری طرف خسرو خان نے یہ کیا کہ اپنے ہم وطنوں کی زبردست فوج تیار کرڈالی اور اس فوج کے منتخب بہادروں کو اپنا عزیز رشتہ دار ظاہر کر کے قصر ہزار ستون ہی میں ٹھہرا لیا۔ ان میں جاہریا بھی شامل تھا جو بادشاہ کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور وہ ہندو بھی جو نائب ملک کافور کے ساتھ تھے اور اس کے قتل کے بعد خسرو خان سے مل گئے تھے۔

اب یہ سب لوگ راتوں کو قصر ہزار ستون میں گھومتے پھرتے رہتے۔

رات کے پچھلے پہر جب خسرو خان بادشاہ کے کمرے سے نکل کر نیچے اترا تو اس نے ایک جگہ جاہریا کو گم صم کھڑے دیکھا، وہ زمین کے فرش پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ خسرو خان لنگڑاتے ہوئے جاہریا کے قریب جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”جاہریا! یہ تو یہاں کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟“

جاہریا نے جواب دیا۔ ”خسرو خان! میں اس جگہ کو دیکھ رہا ہوں جہاں اپنے ملک کافور کا سر کاٹ کر پھینکا گیا تھا۔“ وہاں خون کے سیاہی مائل دھبے اب بھی موجود تھے، جاہریا نے ادھر ادھر دیکھ کر خون کے دھبوں کو بوسہ دیا اور کہا۔ ”ملک کافور! اب وقت آگیا ہے کہ تیرے خون کا بدلہ لے لیا جائے۔“ پھر اس نے خسرو خان سے کہا۔ ”کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ مجھے اس حصے کی بھی زیارت کرادی جائے جہاں ہمارے بہادر سردار کو ذبح کیا گیا تھا۔“

خسرو خان نے جواب دیا۔ ”میں وہ جگہ بھی دکھا دوں گا، وہ اوپر منزل میں ہے اور شاید وہاں خون کے سیاہ دھبے اب بھی موجود ہوں گے، میں اس جگہ کی زیارت تم کو ضرور کراؤں گا۔“

جاہریا نے جذباتی آواز میں کہا۔ ”تب پھر میں یہ دعویٰ بھی کرسکتا ہوں کہ کچھ بھی ہو، میں ملک کافور کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

خسرو خان نے ”شی“ کر کے خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا اور پھر سرگوشی میں کہا۔ ”یہ تو پاگل کیوں ہوا جا رہا ہے، اگر کسی نے ہماری یہ باتیں سن لیں تو معلوم نہیں اس کا کیا نتیجہ نکلے، اس لیے ذرا احتیاط کر۔“

جاہریا نے طنزاً کہا۔ ”استاد خسرو خان! جب تک بادشاہ تیرا...... عاشق ہے، ہماری یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

خسرو خان نے کہا۔ ”بادشاہ کا استاد قاضی خان کہاں ہے، کیونکہ محل کی کنجیاں اسی کے پاس رہتی ہیں اور وہ کہیں بھی موجود ہوسکتا ہے اور ہماری باتیں سن سکتا ہے۔“

جاہریا نے جواب دیا۔ ”خسرو خان! تو قاضی خان کی بھی فکر نہ کر، اس کو تو میں بادشاہ سے پہلے ہی نرکھ کی سیر کرادوں گا۔“

خسرو خان نے کہا۔ ''اچھا اب آرام کر، تو بولتا بہت زیادہ ہے اور زیادہ بولنا اچھی عادت نہیں ہے۔''

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو وہیں کہیں داستان گو ابوالحسن بھی موجود تھا۔ خسرو خان کے جاتے ہی بادشاہ پر بے خوابی کا دورہ پڑا۔ اس نے دل بہلانے کے لیے داستان گو ابوالحسن کو طلب کر لیا۔ راستے میں جب اس نے خسرو خان اور جاہریا کی باتیں سنیں تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بادشاہ کے پاس پہنچ تو گیا، لیکن خسرو خان اور جاہریا کی سازش کا انکشاف کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''ابوالحسن! میری نیند اڑ گئی ہے اور میں بے خوابی میں مبتلا ہو گیا ہوں، اس لیے کوئی ایسی داستان سنا جو لوری کا کام بھی دے۔''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میرے پاس داستانوں کی تو کوئی کمی نہیں، ایک سے ایک رنگین داستان میرے ذہن میں کلبلا رہی ہے لیکن اس وقت میں ایک بار پھر اسدالدین جیسی سازش سے مطلع کرنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ سہم گیا، پوچھا۔ ''اب میرے خلاف کون سازش کر رہا ہے؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں بتانے کو تو سب کچھ بتا سکتا ہوں لیکن ڈرتا اس بات سے ہوں کہ حضور اس پر یقین نہیں فرمائیں گے اور میں خود اس سازش کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ پیش کر سکوں گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''تو بتا تو سہی، مجھے تیری وفاداری پر یقین ہے۔''

ابوالحسن نے خسرو خان اور جاہریا کی جو گفتگو سنی تھی، بادشاہ کے گوش گزار کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اتنا بڑا انکشاف ہے جس پر بادشاہ دنگ رہ جائے گا اور قصر ہزار ستون میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا لیکن اس نے دیکھا کہ بادشاہ اس کی باتوں پر بے اختیار ہنس رہا تھا۔

بادشاہ نے ہنستے ہنستے دم لے کر کہا۔ ''ابوالحسن! یقیناً تو بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے، خسرو خان اپنے ساتھی سے مذاق کر رہا ہوگا، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ خسرو خان میرا محبوب ہے میں اس پر سب سے زیادہ اعتبار کرتا ہوں۔ خبردار جو تو نے آئندہ کبھی اس کی مجھ سے کوئی شکایت کی۔ خسرو خان سے سبھی حسد کرتے ہیں، کیا اب تو بھی ان حاسدوں میں شامل ہو گیا؟''

ابوالحسن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''ہو سکتا ہے مجھ سے غلط فہمی ہوئی ہو اور وہ آپس میں مذاق ہی کر رہے ہوں۔ خدا کرے یہی ہو۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا اب ایک پرلطف داستان سنا تاکہ میری بے چینی دور ہو۔''

ابوالحسن نے ایک داستان چھیڑ دی اور نصف ساعت بعد ہی بادشاہ خراٹے لینے لگا۔

☆☆☆

کئی دن بعد محل کے کلید بردار اور بادشاہ کے خطاطی کے استاد قاضی خان نے بھی خسرو خان کی شکایت کی اور کہا۔ ''حضور والا! یہ لوگ حضور کے خلاف کوئی زبردست سازش کر رہے ہیں۔''

بادشاہ نے منہ پھیر کر پوچھا۔ ''اس کا کوئی ٹھوس ثبوت؟''

قاضی خان نے جواب دیا۔ ''اس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ خسرو خان نے اپنے جن عزیزوں اور ہم قوموں کو قصر میں ٹھہرایا ہے وہ ہر وقت مسلح رہتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر بڑی دلیری سے آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔''

بادشاہ نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ کوئی دلیل نہیں۔''

قاضی خان نے عرض کیا۔ ''حضور والا! یہ جو کچھ میں نے عرض کیا۔ اگر یہ سازش کسی طرح کامیاب ہو گئی تو اس کا سب سے زیادہ نقصان حضور کی ذات اور حضور کے خاندان کو پہنچے گا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، حضور اس کی تفتیش ضرور فرما لیں۔''

بادشاہ ایک دم برہم ہو گیا، بولا۔ ''قاضی خان! تو خطاطی میں میرا استاد رہ چکا ہے، میں تیرا احترام کرتا ہوں لیکن اب یہ احترام ختم کرتا ہوں اور تجھے حکم دیتا ہوں کہ آئندہ خسرو خان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا۔''

قاضی خان نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''بندہ پرور! میں نے آپ کے والد مرحوم کا دور بھی دیکھا ہے، آپ کے والد کی آگہی کا یہ حال تھا کہ کسی امیر کے گھر کا حال تک ان سے مخفی نہ ہوتا تھا، چہ جائیکہ محل کے اندر ہی سازش ہو رہی ہو اور بادشاہ کو اس کی خبر نہ ہو۔''

بادشاہ نے قاضی خان کو ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ ''قاضی خان! تیری خیریت اسی میں ہے کہ اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ میں خسرو خان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا، اگر آئندہ تیری زبان سے کوئی ایسی بات سنی تو میں تیرے خلاف سازش کا مقدمہ قائم کر دوں گا۔''

قاضی خان نے دلیری سے کہا۔ ''اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

اتفاق کی بات کہ اسی وقت خسرو خان بھی آ گیا، وہ بہت بن سنور کر آیا تھا، بادشاہ نے قاضی خان کو روک لیا۔ ''قاضی ذرا رکنا تو۔''

قاضی خان رک گیا۔ بادشاہ نے ساری باتیں خسرو خان کو بتا دیں اور کہا۔ ''خسرو خان! اس وقت اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ تیرے خلاف ہو جاتا لیکن میں نے اس بوڑھے کو ڈانٹ کر متنبہ کر دیا کہ اگر اس نے آئندہ ایسی حرکت کی تو سازش میں اسے قتل کرا دوں گا۔''

خسرو خان بادشاہ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ ''حضور والا! اس طرح میں کب تک محفوظ رہوں گا، میری مثال اس نرم و نازک اور کمزور پودے جیسی ہے جو تند و تیز آندھی کے جھکڑوں میں اپنی بقا کی جدوجہد کر رہا ہو، ساری بادشاہت میری مخالف ہے، جملہ امرا میرے دشمن ہیں، خدا معلوم یہ چاہتے کیا ہیں اور مجھے قتل کروا کے معلوم نہیں کیا پا جائیں گے؟''

بادشاہ نے خسرو خان کو قدموں سے اٹھا لیا، بولا۔ ''ان حاسدوں سے تو کیوں ڈرتا ہے؟''

قاضی خان اس حیا سوز نظارے کی تاب نہ لا سکا اور چلا گیا۔

خسرو خان نے بادشاہ سے دریافت کیا۔ ''کیا حضور آج رات مجھے بلائیں گے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''کیوں نہیں، بالکل، کیا تو جانتا نہیں کہ میں تیری موجودگی میں کسی اور سے دل نہیں بہلا سکتا۔''

خسرو خان نے درخواست کی۔ ''تب پھر حضور مجھے اتنی مہلت ضرور دیں کہ میں اپنے چند مہمانوں کو مطلع کر آؤں کہ وہ میرا انتظار نہ کریں، میں رات حضور کی صحبت میں گزاروں گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن شرط یہ ہے کہ تو فوراً ہی واپس آئے گا۔''

خسرو خان نے جاتے ہوئے کہا۔ ''حضور کا حکم سر آنکھوں پر، بس ابھی حاضر ہوا۔''

خسرو خان بالائی منزل سے نیچے اترا اور جاہریا کو تلاش کرنے لگا جب وہ مل گیا تو اس نے سرگوشی میں جاہریا کو سمجھایا۔ ''دیکھ جاہریا، اب وقت نہیں رہ گیا، تو نے کچھ اور سنا، محل کا کلید بردار قاضی خان بادشاہ سے ہم سب کی چغلی کھا رہا تھا، بادشاہ سے پہلے اس کا کام تمام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔''

جاہریا نے جواب دیا۔ ''خسرو خان! تو فکر نہ کر، یہ کام بھی ہو جائے گا۔''

خسرو خان بادشاہ کے پاس واپس گیا، بادشاہ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور والہانہ کہنے لگا۔ ''عزیز از جان خسرو خان! تو نے معلوم نہیں مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ... میں ہر وقت تیرے ہی نام کا ورد کرتا رہتا ہوں، معلوم نہیں کیوں۔''

خسرو خان نے جواب دیا۔ ''جی دیکھ لیا...... لیکن میں اب بھی اس چالاک آدمی سے خوفزدہ ہوں، معلوم نہیں کس وقت اس کی چغلی کارگر ہو جائے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''کیا تو ابھی تک اپنی اس قدر و قیمت سے لاعلم ہے، جس کا میں نے اپنے دل میں تعین کر رکھا ہے، مختصراً میں یہی کہوں گا کہ تیرے ایک بال پر میں اپنی پوری سلطنت نثار کر سکتا ہوں۔''

اسی وقت جاہریا نے دھوکے سے قاضی خان کو قتل کر دیا، اس کی مدد پر محل سرا کے سارے لوگ موجود تھے جنہوں نے خود کو بادشاہ کے در کی نگہبانی پر تعینات کر رکھا تھا، قاضی خان کے قتل سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، بادشاہ نے خسرو خان سے پوچھا۔ ''یہ شور و غل کیسا ہو رہا ہے؟''

خسرو خان نے بہ حالت برہنگی عرض کیا۔ ''اگر حضور اجازت دیں تو حقیقت حال معلوم کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''ضرور جا اور اصل واقعہ کا پتا چلا۔''

خسرو خان نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا، وہ کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا، پھر واپس جا کر بادشاہ سے عرض کیا۔ ''حضور والا ایک گھوڑا بدک گیا ہے، اب وہی بھاگا پھر رہا ہے، لوگ اس کو پکڑنے کی فکر میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔''

لیکن بادشاہ نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ قاضی خان کو قتل کر کے جاہریا اپنے ہم قوموں کو ساتھ لے کر بالائی منزل پر چڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بالائی منزل خسرو خان کے ہم قدموں سے بھر گئی۔ بادشاہ کی سمجھ میں فوراً یہ بات آ گئی کہ بغاوت ہو گئی ہے، ننگ دھڑنگ بادشاہ حرم سرا کی طرف بھاگا، خسرو خان نے سوچا کہ اگر بادشاہ کسی طرح حرم سرا میں داخل ہو گیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور پھر بادشاہ کا ہاتھ آنا ناممکن ہوگا۔ خسرو خان بے تحاشا بادشاہ کے پیچھے دوڑا اور پیچھے سے بادشاہ کے پٹھے پکڑ لیے، بادشاہ خسرو خان سے زیادہ صحت مند تھا۔ اس نے خسرو خان کو زمین پر گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا لیکن خسرو خان

نے بھی بادشاہ کے بال نہیں چھوڑے۔

اسی وقت جاہریا قاضی خان کے خون میں تر تلوار لیے ہوئے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے آس پاس اس کے ہم قوموں کا جمگھٹا تھا اور یہ سارے ہی ہتھیاروں سے لیس تھے، خسرو خان نے جاہریا کو دیکھتے ہی چیخ کر کہا۔ ''جاہریا! میں ادھر ہوں بادشاہ کے نیچے۔''

جاہریا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ابھی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ خسرو خان نے بڑی بے چینی سے کہا۔ ''جاہریا! فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کر، تبر کا نپا تلا ہاتھ بادشاہ کے لگا تاکہ میں اس کی گرفت سے آزادی حاصل کرسکوں۔''

بادشاہ نے غصّے سے کہا۔ ''کمبخت، احسان فراموش، تو تو یہ ہے بدذات کمینے۔''

خسرو خان نے جاہریا کو ڈانٹا۔ ''بدبخت جاہریا! تو خوامخواہ مجھے گالیاں سنوا رہا ہے، آخر اس کا کام تمام کیوں نہیں کرتا۔''

جاہریا نے جواب دیا۔ ''میں اگر اس کمین بادشاہ کو تبر ماروں گا تو اس سے تو بھی زخمی ہو جائے گا۔''

خسرو خان نے کہا۔ ''تو میری پروا نہ کر اور اپنا کام کر۔''

جاہریا نے بڑی ہوشیاری سے تبر کا بھرپور وار بادشاہ کے سینے پر لگایا، بادشاہ کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ خسرو خان کے اوپر سے لڑھک کر ایک طرف گر گیا۔

کئی گجراتیوں نے مشورہ دیا۔ ''اسے وہیں اسی جگہ گھسیٹ کر لے چلو، جہاں ہمارے ہم قوم نائب ملک کافور کو قتل کیا گیا تھا۔''

جاہریا نے بادشاہ کی زلفوں کو ہاتھ میں لپیٹ لیا اور اس جگہ گھسیٹ لے گیا، جہاں نائب ملک کافور کو قتل کیا گیا تھا اور اس جگہ خون کے دھبے اب بھی موجود تھے، زخمی بادشاہ نے نیم مدہوشی میں اپنے سامنے بہت سے آدمیوں کو تماشائی کی طرح ہنستے دیکھا، ان میں بہاالدین دبیر بھی شامل تھا۔

بادشاہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''بہاالدین تم بھی؟''

بہاالدین نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں بھی، وہ عورت کہاں ہے؟''

لیکن بادشاہ نے ابھی کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ جاہریا کا تبر بادشاہ کی گردن پر گرا اور اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ جاہریا نے کٹا ہوا سر اٹھا لیا اور ایک ہم قوم سے کہا۔ ''جا، تو نیچے چلا جا اور ٹھیک اس جگہ کھڑا ہو جا، جہاں ہمارے ملک کافور کا سر گرا تھا۔ میں بادشاہ کا سر بھی وہیں پھینکنا چاہتا ہوں۔''

وہ شخص بھاگا بھاگا نیچے پہنچا اور ایک جگہ پیر پٹختے ہوئے بولا۔ ''یہاں یہاں، اس جگہ۔''

جاہریا نے بادشاہ کا سر ٹھیک اسی جگہ پھینک دیا۔

اس کے بعد خسرو خان اور جاہریا حرم سرا میں گھس گئے اور شاہی خواتین کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ بادشاہ کی بیوی کو خسرو خان نے اپنے قبضے میں کیا۔ دوسری خواتین اور کنیزوں کو اپنے ہم قوموں میں تقسیم کر دیا۔ پھر خسرو خان نے اسی رات امرا کو ان کے گھروں سے بلوا لیا اور ان سب کو قصر ہزار ستون میں قید کر دیا گیا، بعض کو قتل کر دیا، اس نے دوسرے دن اپنی بادشاہ کا اعلان کر دیا اور اپنے نام میں ناصر الدین کا اضافہ کر لیا۔ اپنے ماموں راندھول کو رائے رایاں کا خطاب دیا، اپنے بھائی حسام الدین کو خان خاناں اور بہاالدین دبیر کو اعظم الملک کے خطابات سے نواز دیا۔

جاہریا کو زر و جواہر سے لاد دیا گیا۔

معلوم نہیں کس طرح خسرو خان کو داستان گو ابوالحسن کا علم ہو گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسدالدین کی سازش کو اسی داستان گو نے ناکام بنا دیا تھا اور یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس داستان گو نے خسرو خان کے خلاف بھی بادشاہ کو خبریں پہنچائی تھیں۔ جب خسرو خان کے آدمی داستان گو کی تلاش میں اس کی قیام گاہ میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ بھی نہ ملا، ہاں کمرے کی ایک دیوار پر کوئلے سے کسی نے لکھ دیا تھا۔

''اے ابوالحسن! اب تو اس دیار سے کوچ کر، کیا تیرے جیسے غیرت مند کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ کل تک جس تخت شاہی پر التمش، غوری اور خلجی بیٹھا کرتے تھے، آج وہ ایک ایسے شخص کے قبضے میں آ گیا ہے جو کل تک مابون، مفعول اور زیر خجب تھا۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!''

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فرشتہ، ابوالقاسم فرشتہ۔ آئینہ حقیقت نما، اکبر شاہ نجیب آبادی۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبدالمجید سالک۔ عجائب الاسفار، ابن بطوطہ۔ خلاصۃ التواریخ، سجان رائے بٹالوی۔

خون کا رشتہ

کاشف زبیر

یعض رشتے بہت بڑی آزمائش بناکر دنیا میں اتارے جاتے ہیں، وہ بھی ایک ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا جس سے اپنایت کا اظہار اذیت ناک عمل بن جاتا تھا۔ وہ جو خوف و دہشت کی علامت تھا مگر پوری دنیا میں کوئی ایک ایسا بھی تھا جس سے وہ خود خوف زدہ ہوجاتا... اور یہ منظر ہمیشہ دیکھنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا تھا، جس کا پس منظر اس کے بالکل برعکس تھا۔ گویا جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو... ہوتا ہے وہ نظر آتا نہیں۔

مغربی معاشرے میں مجرمانہ کارروائیوں کا

منفرد انداز

کار برف سے صاف سڑک پر تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ سڑک کے اطراف میں برف کا ڈھیر بتا رہا تھا کہ موسم سرما کا آغاز کتنے شدید انداز میں ہوا تھا۔ امریکا کی شمالی ریاستوں میں نومبر کے پہلے ہفتے سے برف باری کا سلسلہ جاری تھا۔ محکمۂ موسمیات کے مطابق آنے والے چوبیس گھنٹے میں درجۂ حرارت مزید گرنے کا امکان تھا۔ اس وقت بھی آسمان پر گہرے بادل تھے۔ کار کے اگلے حصے میں ایڈورڈ اور روز جیراڈ تھے۔ ڈرائیونگ جیراڈ کر رہا تھا۔ پچھلی نشست پر جیسکا تھی۔ ایڈورڈ عرف ایڈ نے مڑ کر دیکھا۔ ''ہمیں کل تک بہر صورت سرحد پار کرنی ہے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔'' روز نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ ''خاص طور سے چوری کی کار میں۔''

''کار ہم جنگل میں چھوڑ دیں گے اور باقی راستہ پیدل طے کریں گے۔''

ایڈ اور جیسی کینیڈا کے شہری تھے جبکہ جیراڈ امریکی تھا۔ صرف چھ گھنٹے پہلے انہوں نے صبح آٹھ بجے ریاست وسکونسن کے دارالحکومت میڈیسن کے گولڈ مین بینک میں ڈاکا ڈالا تھا اور وہاں سے تقریباً پانچ ملین ڈالرز کی رقم لوٹ لی تھی۔ ڈاکا نہایت کامیاب رہا تھا۔ انہوں نے صرف پانچ منٹ میں اپنا کام کیا اور اس سے پہلے کہ پولیس علاقے کو بلاک کرتی وہ میڈیسن سے نکل گئے تھے۔ جس کار میں ڈاکا ڈالا تھا وہ چوری کی تھی اور اب وہ جس کار میں کینیڈا کی سرحد کی طرف جارہے تھے وہ بھی چوری کی تھی لیکن جب تک کوئی پولیس والا انہیں نہ روکتا اس کا پتا نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ یہ منصوبہ جیراڈ کا تھا۔ وہ میڈیسن کا رہنے والا تھا۔ طے پایا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ بھی ان دونوں کے ساتھ کینیڈا جائے گا اور وہاں اس وقت تک رکے گا جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوجاتا۔ اس کا حصہ چالیس فیصد تھا جبکہ ایڈ اور جیسی کے حصے میں ساٹھ فیصد یعنی تین ملین ڈالرز کی رقم آتی۔ جیسی عقبی نشست پر بیٹھی ہوئی رقم گن رہی تھی اس میں الگ الگ نوٹ بھی تھے، وہ انہیں گڈیوں کی صورت دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک ملین ڈالرز الگ الگ بنڈل بنا کر دو بیگوں میں رکھ رہی تھی اور چار ملین ڈالرز تیار ہوچکے تھے۔ جیسی پانچواں ملین تیار کررہی تھی۔ نوٹوں کی گڈیاں ترتیب سے سیٹ پر رکھی تھیں۔

''اگر سرحد پر چیکنگ سخت ہوئی تو...؟''

''میں نے کہا، تاہم باقاعدہ چیک پوسٹ سے سرحد کراس نہیں کریں گے۔'' ایڈ نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا سخت نقوش والا شخص تھا۔ جیراڈ جوان تھا، وہ اٹھائیس سے زیادہ کا نہیں تھا اور اس کے چہرے پر نرمی تھی۔ جیسی مشکل سے چوبیس سال کی تھی اور وہ بہت حسین لڑکی تھی، خاص طور پر اس کے نقوش اور بلوری آنکھیں دیکھنے والے کو سحر زدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس نے اس موسم میں بہت مختصر سا اور تقریباً نہ ہونے کے برابر لباس پہن رکھا تھا۔ اوپر سے اس نے اونی شال لے رکھی تھی مگر کار سے باہر یہ لباس نہیں چل سکتا تھا کیونکہ باہر درجۂ حرارت منفی میں تھا اور قیامت خیز ہوا چل رہی تھی جس کے ساتھ روئی کے گالے جیسی برف اڑ رہی تھی۔

جیراڈ نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو اس کی نظر جیسی کی ٹانگوں کی طرف گئی اور اسے واپس سڑک کی طرف توجہ دینے میں ذرا تاخیر ہوئی۔ جب اس نے سامنے دیکھا تو وہ ہرن بالکل سامنے آگیا تھا اور بچنے کا موقع نہیں تھا۔ کار نے تقریباً سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے ہرن کو ٹکر ماری اور وہ اچھل کر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور اس پر جال ڈال دیا۔ وسط میں اس کے خون کا بڑا سا دھبا آگیا۔ اب ونڈ اسکرین کے دوسری طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جیراڈ نے بے ساختہ اسٹیئرنگ کاٹا تھا اور کار اس رفتار پر قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ کار سڑک سے اتر کر کنارے پر جمع برف پر چڑھی اور پھر ہوا میں اچھلتی ہوئی دوسری طرف گری۔ اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور آخر میں الٹی ہو کر رک گئی۔

☆☆☆

جے آرتھر ڈگلس جیل سے باہر آیا تو اس نے چھ مہینے بعد آزاد فضا میں سانس لیا تھا۔ چھ مہینے پہلے وہ قومی ہیرو تھا، اس نے بیجنگ اولمپک میں ہیوی ویٹ کلاس باکسنگ میں کانسی کا تمغہ لیا تھا مگر پھر اس کا ایک بار میں چند لفنگوں سے جھگڑا ہوا اور اس کے گھونسے نے ایک آدمی کو تقریباً موت کے گھاٹ اتار دیا تاہم اس کی جان بچ گئی تھی، بعد میں ثابت ہوا کہ جھگڑے میں ان لفنگوں کا ہاتھ تھا اس کے باوجود جے کو چھ مہینے جیل میں گزارنا پڑے تھے۔ اس کے قومی ہیرو ہونے کی وجہ سے اسے صرف چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی لیکن یہ چھ مہینے اس کے کیریئر پر سوالیہ نشان لگا گئے تھے۔ وہ پروفیشنل باکسنگ میں داخل ہونے کی تیاری کررہا تھا اور اس واقعے کے وقت اس کی پہلی باؤٹ طے ہوچکی تھی۔ اس کا کوچ اور منیجر کلی جوزف میڈیسن میں ایک جم چلاتا تھا درحقیقت اسی کی کوشش سے جے اس مقام پر پہنچا تھا مگر جیسے ہی جے پر مشکل آئی اس نے آنکھیں پھیر لیں اور دوبارہ اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کے ذمے جے کی کچھ رقم نکلتی تھی اور اس کا اولمپک تمغہ بھی اسی کے پاس تھا۔

جے کا ڈوج ٹرک جیل کے باہر پارکنگ میں موجود تھا۔ ایک پولیس والے نے اسے چابی دی۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو ٹرک کے پیچھے اس کا سامان بھی رکھا ہوا تھا، وہ گھر جا رہا تھا۔ وہ جیل سے روانہ ہوا تو موسم نہایت خراب تھا، ہوا میں برف کے ٹکڑے تھے جس کی وجہ سے اسکرین پر بار بار برف جم رہی تھی اور اسے وائپر چلانا پڑ رہا تھا۔ نو بجے وہ میڈیسن شہر میں تھا۔ کلی کے جم جانے سے پہلے اس نے ایک فون بوتھ سے گھر کال کی۔ کال اس کے باپ نے ریسیو کی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''پاپا یہیں ہیں جینا۔''

''جے۔'' اس کے باپ کلارک نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''بیٹے کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں پاپا۔'' وہ بولا مگر چاہنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ وہ گھر آنا چاہتا ہے۔ وہ چپ ہو گیا، کلارک نے کہا۔

''لو اپنی ماں سے بات کرو۔''

''جے، میری جان... میرے بیٹے کیسے ہو تم؟'' باپ کے برعکس ماں کے لہجے میں گرم جوشی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں کل آرہا ہوں۔''

''سچ میں۔'' جینا خوش ہوگئی تھی۔ ''کل تھینکس گیونگ ڈے بھی ہے۔''

''ماما، کیا پاپا کو میرا آنا ٹھیک لگے گا؟''

جینا کا لہجہ مدھم ہوگیا۔ ''جے وہ تم سے خفا ہیں لیکن وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''میں کل آرہا ہوں ماما۔'' جے نے کہا اور فون رکھ دیا۔

یہاں سے کلی کا جم کچھ ہی دور تھا اس لیے وہ پیدل چل پڑا۔ جم ویران نظر آرہا تھا۔ جے جانتا تھا یہاں اصل رونق شام کو ہوتی ہے۔ وہاں صرف دو باکسر رنگ میں مقابلہ کررہے تھے۔ کلی البتہ اپنے دفتر میں تھا، وہ جے کو دیکھ کر چونکا لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا۔ ''جے بوائے، کیسے ہو تم، کب چھوٹے؟''

''ابھی دو گھنٹے پہلے۔''

''تب تم بڑی تیزی سے یہاں آئے ہو۔'' وہ جا کر میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا میڈل کہاں ہے؟'' جے نے سرد لہجے میں پوچھا۔

جواب میں کلی نے میز کی دراز سے میڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جے نے اسے گلے میں پہنا اور پھر بولا۔ ''میری رقم...''

''کیسی رقم؟''

''جو تمہارے ذمے بنتی ہے۔'' جے کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ''میں نے گدھوں کی طرح یہاں بارہ بارہ گھنٹے کام کیا ہے اس کا معاوضہ...''

''اوہ، اچھا......'' کلی نے کہا اور دراز سے ایک بکس نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ''اس میں رقم ہے۔''

لیکن جیسے ہی جے نے بکس کی طرف ہاتھ بڑھایا کلی نے میز کے پیچھے سے لکڑی کا موٹا سا ڈنڈا نکال کر اس پر وار کیا۔ وار اس کے شانے پر لگا تو کلی نے اگلا وار اس کی پشت پر کیا۔ وہ نیچے گرا تو لگاتار کئی ٹھوکریں ماریں۔ کلی پچاس برس کا لیکن تنومند شخص تھا۔ ایک زمانے میں وہ پرائز فائٹر بھی رہا تھا۔ اس کے پاس کئی اچھے لڑکے تھے جنہیں وہ مستقبل کے لیے تیار کررہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ سے رقم مانگ رہے ہو... تم نے میرے جم کو بدنام کردیا۔ میں تمہیں رقم دیتا ہوں...'' اس نے جے کی پشت پر وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا تھا کہ جے نے فرش سے اٹھتے ہوئے اسے نیچے سے اپر کٹ مارا۔ اس وار کے پیچھے اس کی ساری قوت اور غصہ تھا۔ کلی ہوا میں اچھلا اس کا سر لوہے کی الماری سے ٹکرایا اور وہ فرش پر گر کر ساکت ہوگیا۔ جے سمجھا کہ وہ مکر کر رہا تھا لیکن جب اس نے اسے سیدھا کیا تو اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش تھا۔ جے کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ابھی جیل سے رہا ہوا تھا اور فوراً ہی ایک معاملے میں ملوث ہوگیا تھا۔ اس نے جلدی سے کلی کے دفتر کا فون اٹھا کر نائن ون ون ڈائل کیا اور کلی کے جم کا پتا بتاتے ہوئے وہاں ایمبولینس بھیجنے کو کہا۔ فون رکھ کر اس نے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے اور پھر تیزی سے باہر نکل آیا۔ اسے امید تھی کہ کسی نے اسے جم میں آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ واپسی اس نے پچھلے دروازے سے کی تھی۔ وہ گھوم کر اپنے ٹرک تک آیا اور فوری روانہ ہوگیا مگر اسے یقین تھا کہ کلی ہوش میں آتے ہی پولیس کو اس کے بارے میں بتائے گا اور پولیس اس کی تلاش شروع کردے گی۔

☆☆☆

جے سے بات کرکے جینا کلارک کے پاس آئی۔ ''وہ یہاں آنے کو کہہ رہا ہے۔''

''وہ پھر سے اس خاندان کا حصہ بننا چاہتا ہے۔'' کلارک کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''قطع نظر اس کے جو اس نے کیا......؟''

''وہ ہماری اولاد ہے۔'' جینا نے شوہر کا شانہ تھاما۔ ''بچوں سے غلطیاں ہوتی ہیں لیکن ماں باپ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ اس نے جو کیا وہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔''

کلارک خاموش ہوگیا تھا۔ جینا نے باہر دیکھا جہاں مسلسل برف گر رہی تھی۔ پیش گوئی تھی کہ درجۂ حرارت مزید گرے گا۔ وہ کل کے ڈنر کی تیاری کررہی تھی۔ اس موقعے پر جے کی آمد اس کے لیے سرپرائز تھی۔ اچانک باہر سے پولیس کار کا سائرن ایک لمحے کو سنائی دیا۔ کلارک، جو خاموش بیٹھا تھا، وہ چونکا اور جوش سے بولا۔ ''میری آئی ہے۔''

دونوں میاں بیوی جیکٹ اور سوئیٹر پہنتے ہوئے باہر نکلے۔ سامنے کھڑی پولیس کار سے ایک نوجوان اور خوب

صورت لڑکی یونیفارم میں اتری تھی۔ جینا نے اسے گلے لگایا۔ ''کیسی ہو تم؟''

''ٹھیک...... ماما اور آپ کیسی ہیں۔'' جینا کو پیار کرکے وہ کلارک کے گلے لگی۔ میری کا باپ پولیس میں کلارک کا ساتھی تھا۔ اب وہ اس کاؤنٹی کا شیرف تھا۔ میری ماں کے مرنے کے بعد جینا اور کلارک کے ساتھ رہی تھی۔ اس کا باپ شیرف بارنی ایک سخت گیر آدمی تھا اور میری کی اس سے کبھی نہیں بنی تھی۔ اسے میری کا پولیس میں آنا پسند نہیں آیا تھا اس لیے میری نے ایف بی آئی میں جاب کی درخواست دیدی تھی۔ جینا اور کلارک کے لیے میری بیٹی جیسی تھی۔ جے اس کا بھائی تھا۔ وہ اندر آئے، جینا نے اسے بتایا کہ جے کل آرہا ہے تو وہ خوش ہوگئی تھی۔ ''پھر تو کل ڈنر کا صحیح مزہ آئے گا۔''

جے کے ذکر پر کلارک کا چہرہ کچھ دیر کے لیے تنا لیکن پھر وہ مسکرانے لگا۔ جینا کافی بنانے لگی اور میری، کلارک کے ساتھ میز پر آگئی۔ اس نے کہا۔ ''ایک مسئلہ ہوا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟'' کلارک بولا۔

''آج صبح میڈیسن میں ایک بینک سے ڈاکو پانچ ملین ڈالرز لوٹ کر فرار ہوگئے اور ابھی کچھ دیر پہلے پولیس کو ہائی وے پر ایک حادثہ شدہ کار ملی ہے۔ اس کا ڈرائیور مر گیا ہے۔ کار چوری کی ہے اور اس میں کچھ کرنسی نوٹ ملے ہیں جو بینک سے لوٹے گئے تھے۔''

کلارک سابق پولیس والا تھا، یہ اس کے مطلب کی خبر تھی، وہ چوکنا ہوگیا۔ ''حادثہ کہاں ہوا؟''

میری نے جیب سے نقشہ نکال کر میز پر پھیلایا۔ ''یہ منی سوٹا کی حدود میں... یہاں سے کوئی پچاس کلومیٹر پیچھے۔''

''ڈاکوؤں کی تعداد کیا تھی؟''

''وہ تین تھے اور ان میں ایک لڑکی تھی۔ رقم اور دو افراد غائب ہیں جن میں لڑکی بھی شامل ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ اسی علاقے میں موجود ہیں؟''

''بالکل۔'' میری بولی۔ ''چوری کی کار میں سفر کرنے کا مطلب ہے وہ کینیڈا کی طرف جارہے تھے۔''

''بارنی کیا کر رہا ہے؟''

''انہوں نے تمام ہائی ویز پر پولیس کو چوکنا کر دیا ہے اور جنگلوں میں متلاشی پارٹیاں بھیجنے والے ہیں۔''

''تم بھی شامل ہو؟''

''نہیں، مجھے دفتر میں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔'' میری افسردہ ہوگئی۔ ''پاپا نے میری درخواست مسترد کر دی۔''

جینا کافی لے آئی۔ ''میری، تمہارے لیے بہتر ہے کہ تمہیں ایف بی آئی میں ملازمت مل جائے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن میری خواہش پولیس میں جاب کرنا ہے۔''

کافی پی کر میری اٹھ گئی تھی۔ جینا اس کے ساتھ باہر تک آئی۔ ''ہم کل تمہارا انتظار کریں گے۔''

''میں آؤں گی۔'' اس نے سر ہلایا اور کار میں بیٹھ کر رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

ایڈ اور جیسی جائے حادثہ سے کوئی ایک کلومیٹر دور ہا وے سے ہٹ کر جنگل میں موجود تھے۔ ان دونوں نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ بچ گئے۔ جیراڈ نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی اور جب حادثہ پیش آیا تو اس کا ونڈ اسکرین سے یوں ٹکرایا کہ اس کے پار نکل گیا اور اس مردہ جسم اسی میں پھنسا رہ گیا۔ ایڈ بہ مشکل کار سے باہر نکلا اس کے سر پر معمولی سا زخم آیا تھا ویسے وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ جیسی بھی ٹھیک تھی۔ ایک ملین ڈالرز کے نوٹ پوری کا میں بکھر گئے تھے۔ ان دونوں نے مل کر بہ مشکل تمام ان نوٹوں کو سمیٹ کر بیگ میں ڈالا۔ ایڈ نے جیسی سے پوچھا۔ ''سارے نوٹ نکال لیے ہیں؟''

''تقریباً۔'' وہ ہانپتے اور کانپتے ہوئے بولی۔ کار کے گرم ماحول سے باہر آتے ہی اس کا سردی سے برا حال ہو گیا تھا۔ جب رقم سمیٹ لی تو اسے لباس کی فکر ہوئی۔ اس کے پاس صرف ایک جینز کی پینٹ اور سوئیٹر تھا۔ اس نے وہی پہن لیا۔ ایڈ گرم کوٹ میں تھا مگر وہ بھی سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے تمام رقم دو بیگوں میں منتقل کی۔ ایک بیگ میں تین ملین ڈالرز تھے اور دوسرے میں دو ملین ڈالرز۔ اس نے دو ملین ڈالرز والا بیگ جیسی کو تھما دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ہمیں یہاں سے الگ الگ جانا ہوگا۔'' ایڈ بولا۔ ''پولیس جلد کار تلاش کر لے گی اور اس میں نوٹ ہی وہ ہمارے بارے میں جان جائے گی۔ جیراڈ مارا جا ہے اب پولیس کو ایک مرد اور ایک لڑکی کی تلاش ہوگی۔ ہم الگ الگ سفر کریں گے تو خطرہ کم ہوگا۔''

''پھر......؟''

''میں تم سے اور تم مجھ سے رابطہ رکھوگی۔'' ایڈ نے کہا۔ ''مشرق کی طرف جاؤ اور میں مغرب کی طرف جاتا ہوں۔''

''ایڈ...'' جیسی نے ہچکچا کر کہا۔ ''میں اکیلے...؟''

وہ پلٹ کر اس کی طرف آیا اور کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ ''تم کر سکتی ہو۔''

اس نے اپنے کوٹ سے ایک پستول نکال کر جیسی کو تھمایا اور پلٹ کر تیز قدموں سے چل دیا۔ جیسی نے گہری سانس لے کر پستول اپنی جینز میں اڑسا اور بیگ شانے پر لٹکایا، برف میں دھنستے قدموں کے ساتھ ہائی وے کی طرف جانے لگی۔

☆☆☆

جے نے میڈیسن اور پھر وسکونسن سے نکل کر سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ شمالی منی سوٹا میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ کا گھر کینیڈا کی سرحد کے پاس تھا۔ اس کا بچپن وہیں گزرا تھا۔ پھر ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرکے وہ میڈیسن چلا آیا، یہاں اس نے باکسنگ کو پیشے کے طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا۔ کی نے اس میں چھپے باکسر کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے جے کو تربیت دی اور اسے پروموٹ بھی کیا لیکن ساتھ ہی اس نے اسے خوب استعمال بھی کیا۔ جب اسے جیل ہوئی تو کی کے پاس اس کی تین مہینے کی تنخواہ تھی۔ اولمپک میڈل کے ساتھ اسے جو رقم ملی تھی اس سے اس کے تین مہینے بہت اچھے گزرے تھے۔

جیسے جیسے وہ شمال کی طرف جارہا تھا، موسم خراب اور سرد تر ہوتا جارہا تھا۔ ٹرک کے بند کیبن میں اتنی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جگہ جیسے ہی ہائی وے ذرا بلند ہوکر نیچے آئی، جے نے بے اختیار بریک لگائی۔ دور نشیب میں پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا اور وہاں کئی پولیس کاریں اس طرح کھڑی تھیں کہ ان کے درمیان سے کوئی دوسری گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔ اس نے بے ساختہ گاڑی گھمائی اور اسی سڑک پر روانہ ہوگیا۔ اس نے دیکھا نہیں تھا کہ پولیس ایک حادثہ شدہ کار کے پاس موجود تھی اور اس سے جیراڈ کی لاش ایمبولینس میں منتقل کی جارہی تھی۔ جے اضطراری طور پر تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا اچانک اسے عین سڑک پر کوئی کھڑا دکھائی دیا اور اس نے بروقت بریک لگائی۔ ٹائروں کے شور نے بھی اس آدمی کو نہیں چونکایا تھا۔ جے غصے سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا وہ عورت تھی اور کھڑے کھڑے کانپ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا۔ ''اے...... کون ہو تم اور یہاں کیوں کھڑی ہو؟''

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سردی سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی کیونکہ اس نے عام سی جینز اور اوپر معمولی سوئیٹر پہنا ہوا تھا، سر اور گردن پر اس نے اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جیسی تھی اور کھڑے کھڑے کانپ رہی تھی۔ جے نے اسے سہارا دیا اور ٹرک تک لایا لیکن وہ خود سے ٹرک میں سوار بھی نہیں ہو سکی تھی جے نے اسے اٹھا کر سیٹ پر بٹھایا اور پھر پیچھے رکھا چھوٹا سا کمبل نکال کر اسے اوڑھا دیا۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ جیسی نے چہرہ اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے جے نے ہیٹر تیز کر دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ دس منٹ بعد جیسی کی حالت اتنی اچھی ہوگئی تھی کہ اس نے خود پر سے کمبل ہٹا دیا تھا۔ اس کا بیگ بہ دستور اس کی کمر سے لٹکا ہوا تھا، جے نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ جے نے اس سے پوچھا۔

''اس موسم میں تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟''

''میری گاڑی خراب ہوگئی تھی، مجبوراً میں پیدل چل پڑی۔'' جیسی نے جواب دیا۔ ''تم کہاں جارہے ہو؟''

''میں اپنے گھر جارہا ہوں۔''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''شمالی منی سوٹا میں... کینیڈا کی سرحد کے پاس۔''

''مجھے کینیڈا جانا ہے، کیا تم مجھے اپنے قصبے تک لفٹ دے سکتے ہو؟''

جے نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''سوری میں تمہیں اگلے گیس اسٹیشن پر اتار دوں گا، اس سے آگے تم خود چلی جانا۔''

جیسی پریشان ہوگئی۔ اگر یہ اسے ساتھ لے جاتا تو اسے بہت آسانی ہو جاتی۔ اکیلے سفر کرنے کی صورت میں اسے بہت مشکل پیش آتی اور امکان تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتی۔ جے نے شمال کی طرف جانے والا متبادل راستہ اختیار کیا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ نظر آنے والے پہلے گیس اسٹیشن کی طرف مڑ گئے، اس کے ساتھ ایک بار اور موٹل بھی تھا۔ یہاں موسم مزید خراب تھا اور تیز ہواؤں کے ساتھ برف اڑ رہی تھی۔ وہ نیچے اترے تو کانپ اٹھے۔ اندر بار گرم تھا اور یہاں انہیں سکون ملا۔ جے نے اندر آتے ہی بار کی مالکہ سے پوچھا۔ ''یہاں فون ہے؟''

''بالکل...... وہ رہا... تمہارے پاس کالنگ کارڈ ہے؟ اگر نہیں ہے تو مجھ سے خرید لو۔''

جے کے پاس نہیں تھا اس نے دس ڈالرز والا کارڈ خریدا اور کال کرنے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیسی تیزی

سے باہر نکلی اور دوڑتے ہوئے جے کے ٹرک تک آئی۔ اس نے اندر سیٹ کے پیچھے رکھا ہوا بیگ کھولا اور اس کی سائیڈ پاکٹ ٹٹولی، اندر سے چند خطوط نکلے تھے۔ اس نے دیکھا ان پر میڈیسن کی جیل کا پتا لکھا ہوا تھا اور بھیجنے والے کا پتا شمالی منی سوٹا کا تھا۔ جیسی نے پتا ذہن نشین کیا اور نیچے اتر آئی، اس نے موبائل نکال کر ایڈ کو کال کی لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا اس لیے اس نے آواز والا پیغام دیا۔ ''میں جیسی بات کر رہی ہوں۔ ایک پتا ہے، کل شام میں وہاں ملوں گی۔'' اس نے پتا دہرایا اور موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اندر جے کال کر کے آ گیا تھا اور بار کی مالکہ سے ایک شاٹ کی فرمائش کی۔ اس نے چھوٹے سے گلاس میں شراب نکال کر اس کے سامنے رکھی۔ ''تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے، شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

جے کو کھانسی آ گئی مگر وہ تردید نہیں کر سکا تھا۔ اتنے میں جیسی آ گئی اور جے کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ابھی سال نہیں ہوا،

''شمالی منی سوٹا کینیڈا کے قریب۔'' جے نے جواب دیا۔ ''وہاں میرے پاپا اور مام کا گھر ہے۔''

بار کی مالکہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی وہاں جانے والے راستے بند ہیں تمہیں لازمی کل تک یہاں رکنا پڑے گا۔''

جے پریشان ہو گیا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ کل تک راستے کھل جائیں گے؟''

''امید ہے کل صبح نہیں تو دوپہر تک کھل جائے گا۔''

جیسی نے کہا۔ ''تب تک ہمیں یہاں رکنا ہو گا۔''

بار کی مالکہ آج اکیلی تھی اگرچہ موسم کی وجہ سے زیادہ گاہک نہیں تھے مگر سارا کام اسے کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھے گاہکوں کی فرمائش پوری کرنے گئی تو جیسی نے آہستہ سے کہا۔ ''ہم کیسے میاں بیوی ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے کے نام بھی نہیں معلوم۔''

''یہ غلط فہمی ہے۔'' جے بولا۔

''لیکن اس غلط فہمی کی وجہ سے ہمیں ایک ہی کمرے میں رکنا پڑے گا۔''

جے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہمیں رکنا ہے؟''

''ہاں، تم نے سنا نہیں...... موسم اتنا خراب ہے کہ ابھی سفر نہیں کیا جا سکتا۔'' جیسی ہنسی، اس کی بلوری آنکھوں میں شرارت آ گئی تھی۔ جے اسے دیکھتا رہا پھر پہلی بار اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

☆☆☆

ایڈ نرم برف میں پاؤں رکھتا جا رہا تھا اس کا رخ ہائی وے سے مخالف سمت میں تھا، اسے رہ رہ کر جیسی کا خیال آ رہا تھا کیونکہ اس کا لباس اتنا گرم نہیں تھا کہ اسے اس موسم میں تحفظ دے سکتا۔ اگر اسے جلد کوئی گاڑی یا لفٹ نہ ملتی تو سردی اس پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ مگر انہیں یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ وہ گرم لباس میں بھی ٹھٹھر رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ رات گزارنے کے لیے اسے کہیں پناہ لینی پڑے گی۔

ایڈ سر جھکائے تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ یہ پورا ناہموار پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں بلند قامت درخت لگے تھے۔

اچانک اسے نزدیک ہی کسی آدمی کے زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ایڈ محتاط ہو گیا۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس راستے کے اوپری حصے میں آیا جہاں ایک شخص اپنی اسنو بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اسے کوس رہا تھا۔ اس نے ریڈ انڈین طرز کا مخصوص کوٹ پہن رکھا تھا اور اپنے سیاہ بالوں سے بھی وہ ریڈ انڈین ہی لگ رہا تھا۔ یہ خاصی پرانی اسنو بائیک تھی اور شاید اسی لیے گڑبڑ کر رہی تھی۔ اچانک ریڈ انڈین کے ساتھ موجود کتا بھونکا اور پھر اوپر کی طرف لپکا اس نے ایڈ کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ ایڈ نے پستول نکال لیا اور جیسے ہی کتا اوپر آیا اس نے اسے گولی ماردی۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو کتا اس پر حملہ کر چکا ہوتا۔ وہ بڑی جسامت کا شکاری کتا تھا۔ ریڈ انڈین جو کتے کو آواز دے رہا تھا، فائر اور پھر کتے کی اذیت بھری چیخیں سن کر اوپر آ گیا۔ اس نے ایک نظر اپنے مرتے کتے کو دیکھا اور پھر ایڈ کو دیکھ کر دانت پیسے۔ اس نے چاقو نکال لیا۔

''تم نے میرے کتے کو مارا ہے میں تمہیں قتل کر دوں گا۔''

''میں نے اسے اپنے دفاع میں مارا ہے۔'' ایڈ نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے بلاوجہ مجھ پر حملہ کیا تھا۔''

مگر ریڈ انڈین نے اس کی بات نہیں سنی وہ چاقو تولتے ہوئے ایڈ کی طرف آیا۔ ایڈ نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ ''رک جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی شوٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

''کر دو۔'' ریڈ انڈین نے غرا کر کہا۔ حلیے سے وہ چیف ریڈ انڈین لگ رہا تھا۔ ''مجھ سے مقابلہ کرو ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔''

ایڈ پریشان تھا، وہ گولی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ کتے پر بھی اس نے مجبور ہو کر گولی چلائی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ پولیس علاقے میں ہوئی تو وہ فائر سن کر اس کی طرف آ جائیں گے۔ اس نے سر ہلایا اور پستول ایک طرف رکھ کر اپنے پاؤں سے بندھا خنجر نکال لیا۔ دونوں ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہوئے نیچے کھلی جگہ پر آئے۔ پھر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اتفاق سے دونوں نے ایک جیسا وار اور دفاع کیا۔ دونوں نے اپنے خالی ہاتھ سے دوسرے کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا۔ اسی کشمکش میں گر پڑے۔ ایڈ نے پاؤں سے چیف کے گھٹنے پر وار کیا، وہ کراہا لیکن ہاتھوں کی گرفت کمزور نہیں کی۔ اس نے ایڈ کو دور دھکا دیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت طاقتور تھا، ایڈ بھی کھڑا ہوا اور دونوں پھر جھپٹے۔ ان کے درمیان کشمکش کئی منٹ تک جاری رہی۔ پھر ایڈ کا ایک وار ناکام ہو کر درخت کے تنے پر لگا اور خنجر اس میں پیوست رہ گیا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے نکالتا۔ چیف اس پر مسلسل حملے کر رہا تھا اور ایڈ ان حملوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک ایڈ کا پاؤں پھسلا اور وہ پشت کے بل گرا۔ اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے لگا۔ اس نے ٹٹولا تو یہ پتھر نکلا۔ ایڈ نے اس پر گرفت کر لی اور جیسے ہی چیف اس کی طرف آیا اس نے اچانک پتھر کھینچ کر مارا۔ پتھر سیدھا چیف کے ماتھے پر لگا اور وہ اپنے زور میں اس پر آن گرا۔ ایڈ نے اس کا خنجر والا ہاتھ قابو میں کیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ اسے مارنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ زور لگا تو وہ ڈھلان سے لڑھک گئے اور ایک دوسرے کے اوپر سے قلابازیاں کھاتے نیچے پہنچے تو چیف کے حلق سے کراہ نکلی۔ ایڈ نے اس کا خنجر اس کے اپنے سینے میں اتار دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چیف کی آنکھیں بے جان ہو گئیں اور اس نے دم توڑ دیا۔ ہانپتے ہوئے ایڈ اٹھا، اس نے سب سے پہلے چیف کی کھال سے بنی جیکٹ اتاری۔ اس سردی میں یہ بہت کام کی چیز تھی۔ پھر اس نے اپنا پستول اور خنجر لیا۔ اسنو بائیک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ ایڈ نے کوشش کی اور خوش قسمتی سے تیسری کوشش میں اس کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ ایڈ بیٹھا اور وہاں سے چل پڑا۔

☆☆☆

میری دفتر میں آئی تو اس کا باپ شیرف بارنی اپنے آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ وہ انہیں نقشے کی مدد سے سمجھا رہا تھا کہ انہیں کہاں کہاں سڑکیں اور راستے بلاک کرنا تھے، جہاں سے ڈاکوؤں کے گزرنے کا امکان تھا۔ بات کرتے ہوئے بارنی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ''شیرف! کیا میں بھی چل سکتی ہوں؟''

''نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم دفتر میں ڈیوٹی دو گی۔''

''یس شیرف۔'' وہ بادل ناخواستہ بولی۔ کچھ دیر میں شیرف کے آدمی روانہ ہو گئے۔ ہائی وے پیٹرولنگ پولیس کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا۔ اب شیرف کے آدمی بھی ناکا... لگاتے۔ حادثہ شدہ کار سے ملنے والے کرنسی نوٹ بینک ڈکیتی کے ثابت ہوئے تھے۔ میری دفتر میں آئی تو ماما کیتھی اپنی ڈیسک پر موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔''

میری نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اٹھی اور اس نے ایک دراز سے لفافہ نکالا اور اس کی طرف آئی۔ ''سرپرائز... تمہاری ایف بی آئی میں جاب کی درخواست قبول کر لی گئی ہے کیونکہ تم ٹیسٹ میں پاس ہو گئی ہو۔''

مگر میری کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ماما تم جانتی ہو میں پولیس میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں یہ درخواست بھی میں نے تمہارے کہنے پر دی تھی۔''

''پولیس جاب۔'' ماما کیتھی کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''جس میں تمہارے لیے کوئی ویلیو نہیں ہے۔ شیرف سمجھتا ہے کہ عورتوں کا پولیس میں کوئی کام نہیں ہے اور بدقسمتی سے وہ تمہارا باپ بھی ہے۔ تم کیوں اس جہنم میں رہنا چاہتی ہو۔''

میری جانتی تھی کہ ماما کیتھی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ سینتیس سال سے اس دفتر میں کام کر رہی تھی اور آج تک اسے دفتر سے باہر کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے ماما کیتھی سے لفافہ لیا اور اپنی میز پر آ گئی۔

☆☆☆

شام ہونے پر بار میں کچھ رونق ہوئی تھی۔ کئی نوجوان جوڑے آ گئے تھے اس لیے بار کی مالکہ نے جیوک باکس آن کر دیا اور اب وہاں موسیقی گونج رہی تھی۔ جے اور جیسی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے تاریکی ہوتے ہی رات کا کھانا کھا لیا۔ یہاں کھانا بہت اچھا اور مناسب قیمت پر دستیاب تھا۔ جے جیسی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ مسلسل جھوٹ بول رہی تھی۔ البتہ ایک سوال کا اس نے درست جواب دیا تھا جب جے نے پوچھا۔ ''تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟''

''نہیں، مجھے آج تک اس کا موقع نہیں ملا۔'' جیسی نے سچ کہا۔ وہ جس قسم کی زندگی گزارتی آئی تھی اس میں

بوائے فرینڈ اور شوہر جیسے رشتوں کی گنجائش کم تھی۔ اس نے بچپن سے سوائے ایڈ کے اور کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب اسے جے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بے پناہ حسین تھی، اس کے پاس آنے والا مرد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جے کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے ستائش تھی لیکن اس نے اب تک بہت اچھے رویے کا مظاہرہ کیا تھا، کسی موقع پر اس پر حق جتانے یا اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اچانک جیسی نے پوچھا۔ ''میں تمہیں کیسی لگی؟''

جے نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''تم سے پہلے آج تک کوئی لڑکی مجھے اتنی اچھی نہیں لگی۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' جیسی خوش ہو گئی۔

''ہاں، مجھے سچ کہنے کی بیماری ہے اور میں نے اس کی سزا بھی بھگتی ہے۔''

جیوک باکس میں اگلا گانا شروع ہوا اور یہ جیسی کا پسندیدہ گانا تھا، اس نے جے سے کہا۔ ''کیا خیال ہے؟''

وہ دونوں فلور پر آ گئے۔ کھڑکی سے باہر ہواؤں کے زور پر برف اڑ رہی تھی اور سردی کی شدت میں یقیناً اضافہ ہو گیا تھا لیکن اندر اس کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ جیسی نے اپنا سوئیٹر اتار دیا تھا اندر اس نے وہی مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لگے ہلکورے لے رہے تھے۔ جیسی نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے کیا سچ بولا تھا جس کی سزا بھگتی؟''

جے ایک لمحے کو جھجکا پھر اسے بتانے لگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کی سزا کا سن کر جیسی چونکی تھی مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا لیکن جب جے نے بتایا کہ اس نے اولمپک میڈل جیتا تھا تو وہ حیران ہوئی۔ ''سچ میں...؟''

جے نے اپنے گریبان میں موجود میڈل نکال کر اسے دکھایا۔ جیسی نے میڈل دیکھا۔ ''واہ... تم تو چیمپئن ہو۔''

''میں نے کوشش کی تھی لیکن سیمی فائنل میں شکست کھا گیا۔ بہرحال پھر میں نے پروفیشنل بننے کا سوچا تو یہ حادثہ پیش آ گیا۔''

''تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ تمہیں بری ہونا چاہیے تھا۔''

''ایک باکسر کو ہمیشہ جارح مزاج سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ کسی جھگڑے میں ملوث ہو تو عام طور سے اسے ہی قصور وار سمجھا جاتا ہے۔ اسی تاثر کی وجہ سے مجھے سزا ہوئی۔''

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی تو میں گھر جا رہا ہوں۔ کچھ عرصے آرام کروں گا پھر سوچوں گا۔''

''تم پروفیشنل باکسر بنو۔'' جیسی نے اصرار کیا۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا یا پھر میں اپنا جم کھول لوں لیکن اس کے لیے بہت ساری رقم چاہیے ہوگی۔''

''کتنی رقم؟''

''کم سے کم بھی دو لاکھ ڈالرز چاہیے ہوں گے۔''

جیسی کو اپنے بیگ کا خیال آیا جس میں دو ملین ڈالرز موجود تھے مگر وہ جے کو اس کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ تھک گئے تو میز پر واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے لیے ڈرنک منگوائی۔ بار کی مالکہ نے انہیں ڈرنک کے ساتھ ایک چابی بھی دی۔ ''یہ پیچھے کا کمرا ہے، نمبر چابی پر ہے۔ تمام سہولتیں ہیں لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو دفتر میں آ جانا، رات کو یہاں جیک ہوتا ہے۔''

رات کے دس بج رہے تھے انہوں نے ڈرنکس ختم کی اور اٹھ گئے۔ دونوں خاصی پی گئے تھے اور نشے میں تھے۔ راستے میں جیسی لڑکھڑائی تو جے نے اسے سنبھال لیا لیکن وہ گری جا رہی تھی۔ جے نے اسے گود میں اٹھایا اور کمرے میں لایا۔ دروازہ بند کر کے وہ بیڈ کی طرف بڑھا اور جیسی کو اس پر لٹا کر سیدھا ہونے لگا تھا کہ جیسی نے اسے کھینچ لیا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اسنو بائیک کا انجن پھر گڑبڑ کرنے لگا اور پھر وہ بند ہو گیا۔ ایڈ نے کئی بار کوشش کی لیکن اس بار وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجبوراً اس نے اسنو بائیک کو چھوڑا اور پیدل آگے روانہ ہو گیا۔ برف کا طوفان رک گیا تھا اور ہوا بھی معمول کے مطابق چلنے لگی تھی لیکن سردی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس نے ایک چھوٹی سی ندی عبور کی تھی کہ اسے سامنے ایک لکڑی کا کیبن دکھائی دیا۔ اچانک کیبن کا دروازہ کھلا اور ایک عورت گود کے بچے کو اٹھائے باہر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گنجا اور ادھیڑ عمر آدمی باہر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دس گیارہ سال کی لڑکی بھی باہر نکل آئی تھی۔ آدمی عورت پر چلا رہا تھا۔ ''کتیا... دفع ہو جا یہاں سے...''

''پلیز... اس سردی میں، میں اور میرے بچے مر جائیں گے۔''

''میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ... ایلس تم اندر آؤ۔'' آدمی نے بچی کو حکم دیا اور دھمکی آمیز انداز میں عورت کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ وہ چیخ مار کر بھاگی اور کیبن سے ذرا دور کٹی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر کے ساتھ آ بیٹھی۔ اب بچے نے سردی سے رونا شروع کر دیا تھا۔ عورت اسے چپ کراتے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔ آدمی نے دوبارہ لڑکی سے کہا۔ ''ایلس، اندر آ رہی ہو یا اپنی ماں کے ساتھ باہر رہنا چاہتی ہو؟''

لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، اس نے معمولی سے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے جو اس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ وہ پلٹی اور کیبن میں چلی گئی۔ آدمی بھی اندر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ گھوم کر کیبن کی طرف بڑھا، اس کی کوشش تھی کہ عورت کی نظر اس پر نہ پڑے۔ وہ کیبن کے دروازے تک آیا، اس نے اپنا پستول نکالا اور اچانک لات مار کر دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا جہاں آدمی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا اور میز پر شراب کی متعدد بوتلیں رکھی تھیں۔ اس نے حیرت سے ایڈ کی طرف دیکھا پھر اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ ایڈ نے اسے خبردار کیا۔ ''حرکت مت کرنا۔''

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں گھسنے کی؟'' آدمی نے کہا۔

''ایلس۔ تم اپنی مام کے پاس جاؤ۔'' ایڈ نے آدمی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''نہیں۔'' لڑکی سہم کر بولی۔

''جاؤ۔'' ایڈ نے سخت لہجے میں کہا تو لڑکی مجبوراً باہر چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے ایڈ کی توجہ اس کی طرف گئی تو آدمی نے موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر شاٹ گن نکالی لیکن اس سے پہلے وہ اسے ایڈ پر استعمال کرتا، ایڈ نے دو فائر کیے اور وہ اپنا سینہ تھام کر ڈھیر ہو گیا۔ ایڈ نے اسے چیک کیا، وہ مرنے والا تھا پھر وہ باہر کی طرف لپکا۔ ایلس ماں کے پاس بیٹھی تھی اور عورت بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس نے ہلکے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایڈ نے اس کی گود سے بچہ نکال کر ایلس کو دیا۔ ''تم اسے لے جاؤ، میں تمہاری مام کو لے کر آتا ہوں۔''

اس نے عورت کو اٹھایا اور کیبن میں لے آیا۔ یہ ایک کمرے کا کیبن تھا اور درحقیقت شکار کے لیے بنایا گیا تھا۔ ایڈ کو حیرت تھی کہ وہ شخص اس موسم میں اس عورت اور بچوں کو یہاں کیوں لایا تھا۔ عورت کو بستر میں لٹا کر کمبل سے ڈھک دیا۔ ایلس بچے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ ایڈ نے آدمی کی لاش کے پاؤں تھامے اور اسے کھینچتا ہوا کیبن سے باہر آ گیا۔ باہر یہ کام مشکل تھا لیکن وہ لاش کو ندی تک لایا اور اسے ندی میں دھکیل دیا۔ دو منٹ بعد وہ کیبن میں لوہے کی بنی بھٹی کے سامنے بیٹھا تھا جس میں آگ جل رہی تھی اور کیبن کا درجہ حرارت باہر سے بہتر تھا، اس کے باوجود وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ عورت اب بہتر تھی اور اس کے چہرے کی نیلاہٹ سرخی میں بدل گئی تھی۔ ایڈ نے بھٹی کا دروازہ کھولا اور براہ راست آگ تاپنے لگا۔ ایلس اب اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اچانک کہا۔ ''تم نے ڈیڈی کو قتل کر دیا ہے؟''

''ہاں، اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔'' ایڈ نے کہا اور بوتل سے اپنے لیے شراب نکالی۔ ''وہ تمہارا سگا باپ تھا؟''

''سوتیلا۔'' ایلس نے تصحیح کی۔ ''مام نے دو مہینے پہلے اس سے شادی کی تھی، وہ برا آدمی تھا۔ مام کو مارتا تھا لیکن میرے ساتھ برا سلوک نہیں کرتا تھا۔''

ایڈ نے اس پیاری سی بچی کو دیکھا جو کچھ عرصے بعد ایک نوجوان لڑکی میں بدل جاتی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شخص اس پر کیوں مہربان تھا۔ عورت واجبی شکل صورت والی تھی۔ آگ کم ہونے لگی تو اس نے بھٹی میں مزید لکڑی ڈالی۔ ایلس اب اس میں دلچسپی لے رہی تھی، اس کا ابتدائی خوف کم ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے یہ انڈین جیکٹ کہاں سے لی؟''

''ایک انڈین چیف سے، میری اس سے لڑائی ہوئی تھی۔''

''تم نے اسے بھی مار دیا؟''

''ہاں...... ورنہ وہ مجھے مار دیتا۔''

''تم مجھے بھی مار دو گے؟''

''نہیں، تم بچی ہو اور بچوں کی حفاظت کی جاتی ہے ان کو مارا نہیں جاتا۔'' ایڈ نے کہا۔ ''اب تم سو جاؤ تمہاری مام کی حالت ٹھیک ہے۔ صبح تم لوگ یہاں سے چلے جانا۔''

ایلس نے سر ہلایا اور اپنی ماں اور بھائی کے پاس لیٹ گئی۔ خود ایڈ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔

☆☆☆

میری صبح ڈیوٹی پر پہنچی تو شیرف کا آفس خالی تھا۔ صرف ماما بیٹھی تھی۔ میری اپنی میز پر آئی تھی کہ ایک عورت دفتر میں داخل ہوئی۔ وہ خاصی بوڑھی تھی۔ وہ سیدھی میری کے پاس آئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ ''یس مام، میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''میں اپنی بیٹی کی طرف سے پریشان ہوں۔'' بڑی

لی نے کہا۔ ''میں میگارتھی ٹریش ہوں۔ میری بیٹی جین نے دو مہینے پہلے نیڈ نامی شخص سے شادی کی تھی وہ اچھا شخص نہیں ہے۔ وہ اچانک ہی جین اور اس کے بچوں کو لے کر جنگل میں واقع اپنے شکاری کیبن کی طرف چلا گیا ہے اور دو دن سے مجھے جین کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔''

جین چونکی۔ ''اس موسم میں... کیا تم نے اس سے رابطہ نہیں کیا؟''

''وہاں کچھ نہیں ہے، نہ فون ہے اور نہ موبائل کام کرتا ہے۔'' میگارتھی کا لہجہ روہانسا ہوگیا۔ ''میں اپنی بیٹی کی سلامتی کے لیے بہت فکرمند ہوں۔ پلیز...... کیا تم چیک کر سکتی ہو۔ میری بیٹی اور اس کے بچے ٹھیک ہیں؟ مجھے صرف ان کی سلامتی کی خبر معلوم کرنا ہے۔''

اگرچہ پولیس ایسی شکایات پر کارروائی نہیں کرتی تھی کیونکہ بارنی کے خیال میں اس سے صرف پولیس کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ مگر میری اس بوڑھی عورت کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی جو پہلے ہی پریشان تھی، اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں چیک کرتی ہوں۔''

''میں تمہاری شکرگزار ہوں گی آفیسر۔'' میگارتھی نے کہا۔ میری نے اس سے رابطے کا نمبر اور پتا لیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کھڑی ہوگئی۔ اسے معلوم تھا پیٹرول پولیس یا دفتر کے ساتھیوں سے کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا، ان میں سے کوئی کیبن تک جانے کی زحمت نہیں کرتا۔ اسے خود ہی جانا تھا۔

☆☆☆

جے سو گیا تو جیسی اٹھ کر خاموشی سے واش روم میں آئی، اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا لیکن اس پر ایڈ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں تھا۔ اس نے نمبر ملایا تو وہ بند جا رہا تھا۔ جیسی روہانسی ہوگئی۔ اس نے نم لہجے میں ایڈ کے نمبر پر وائس میسج کیا۔ ''پلیز، تم کہاں ہو... تم جانتے ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی... پلیز مجھ سے رابطہ کرو... میں تمہارے بغیر کینیڈا نہیں جاؤں گی۔''

بات کر کے وہ باہر آئی اور بستر میں گھس کر جے کے ساتھ لیٹ گئی۔ صبح جے کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ جیسی کمرے میں نہیں ہے، اس کا بیگ بھی غائب تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا تب اس نے دیکھا کہ جیسی ایک ٹرک کے ساتھ کھڑی ہوئی اس کے ڈرائیور سے بات کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر باہر نکل آیا۔ وہ دور سے چلایا۔ ''اے، کہاں جا رہی ہو تم؟''

جیسی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹرک والے سے بات کر رہی تھی۔ جے نے آکر اس کا بازو تھاما تو ٹرک والا نیچے اترنے لگا۔ جے نے غرا کر کہا۔ ''دفع ہو جاؤ اپنا منہ صحیح سلامت لے کر۔''

ٹرک والے نے جے کی جسامت دیکھی اور اسی میں عافیت جانی کہ وہاں سے چلا جائے۔ جیسی نے اپنا بازو چھڑایا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''تم نے اس طرح کیوں روکا ہے... ہمارا بس ایک دن کا ساتھ تھا۔''

''ہمارا ایک دن کا ساتھ نہیں تھا۔'' جے کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ''پلیز، اندر چلو۔''

وہ اندر آئے۔ جیسی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس طرح بھاگے آؤ گے۔''

''ہاں۔'' جے جذباتی ہوگیا۔ ''میں نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا لیکن آج تمہیں جاتے دیکھ کر مجھے لگا جیسے میرے وجود کا کوئی حصہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہو۔ اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔''

''لیکن مجھے جانا ہے۔''

''میرا مطلب ہے اس طرح، کوئی نمبر یا پتا دیے بغیر مت جانا۔ ویسے تم کینیڈا کی سرحد تک ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھیں تو میرے ساتھ چلو۔''

''پہلے تم نے انکار کر دیا تھا۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''اس وقت تم سے یہ وابستگی نہیں تھی۔'' جے نے کہتے ہوئے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

☆☆☆

میری اسنو بائیک پر کیبن کی طرف جا رہی تھی، اس نے جان بوجھ کر معروف راستوں کے بجائے جنگل کے راستے اختیار کیے تھے جہاں اسے ساتھی پولیس والوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ بات بارنی تک جاتی تو بہت کچھ سننے کو ملتا۔ میری اٹھارہ سال تک جینا اور کلارک کے ساتھ رہی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باپ کے پاس واپس نہیں آئی تھی بلکہ الگ رہنے لگی تھی۔ اس نے اپنی محنت سے پولیس فورس کا امتحان پاس کیا تھا اور ٹریننگ میں وہ تیسرے نمبر پر آئی تھی اس کے باوجود بارنی کا رویہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے آدمیوں کا رویہ بھی میری سے ٹھیک نہیں تھا، وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اکثر اسے ڈی گریڈ کر جاتے تھے۔ وہ ایک راستے پر نکلی اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہاں پولیس اسنو بائیکس سمیت اس کے دفتر کے تین افراد موجود تھے۔ یہ سام، کارل اور شیپر تھے۔ کارل میری کا کزن تھا اور اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ بارنی اس پر فخر کرتا تھا۔ سام اسے پسند کرتا تھا مگر بارنی کے ڈر سے اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے نزدیک آکر اپنا ہیلمٹ اتارا تو کارل چونک گیا۔

''تم یہاں......؟ شیرف نے تمہیں دفتر میں رکنے کو کہا تھا۔''

''میں ایک شکایت پر جا رہی ہوں۔'' میری نے جواب دیا۔ ''یہاں پاس ہی نیڈ نامی شخص کا شکاری کیبن ہے وہ اس موسم میں اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں لے آیا۔ جین کی ماں اس کی خیریت کے بارے میں فکرمند ہے۔''

''ماں فکرمند ہے اور تم اس کی تسلی کے لیے یہاں دوڑی آئیں؟'' کارل نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔'' میری کا لہجہ سرد ہوگیا۔ ''یہ ایک پولیس والے کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی مدد کرے۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے ہیلمٹ پہنا کہ سام آگے آیا۔ ''میں بھی چل رہا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے، وہ ڈاکو یہیں گھوم رہے ہیں۔'' سام نے وہاں موجود اسنو بائیک سنبھالی تو مجبوراً کارل بھی آگیا۔ شیپر وہیں رک گیا تھا۔ وہ میری کے پیچھے جا رہے تھے۔ میری کے مطابق کیبن دو میل کے فاصلے پر تھا۔ پھر وہ ندی آگئی جس کے پار کیبن تھا۔ سام نے اترتے ہوئے کہا۔ ''تم یہیں رکو میں دیکھ کر آتا ہوں۔''

وہ ندی پار کر کے کیبن کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

ایڈ کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور بھٹی کی آگ کم ہونے سے کیبن سرد ہو رہا تھا۔ اس نے کمبل ہٹایا جو اس کے سونے کے دوران ایلس نے اس پر ڈال دیا تھا۔ پہلے اس نے بھٹی میں لکڑی ڈالی۔ پھر اس نے اپنا موبائل نکال کر دیکھا اس پر جیسی کے دو پیغام تھے اور ایک میں پتا بھی تھا۔ اس نے اسے کال کرنے کے بجائے جوابی پیغام دیا کہ وہ جلد اس پتے پر پہنچ جائے گا۔ یہاں سگنل بہت کم تھے، کال ہونے کا امکان نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ میسج پہنچ جائے گا۔ وہ اپنے لیے ناشتا بنانے میں لگ گیا۔ جین اور اس کے دونوں بچے سو رہے تھے، اس نے موقع غنیمت سمجھ کر اپنے بیگ سے پچاس ہزار ڈالرز مالیت کی گڈیاں نکالیں اور عورت کے پرس میں رکھ دیں۔ اس نے اپنے لیے کافی بنائی۔ توس گرم کر کے ان پر مکھن لگایا اور انڈے ابلنے کے لیے رکھ دیے۔ ناشتا کر کے وہ جانے کے لیے تیار ہوا ہی تھا کہ ایلس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم جا رہے ہو؟''

''ہاں۔'' ایڈ نے رقم والا بیگ شانے پر لادا۔ ''میرے جانے کے بعد جیسے ہی تمہاری ماما کی طبیعت ٹھیک ہو تو تم لوگ بھی یہاں سے چلے جانا۔''

''پولیس تمہارے بارے میں پوچھے گی۔''

''اسے سب سچ سچ بتا دینا۔'' ایڈ نے نیڈ کی شاٹ گن شانے پر ٹانگ لی اس کے اضافی کارتوس بھی وہ جیب میں رکھ چکا تھا۔ اب وہ بہتر طور پر مسلح تھا لیکن جیسے ہی وہ دروازے کے پاس آیا اور اس نے شیشے کا پردہ ہٹا کر دیکھا، اسے ندی کے پار پولیس والے دکھائی دیے اور ایک پولیس والا اسی طرف آ رہا تھا۔ ایڈ نے بے ساختہ پیچھے ہٹتے ہوئے شاٹ گن تان لی تھی۔

☆☆☆

میری بے چین تھی، سام کیبن کے دروازے پر پہنچ گیا تھا اور اس پر دستک دے رہا تھا۔ میری ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف آئی۔ سام نے دوسری بار دستک دی اور بلند آواز سے پولیس کا بتا کر اندر موجود افراد کو باہر آنے کو کہا۔ میری ندی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ندی میں ڈوبی ہوئی نیڈ کی لاش پر گئی، اس کا صرف سر برف سے باہر تھا اور باقی جسم ندی کے اوپر جمی برف کے نیچے تھا۔ میری نے سام کی طرف دیکھا اور چلائی۔ ''ہوشیار، یہاں ایک لاش ہے۔''

سام نے اس کی آواز سن لی تھی، اس نے اپنا پستول نکالنا چاہا تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور وہ اچھل کر پیچھے گرا تھا۔ شاٹ گن کی گولی نے اس کے پیٹ اور سینے میں بڑا سا سوراخ کر دیا تھا۔ وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ کیبن کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ اس سے باہر آکر ایڈ نے ان تینوں پر لگاتار کئی فائر کیے اور انہیں بچنا پڑا اس سے فائدہ اٹھا کر ایڈ وہاں موجود نیڈ کی اسنو بائیک پر بیٹھا اور بھاگ نکلا مگر یہاں ندی کے ساتھ جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ ندی آگے ایک جھیل میں گر رہی تھی اور جھیل کی سطح شدید سردی سے منجمد ہوگئی تھی۔ ایڈ کو ندی کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔

کارل غم و غصے سے دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ اپنی اسنو بائیک کی طرف لپکا اور ندی کے ساتھ ساتھ ایڈ کا پیچھا کرنے لگا۔ میری اس کے پیچھے تھی۔ برف پر اچھلتی کودتی دونوں اسنو بائیکس آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ کارل نے پستول نکال کر ایڈ کی طرف فائر کیے لیکن اتنی اچھل کود میں درست نشانہ لینا ناممکن تھا۔ ذرا آگے جا کر جھیل شروع ہوئی تو اب وہ آگے پیچھے

تھے۔ کارل کا پستول خالی ہو گیا تھا اس لیے وہ نزدیک آنے پر بھی ایڈ پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈ نے اس پر گولی چلانے سے گریز کیا حالانکہ اس کے پاس پستول تھا۔ وہ ساری توجہ فرار ہونے پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ اس نے اچانک ہی کارل کی بائیک کو ٹکر ماری۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اس کی بائیک الٹ گئی اور وہ برف پر پھسلتا ہوا دور جا گرا تھا۔ میری جب تک اس کے پاس آتی ایڈ دور جنگل میں داخل ہو گیا تھا۔ میری، کارل کے پاس رکی۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”کتیا کا بچہ۔“ کارل نے غصے میں کہا اور اٹھ کر میری کے پاس آیا اور اچانک اسے بازو سے پکڑ کر بائیک سے کھینچ کر برف پر پھینک دیا۔ جب تک میری اٹھتی وہ اس کی بائیک پر آگے جا چکا تھا، میری نے چلا کر اسے آواز دی لیکن وہ اس کی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری کے خیال میں انہیں ڈاکو کا پیچھا کرنے کے بجائے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کرنا چاہیے تھا اور وہ سب مل کر اسے گھیر سکتے تھے۔ ڈاکو شاٹ گن سے مسلح تھا اور سام کو پہلے ہی مار چکا تھا۔ سام کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی تھی مگر یہ موقع سوگ منانے کا نہیں تھا۔ اس نے کوشش کر کے کارل کی بائیک سیدھی کی اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے روانہ ہو گئی۔

ایڈ جنگل میں داخل ہو گیا تھا لیکن اس نے بائیک کی رفتار کم نہیں کی تھی، وہ جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ جیسی کے بتائے پتے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جنگل کی حد اچانک ختم ہوئی پھر سرخ کپڑے لہراتے دیکھ کر اس نے بروقت بائیک کو بریک لگائی۔ یہ خاردار تاریں تھیں جن سے خبردار کرنے کے لیے ان پر کچھ کچھ فاصلے پر سرخ کپڑا لگایا گیا تھا تاکہ کوئی بے خبری میں ان کا شکار نہ ہو جائے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر اسے ایک خیال آیا۔ وہ بائیک سے اترا اور تاریں ہٹا کر اس کے نیچے سے بائیک سمیت دوسری طرف نکل گیا۔ پیچھے سے اسنو بائیک کی آواز آئی تو عجلت میں حرکت میں آیا۔

کارل پاگلوں کی طرح بائیک چلا رہا تھا۔ سام کی موت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا اور وہ بہر صورت اس شخص کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہوا اور جیسے ہی وہ درختوں کے آخری حصے میں پہنچا اسے سامنے کھلی جگہ ڈاکو بائیک سمیت رکا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی کارل کا غیظ و غضب سوا ہو گیا تھا، اس نے بائیک کی رفتار تیز کی اور جیسے ہی وہ درختوں سے نکلا کوئی چیز اس کے سینے اور گردن سے ٹکرائی۔ وہ ہوا میں اچھلا، بائیک اس کے نیچے سے نکل گئی تھی۔ وہ زمین پر گرا اور اس نے اپنا گلا تھاما تو اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ یہ خون اس کی گردن سے ابل رہا تھا۔ جسے خاردار تار نے کاٹ دیا تھا۔ ایڈ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ اس نے تاروں سے لال کپڑے ہٹا دیے تھے۔

میری وہاں پہنچی تو دور تک کوئی نہیں تھا اور کارل برف پر ساکت پڑا تھا اور اس کے آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ میری تیزی سے اس کے پاس آئی، اس نے کارل کا ہیلمٹ الگ کیا تو اس کی گردن کا زخم سامنے آ گیا۔ اس سے اب بھی خون ابل رہا تھا اور کارل مر چکا تھا۔ میری نے سر تھام لیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک معمولی سی شکایت کی انکوائری اتنی خون ریزی میں بدل جائے گی۔ ڈاکو غائب ہو چکا تھا۔ اس نے شانے پر موجود ریڈیو سے دفتر رابطہ کیا اور واقعے کی اطلاع دینے لگی۔

☆☆☆

جے شروع میں ڈرا ہوا تھا کہ ابھی پولیس اس کے پیچھے آئے گی یا یہاں کی پولیس کو اس کے بارے میں بتا دیا گیا ہوگا۔ اس نے ٹی وی پر مقامی چینل دیکھے لیکن کہیں کی کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ ہوش میں آ بھی گیا تھا تو اس نے پولیس کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی اس سے دھوکا کر چکا تھا۔ وہ اس کے معاوضے کی رقم کھا چکا تھا۔ جے نے سکون محسوس کیا۔ اس نے جیسی کو کی کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ جیسی نے کہا۔ ”تم نے اپنا دفاع کیا تھا اس لیے فکر مت کرو، حملہ اس نے کیا تھا تم نے نہیں۔“

”مسئلہ وہی ہے، میں پہلے ہی سزا یافتہ ہوں اس لیے پولیس مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرائی۔“

جیسی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ وہ خود جرم کی زندگی گزارتی آئی تھی۔ ناشتے کے بعد انہیں پتا چلا ہائی وے کے مکمل کھلنے میں چند گھنٹے اور لگ سکتے ہیں اس لیے جے نے روانگی کا ارادہ تین بجے تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی اب دو ڈھائی گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ وہ باہر آئے۔ موسم صاف ہو گیا تھا اور ہوا ساکن تھی۔ انہوں نے گرم لباس پہن لیا تھا اور اب موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسی نے کہا۔ ”کیا خیال ہے، اسنو مین بنائیں؟“

انہوں نے برف جمع کی اور اسنو مین بنانے لگے۔ جے نے اچانک کہا۔ ”تم نے اپنے بارے میں تو بتایا نہیں۔“

”تم میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“ جیسی نے برف جماتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، سب جاننا چاہتا ہوں جو تم بتانا چاہو۔“

جیسی خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ”میرا بچپن بہت اچھا نہیں تھا، میرا باپ ایک عفریت تھا، اس نے میری ماں کو بہت اذیتیں دیں۔ وہ تکلیفیں سہتے ہوئے مر گئی۔ پھر اس کی اذیت رسانیوں کا رخ میری طرف ہوا مگر میرے بھائی نے مجھے بچا لیا۔ ہم نے گھر چھوڑ دیا۔ دربدر پھرتے رہے۔ میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اور میں آج بھی دربدر ہوں۔“

”تم نے تعلیم حاصل کی؟“

جیسی نے سر ہلایا۔ ”میں نے اٹھارہ سال کی عمر تک ایک مشن اسکول میں تعلیم حاصل کی، میں وہیں رہتی تھی اور وہ بھی کوئی اچھی جگہ نہیں تھی، وہاں بہت گھٹن اور پابندیاں تھیں۔ جیسے ہی میں اٹھارہ سال کی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔“

”میں نے بھی صرف اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں کالج جاؤں اور پھر ان کی طرح پولیس فورس میں آؤں۔“

جیسی چونکی۔ ”تمہارے پاپا پولیس میں ہیں؟“

”نہیں، ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔“ جے نے بتایا تو جیسی نے سکون کا سانس لیا مگر یہ بات بھی کم تشویشناک نہ تھی کہ جے کا باپ پولیس فورس میں رہا تھا۔ ”مجھے بچپن سے باکسنگ کا شوق تھا اس لیے میں نے اسے کیریئر کے طور پر اپنایا۔“

”جیل جانے پر تمہارے پاپا کا ردعمل کیا تھا؟“

”بہت زیادہ خوفناک، انہوں نے اس دوران میں نہ تو مجھ سے ملاقات کی نہ فون پر بات کی اور نہ خط لکھا۔ مام دو بار مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ وہ ہر ہفتے خط لکھتی تھیں اور جس دن فون کی اجازت ہوتی تھی اس دن لازمی وہ مجھے کال کرتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے وہ میرے گھر آنے سے خوش ہوں گی اور میں ان کی خاطر ہی جا رہا ہوں۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”اور تمہارے پاپا؟“

”وہ صرف مجھ سے ناراض ہیں باقی سب سے وہ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔“

”کیا وہ مجھے قبول کر لیں گے؟“

”جب میں نے قبول کیا ہے تو وہ کیوں نہیں کریں گے۔ مام مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“

انہوں نے اسنو مین مکمل کیا۔ جیسی نے اس کی آنکھیں اور منہ بنایا۔ پھر اسے اپنا مفلر پہنا دیا۔ ”اب یہ مکمل ہے۔“

”ہمارے تعلق کی طرح۔“ جے نے اس کے گرد بازو حمائل کر دیے اور جیسی نے اس کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ جے نے طے کیا تھا کہ وہ لنچ کر کے روانہ ہوں گے۔

☆☆☆

جینا ڈنر کی تیاری کر رہی تھی وہ اس دن کے لیے خاص اہتمام کرتی تھی۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی لیکن وہ کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔ کلارک کے لیے یہ وقت بوریت کا تھا، اس نے اعلان کیا۔ ”میں شکار پر جا رہا ہوں ممکن ہے کوئی ہرن مل جائے۔“

وہ تیار ہو کر آیا تو جینا اسے چھوڑنے دروازے تک آئی اور پھر اس کے گلے لگ کر اس نے کلارک کی جیبوں کی تلاشی لی، اندر سے ایک ہتھکڑی نکلی تھی۔ ”کیا یہ بھی شکار کے لیے ہے؟“

”نہیں، اس علاقے میں دو ڈاکو گھوم رہے ہیں ممکن ہے ان کے لیے اس کی ضرورت پڑ جائے۔“

”تم ریٹائر ہو گئے ہو۔“ جینا نے اسے یاد دلایا۔

”پولیس والا کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔“ کلارک نے کہا اور باہر نکل گیا۔ جینا ٹھنڈی سانس لے کر واپس کچن میں آ گئی۔ ابھی خاصا وقت تھا، اس نے کچھ چیزیں چولہوں پر رکھ دی تھیں، وقت گزاری کے لیے وہ کافی نکال کر میز پر آ بیٹھی اور آج کا اخبار دیکھنے لگی۔ ایک چھوٹی سی خبر نے اس کی توجہ حاصل کر لی۔ کی جم کا مالک کی زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہوا تھا، اس کا کہنا تھا کہ پاؤں پھسلنے سے اس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ جینا کو یاد آیا کہ وہی جے کا ٹرینر اور منیجر تھا اور جے اسی جم میں کام کرتا تھا۔

☆☆☆

ایڈ تیز رفتاری سے بائیک چلا رہا تھا۔ وہ ایک کچی سڑک پر آ نکلا تھا، یہاں راستہ بتا رہا تھا کہ اس پر باقاعدگی سے آمد و رفت ہوتی تھی۔ اس نے ایک قصبے کے آثار دیکھتے ہی بائیک ایک طرف روک دی۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر اس پر لوکیشن چیک کی تو یہ وہی قصبہ نکلا۔ اس نے جی پی ایس پر وہ پتا ڈالا جو جیسی نے اسے بھیجا تھا تو فوراً نقشے پر اس کی نشان دہی آ گئی۔ مکان اس جگہ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس نے موبائل جیب میں رکھا اور آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جان بوجھ کر درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا، اسے خطرہ تھا کہ راستے میں کوئی پولیس والا نہ مل جائے۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اب مقامی پولیس بھی انہیں تلاش کر رہی ہوگی۔

ایک جگہ خوب صورت دو منزلہ مکان اس کے سامنے آیا۔ اس نے اندر جانے سے پہلے لیٹر بکس پر پتا دیکھا یہ وہی پتا تھا جو جیسی نے اسے بھیجا تھا۔ وہ دبے قدموں دروازے تک آیا اور اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آیا تو اخبار پڑھتی جینا نے کہا۔ ''ڈیئر، مہربانی کرکے اپنے جوتے صاف کرکے اندر آنا۔''

''سوری مام۔'' ایڈ نے اس کے سر سے شاٹ گن کی نال لگائی۔ ''میں پہلے ہی اندر آچکا ہوں۔ اس لیے تمہارا فرش خراب ہوگیا ہے۔''

جینا ساکت ہوگئی تھی۔ ''کون ہو تم؟''

''میں کون ہوں یہ بیکار کی بات ہے اصل بات یہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے سنا ہے تم تھینکس گیونگ ڈنر بہت اچھا بناتی ہو، میں وہ ڈنر کرنے آیا ہوں لیکن فی الحال مجھے کوئی گرم چیز دو۔''

جینا نے کافی نکال کر جب اس کے سامنے رکھ دی تو اس نے شاٹ گن میز پر اس طرح سے رکھی کہ اس کا رخ جینا کی طرف تھا اور ٹریگر ایڈ کے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے کافی کا پہلا گھونٹ لے کر مگ میز پر رکھا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ ''اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو.... ورنہ میں تمہارا سر اڑا دوں گا۔''

ایڈ ساکت ہوگیا تھا۔ اس کی نظر جینا کے عقب میں دائیں طرف دیوار پر لگے آئینے پر مرکوز تھی جس میں کلارک صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں بائیس بور کی شکاری رائفل تھی جس کی نال کا رخ ایڈ کے سر کی طرف تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''سنا نہیں تم نے...؟''

''آرام سے پاپا۔'' ایڈ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''میز پر شاٹ گن رکھی ہے، اس کی نال کا رخ ٹھیک تمہاری بیوی کی طرف ہے اور ٹریگر پر میری انگلی ہے۔''

''بکواس مت کرو، میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' کلارک چلایا۔ ''ہاتھ اوپر کرو۔''

''یہ اچھا خیال نہیں ہے کیونکہ میرے ساتھ تمہاری بیوی بھی ماری جائے گی اس لیے تم رائفل نیچے کرلو۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جینا نے شوہر کو بتایا۔

کلارک کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر رائفل نیچے رکھ دی۔ ایڈ پھرتی سے شاٹ گن اٹھاتے ہوئے گھوما اور اس نے آگے بڑھ کر رائفل اٹھالی۔ ''اچھی رائفل ہے۔ پاپا، اب تم بھی میز پر آجاؤ۔''

کچھ دیر بعد کلارک اور جینا میز پر سامنے بیٹھے تھے ایڈ نے جینا کی طرف دیکھا۔ ''مام، تم ڈنر تیار کرو جب تک میں پاپا کے ساتھ گپ شپ کرتا ہوں۔''

جینا پریشان تھی، وہ میز سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

شیرف بارنی، سام کی لاش کے سامنے غم زدہ کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے پولیس والے تھے اور میری بھی وہاں موجود تھی۔ کچھ دیر بعد بارنی نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

میری بتانے لگی کہ وہ ایک انکوائری کے لیے آئی تھی اور اتفاق سے ڈاکو اسی کیبن میں موجود تھا اس نے کیبن کے مالک نیڈ کو پہلے ہی قتل کر دیا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو کچھ نہیں کہا تھا۔ بچی ایلس کا کہنا تھا کہ ڈاکو اچھا آدمی تھا اس نے ان کا خیال رکھا اور انہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ جین کو کچھ یاد نہیں تھا کیونکہ وہ اس دوران میں سوتی رہی تھی اور اس کی آنکھ شاٹ گن کے دھماکے سے کھلی تھی، اس نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی جب ڈاکو باہر جا رہا تھا۔ ایلس کا کہنا تھا کہ ڈاکو نے جو جیکٹ پہنی تھی وہ اس نے ایک انڈین چیف کو قتل کرکے لی تھی۔ پولیس کو انڈین کی لاش مل چکی تھی۔ بارنی کا موڈ سخت خراب تھا، اس سے پہلے کبھی اس کے علاقے میں ایک دن میں اتنی قتل و غارت گری نہیں ہوئی تھی اور خود اس کے دو آدمی مارے جا چکے تھے۔ اس کے لیے اصل دکھ یہی تھا۔ جب میری خاموش ہوئی تو اس نے کاٹ دار انداز میں کہا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا؟''

میری بھڑکی۔ ''میری وجہ سے کیوں؟''

''تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

میری کو اپنے باپ کی منطق پر حیرت ہوئی تھی، اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''شیرف! کیا اس ڈاکو کو میں نے یہاں پہنچایا تھا۔ کیا نیڈ کو اس نے میری وجہ سے قتل کیا اور سام اور کارل خود میرے ساتھ آئے تھے۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا لیکن سام کا کہنا تھا کہ ڈاکو اسی علاقے میں ہے۔ پھر اس نے سام کو شوٹ کیا تو میں نے کارل کو روکا تھا کہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے دوسروں سے رابطہ کرکے ناکا بندی کا کہا جائے لیکن وہ میری ایک سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور کیوں سنتا میں ایک لڑکی ہوں، پولیس کی ملازمت کے لیے مس فٹ ہوں...... مگر کیا ہوا؟ یہ سورما مرد اپنی جانوں سے گئے اور ڈاکو اب بھی آزاد ہے۔''

بارنی اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس نے گھٹے ہوئے

لہجے میں کہا۔ ''اب تم واپس دفتر جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں وہاں سے مت نکلنا۔''

''سوری شیرف، اب تم مجھے حکم نہیں دے سکتے۔ میری ایف بی آئی میں جاب کی درخواست منظور ہوگئی ہے اور کل میں باضابطہ پولیس فورس سے استعفیٰ دیدوں گی۔ مگر تم مجھے ابھی سے فارغ سمجھو۔'' میری کا لہجہ تند ہو گیا تھا، وہ کیبن کے اندر آئی اس نے جین اور اس کے بچوں کو لیا اور پولیس کار میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ شیرف، سام کی لاش اٹھوا رہا تھا پھر وہ اس طرف روانہ ہو گیا جہاں کارل کی لاش موجود تھی۔

☆☆☆

جینا مٹن پائی بنا رہی تھی۔ ایڈ کے سامنے ان کی بہترین شراب کی بوتل رکھی تھی اور وہ وقفے وقفے سے گلاس میں ڈال کر پی رہا تھا۔ ایڈ نے کلارک کی پولیس وردی والی تصویر دیکھ لی تھی اور اب اس سے اس کی پولیس سروس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کلارک اس کے سوالوں کے مختصر جواب دے رہا تھا۔ اچانک ایڈ نے پوچھا۔ ''موجودہ شیرف کس قسم کا آدمی ہے؟''

''اچھا آدمی ہے، وہ اچھا پولیس مین ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنے کا قائل نہیں ہے۔''

''تم کہہ سکتے ہو۔ وہ سخت مزاج ہے۔'' کلارک نے اس کی تائید کی۔

''اے مام۔'' ایڈ نے پکار کر کہا۔ ''کیا آج کے ڈنر میں کچھ لوگ اور بھی ہوں گے؟''

جینا ہچکچائی لیکن پھر اس نے انکار کیا۔ ''کوئی نہیں ہوگا۔''

''اچھا!'' ایڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ وہ ڈنر ٹیبل پر آگئے تھے، یہ خاصی بڑی ڈنر ٹیبل تھی اور اس پر آٹھ افراد کے لیے کرسیاں تھیں۔ ایڈ نے کلارک کو اس کی اپنی ہتھکڑی پہنا دی۔ اب وہ مجبور بیٹھا تھا، چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کلارک سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں کون ہو سکتا ہوں؟''

''میرا خیال ہے تم ان ڈاکوؤں میں سے ایک ہو جنہوں نے میڈیسن میں بینک سے پانچ ملین ڈالرز کی رقم لوٹی تھی۔ تمہارا ایک ساتھی کار کے حادثے میں مارا گیا اور تم اور تمہارے ساتھ کی لڑکی یہاں بھٹک رہے تھے۔''

''درست کہا۔'' ایڈ نے کہا۔ ''میری ساتھی لڑکی ابھی تک بھٹک رہی ہے۔''

''تم لوگ پولیس سے نہیں بچ سکو گے کیونکہ یہاں ہر طرف ناکا بندی ہے۔ جنگلوں میں بھی پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہوگی۔ ممکن ہے تمہاری ساتھی لڑکی اب تک پولیس کے ہاتھ لگ چکی ہو۔''

یہ بات ایڈ سے بہتر کون جانتا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ دونوں پولیس والے مارے گئے اور وہ بچ گیا تھا۔ اسے شاٹ گن نے بچا لیا تھا۔ باہر رات ہو چکی تھی۔ مکان کے سامنے تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ کلارک کا مکان قصبے سے ذرا ہٹ کر تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا مکان اور تھا باقی آس پاس خالی زمین تھی جس پر برف جمع تھی۔ اس لیے یہاں کسی پڑوسی کے آنے کا امکان کم تھا، جو بھی آتا خاص طور سے آتا۔ جینا ڈشیں تیار کر رہی تھی اور جو تیار ہوتی جا رہی تھیں انہیں میز پر لا رہی تھی۔ انہیں گرم رکھنے کے لیے فی الحال ہاٹ پاٹ میں رکھا تھا۔ وہ کام کر رہی تھی لیکن اس کے انداز سے کشیدگی صاف جھلک رہی تھی۔ اچانک باہر سے کسی گاڑی کی روشنیاں کھڑکی پر لہرائیں تو جینا نے باہر جھانکا۔ اسے جے کا ڈوج ٹرک دکھائی دیا جو سڑک سے گھوم کر مکان کی طرف آ رہا تھا۔

''میرے خدا۔۔۔!''

''کیا ہوا مام؟'' ایڈ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''جے۔۔۔۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔ وہ آگیا ہے۔''

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے اسے بھی اندر لے آؤ۔''

وہ جانتی تھی کہ جے غصے کا تیز تھا اور اسے معلوم ہوتا کہ گھر میں ایک مسلح ڈاکو نے انہیں یرغمال بنا رکھا ہے تو نہ جانے اس کا کیا ردعمل ہوتا۔ جینا اسی لیے پریشان تھی۔ جے اور جیسی ٹرک سے اترے تھے۔ ایڈ نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ دونوں ساتھ ساتھ لگے ہوئے آ رہے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ان کے درمیان کس قسم کا تعلق قائم ہو چکا ہے۔ ایڈ کا چہرہ تن گیا تھا۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''تو یہ بات ہے۔''

وہ دونوں دروازے تک پہنچ گئے تھے لیکن ان کے دستک دینے یا کال بیل کا بٹن دبانے سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ سامنے جینا تھی۔ وہ باہر آئی اور جے کے گلے لگ گئی۔ اس کے تاثرات نے جے کو بتا دیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ''مام، کیا بات ہے پاپا ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں لیکن اندر ایک آدمی ہے۔'' جینا نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''وہ مسلح ہے۔''

''کیا وہ زبردستی اندر آیا ہے؟'' جے کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

''پلیز، خود کو ٹھنڈا رکھو۔'' جینا نے سہم کر کہا۔

وہ اندر آئے تو ایڈ میز پر شاٹ گن رکھے بیٹھا تھا۔ جے بے قابو ہو کر اس کی طرف بڑھا تو ایڈ نے شاٹ گن اٹھا کر کلارک کے سر سے لگا دی۔ ''کیا خیال ہے، تم ڈنر کے موقع پر اپنے باپ کا اڑا ہوا سر دیکھنا چاہو گے؟''

جے رک گیا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''ابھی تو تم دونوں بیٹھ جاؤ۔۔۔ فی الحال میں سکون سے ڈنر کرنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میں پہلا موقع ہے جب میں تھینکس گیونگ ڈے کا ڈنر کر رہا ہوں۔''

''پلیز۔'' جیسی نے کہا تو جے کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کی کینہ توز نظریں ایڈ پر مرکوز تھیں۔ جیسی سہمی ہوئی نظریں جھکا کر بیٹھی تھی، وہ ایڈ سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھی۔ ایڈ نے جے کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

''کیا تم مجھے آزمانا چاہ رہے ہو۔۔۔ لیکن میں بتا دوں یہ اچھا خیال نہیں ہوگا۔''

''پلیز۔'' جینا نے التجا کی۔ ''کوئی بات نہ کرے اور میں ڈنر سرو کرنے والی ہوں۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

جینا سب کے لیے ڈنر سرو کرنے لگی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ شخص سکون سے یہاں سے چلا جائے، کوئی قتل خون خرابا نہ ہو۔ وہ کلارک اور جے دونوں کی سلامتی چاہتی تھی۔

☆☆☆

شیرف بارنی، کارل کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس کے بھائی کا بیٹا تھا، اس کا اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا اور وہ کارل کو ہی اپنا بیٹا سمجھتا تھا اور اس وقت یہ بیٹا مردہ حالت میں برف پر پڑا تھا۔ اچانک بارنی کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ برف پر بیٹھ گیا، اس کے منہ سے ایک بلند چیخ نکلی اور وہ رونے لگا۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا جو اسے روتے دیکھتا اس لیے وہ بلند آواز سے کارل کا غم منا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا مگر اس کی جگہ اب اس کے سینے میں آتش انتقام بھڑکنے لگی تھی اور وہ اس شخص کو اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتا تھا جس نے کارل کی جان لی تھی۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا اور وہ اسے ذاتی سطح پر نمٹانا چاہتا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے ریڈیو سے کال کر کے ایمبولینس اور عملہ بھیجنے کو کہا۔

بارنی نے ٹارچ روشن کرلی کیونکہ تاریکی بڑی تیزی سے آئی تھی۔ اس نے برف پر نشانات تلاش کیے اور جلد اسے ایک اسنو بائیک کے نشانات مل گئے۔ وہ شمال کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ان نشانات پر آگے بڑھنے لگا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ قاتل کتنا آگے نکل گیا تھا، اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اگر امریکا کی سرحد عبور کر کے کینیڈا جا چکا تو وہ وہاں بھی اس کا پیچھا کرے گا۔ جب تک وہ اسے پا نہیں لے گا اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔

مہکتی کلیاں

☆ جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہاری دعائیں قبول نہ ہو رہی ہوں تو دو چیزوں کا احتساب کرو، اپنی غذا اور اپنی گفتگو کا۔

☆ ریس میں جیتنے والا گھوڑا نہیں جانتا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے، وہ ڈرتا ہے تو صرف اپنے مالک کی طرف سے ملنے والی تکلیف کی وجہ ہے۔ تو جب کبھی تم خود کو تکلیف میں پاؤ تو سمجھ جانا کہ تمہارا مالک (اللہ تعالیٰ) چاہتا ہے کہ صرف جیت تمہاری ہو۔

☆ محنت اور جدوجہد سیڑھیوں کی طرح ہے اور مقدر لفٹ کی طرح۔ یاد رکھو! کسی وقت لفٹ کام کرنا بند کرسکتی ہے مگر سیڑھیاں کھلی رہتی ہیں اور یقینی طور پر بلندی تک لے جاتی ہیں۔

☆ دو چہرے انسان کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ایک جو مشکل حالات میں ساتھ دے اور دوسرا چہرہ وہ جو مشکل حالات میں ساتھ چھوڑ دے۔

☆ کسی انسان کی نرمی، اس کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتی کیونکہ پانی سے نرم کوئی چیز نہیں ہے لیکن اس کی طاقت چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہٰ، نیو سینٹرل جیل، بہاولپور

☆☆☆

میری نے جین اور اس کے بچوں کو جین کی ماں میگار تھی کے گھر چھوڑا تھا۔ میگار تھی اس کی بہت شکر گزار تھی۔ ''اگر تم نہ جاتیں تو وہ ڈاکو نہ جانے جین اور اس کے بچوں کے ساتھ کیا کرتا؟''

"یہ میری ڈیوٹی ہے۔" میری نے کہا۔ وہ باقی وقت دفتر میں رہی تھی۔ چھ بجے اس کی آف ہوئی تو وہ جینا کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔ اسے اپنے دو ساتھیوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ سام اسے پسند کرتا تھا اور وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی۔ کلارک اس کا کزن تھا۔ اسے اپنے باپ کے ردعمل پر غصہ آیا تھا جو اس ساری صورت حال کا ذمے دار اسے قرار دے رہا تھا، اس نے اپنے آدمیوں کے طرزِعمل کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ جینا کے گھر ڈنر کر کے اپنے گھر جا کر سو جانا چاہتی تھی۔ یہی ایک صورت تھی تھکن اور اعصابی کشیدگی ختم کرنے کی۔ جینا کے گھر کے پاس پہنچ کر اس نے حسبِ عادت ایک لمحے کو پولیس سائرن آن کر کے آف کیا تا کہ جینا اور کلارک کو اس کی آمد کی اطلاع مل جائے۔ وہ کار سے اتری تو خلافِ توقع ابھی تک جینا یا کلارک میں سے کوئی باہر نہیں آیا تھا لیکن اس نے اتنی توجہ نہیں دی۔ وہ دروازے تک آئی تو دروازہ کھل گیا۔ وہاں جینا موجود تھی اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ "کیا ہوا مام؟"

"کچھ نہیں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "اندر آؤ۔"

جینا اندر آئی تھی۔ ڈنر کی میز پر جے اور ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ خلافِ توقع ایک اجنبی مرد بھی دکھائی دیا۔ جیسے ہی میری سامنے آئی، اس نے اجنبی کے ہاتھ میں کسی گن کی جھلک دیکھی اس کا ہاتھ خودکار انداز میں اپنے پستول کی طرف بڑھا لیکن اتنی دیر میں ایڈ شاٹ گن نکال کر کلارک کے سر سے لگا چکا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "اپنی بیلٹ اتار کر میری طرف سرکا دو۔"

شاٹ گن کی نال کلارک کے سر سے لگی تھی اور ٹریگر پر ایڈ کی انگلی تھی۔ مجبوراً اس نے پستول والا بیلٹ کھول کر نیچے رکھا اور اسے پاؤں سے ایڈ کی طرف سرکا دیا۔ جینا نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔ "آئی ایم سوری ڈیئر لیکن میں مجبور تھی۔"

"سب ٹھیک ہے۔" میری نے اسے تسلی دی۔

"پلیز سیٹ لو۔" ایڈ نے حکم دیا سب کے سامنے پلیٹوں میں کھانا موجود تھا لیکن کسی نے ابھی تک شروع نہیں کیا تھا۔ ایڈ نے دوسرا حکم دیا۔ "سب کھانا شروع کریں۔"

لیکن جب کسی نے اپنی پلیٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس نے دہاڑ کر کہا۔ "کھاؤ۔"

بادلِ ناخواستہ ان لوگوں نے کھانا شروع کیا۔ ایڈ نے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر منہ میں رکھا اور اسے چباتے ہوئے بولا۔ "جے، کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟"

"یہ میری دوست ہے۔"

"اوہ، تب میں اسے پیار کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔" ایڈ نے کہتے ہوئے جیسی کے رخسار پر پیار کیا۔ جے غرا کر اٹھا۔ ایڈ نے شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کیا تھا کہ کلارک نے نال پکڑ کر اس کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ نہ جانے ایڈ فائر کرنے جا رہا تھا یا کلارک کے اوپر کرنے کی وجہ سے شاٹ گن کا ٹریگر دب گیا اور گولی چل گئی۔ بلٹ چھت پر لگا تھا۔ جے نے آگے ہو کر ایڈ کے منہ پر گھونسا مارا وہ جھٹکے سے اپنی نشست پر گرا لیکن اس سے پہلے کہ وہ یا میری مزید کوئی حرکت کرتے، اس نے شاٹ گن ایک جھٹکے سے چھڑا لی۔ جینا خوفزدہ انداز میں سب سے پرسکون رہنے کی اپیل کر رہی تھی۔ مشتعل ایڈ نے شاٹ گن کا رخ دوبارہ جے کی طرف کیا تو جیسی نے نال پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

"نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔"

ایڈ ہانپتے ہوئے جے کو گھور رہا تھا پھر اس نے ایک جھٹکے سے نال پیچھے کر لی اور غرا کر بولا۔ "میں اس کتے کو چھوڑوں گا نہیں۔"

جینا اور کلارک نے سکون کا سانس لیا ورنہ ان دونوں کو لگا تھا کہ وہ جے پر گولی چلا دے گا۔ جیسی نے ایڈ سے کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔"

"جیسی نہیں جائے گی۔" جے بولا۔

"تم کیا کہتی ہو؟" ایڈ نے جیسی کی طرف دیکھا۔ "کیا تم نے اسے میرے بارے میں نہیں بتایا۔"

"جیسی، یہ کیا کہہ رہا ہے؟" جے بولا۔ "کیا تم اسے جانتی ہو؟"

جیسی نے سر ہلایا اور پھر ملتجی لہجے میں ایڈ سے بولی۔ "میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی، میں نے جے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ تم سے محبت کرتا ہے؟" ایڈ نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ "اگر اسے تمہارے بارے میں معلوم ہو جائے تو اس کی محبت کہاں جائے گی؟"

جے کنفیوز ہو گیا۔ جیسی اور اس شخص کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ جیسی نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" ایڈ نے تند لہجے میں کہا اور جیسی کے بال پکڑ لیے۔ "تم میرے ساتھ جاؤ گی۔"

جے نے مداخلت کرنا چاہی لیکن اسی لمحے میری کے شانے سے بندھا ریڈیو کھڑکھڑایا اور اس سے شیرف بارنی کی آواز آئی۔ "شیرف کالنگ... میں کلارک کے مکان کے پاس ہوں اور میرا خیال ہے ڈاکو نے یہاں پناہ لے رکھی ہے، آس پاس موجود تمام پولیس کاروں کو اس طرف بھیج دو... کیا تم نے سن لیا ہے؟"

"یس شیرف۔" ماما کیتھی کی آواز آئی۔ "میں ابھی سب کو ہدایات جاری کرتی ہوں۔"

میری اور جینا کے چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ میری کو موقع نہیں ملا کہ وہ ریڈیو آف کرتی۔ ایڈ مسکرایا۔ "اوہ، تو اب شیرف خود یہاں آرہا ہے۔"

☆☆☆

شیرف بارنی نے اسنو بائیک تلاش کر لی تھی اور اس سے کچھ دور وہ قصبہ تھا جہاں کلارک رہتا تھا وہ چلتا ہوا قصبے تک آیا تو اتفاق سے پہلا مکان ہی کلارک کا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ وہاں نہ صرف ایک پولیس کار بلکہ ایک ڈوج ٹرک بھی کھڑا ہوا تھا۔ اسنو بائیک سے پیروں کے نشانات کلارک کے مکان تک آئے تھے اور اسی وجہ سے بارنی کو یقین ہو گیا کہ ڈاکو اندر موجود ہے۔ اس نے ریڈیو سے دفتر اطلاع دی اور پولیس کاریں بھیجنے کا حکم دیا۔ اب اسے کرنا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ رک کر پولیس کی آمد کا انتظار کرتا لیکن وہ کارل کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا اس لیے اس نے اکیلے اندر جانے کا فیصلہ کیا، اس نے ریڈیو اتار کر وہیں پھینک دیا اور خار دار تاروں سے ہوتا مکان کے احاطے میں داخل ہوا۔ اس نے سامنے والے حصے سے جانے کے بجائے مکان کے پچھلے حصے کا رخ کیا، اسے معلوم تھا کہ ایک دروازہ اس طرف بھی تھا۔ خوش قسمتی سے وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا اور سیڑھیوں کے پاس سے ہوتا ہوا اندر آیا۔ وہاں خاموشی تھی جبکہ کئی افراد کی موجودگی یقینی تھی اور اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ دبے قدموں کچن اور ڈائننگ والے حصے کی طرف آیا، اس نے پستول نکال لیا تھا اور گولی چلانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے ذرا سا جھانکا اور اسے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے افراد دکھائی دیے ان میں انڈین جیکٹ والا اس کی طرف پشت کر کے بیٹھا تھا، اس نے سر پر ہیٹ لیا ہوا تھا۔ بارنی جانتا تھا انڈین جیکٹ ڈاکو نے پہن رکھی ہے اس لیے اسے گولی چلانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ اس نے اچانک سامنے آتے ہوئے اس کی پشت میں گولی اتار دی مگر جواب میں چیخ لڑکی کی سنائی دی تھی۔ وہ کرسی سے نیچے گری اس کا ہیٹ الگ ہو گیا تب بارنی نے دیکھا وہ میری تھی، اس کی اپنی بیٹی۔

"خوش آمدید شیرف۔" سائڈ سے ایڈ، کلارک کو ڈھال بنائے نمودار ہوا۔ کلارک کو دیکھ لینے کے باوجود بارنی نے پستول کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کی لیکن ایڈ کی شاٹ گن نے پہلے شعلہ اگل دیا اور بارنی اچھل کر فرش پر جا گرا۔ گولی نے اس کا بایاں پہلو ادھیڑ دیا تھا۔ اس موقعے پر کلارک نے جرأت کا مظاہرہ کیا، شاٹ گن کی نال اس کی بغل سے نکلی ہوئی تھی، اس نے نال پکڑتے ہوئے دائیں ہاتھ کی کہنی ایڈ کے پیٹ میں ماری وہ کراہا اور دوبارہ گولی چلائی لیکن اس بار کوئی نشانہ نہیں بنا تھا۔ پھر اس نے کلارک کو گھما کو ایک طرف اچھال دیا۔ اسی لمحے جے حرکت میں آیا۔ اس نے میز ایڈ پر الٹ دی اور پھر اس پر اچھل کر آیا۔ ایڈ کھڑا ہوا تھا کہ جے اسے لیتے ہوئے کھڑکی توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ ایڈ کی شاٹ گن اندر ہی رہ گئی تھی اور اسے پستول نکالنے کا موقع نہیں ملا۔ جے نے اٹھتے ہی اسے گھونسا مارا۔ وہ پیچھے گیا اور اس نے جے کو جوابی گھونسا مارا۔ اس کا ہاتھ بھی سخت تھا مگر جے باکسر تھا اس کی ضرب کہیں بہتر تھی دوسرے گھونسے نے ایڈ کو نیچے گرا دیا اور جے اس پر چھا گیا تھا۔ اس نے لگاتار کئی گھونسے مارے اور ایڈ کا حلیہ بگڑ گیا۔

"تم ذلیل... گھٹیا شخص... تم جیسی کو لے جانا چاہتے تھے۔" ایڈ کہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ "اب لے جا کر دکھاؤ۔" اس نے آخری گھونسا مارا اور ایڈ بے دم ہو کر گر گیا۔ جے نے اسے چھوڑا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جیسی کی طرف بڑھا جو باہر نکل آئی تھی۔ وہ اس کی طرف آتے آتے رک گئی، اس کی نظر ایڈ کی طرف تھی۔ جے نے مڑ کر دیکھا ایڈ نے پستول نکال لیا تھا اور اس کی طرف رخ کیا تھا۔

"تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

جے خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ "ہاں، میں اس سے محبت کرتا ہوں اور کوئی جیسی کو مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" ایڈ نے دانت پیسے، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس پر گولی چلا دے گا مگر جیسی بر وقت چلائی۔

"نہیں، تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔" جیسی نے کہتے ہوئے پستول نکالا اور اپنے سر سے لگا لیا۔ "اگر تم نے اس پر گولی چلائی تو میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔"

ایڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اس کی خاطر خود کو مار لو گی۔"

"ہاں... کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں، اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم تو میرے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔" ایڈ نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں مگر اب... میں جے کے ساتھ ہوں۔"

"تم اس سے محبت کرتی ہو؟" ایڈ نے پوچھا۔ اسی لمحے کئی پولیس کاریں وہاں آکر رکیں اور ان سے پولیس والوں نے نکل کر ہتھیار تان لیے تھے۔ ایک چلا چلا کر ایڈ اور جیسی سے گن پھینکنے کو کہہ رہا تھا۔

"ہاں، میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

ایڈ نے پلٹ کر دیکھا اب بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔ اسے پکڑے جانا منظور نہیں تھا۔ جیسی نے التجا کی۔ "پلیز، ہتھیار پھینک دو۔"

"نہیں۔" ایڈ نے کہا اور جے کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اس کی حفاظت کرو گے۔ اسے بچاؤ گے؟"

"ہاں، میں اس کی حفاظت کروں گا۔" اس نے کہا۔

"یاد رکھنا جیسی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" ایڈ نے کہا اور اچانک پستول اپنے سر پر رکھ کر گولی چلا دی۔ جیسی چلائی مگر اتنی دیر میں ایڈ گولی چلا چکا تھا۔ وہ پستول پھینک کر اس کی طرف بھاگی اور اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ پولیس والے آ گئے تھے، انہوں نے ہتھیار اپنے قبضے میں کیے اور پھر جیسی کو ایڈ کی لاش کے پاس سے ہٹا دیا۔ جے اسے اندر لے آیا۔ پولیس کاروں کے ساتھ ایمبولینس بھی آئی تھی۔ فوراً ہی زخمی بارنی کو ایمبولینس میں منتقل کر کے اسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔ گھر میں کلارک، جینا، جے اور جیسی کے ساتھ میری بھی تھی اور اس نے بھی جیسی اور ایڈ کی گفتگو سنی تھی۔ جینا اس کی جیکٹ کے نیچے موجود بلٹ پروف میں گھسی گولی نکال رہی تھی۔ بلٹ پروف نے اسے بچا لیا تھا۔ جب جے نے اس سے درخواست کی کہ وہ پولیس کے سامنے جیسی کا ایڈ سے تعلق پوشیدہ رکھے تو اس نے کہا۔

"میں پولیس فورس چھوڑ چکی ہوں اور تم بے فکر رہو۔"

جے نے سکون کا سانس لیا۔ ایڈ کے پاس موجود بیگ سے تین ملین ڈالرز کی رقم ملی تھی۔ جبکہ جیسی کے پاس بھی رقم والا بیگ موجود تھا۔ جے نے وہ بیگ بھی ایڈ کے بیگ کے ساتھ رکھ دیا اور اس کے بارے میں یہی بتایا کہ وہ بھی ایڈ لایا تھا۔ بارنی زخمی تھا، اس کے نائب کیمسن نے سارے معاملات نمٹائے تھے۔ اس نے جے، میری اور باقی سب کے بیانات من وعن تسلیم کر لیے تھے۔ جیسی کو جے نے اپنی دوست ظاہر کیا تھا جو میڈیسن سے اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کینیڈین سیاح تھی جو اب واپس جا رہی تھی۔ اس کے پاس شناخت کے لیے کینیڈا کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ امریکا اور کینیڈا کے شہریوں کو ایک دوسرے کے ملک میں آنے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر وہ زمینی راستے سے سرحد عبور کریں تو صرف شناختی کاغذات دکھا کر بھی آجا سکتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں سارا معاملہ نمٹ گیا تھا۔ بارنی کے بارے میں اسپتال سے اطلاع آئی تھی کہ اس کی جان بچ گئی تھی مگر اسے خاصے عرصے اسپتال میں رہنا تھا۔

پولیس کے جانے کے بعد جے اور کلارک کارڈ بورڈ سے ٹوٹ جانے والی کھڑکی کو عارضی طور پر بند کر رہے تھے تاکہ سردی اندر نہ آئے۔ کچن میں جینا کے ساتھ جیسی صفائی کرا رہی تھی۔ میز اور کرسیاں اپنی جگہ لگا کر اور بچ جانے والی ڈشز ان پر سجا کر جینا نے جے اور کلارک کو ڈنر کے لیے پکارا۔ ڈنر کے بعد جے اور جیسی لیونگ روم میں آ بیٹھے تھے۔

"پولیس ایڈ کی لاش کا کیا کرے گی؟"

"پاپا کوشش کریں گے کہ تدفین ہمارے سامنے ہو۔" جے نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گی؟"

جیسی نے اس کے شانے پر سر ٹکا دیا۔ "میں یہیں رہوں گی۔"

جے خوش ہو گیا۔ "ویسے بھی ایڈ نے تمہیں میری ذمے داری بنایا ہے لیکن تم نے بتایا نہیں وہ کون تھا، تم سے محبت کرتا تھا؟"

"ہاں، لیکن وہ والی نہیں جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ میرا بڑا بھائی تھا۔" جیسی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "وہ اس دنیا میں میرا واحد رشتہ تھا۔"

"اوہ۔" جے نے گہرا سانس لیا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن اس نے خودکشی کیوں کی؟"

"تاکہ پولیس اس سے میرا تعلق نہ جوڑ سکے۔"

لیونگ روم کی کھڑکی سے باہر سفید برف پر خون کا دھبا نمایاں تھا۔ خون کے رشتے نے خون دے کر اسے محفوظ کر دیا تھا۔

☒

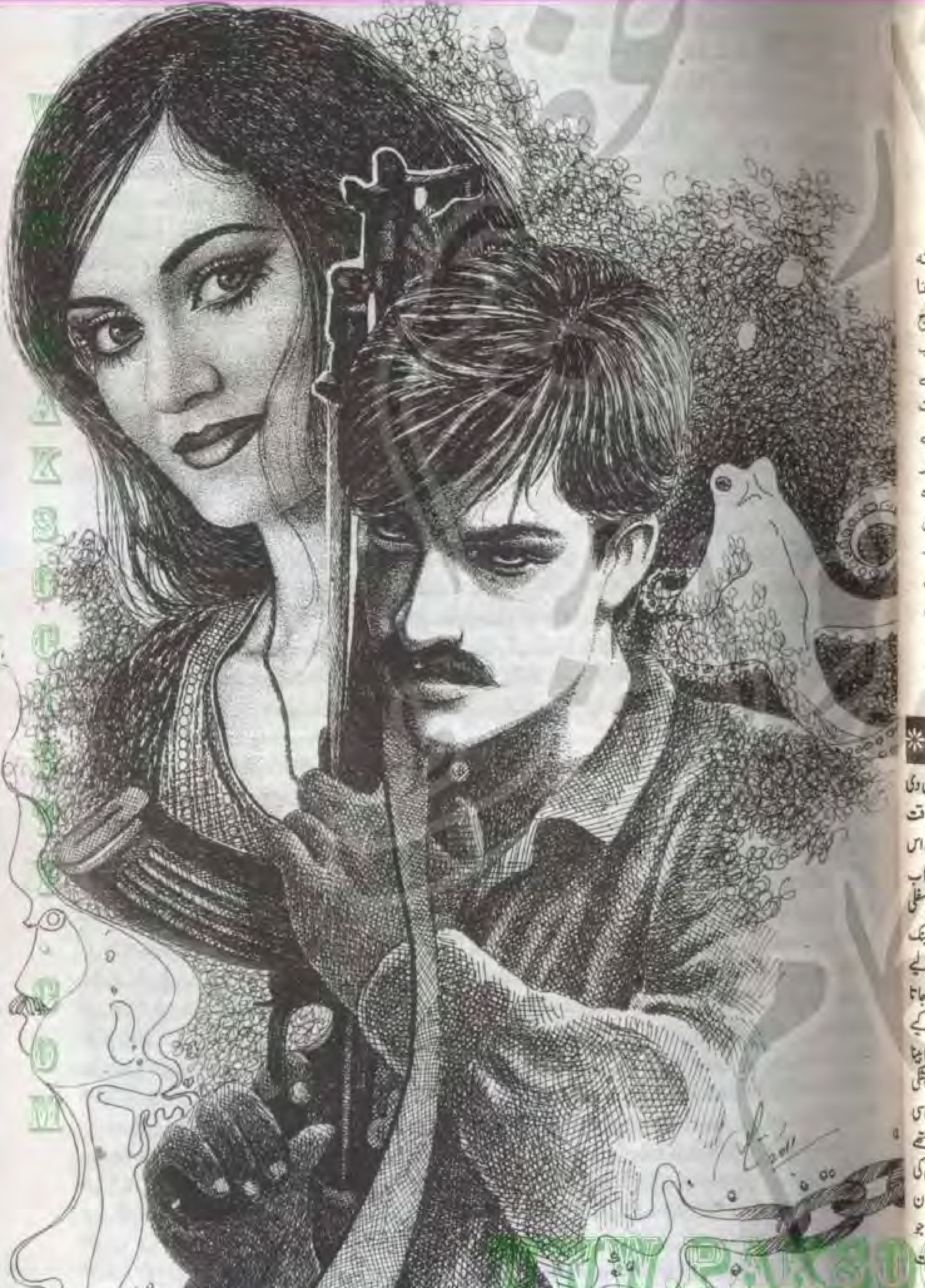

قسط نمبر : 26

کشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعائیں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ، ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست

میڈم روبی کی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بہ ظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے علم میں لے آتا حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے تیجو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحین کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے مگر امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگزیب طرمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سعی میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی تابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا

اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی حویلی میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے، کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ وشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ وشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہتی ہے اور شہلا ورما اور جوتی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا استعفیٰ منظور نہیں ہو رہا تھا اسے ”کوبرا“ کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کر دے بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کر لیا اور اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان کشیدگی قائم ہو گئی۔ وشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مفید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو ”شکرہ“ کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔ اورنگ زیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آکٹوپس کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگزیب بینا سے پوچھ گچھ کرتا ہے کرنل احتشام وشنو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور سکندر علی شاہ کو نام سے بلیک میلنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ سکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کراتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ یہ لوچن اور جگا کی کارروائی تھی۔ لیاقت حسین کے حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے بعد گرفتاری دینے کے بعد اسے بری کرنے والے مجسٹریٹ کی پراسرار موت واقع ہوتی ہے۔ دارا کی بیوی روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا جاتا ہے اور سابق چیف پولیس علیم احمد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب ماروی سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ دوسری جانب وشنو ملٹری کسٹڈی میں تفتیش کے دوران مارا جاتا ہے۔

سیوا سماج کی میت گاڑی اس وقت شمشان گھاٹ جانے والے راستے پر رواں دواں تھی۔ اس وقت رات کے دو بجے کا عمل تھا، سڑک پر ٹریفک نام کو بھی نہیں تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر میں ہندو تنظیم کا نائب پرشوتم بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ جب ڈرائیور نے آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔

''اتنی رات گئے کس کی ارتھی کو آگ لگانا ضروری ہے؟''

پرشوتم نے چونک کر ڈرائیور کو دیکھا، کسمسا کر بولا۔ ''تجھے کس بات کی چنتا ویاکل کر رہی ہے؟''

''راستے میں پولیس چوکی بھی پڑتی ہے۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''وہ بھی یہی سوال کر سکتے ہیں۔''

''اس کا بندوبست کرلیا گیا ہے۔'' پرشوتم نے اس بار بھی روکھے لہجے میں جواب دیا اور فوراً ہی کینچلی بدل کر بولا۔ ''مرنے والا فوجی افسران کی قید میں تھا۔ ان ہی کہنے کے انوسار ہمیں اس وقت چتا کو آگ دکھانی ہوگی۔ رہا پولیس چوکی کا معاملہ تو اس کی بات میں نے پہلے ہی کرلی ہے گھاٹ پر ہمارے آدمیوں نے چتا بھی تیار کرلی ہوگی۔''

''کون غریب تھا جو فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا؟''

''آم کھانے کی بات کیا کر۔'' پرشوتم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''زیادہ کھوجنے کی گھات نہ لگایا کر۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈرائیور نے بے پروائی سے کہا۔ ''کل کو کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو پھر میں سب کو وہی بیان دوں گا جو میرا من چاہے گا۔''

''زیادہ لمبی چوڑی باتیں کرنی چھوڑ دے۔'' پرشوتم نے چمک کر کہا۔ ''تیری ڈیوٹی کیوں گارڈ والی پسند کی ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو اس سے بھی تیرا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

ڈرائیور نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ پرشوتم کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔ شاید اس لیے کہ پرشوتم کوئی چار مہینے پہلے سیوا سماج کا نائب بنا تھا جب کہ ڈرائیور دو سال سے اپنی پوری ڈیوٹی ایمان داری سے نباہ رہا تھا۔

راستے میں گاڑی کو پولیس چوکی پر پوچھ گچھ کے لیے روکا گیا۔ پرشوتم نیچے اتر کر چوکی کے اندر چلا گیا پھر دو منٹ بعد واپس بھی آگیا اور چوکی سے ایک سادہ لباس والا گاڑی میں سوار ہوگیا تھا۔

شمشان گھاٹ پر پرشوتم کے کہنے کے مطابق سیوا سماج کے تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔ چتا بھی تیار کرلی گئی تھی۔ چتا کے ساتھ تیل کا وہ کنستر موجود تھا جسے لکڑیوں پر چھڑک کر آگ دکھانی تھی۔ گاڑی رکنے کے بعد سادہ لباس والا کچھ دور اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ گھاٹ پر موجود تینوں آدمیوں نے مل کر بانسوں کی بنی وہ ارتھی بھی گاڑی سے نکال لی جس پر وشنو کا اکڑا ہوا جسم پڑا تھا۔ سب نے مل کر دس بارہ بار رام ست ہے کے نعرے بلند کیے۔ ارتھی کو لکڑیوں کے ڈھیر کے اوپر رکھ دیا گیا۔ کنستر کا تیل لکڑیوں کے ڈھیر پر چاروں طرف چھڑک دیا گیا پھر سب خاموش کھڑے ہوگئے تو پرشوتم نے دھرم کے انوسار کوئی اشلوک پڑھا، اس کے بعد پرشوتم نے چتا کو آگ بھی لگادی۔

آگ آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ جب درختوں کے جھنڈ کے دوسری جانب سے فائر کی آواز ابھری جسے سن کر سب ہی چونکے تھے۔ ڈرائیور نے اس بار بھی درختوں کے سمت جانے کی کوشش کی تھی جب پرشوتم نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ مدھم لہجے میں کہا۔

''ادھر جھاڑیوں کے بیچ خرگوشوں نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ مچھیروں کی بستی کے لوگ اکثر رات گئے ان کا شکار کرنے آجاتے ہیں۔'' ڈرائیور نے ایک نظر پرشوتم کو گھورا تو وہ بھی سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ چتا کی آگ پوری طرح بھڑک رہی تھی۔ فائر کی آواز پر بس ایک لمحے کو سب ہی کی توجہ اس طرف ہوگئی تھی لیکن پھر وہ اس وقت تک سر جھکائے کھڑے رہے جب تک چتا کی آگ سرد نہیں ہوگئی۔ سادہ لباس والا جو درختوں کے پاس چلا گیا تھا دوبارہ قریب آکر پرشوتم سے بولا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''دو کنستر پانی گرم راکھ پر ڈال کر واپس لوٹ چلیں گے۔''

''کیا مرنے والے کی راکھ نہیں لوگے؟'' سادہ لباس والے نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''سنا ہے اس راکھ کو پیتل کی لٹیا میں جمع کرکے کسی شبھ گھڑی میں دریا میں بہا دیتے ہیں؟''

''ٹھیک سنا ہے۔ پر تو یہ کام مرنے والے کے گھر والے کرتے ہیں۔'' پرشوتم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''جو اناتھ (لاوارث) ہوتا ہے اس کے لیے ہم یہ روگ نہیں پالتے۔''

''مرنے والے کی لاش تمہیں کہاں سے مل گئی؟'' سادہ لباس والے کے لیے بھی تجسس تھا۔

''اناتھ آشرم ہی کا ایک سیوک تھا جس کے آگے پیچھے کوئی اور نہیں تھا۔''

''اوہ۔'' سادہ لباس والے نے شانے اچکا کر کہا پھر واپسی کے وقت بھی وہ گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔

''اس وقت کہاں ہو؟'' دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

''سارا کریا کرم ہوگیا سر۔ ہم اب واپس لوٹ رہے ہیں۔''

''کوئی خاص بات؟''

''یس سر، چتا کو آگ لگانے کے بعد گھنے درختوں کی طرف سے ایک فائر کی آواز ابھری تھی لیکن جس خرگوش پر گولی داغی گئی تھی وہ بچ کر نکل گیا۔ میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''رات پولیس چوکی پر ہی گزارنا۔'' تحکمانہ لہجے میں کہا گیا۔ ''میں نے ڈیوٹی آفیسر سے بات کرلی ہے۔''

''رائٹ سر۔''

''ایک بات اور...... کسی کے سوال کا کوئی جواب مت دینا۔ اپنی زبان بند ہی رکھنا۔'' اس بار بھی سپاٹ لہجے میں کہا گیا پھر لائن منقطع کردی گئی۔

☆☆☆

سبکدوش ہونے والے ڈی آئی جی، علیم احمد کے قتل کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی تو ایک بار پھر عوام میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں بھی اوپر سے نیچے تک کھلبلی مچ گئی۔ اسی ضمن میں آئی جی نے بھی متعلقہ تھانے کے ذمے دار افسران کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج کو بھی طلب کرلیا تھا۔

بند کمرے میں خاصی دیر تک مختلف پہلوؤں پر زبانی جمع خرچ ہوتی رہی لیکن قتل کے اسباب کیا تھے؟ قاتل کون تھا جس نے صرف مرحوم کو بیدردی سے قتل کیا پھر سارا قیمتی سامان چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ پولیس کی کوشش بسیار کے باوجود جائے وقوع سے کسی قسم کے فنگر پرنٹس یا دوسرا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ قتل کے اسباب کیا تھے؟

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او بھی میٹنگ کے دوران صرف اپنی تفتیشی رپورٹ دہراتا رہا جس سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کسی نامعلوم شخص نے اسے فون کرکے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ اس کے بعد ہی ایس پی اورنگ زیب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے بھی ایس ایچ او کو جوائن کیا تھا۔

''آپ کی کیا فائنڈنگس (Findings) ہیں؟'' آئی جی اورنگ زیب سے سوال کیا۔

''میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ شاید اس لیے کہ مجرموں نے بڑے شاطرانہ انداز میں واردات کی ہے۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''علیم احمد صاحب نے میری اطلاع کے مطابق ریٹائر ہونے کے بعد ہی گارڈ ڈیوٹی کے عملے کو بھی فارغ کردیا تھا۔ ایک ملازم تھا جو سارے کام انجام دیتا تھا۔ واردات کرنے والوں نے اسے پہلے ہی بے ہوش کرکے سرونٹ کوارٹر میں ڈال دیا تھا۔''

''گویا اب اس شہر میں کسی کی جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔'' آئی جی نے الجھ کر کہا پھر دوبارہ ایس ایچ او سے مخاطب ہوا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟''

''آج شام تک وہ بھی مل جائے گی۔ میں ڈاکٹر سے ملا تھا لیکن اس نے رپورٹ سے قبل کوئی رائے نہیں ظاہر کی۔''

''جائے وقوع سے کوئی اور کلیو بھی ملا؟''

''نو سر۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''ہم نے کوٹھی کا ہر حصہ کھنگال ڈالا ہے۔''

''اخبار کو اس واردات کی خبر کس طرح مل گئی؟'' آئی جی نے تلملا کر سوال کیا۔

''جن لوگوں نے ایس ایچ او کو اطلاع دی ان کو اخبارات کے دفتر میں بھی فون کرنے سے کون روک سکتا تھا۔'' ایس ایچ او کے بجائے اورنگ زیب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قانون کی بالادستی بھی اب محض برائے نام رہ گئی ہے۔''

آئی جی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اورنگ زیب کے تلخ جواب کو وہ حلق کے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا جبھی فون کی گھنٹی نے اس کی مشکل آسان کردی۔

''ہیلو۔'' اس نے ریسیور اٹھا کر خشک لہجے میں کہا۔

''آئی جی اسپیکنگ۔''

''ہوم منسٹر بھی ہوتے تو میری صحت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہارے آفس میں جو افسران جمع ہیں وہ بھی تمہاری طرح وقت برباد کر رہے ہیں۔''

''کون بول رہا ہے؟'' آئی جی جھنجلا گیا۔

''آکٹوپس......'' سرسراتے لہجے میں جواب ملا۔

‘‘اپنے ہونہار ایس پی کو بھی ہوشیار کردینا۔ ابھی تک میں نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔ جس دن یہ مدت ختم ہو گئی اس کو بھی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دوں گا۔’’ جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ ختم کر دیا گیا۔

آئی جی نے جس انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھا اسے سب ہی نے محسوس کرلیا تھا لیکن کسی نے کچھ کہنے کی جسارت نہیں کی۔ خود آئی جی بھی کچھ دیر ہونٹ چباتا رہا پھر اس نے دوبارہ اورنگ زیب کو مخاطب کیا۔

‘‘کسی نامعلوم فرد نے کال کی تھی اور...... اس نے خاص طور پر آپ کے سلسلے میں بھی کچھ نازیبا بات کی ہے۔’’

‘‘یقیناً کی ہوگی۔’’ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ‘‘مجرم جب کسی سے خوفزدہ ہوتا ہے تو اس کو مرعوب کرنے کی خاطر ایسے ہی بھونڈے راستے اختیار کرتا ہے۔ ایسی باتوں سے مجھے ہمیشہ اپنی کارکردگی اور برتری کا احساس ہوتا ہے۔’’

آئی جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک علیم احمد کے قتل کیس کو مختلف زاویوں کو کھنگالا گیا پھر آئی جی نے مجرم کی گردن تک جلد از جلد پہنچنے کے احکامات صادر کر کے سب کو رخصت کر دیا۔

اورنگ زیب، سراج کے ساتھ آئی جی کے کمرے سے باہر نکلا تو اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ کوئی خاص نکتہ ہے جو اس کے اندر اپنا حجم بڑھا رہا تھا۔

‘‘اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟’’ سراج نے پوچھا۔

‘‘جن کی پوسٹنگ ہیڈ کوارٹر میں ہوتی ہے ان کے پاس کرسی توڑنے یا مکھیاں مارنے کے سوا اور کوئی خاص کام نہیں ہوتا لیکن اس وقت میں ان دو کاموں کو انجام دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔’’

‘‘پھر؟’’

‘‘سنا ہے ریڈ کراس اسپتال میں آج کل کچھ بڑے لوگ ایڈمٹ ہیں؟’’

‘‘کیا مطلب؟’’ سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

سراج کو اس کی بات کا جواب نہیں مل سکا۔ اورنگ زیب نے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اشارہ کیا تو سراج بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی احاطے سے باہر نکلی تو سراج نے پھر وہی سوال کیا۔

‘‘ریڈ کراس اسپتال میں کون بڑے لوگ موجود ہیں؟’’

‘‘دارا رستم علی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ہی نام کلبلا رہا ہے ...... روشنا۔’’ اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

‘‘اس وقت آپ کے ذہن میں دارا کہاں سے آ گیا؟’’

‘‘علیم احمد کی کوٹھی میں مجھے اسی کی کال ریسیو ہوئی تھی۔ دارا کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے فوری ملنا چاہتا تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی ہیجانی کیفیت سے دوچار ہے۔’’

‘‘پھر؟’’

‘‘میں نے کسی خیال کے تحت معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے لیکن اس نے دوبارہ کال کرنے کا کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔’’

‘‘لیکن اس گفتگو میں ایسی کون سی بات ہے کہ آپ کے ذہن میں ریڈ کراس اسپتال ابھر آیا؟’’

‘‘آئی جی کا وہ جملہ ابھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے جو اس نے کسی کی کال ریسیو کرنے کے بعد مجھ سے کہا تھا۔’’ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ‘‘جس نے میرے لیے کچھ نازیبا بات آئی جی کے ذریعے کہلوائی وہ...... وہ...... آکٹوپس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔’’

‘‘ریڈ کراس اسپتال کے بعد آکٹوپس ...... آپ کی باتیں......’’

‘‘ذہن پر زور دو تو دو اور دو چار آسانی سے ہو جائیں گے۔’’ اورنگ زیب نے جملہ منقطع کر کے سنجیدگی سے کہا۔ ‘‘اب تک ہمارے اور آکٹوپس کے درمیان بے جان چیزوں کی تباہی کا جو سلسلہ جاری تھا اس نے شاید اب جان دار چیزوں کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ نہیں...... کوئی سوال نہیں، صرف غور سے سنتے رہو۔ علیم احمد کا قتل ہمارے لیے جنگ کا آغاز ہے۔ اس کی موت کے ساتھ ہی خالی کوٹھی میں کچھ اور کھیل تماشے بھی ضرور ہوئے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو لیکن اسی کوٹھی میں تفتیش کے دوران دارا کی کال، اس کے بدلے ہوئے تیور سے یہ کہنا کہ مجھ سے فوری ملاقات کرنا چاہتا ہے پھر اس کی خاموشی...... نہیں سراج صاحب، یہ سارے امکانات بے ربط نہیں ہو سکتے۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کڑی ایک دوسرے سے ضرور ملتی ہوگی۔’’

‘‘آئی سی۔’’ سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ ‘‘آپ کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں لیکن ریڈ کراس اسپتال......’’

‘‘اس کی اطلاع مجھے میرے مخبر نے دی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ روشنا بھی وہاں کے آئی سی یو روم میں ایڈمٹ ہے۔’’ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ‘‘دارا نے فوری ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت یقیناً وہ کسی جذباتی کیفیت سے دوچار ہوگا پھر اس نے دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔’’

‘‘ایسی صورت میں وہ اس وقت بھی زبان نہیں کھولے گا۔’’ سراج نے ایک امکانی بات کہی۔

‘‘تکلیف کی شدت معلوم کرنے کی خاطر زخم کو ٹھیس پہنچانا بھی ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ قبل از وقت یقین سے ......’’ اورنگ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر موبائل آن کر لیا۔ اسکرین پر نظر آنے والا مخصوص نمبر اور ڈبل ایکس کا کوڈ دیکھ کر اس نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

‘‘اس وقت کیسے فون کیا؟ گڈ...... میری بات غور سے سنو، جب تک میرا کوئی دوسرا آدمی تم سے رابطہ نہ کرے تم سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہو...... نہیں، فی الحال ایسی کوئی غلطی نہ کرنا۔ اس کی فکر مت کرو، میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کی آنے جانے والی کالوں کا ریکارڈ بھی تیار ہوتا رہے۔’’

‘‘شاید آپ کے مخبر کی کال تھی۔’’ سراج نے پوچھا۔ ‘‘کوئی اہم اطلاع؟’’

‘‘اہم ترین کہو۔’’ اورنگ زیب نے کہا۔ ‘‘اس لڑکی کا نام اور پتا بھی مل گیا ہے جس نے ماروی کو فارم ہاؤس جانے کے لیے بک کیا تھا۔’’

‘‘آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ لڑکی شرافت سے زبان کھول دے گی؟’’

‘‘تم بھول رہے ہو سراج، میں نے تم سے شیلا ورما کے بیوٹی پارلر کی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں ایک اہم بات کہی تھی۔ آکٹوپس اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا عادی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے شبنم کے اغوا کے امکانات کی بات بھی کی تھی مگر شبنم کے بجائے شاید روشنا کو کسی وجہ سے اغوا کر لیا گیا اور اب...... اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پالیسی کو اپنا لوں۔’’ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ‘‘اب جو لڑکی ماروی کے حوالے سے سامنے آئی ہے وہ ہمارے لیے پہلی سیڑھی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔’’

‘‘میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ آپ کے آکٹوپس کے لیے فارم ہاؤس بہترین پناہ گاہ ہو سکتی ہے۔’’

‘‘اتنی جلدی آخری رائے نہ قائم کرو۔ دارا سے مل لینے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔’’

اورنگ زیب نے گاڑی ریڈ کراس اسپتال کے پارکنگ لاٹ سے ہٹ کر ایک جگہ پارک کی پھر سراج سے بولا۔ ‘‘محتاط رہنا، ہو سکتا ہے کہ دشمن کے آدمی بھی ہمارا تعاقب کر رہے ہوں۔’’

‘‘اگر مارنا ہوتا تو اب تک زندہ بھی نہ چھوڑتے۔’’

اورنگ زیب نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا اسپتال کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی ہوئی تھی۔ سراج اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتا رہا۔ گاڑی دوبارہ حرکت میں آئی تو اس نے پوچھا۔

‘‘کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟’’

‘‘میں نے جس شبہے کا اظہار کیا تھا وہ غلط نہیں تھا۔’’ اورنگ زیب نے سڑک پر نظریں جمائے جمائے جواب دیا۔ ‘‘شبنم کے بجائے روشنا کو دھوکے سے اغوا کر کے علیم احمد کی کوٹھی پر لایا گیا تھا۔ وہاں روشنا کے ساتھ کیا سلوک ہوا، دارا نے اس ضمن میں زبان نہیں کھولی لیکن جس آدمی نے روشنا سے ملاقات کی تھی اس کا حلیہ ایک فی صد بھی آکٹوپس سے مختلف نہیں کہا جا سکتا۔’’

‘‘روشنا کو اغوا کرنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا؟’’ سراج نے استفسار کیا۔

‘‘پہلا مقصد یہ تھا کہ روشنا کے ذریعے بھی مجھے یہی پیغام دیا جائے کہ میں اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔’’ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ‘‘میرے فلیٹ کی تباہی سے پہلے غالباً وہ فائل بھی اس کے ہاتھ لگ گئی ہوگی جو رستم علی آغا خانی نے میجر عاطف کے ذریعے مجھ تک بھیجی تھی، اس کے علاوہ...... علیم احمد کی موت کے بعد اس کی خالی کوٹھی بھی بطور پناہ گاہ وقتاً فوقتاً استعمال کی جا سکتی ہے۔’’

‘‘دارا نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ سے فوری طور پر کیوں ملنا چاہتا تھا؟’’

شاید اسے بعد میں احساس ہو گیا ہو کہ جذباتی لمحوں میں اصل بات بھی زبان سے نکل جاتی تو وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔’’

‘‘کیا مطلب؟’’ سراج چونکا۔ ‘‘کیا رستم علی آغا خانی کے بعد اب روشنا کو بھی بلیک میل کرنے کی خاطر وہی ناپاک کھیل دہرایا گیا ہے؟’’

"تمہاری جگہ کوئی ذہین بچہ ہوتا تو وہ بھی یہی رائے قائم کرتا۔" اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ "صرف مجھے پیغام پہنچانا اصل مقصد ہوتا تو پھر علیم احمد کو راستے سے ہٹانے اور روشنا کو اغوا کرنے کے بعد وہاں تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ ایک مقصد اور بھی ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہوسکتا ہے آکٹوپس نے یہ سب کچھ ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی خاطر کیا ہو۔"

"میں ایک بار پھر اپنی کند ذہنی کا اقرار کرتا ہوں۔" سراج نے تلملا کر پوچھا۔ "غلط راستے پر ڈالنے سے آپ کا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟"

"میں نے ایک امکانی بات کہی تھی۔ ماروی کے سلسلے میں اب جو لڑکی ہماری لسٹ پر آئی ہے، اُسے کھنگالنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔"

"سمجھ گیا۔" سراج نے بڑی معصومیت سے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ "آئندہ آپ کو کریدنے سے گریز کروں گا۔"

جواب میں اورنگ زیب نے بڑی اپنایت سے ہاتھ بڑھا کر سراج کے شانے تھپتھپانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ مریدوں سے فارغ ہوکر اپنی خواب گاہ میں آیا تو اس کے چہرے سے معصومیت، سادگی اور بردباری کا وہ ملمع اتر گیا جو پیری مریدی کے دوران وہ دنیا دکھاوے کے لیے چڑھائے رکھتا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں جاہ وجلال کی سرخی اترنے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ کسی گہری سوچ میں غرق رہا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ اس دوران بھی اس کے ذہن میں فارم ہاؤس کے اس چوکیدار کا خیال کلبلا رہا تھا جس نے ماروی کو بے عزت کرنے کا اقرار نامہ لکھ کر خودکشی کرلی تھی۔ اس کے حکم سے چوکیدار کی لاش کو خاموشی سے دفنا دیا گیا تھا لیکن وہ اپنے ایک ایک ملازم سے واقف تھا۔ مرنے والا نمک حلال اور بے داغ کردار کا مالک تھا پھر...... اس نے کس کے اشارے پر اقرار جرم کی تحریر چھوڑ کر خودکشی کرلی تھی؟

"ہیلو۔" دوسری جانب سے کسی کی بھاری اور کھردری آواز سنائی دی۔ "کون بول رہا ہے؟"

"تمہارا ناجائز باپ۔" سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ غرا کر کہا۔ "نچلے سروں میں بات کیا کر ورنہ......"

"سوری سر لیکن آپ کا نمبر......"

"کام کی بات کرو۔" سکندر علی شاہ نے جھڑک کہا۔ "تو جانتا ہے کہ میں نمبر بدلتا رہتا ہوں۔"

"حکم دیں مالک۔"

"ماروی کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟"

"پولیس کے بھاڑو سے ملاقات کے بعد ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میں نے ایک بندہ پر اس پر لگار ہے۔ آپ کی دی ہوئی رقم بھی اس کو پہنچا دی گئی ہے۔"

"دوسری پر بھی نظر رکھنا۔" سکندر علی شاہ نے پیشانی پر بل ڈال کر حکم دیا۔ "ہوسکتا ہے کہ جس کو تو نے بھڑوے کے بجائے بھاڑو کہا ہے وہ اس سے بھی ملنے کی کوشش کرے۔"

"ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں مالک۔"

"جلدی بھونک ڈال۔ میرے پاس وقت کم ہی ہوتا ہے۔"

"آپ صرف اشارہ کردیں، ہم اس خطرے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے جو آپ کا راستہ کاٹنے کی غلطی بار بار کرتا ہے۔"

"نہیں۔" سکندر علی شاہ نے حقارت سے کہا۔ "شکاری کتوں کا پورا غول ہوتا ہے۔ ایک کو گولی ماردی جائے تو اس کے دوسرے ساتھی بھونکنا شروع کردیتے ہیں۔"

"پھر جیسا آپ کہیں۔"

"جتنا کہا گیا ہے اسی کا دھیان رکھنا۔ میں غفلت برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" سکندر علی شاہ نے سلسلہ منقطع کیا پھر دوسرے فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے دلربا کے نمبر ڈائل کیے۔

"زہے نصیب۔" دوسری جانب سے کال خود دلربا نے وصول کی تھی۔ "آج آپ نے خود سے کال کیا ہے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"تم نے ماروی کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی؟" سکندر علی شاہ نے سنجیدگی برقرار رکھی۔

"جو لڑکیاں میری فہرست میں ہوں میں ان سے غافل نہیں ہوتی۔" دلربا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ایس پی اورنگ زیب نے اسے ہر طرح ٹٹولنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میرے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ آئندہ بھی ایسی غلطی نہیں کرے گی۔"

"فارم ہاؤس جانے کے سلسلے میں اس نے کوئی نہ کوئی وجہ تو بیان کی ہوگی؟"

"اس سلسلے میں بھی ماروی نے بڑی صاف گوئی سے

دکھا کر اپنے گھریلو حالات اور کسی ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی خاطر یہ اقرار کرلیا کہ وہ مجبور ہوکر کال گرل بن گئی ہے۔ فارم ہاؤس جانے کے سلسلے میں بھی اس نے دور اندیشی سے کام لیا ہے۔ ایس پی کو یہی بیان دیا ہے کہ ایک درمیان آدمی اسے ساتھ لے گیا تھا جس نے اسے فارم ہاؤس پر چھوڑ دیا تھا۔ وہاں اسے رات کے اندھیرے میں کس نے لوٹا، وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکی۔ دوسری صبح وہی درمیانی آدمی اسے......"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ "کیا اس گھاگ...... نے ماروی کی فرضی کہانی آسانی سے ہضم کرلی ہوگی؟"

"میں یقین سے کہہ نہیں سکتی لیکن آپ کو کس بات کی پریشانی ہے؟"

"دلربا......" سکندر علی شاہ کے لہجے میں پہلی بار تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ "فارم ہاؤس کے حوالے سے پولیس کے ذہن میں میرا نام بھی ضرور ابھرا ہوگا اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ پولیس میری حویلی تک آئے۔"

"میں سمجھ رہی ہوں لیکن فارم ہاؤس میں جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری مجھ پر یا ماروی پر عائد نہیں ہوتی۔"

"جانتا ہوں لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔" سکندر علی شاہ نے بہ دستور خشک لہجے میں کہا۔ "پولیس کے چھوٹے موٹے ایس پی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے ایس پی اپنے شکاری کتوں کی مدد سے تم تک بھی پہنچ جائے۔"

"اگر وہ آتا ہے تو آنے دو۔" بے پروائی سے جواب دیا گیا۔ "میری رسائی بھی کچھ ایسے لوگوں تک ہے جن کا نام سن کر ہی ایس پی کو بھی پسینا آجائے گا۔"

"قبل از وقت کسی خوش فہمی کا شکار ہونے کے بجائے میری بات غور سے سنو۔ تم سرے سے اس بات کو قبول کرنے سے منکر ہوجانا کہ تم ماروی نام کی کسی لڑکی سے واقف ہو۔ باقی حالات میں سنبھال لوں گا۔ ایک اہم بات اور نوٹ کرلو، دوبارہ جب تک میں نہ کہوں تم میرے کسی نمبر پر کال کرنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔" سکندر علی شاہ نے سرد لہجے میں ہدایت دی پھر سلسلہ بھی منقطع کردیا۔

دلربا سے گفتگو کے بعد پانچ سات منٹ تک وہ کسی سوچ میں ڈوبا رہا پھر دوسرے فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

لیاقت حسین نے کچھ دنوں آرام کرنے کے بعد دوبارہ کام سنبھال لیا تھا۔ اس وقت وہ سیٹھ عثمان کے کمرے میں بیٹھا دفتری امور پر گفتگو کررہا تھا جب انٹرکام پر سگنل ملا۔ سیٹھ عثمان نے ریسیور اٹھا کر سیکریٹری کی بات سنی پھر اوکے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"خدا کا شکر ہے لیاقت حسین کہ ہمارے ماربل کے ایکسپورٹ کا کام روز بہ روز ترقی کررہا ہے۔ اس سلسلے میں تمہارے والد سے بھی گفتگو ہوتی رہی ہے، وہ بھی خوش ہیں۔"

"بابا مجھ سے بھی بار بار ایک ہی بات کہتے ہیں۔" لیاقت حسین نے پہلو بدل کر کہا۔ "ففٹی ففٹی کے معاملے میں دیانت سے کام لینا، ابھی تک انہیں اس بات کا علم نہیں ہوا کہ میں نے آپ کے کہنے سے اپنی فرم کا اکاؤنٹ بھی کھول لیا ہے لیکن کب تک...... بابا جب بھی آئے ان کا نزلہ مجھ پر ہی گرے گا۔"

"فکر مت کرو۔" سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ سرفراز خان کے ساتھ سردار کا دم چھلا بھی لگا ہوا ہے۔ انہیں اپنی پگ کے شملے کو اونچا رکھنے کی فکر بھی لاحق رہتی ہے تم فکر مت کرو۔ وہ جب بھی آئے میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تمہارے اوپر نزلہ نہیں گرنے دوں گا۔"

"میری غیر حاضری میں کچھ نئے آرڈر بھی جمع ہوگئے ہیں۔" لیاقت حسین نے موضوع بدلا۔ "ان کی ڈیلیوری بھی پہلی فرصت میں کرنی ضروری ہے۔ کاروبار میں وقت کی پابندی بھی اہمیت رکھتی ہے۔"

"فرحین اب کیسی ہے؟"

"آپ لوگوں کا احسان اور اوپر والے کا کرم ہے۔ بیگم صاحبہ نے اسے میری کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔"

"تم اس وقت کیا کام کررہے تھے؟"

"نئے آرڈر کی فائل دیکھ رہا تھا۔"

"ضرور دیکھ لو۔ ویسے تمہاری عدم موجودگی میں وقتی طور پر دفتر کا ایک اور کارندہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بہرحال اس وقت تمہیں راحیلہ نے کسی کام سے یاد کیا ہے۔ یہاں سے اٹھ کر ان سے ضرور مل لینا۔"

تقریباً چالیس منٹ بعد لیاقت حسین، راحیلہ بیگم کے سامنے موجود تھا۔ فرحین، راحیلہ بیگم کے ساتھ دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" راحیلہ بیگم نے بڑی اپنایت سے دریافت کیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہٹا کٹا آپ کے سامنے بیٹھا

ہوں۔'' لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''پولیس والوں نے جو ڈیل کرائی وہ ان کی دردسری تھی، میں حق پر تھا اس لیے میں نے غم پالنے کی غلطی بھی نہیں کی۔''

''جانتی ہوں لیکن تمہیں ابھی کچھ دنوں اور آرام کی ضرورت تھی۔''

اس بار لیاقت حسین نے فرحین کی طرف دیکھا اس لیے کہ اس نے بھی آرام کا مشورہ دیا تھا۔

''نہیں لیاقت حسین۔'' راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ''فرحین نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تمہاری باعزت رہائی کی خبر سن کر تو یہ بھی اپنا غم بھول کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔''

''رہنے دیں بیگم صاب۔'' فرحین نے لیاقت حسین کو چھیڑنے کی خاطر راحیلہ بیگم کے اور قریب ہو کر کہا۔ ''بیوی کتنے ہی جتن کرلے لیکن مرد اس پر یقین نہیں کرتا، ہمیشہ اپنی مونچھ پر تاؤ دیتا رہتا ہے۔''

''آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا؟'' لیاقت حسین نے فرحین کے جملے کو نظر انداز کر کے راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ اب تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟'' راحیلہ بیگم نے بڑی اپنایت سے سوال کیا۔

''جب آپ مجھے بھائی سمجھتی ہیں تو میں بھی آپ کو بہن ہی کہنے کی جرأت کروں گا۔'' لیاقت حسین نے عقیدت مندی سے جواب دیا۔

''یہ بھی بتادے کہ چھوٹی بہن سمجھتا ہے یا بڑی؟'' فرحین نے درمیان میں لقمہ دیا تو لیاقت حسین نے غور سے دیکھا پھر براہ راست راحیلہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''آپ نے اسے بہت زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ پہلے اسے بولنا نہیں آتا تھا، اب اس کی زبان بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے۔''

''میں نے اس وقت تمہیں عثمان کے کہنے پر بلایا ہے۔'' راحیلہ بیگم نے کچھ توقف سے کہا۔ ''وہ اگر کوئی بات کہتے تو تم شاید اسے ماننے سے گریز کرتے۔ اس لیے یہ ذمے داری بھی مجھے ادا کرنی ہے۔''

''آپ حکم دیں، میں انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔''

''جس راستے پر خطرے لاحق ہوں اسے چھوڑ دینا چاہیے لیاقت حسین۔'' راحیلہ بیگم نے وضاحت کی۔ ''جو دشمن ایک بار ناکام ہو گیا ہو وہ دوسری بار اپنی غلطیوں کو نہیں دُہرائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' لیاقت حسین نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔ ''دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس سے دوستی کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی لیکن اس وقت......''

''وقت ہی سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو پلٹ کر واپس نہیں آتا۔'' راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''عثمان کے علاوہ میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ اب سامان کی ڈیلیوری جہاز راں کمپنی کو کرنے کی خاطر تم بندرگاہ تک نہیں جاؤ گے۔ یہ ذمے داری ہم نے ایک دوسرے ڈرائیور کو سونپ دی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''دشمن اسے میری بزدلی کا نام بھی دے سکتے ہیں لیکن میں آپ کے کسی حکم سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔'' لیاقت حسین نے سر جھکا کر جواب دیا پھر خاموشی سے اٹھ کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

لوچن اس وقت جس حلیے میں تھا اس میں بھی وہ چائنیز ہی لگ رہا تھا لیکن ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت جب اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تو خود ذاتی طور پر بھی اپنے آپ کو لوچن کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکا تھا۔ کلب جانے کی خاطر اس نے رینٹ اے کار کی گاڑی استعمال کی تھی۔ ہوٹل کے منیجر کی سفارش کے بعد اسے گاڑی کے حصول میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ تھری پیس سوٹ میں اس کی شخصیت نے کار کے ڈرائیور کو بھی مرعوب کرنے میں خاصا نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن رین بو کلب کے داخلی دروازے پر اسے بہرحال رکنا پڑا۔ آن ڈیوٹی شخص نے اسے بڑے مہذب انداز میں کہا تھا۔

''یہاں ممبران کے علاوہ کسی اور کو اندر جانے کی......''

''نان سنس۔'' لوچن نے جھلا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ''کیا تمہارے کلب میں غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ بھی شرافت کا سلوک نہیں ہوتا؟''

''سوری سر۔'' آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔'' لوچن کو روکنے والے نے وضاحت کی۔ ''آپ عارضی طور پر گیسٹ کارڈ حاصل کرسکتے ہیں۔ کارڈ کے حصول کے لیے آپ کو کلب کی ریسپشنسٹ سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔''

پھر کلب کے اسی ملازم نے ماریا تک اس کی رہنمائی بھی کردی تھی۔ لوچن کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے تاثرات بدستور قائم تھے۔

''ہیلو سر۔'' ماریا نے ہونٹوں پر پروفیشنل مسکراہٹ سجا کر لوچن کو خوش آمدید کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی زحمت ہوئی ہے تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔''

''نیور مائنڈ۔'' جواب میں لوچن نے بھی مسکرا کر کہا پھر عارضی ممبرشپ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ فوری طور پر اس نے ایک کارنر ٹیبل کا انتخاب کیا تھا جو دو سیٹ ہونے کی وجہ سے خالی تھی۔ اس وقت کلب میں زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ اپنی نشست پر بیٹھا وہ ہال میں موجود ہنستے ہوئے ممبران پر سرسری نظر ڈالتا رہا پھر کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کلب کے مختلف حصوں کا چکر لگانے کے بعد کورڈ سوئمنگ پول کے اس گوشے تک آگیا جہاں کچھ ممبران پول کے اندر لطف اندوز ہورہے تھے، کچھ دور دور رکھی ہوئی میزوں پر سر جوڑے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہاں اسے نگینہ بھی نظر آگئی جو ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ کسی مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لباس کی تراش خراش سے اس کا تعلق کسی ماڈرن خاندان ہی سے لگتا تھا۔ چہرے کے خدوخال نے بھی اس کی خوب صورتی میں اضافہ کررکھا تھا۔ لوچن نے پہلی نظر میں اپنے تجزیے کی روشنی میں لڑکی کے متعلق اس بات کا اندازہ بھی لگا لیا کہ ماڈرن ہونے کے باوجود وہ بدکردار یا فلرٹ کرنے کی عادی نہیں تھی۔

لوچن نے اپنی جگہ رک کر دوسری میزوں کا جائزہ لیا پھر وہ قدم اٹھاتا ہوا سیدھا اسی میز پر جا کر بیٹھ گیا جہاں نگینہ اور لڑکی بیٹھی تھیں، دونوں ہی نے لوچن کو غور سے دیکھا پھر گفتگو کی پہل نگینہ نے کی۔

''آپ کی تعریف؟'' اس کے لہجے میں خفگی کے اظہار کے علاوہ برتری کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔

''پروفیسر چنگ لائی فارچون۔'' لوچن نے ادھر ادھر دیکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں کسی کے بلانے سے آیا تھا۔ اس نے بڑی منت کی تھی، ملنے کی...... فیس بھی منہ مانگی دی تھی لیکن...... شاید اس نے میرے ساتھ ایک بھونڈا مذاق کیا ہو مگر...... عنقریب اس کو سزا بھی ضرور ملے گی لائی فارچون کے خاندان کے کسی فرد کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بھی بات کبھی غلط نہیں ہوتی۔''

''آپ......'' لڑکی نے بڑی دلچسپی سے لوچن کو مخاطب کیا۔ ''آپ کا لائی فارچون سے کیا تعلق ہے؟ میں نے ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ انہیں شاید نوبل ایوارڈ بھی......''

''نہیں۔'' لوچن نے حقارت سے جواب دیا۔

اگر دکھتے ہوئے دانت اکھاڑ دینے کا نام علاج ہے تو دکھتے ہوئے سر، آنکھ، کان اور ناک کے بارے میں کیا خیال ہے
گردہ، مثانہ، پتہ کی پتھریوں، ہر قسم کی گلٹیوں، رسولیوں، بواسیر، موتیا، ہرنیا اینڈ سائیٹس، ٹانسلز اور پراسٹیٹ کے
آپریشن کی ضرورت نہیں
مردوں میں چھاتیوں کا بڑھنا، زنانہ و مردانہ بانجھ پن، عورتوں کے چہرے پر بال، بالوں کا گرنا، قبل از وقت سفید ہونا، چھائیاں زدہ چہرہ، ایام کی بے قاعدگی، خون کی نالیوں کا بند ہونا، اعضاء کا سن ہونا، ریڑھ کے مہروں کا بے قاعدہ ہونا، بچے کا مٹی کھانا، بستر پر پیشاب کا نکل جانا، قد کا چھوٹا رہ جانا، انڈر گروتھ اور گروتھ، جوڑوں کے درد
پیدائشی گونگا بہرا، آنکھ کا ٹیڑھا پن قابل علاج ہیں
شوگر، دمہ، بلڈ پریشر، شیزوفرینا، آٹیوٹیزم قابل علاج ہیں۔ ہیپاٹائٹس، ڈائیلائیسز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔
بائی پاس کو اب بائے بائے کر دیں
گینگرین سے اعضاء کٹوانے کی ضرورت نہیں
ہومیو پروفیسر ڈاکٹر نیاز اکمل
فرید ہومیو پیتھک کلینک اینڈ ریسرچ سنٹر
صبح 11 تا دن 2 بجے
شام 5 تا رات 9 بجے
وی، آئی پی صرافہ مارکیٹ، چوک صادق آباد، راولپنڈی
dr.niazakmal@gmail.com | 0323-5193267

’’گرینڈ فادر نے وہ انعام قبول نہیں کیا تھا۔‘‘

’’پلیز۔‘‘ لڑکی نے بڑی اپنایت سے درخواست کی۔ ’’کیا آپ میرا ہاتھ دیکھ لیں گے؟‘‘

’’ہاتھ نہیں سویٹ گرل۔‘‘ لوچن نے اس بار بزرگانہ انداز اختیار کیا۔ ’’ہم چہرہ دیکھ کر ہی مستقبل میں جھانک لیتے ہیں۔‘‘

’’میرے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟‘‘ لڑکی کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

’’تم...... تم......‘‘ لوچن کی نظریں لڑکی کے چہرے پر منڈلانے لگیں پھر وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ’’خواب دیکھنا چھوڑ دو سویٹ گرل۔ اپنی مرضی کے بجائے اپنے پیرنٹس کا کہا قبول کرلیا کرو اور...... فرینڈز سرکل بڑھانے میں احتیاط سے کام لو ورنہ......‘‘

’’پروفیسر۔‘‘ نگینہ نے فوری طور پر لوچن کی توجہ اپنی جانب تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ ’’کیا آپ میرے لیے بھی کچھ وقت نکال سکیں گے؟ میں آپ کو ایڈوانس دینے کو تیار ہوں۔‘‘

لوچن نے نظریں گھما کر نگینہ کے چہرے پر نظر ڈالی پھر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکال کر جگا کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری جانب سے جگا کی آواز سن کر اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’تم نے جس کی سفارش کی تھی وہ نہیں آیا۔ دوبارہ کسی کو رکمنڈ نہ کرنا۔‘‘

’’تم......؟‘‘ جگا نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ ’’تم اس وقت کہاں ہو؟‘‘

’’رین بو کلب ہی آنے کو کہا تھا اس نے۔ میں یہیں جھک مار رہا ہوں۔ او کے، سوئمنگ پول پر۔‘‘

’’کوئی خطرہ؟‘‘ جگا نے دریافت کیا۔

’’ریسیپشن پر صرف پروفیسر چنگ لائی کا حوالہ دینا۔ وہ تمہیں مجھ تک پہنچا دیں گے۔‘‘ لوچن نے جواب دینے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کردیا پھر اس نے کچھ توقف سے نگینہ کو مخاطب کیا۔

’’تمہارا پاسٹ، پریزنٹ اور فیوچر سب میری نظروں میں ہے۔ تم کیا جاننا پسند کرو گی؟ جو گزر گیا یا جو آنے والا ہے؟‘‘

’’آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟‘‘ نگینہ نے کسمسا کر کہا۔ ’’کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں؟‘‘

شکار کو خود جال میں پھنستا دیکھ کر لوچن دل ہی دل میں مسکرادیا لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ’’میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا اور تم...... تمہارے ساتھ دوسرا مسئلہ ہے۔‘‘

’’ڈونٹ وری پروفیسر۔‘‘ نگینہ نے بات سمجھ کر کہا۔ ’’میں ڈرائیور کو گھر جانے کا کہہ دوں گی۔ آپ سے فارغ ہو کر اسے دوبارہ کال کرلوں گی۔‘‘

’’تمہاری واپسی کا بندوبست میں کردوں گا لیکن......‘‘ لوچن نے لڑکی کی طرف دیکھ کر ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔ ’’کچھ شکی لوگ بلاوجہ بھی چھان بین کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔‘‘

’’میں سمجھ رہی ہوں مگر اس کے باوجود میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔‘‘ نگینہ نے اشارہ سمجھ کر کہا پھر وہ موبائل پر ڈرائیور سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

’’پروفیسر۔‘‘ لڑکی نے دوبارہ لوچن کو بڑی معصومیت سے مخاطب کیا۔ ’’میں بھی آپ سے اطمینان سے ملاقات کرنے کی خواہش مند ہوں۔‘‘

’’میں نے تمہیں سویٹ گرل کہا ہے تو ذہن میں بھی محفوظ رکھوں گا۔ فی الحال ایک ضروری مشورہ دوں گا۔ جو ہے اسی پر قناعت کرو، خوب سے خوب تر کی تلاش ختم کردو ورنہ جو ہے وہ بھی نہ رہے گا۔‘‘

’’مجھے آپ سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔‘‘ لڑکی نے بڑی اپنایت سے درخواست کی۔ ’’پلیز...... پروفیسر۔‘‘

’’پھر ایسا کرو، مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو جب بھی فرصت ہوئی تمہیں کال کرلوں گا۔‘‘

’’اوہ...... اوہ...... تھینکس پروفیسر۔‘‘ لڑکی نے اپنا کارڈ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ’’یو آر گریٹ۔‘‘

پندرہ منٹ بعد جگا بھی سامنے آگیا۔ وہ بھی میک اپ میں تھا۔ لوچن کو نگینہ کے ساتھ دیکھ کر اس کے ذہن میں کئی سوالات بھی ابھرے تھے۔ لوچن جگا کو دیکھ کر اٹھا تو نگینہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر آکر جگا نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ لوچن، نگینہ کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو جگا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

’’کہاں چلنا ہے پروفیسر؟‘‘

’’کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اور مجھے ڈسٹرب نہ کرسکے۔ مجھے اس لڑکی کو تفصیل سے اس کے فیوچر کے بارے میں سب کچھ بتانا ہے۔‘‘ لوچن نے جگا سے اس بار بھی ایسے انداز میں کہا جیسے وہ اس کے خاص مداحوں میں سے ہے پھر اس نے نگینہ کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام لیا۔ نگینہ بھی مستقبل کا حال جاننے کے شوق میں لوچن کے اور قریب ہوگئی۔ چند لمحے لوچن نگینہ کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو نگینہ کے بازو پر رکھ کر اس کا سیاہ رنگ کا عقیق نما پتھر آہستہ سے دبایا۔ نگینہ کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے اس کے بازو میں کسی چیونٹی نے کاٹ لیا ہو۔ بس ایک پل کو اس کے چہرے پر تکلیف کا تاثر ابھرا پھر دوبارہ مسکرانے لگی لیکن یہ مسکراہٹ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ چبھن کے احساس کے تیس سیکنڈ بعد ہی وہ شدید غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہو کر لوچن پر ڈھلک گئی۔ لوچن کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری وہ بھی اس کی جیت کے علامت تھی۔ اس نے نگینہ کو جگہ دے کر نشست پر ہی گڈمڈ کردیا پھر اپنی اصلی آواز میں جگا سے بولا۔

’’تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے ایک ساتھ ہی بگ باسٹرڈ کی کوٹھی کو بموں سے اڑا کر راکھ کا ڈھیر کردیا تھا۔ یہ خوب صورت ناگن اسی قرض کی دوسری قسط ہے جو ہمیں سکندر علی شاہ فراڈیے کو ادا کرنی ہے۔‘‘

’’نہیں سمجھا؟‘‘ جگا نے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔ ’’سکندر علی شاہ کا شیخ حامد سے کیا تعلق ہے؟‘‘

’’میری چھٹی حس کہتی ہے کہ سکندر علی شاہ کسی نہ کسی زاویے سے بگ باسٹرڈ تک پہنچنے کے لیے ایک چور راستہ ثابت ہوگا۔‘‘

جگا کی نگاہوں میں ایک چمک سی ابھری کچھ توقف سے بولا۔

’’دوسری قسط کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہوگا؟‘‘ جگا نے اپنا جملہ ادا کرنے کے ساتھ ہی گاڑی کا رخ بھی ساحلی علاقے میں موجود اپنے ایک محفوظ ٹھکانے کی طرف موڑ دیا تھا۔

’’تمہاری طرح میں بھی خوب صورت عورتوں کو مہلک جراثیم سمجھ کر ان سے دور ہی رہنے کا عادی ہوں۔‘‘ لوچن نے بڑی مہارت اور پھرتی سے خود کو اگلی نشست تک پہنچانے کے بعد بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’ایس پی کا خیال اب مفروضہ نہیں رہا۔ آکٹوپس مر کر دوبارہ زندہ ہوگیا تو کہیں نہ کہیں ہماری نظروں سے چھپا سانس ضرور لے رہا ہوگا۔ تمہارے فرنیچر مارٹ کی تباہی، ڈی ایس پی لودھی کی موت، ایس پی کے لگژری فلیٹ کا کباڑ خانہ ہونا، کنول کا کڈنیپ، اس کی ماں کی موت، سیٹھ رستم علی کے بعد دارا کی مسز کا اغوا اور...... اور...... انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والے میرے دو فرینڈز ہاشم اور ڈوما کی پراسرار موت...... نہیں جگا مائی فرینڈ، نہیں...... میں نے جس کام کے لیے تمہیں انوائٹ کیا وہ تنہا بھی کرسکتا تھا لیکن میں...... میں کل واپس چلا جاؤں گا۔ تم کو اسی شہر میں زندگی گزارنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد بھی تم بگ باسٹرڈ کے سامنے سر اٹھا کر چلو۔ جو لوگ وقت اور نزاکتوں کا خیال نہیں رکھتے وہ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے۔ کوڑے کے ڈھیر سے کسی مطلوبہ چیز کو تلاش کرنے کی خاطر پورا ڈسٹ بن کھڑکھڑانا پڑتا ہے۔ ایک ڈسٹ بن بلیک شیپ سکندر علی شاہ بھی ہے۔‘‘

’’نگینہ کا کیا کرو گے؟‘‘ جگا نے استفسار کیا۔

’’اس کا ڈریس اتار کر کسی چیریٹی فنڈ میں دے دیں گے۔‘‘ لوچن نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ’’نیکڈ باڈی کا گفٹ پیک بنا کر سکندر علی شاہ کو بھیج دیں گے۔ ایک دو ٹرمپ کارڈز اور بھی ہیں، بگ باسٹرڈ کو سامنے لانے کی خاطر باری باری ان کو بھی استعمال کرنا پڑے گا۔‘‘

’’ایس پی صاحب کا حکم ہوتا تو میں اس سے اپنا حساب کتاب پہلے ہی چکتا کردیتا۔‘‘ جگا نے لوچن کا ہاتھ تھام کر ٹھوس آواز میں کہا۔ ’’مجھے اپنے سے الگ مت سمجھنا۔‘‘

جواب میں لوچن نے بھی اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ نگینہ پچھلی نشست پر بے سدھ پڑی تھی۔

☆☆☆

ورائٹی سپر اسٹورز کے ساتھ ہی وہ سیڑھیاں بھی تھیں جو اسی عمارت کے رہائشی فلیٹس تک جاتی تھیں۔

رات کے دس کا عمل تھا جب ایک پرانی موٹرس سیڑھیوں کے سامنے سڑک پر آکر روک دی گئی۔ اس میں سے جو شخص اترا اس نے ملیشیا کلر کے کپڑے کی پتلون اور ڈھیلی ڈھالی فل آستین کی بش شرٹ پہن رکھی تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے پچھلی نشست سے چمڑے کا پرانا بیگ نکالا پھر وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے محض اس کے حلیے کی وجہ سے دریافت کرلیا کہ وہ کہاں جارہا ہے؟ کس سے ملنا ہے؟ ورنہ چھ لگژری فلیٹس کے مکینوں اور آنے جانے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ اس نے شاذ و نادر ہی کسی کو روکنے ٹوکنے کی غلطی کی تھی۔

’’چھت پر نشریاتی کمپنی کا ایک سگنل ٹاور کچھ خراب ہوگیا ہے کسی کی شکایت پر ہی آیا ہوں۔‘‘ آنے والے نے جھلا کر کہا۔ ’’ورنہ اس وقت میں بھی گھر پر پڑا آرام کررہا ہوتا۔‘‘

''ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے میرے یار۔'' چوکیدار ہنس کر بولا۔ ''دوروز سے میں بھی نائٹ شفٹ بھگتا رہا ہوں۔ میں چلوں تمہارے ساتھ؟''

''تم اپنی ڈیوٹی دو، میں جانتا ہوں کہ چھت پر جانے کے لیے لوہے کا پھاٹک لگا ہے۔ اس کی چابی بھی باہر لگے لکڑی کے ڈبے میں رکھی ہوتی ہے۔''

چوکی دار نے پھر مسکرا کر کچھ کہا لیکن آنے والے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ چرمی تھیلے کو سیدھے شانے سے لٹکا کر وہ اوپر جانے والی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ تین منزلیں طے کرنے کے بعد اس نے لکڑی کے لیٹر بکس نما ڈبے سے چھت پر جانے والے پھاٹک کی چابی نکالی۔ بے پروائی سے تالا کھولا پھر چھت پر آ گیا لیکن اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اس نے پھاٹک کو اندر سے بند کر کے اس کی کنڈی بھی لگا دی تھی۔

عمارت کی کشادہ چھت پر موبائل کمپنیز کے بھی دو ٹاور موجود تھے لیکن اس نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ قدم اٹھاتا پیراپٹ وال (Para pet wall) کے اس حصے کی طرف آ گیا جو سپر اسٹور والی مرکزی شاہراہ پر تھا۔ روڈ کی دوسری جانب بھی تجارتی اور رہائشی فلیٹس کی عمارتیں موجود تھیں۔ اس کی نظر میں ایک عمارت کے رہائشی فلیٹ پر مرکوز ہو گئی جہاں دودھیا نائٹ بلب روشن تھا۔ بالکونی یا سامنے کے حصے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے وہ غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے پلٹ کر ایک نظر چھت کے پھاٹک کی سمت دیکھا اس کے بعد دونوں گھٹنوں کے بل چھت پر بیٹھ کر اس نے چرمی تھیلا کھولا اور دور مار گن رائفل کے مختلف ٹکڑے نکال کر جوڑنے لگا۔ سائیلنسر والی رائفل کو اصل شکل میں لانے میں اسے بہ مشکل چار پانچ منٹ لگے تھے۔ دوبارہ کھڑے ہو کر اس نے رائفل کے چیمبر میں تین گولیاں ڈالیں پھر مطلوبہ فلیٹ پر نظر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اتنی بلندی سے چلائی گئی گولیوں کا شور بڑی حد تک کھلی ہوا میں تحلیل ہو جائے گا نہ ہوتا تب بھی وہ کسی کے وہاں تک آنے سے پہلے ہی نکل سکتا تھا۔ سات منٹ گزر گئے تو اس فلیٹ کے خالی حصے کو گھورتے ہوئے کسی زہریلے ناگ کی طرح تلملا کر خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''باسٹرڈ...... تو نے جو چال میرے ساتھ چلی تھی میں اس کا توڑ کر کے پھر آزاد فضا میں کھڑا ہوں لیکن تو اور تیرے ساتھ جو بھی ہو، اب میرے ہاتھوں نہیں بچیں گے۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ پھر کوئی میرے اوپر ہاتھ ڈالنے کی بھول بھی نہیں کرے گا۔ فی الحال میں تجھے موت (م۔و۔ت) کے تین حروف کا پیغام تین گولیوں سے دے رہا ہوں۔ یہ بھی اس بات کی گواہی دیں گی کہ میں نامردوں کی طرح چھپ کر نہیں، للکار کر تجھے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔''

اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی اس مطلوبہ فلیٹ کے بند دروازے اور کھڑکیوں پر کسی ماہر نشانہ باز کی طرح تین فائر کیے۔ دوبارہ پھرتی سے بیٹھ کر اس نے سائیلنسر لگی رائفل کو پھر مختلف ٹکڑوں میں منتقل کر کے چرمی تھیلے میں ڈالا اور نیچے جانے والے زینوں کی سمت تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

''اتنی جلدی فارغ ہو گئے؟'' چوکیدار نے پھر اسے دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

''زیادہ بڑا فالٹ نہیں تھا۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا پھر مورس میں بیٹھ کر ٹریفک کے بہاؤ کا ایک حصہ بن گیا۔

سڑک پر آنے کے بعد اس نے اس بات کا اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ بلندی پر کھلی چھت سے کیے گئے فائر کی سن گن نیچے تک نہیں پہنچی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ سوال بھی نہیں ابھرا کہ اس کی مورس کے حرکت میں آنے کے بعد کسی شخص نے سپر اسٹور سے باہر آ کر اپنی موٹر سائیکل کس مقصد سے اسٹارٹ کی تھی۔

☆☆☆

افضل خان اس وقت بھی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا جبرو کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ شبنم کے اصرار پر اس نے جبرو کو جان سے نہیں مارا تھا۔ کسی اعتبار سے ناکارہ ضرور کر دیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جبرو کا تعلق بھی انہی زرخرید پالتو کتوں میں سے تھا جو کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد کے لیے خدمت انجام دیتے تھے۔ کنول کے اغوا اور پریس میں اس کا بیان آ جانے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ شیخ حامد مرا نہیں، زندہ تھا۔

جبرو کا تعلق جس خطے سے تھا وہاں کے بیشتر لوگ پیسوں کے عوض بک جانے کے عادی تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ایک خوب صورت حسینہ کی موجودگی میں جبرو بھی اپنی بے عزتی برداشت نہ کرتا۔ بنگالی پاڑے کے لفنگوں سے بھی اس کا پرانا یارانہ تھا۔ وہ ان لفنگوں اور اچکوں کے ساتھ مل کر کوئی جوابی کارروائی بھی کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھی بھی کبھی کھل کر سامنے آنے کی غلطی نہ کرتے۔ چھپ کر بزدلانہ وار پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ افضل خان یہ بھی جانتا تھا کہ بنگالی پاڑے کے لفنگے بھی اس کی برتری کو تسلیم کرتے تھے مگر شیخ حامد سے علیحدگی کے بعد ان کی سوچ بھی بدل سکتی تھی۔

خاصی دیر تک وہ حالات پر غور کرتا رہا۔ اسے خود سے زیادہ شبنم کی فکر لاحق تھی۔ جبرو اگر کسی انتقامی کارروائی کی جرأت کرتا تو وہ بھی براہ راست افضل خان سے مقابلہ کرنے کے بجائے شبنم کو ہدف بنانے پر غور کرتا۔ اس نکتے کے بار بار ذہن میں ابھرنے کے بعد افضل خان نے کچھ سوچ کر موبائل پر کسی کے نمبر ملانے شروع کر دیے۔

''اس وقت کیسے یاد کیا؟'' رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''جبرو کی کیا خبر ہے؟''

''وہ جو جھرنا کو لایا تھا اس نے جبرو کو خاموشی سے ایک خیراتی اسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جبرو کی ہڈیوں کی مالش کرنے والے بھی شاید سندر بن سے آ گئے ہیں۔''

''جبرو نے خود کیا کہا؟'' افضل خان نے اسے کریدا۔

''اس نے بھی زبان بند کر رکھی ہے۔ جھرنا بھی ابھی تک چڑیا کی طرح سہمی بیٹھی ہے۔ اس کو چھو منتر کر کے لانے والے نے بھی اسے فوری طور پر کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔''

''ایک کام کرو گے؟'' افضل خان نے سرد لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''جبرو کو کسی بھی ذریعے سے یہ پیغام پہنچوا دو کہ اگر اس کی زبان سے میرا نام نکلا تو میں کتوں ہی کی موت ماروں گا اسے۔''

''تمہاری خاطر یہ بھی کوشش کروں گا لیکن ادھر سب بھاڑے کے ٹٹو ہیں اور میں خود یہ کام......''

''سمجھ رہا ہوں کل تک تمہیں کسی نہ کسی ذریعے سے کچھ رقم بھی مل جائے گی۔''

''اور کوئی خدمت؟''

''جبرو اسپتال سے فارغ ہو کر کہاں آتا ہے، کہاں جاتا ہے اس کی بھی خبر رکھنا۔''

افضل نے رابطہ منقطع کر دیا پھر دوبارہ بستر پر لیٹنے کا ارادہ مکمل نہ کر سکا۔ بالکنی کی سمت سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر اس نے تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکال لیا۔ محتاط قدم سے دروازے تک پہنچا تھا کہ شبنم کی سہمی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم کہاں ہو افضل خان؟ یہ آواز کیسی تھی؟''

''سامنے آنے کی غلطی نہ کرنا، میں سوئچ بند کر کے تمہاری طرف آتا ہوں۔''

دس منٹ بعد وہ لائٹ دوبارہ آن کرنے کے بعد ہی شبنم کے کمرے میں گیا۔ وہ دروازے کے قریب ہی سہمی کھڑی تھی۔

''فکر مت کرو۔'' افضل خان نے پچویشن سمجھنے کے بعد دبی زبان سے کہا۔ ''ہمارے کسی دشمن نے فوری طور پر ہمیشہ کی طرح اپنی بزدلی کا ثبوت دیا ہے۔ بالکونی کے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشوں کو کہیں سے فائر کر کے توڑا گیا ہے۔''

''یہ...... یہ...... ہمارے لیے کسی آئندہ پیش آنے والے بڑے خطرے کی وارننگ بھی ہو سکتی ہے۔'' شبنم نے افضل خان سے استفسار کیا۔ ''وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''آرام سے سو جاؤ۔ اس بات پر صبح بھی غور کیا جا سکتا ہے۔''

''تم ایک اہم بات بھول رہے ہو۔ پولیس کے سادہ لباس والوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس والے بھی ہماری نگرانی پر مامور ہیں کیا فائرنگ کرنے والا ان کی نظروں میں نہیں آیا ہو گا؟''

''اوہ......!'' افضل خاں چونکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر اس حادثے کی اطلاع مسٹر سراج کو کر دینی چاہیے۔'' جملہ پورا کرنے کے دوران ہی اس نے فون بک سے سراج کے نمبر نکال کر کال کا بٹن دبا دیا۔ دوسری گھنٹی نے بعد ہی دوسری جانب سے سراج کی آواز سنائی دی۔

''کوئی خاص بات؟''

جواب میں افضل خان نے شیشے ٹوٹنے والی واردات کے ساتھ اس شبہے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ ممکن ہے فائرنگ سامنے والی عمارت کے کسی فلیٹ سے کی گئی ہو۔

''کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں ملحقہ تھانے کے آن ڈیوٹی آفیسر سے رابطہ کرتا ہوں۔''

اس رات افضل خان اور شبنم پولیس کی ضروری چھان بین کی وجہ سے ایک پل بھی سکون کا سانس نہ لے سکے۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ کسی بھوکے درندے کے مانند اپنی اسٹڈی میں ٹہل رہا تھا۔ شام کے چھ بجے سے وہ اب تک نگینہ کو ہر ممکنہ جگہ ٹیلی فون کر کے تلاش کر چکا تھا۔ جواب ہر جگہ سے نفی میں ملا تھا۔ خود نگینہ کا ذاتی نمبر بار بار ایک ہی جواب دے رہا تھا کہ وہ بند ہے۔

نگینہ چار بجے گھر سے نکلی تھی اسے کچھ ضروری

شاپنگ پر جانا تھا۔ اس روز سے قبل وہ ہمیشہ مانگی ہوئی مہلت سے پہلے ہی آجانے کی عادی تھی لیکن اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

سکندر علی شاہ کے ذہن میں نگینہ کے ماضی کے حوالے سے کئی منفی خیالات بھی ابھرے لیکن اس نے ان سب کو یکے بعد دیگرے رد کردیا۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار سکندر علی شاہ سے وابستہ ہوجانے کے بعد وہ جال میں آئے ہوئے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا تو سکتی تھی لیکن جال توڑ کر اڑ جانے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی۔ یہی خود اعتمادی اس وقت اسے اور الجھا رہی تھی جب اسے ڈرائیور کا خیال آیا جو اپنے بیان کے مطابق نگینہ کو رین بو کلب میں چھوڑ کر ٹھیک پانچ بجے واپس آگیا تھا۔ رین بو کلب کے حوالے پر بھی سکندر علی شاہ کا ذہن پھر الجھ گیا تھا۔

"شاپنگ کا بہانہ کرکے وہ رین بو کلب کیا کرنے گئی تھی؟ اس نے ڈرائیور کو واپسی کا حکم دے کر حویلی واپس جانے کو کیوں کہا تھا؟"

سکندر علی شاہ نے ڈرائیور کو دوبارہ طلب کیا۔ وہ سامنے آیا تو اس کے چہرے پر بھی خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہاتھ باندھے کھڑا تھا جب سکندر علی شاہ نے اسے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

"کمبخت، تو رین بو کلب کیوں گیا تھا؟"

"ب...... ب...... بیگم صاحبہ کا حکم تھا مالک۔"

ڈرائیور نے ہکلا کر صفائی پیش کی تو خود سکندر علی شاہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے لیکن تو واپس کیوں آگیا؟ میں نے حکم دیا تھا کہ ہمیشہ نگینہ بیگم کے ساتھ رہنا۔"

"ان کے ساتھ کلب تک گیا تھا لیکن مم...... میں اندر تو نہیں جاسکتا تھا۔"

"باہر تو رک سکتا تھا؟" سکندر علی شاہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"معاف کردیں مالک۔ لل...... لیکن آپ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بیگم صاحبہ کے حکم پر انکار نہ کروں ورنہ آپ کھال کھینچ کر بھوسا بھر دیں گے۔"

"نگینہ کے ساتھ اور کون تھا؟"

"وہ...... وہ کلب تک گاڑی میں اکیلی تھیں مالک۔"

ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

"راستے میں اس نے کسی سے موبائل پر بات کی تھی؟"

"نہیں مالک۔"

"پھر...... وہ اب تک کہاں مری ہوئی ہے؟" سکندر علی نے پھر بھک کر ڈرائیور پر غصہ اتارنے کی کوشش کی۔

ڈرائیور کیا جواب دیتا۔ سہما کھڑا تھا جب سکندر علی شاہ کے موبائل پر سگنل ملا، نگینہ کے نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی پر نظر آنے والی سلوٹیں بھی دوچند ہوگئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو واپس جانے کا حکم دیا پھر غرا کر سوال کیا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"جس کے بارے میں تم سوال کررہے ہو وہ اس وقت پوری طرح ہوش میں نہیں ہے۔" دوسری جانب سے مردانہ آواز سن کر سکندر علی شاہ چونکا۔

"کون بول رہا ہے؟" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

"دوست ہوتا تو نگینہ اس وقت میرے قبضے میں نہ ہوتی۔"

"تم شاید غلط فہمی کا شکار ہو۔" سکندر علی شاہ نے نزاکت بھانپ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ "میرے آدمی سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

"تم بھی خوش فہمی کا شکار ہو شاہ جی۔" جواب سرد لہجے میں ملا۔ "جب سورج ڈھل جائے تو سائے بھی اپنی اصلیت بدل دیتے ہیں۔"

"فون کرنے کا کیا مقصد ہے؟"

"نگینہ تم کو کچھ دیر بعد مل جائے گی۔ جس حالت میں ملے گی اس سے تم میری طاقت کا اندازہ بھی لگا لوگے۔" بات جاری رکھی گئی۔ "اس کے بعد بھی...... اگر تم نے میرے کسی دشمن کی مدد جاری رکھی تو پھر تم بھی نگینہ ہی جیسی کیفیت میں شہر کے کسی مصروف چوک پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہو۔"

"میرے بارے میں تم یقیناً کسی خوش فہمی کا شکار ہو۔" سکندر علی شاہ نے تلملا کر کہا۔ "مرد ہوتے تو للکار کر سامنے آتے...... اس وقت ایک دوسرے کی طاقت کا فیصلہ بھی ہوجاتا۔ بہرحال، میں تم سے دو باتیں معلوم کرنا چاہوں گا...... نگینہ کو اغوا کرنے کا مقصد اور اس دشمن کا نام جو تمہارے ذہن میں کسی غلط فہمی کی جڑیں مضبوط کررہا ہے۔"

"نگینہ جس حالت میں تمہیں ملے گی اس سے تم کو اندازہ ہوجائے گا کہ اب تمہاری عزت اور شہرت دونوں کا بھرم ہماری مٹھی میں ہے، دشمن کا نام ایس پی اورنگ زیب

نے آکٹوپس رکھا ہے۔ میں اپنی زبان میں اب بھی اسے شیخ حامد ہی کہوں گا۔'' اس بار بھی دوسری جانب سے حقارت بھرا انداز اختیار کیا گیا۔

''تم یقیناً بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں نے شیخ حامد کا نام ضرور سنا ہے لیکن اسے کسی زاویے سے بھی نہیں جانتا۔''

''اتنی جلدی فیصلہ مت کرو...... نگینہ کے وصول ہونے کے بعد شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔'' سرد مہری سے جواب دینے کے بعد دوسری جانب سے سلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

سکندر شاہ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ فون کرنے والے نے نگینہ کے نمبر استعمال کیے تھے تو یہ بھی اسی بات کی دلیل تھی کہ وہ بھی فون کرنے والوں کے قبضے میں ہوگی۔ اسے کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ اس کے اغوا سے شیخ حامد کا کیا تعلق تھا جبکہ ذاتی طور پر سکندر علی شاہ نے کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

خاصی دیر تک ذہنی جمناسٹک ...... کرنے کے باوجود وہ فون کرنے والے کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ نہیں اخذ کر سکا مگر بہر حال اتنا سمجھ گیا تھا کہ نگینہ کو رین بو کلب سے ہی اغوا کیا ہوگا۔ اغوا کرنے والوں کے اشارے پر ہی اس نے ڈرائیور کو واپس جانے کی ہدایت کی ہوگی۔ اس بات کی مزید چھان بین کرنے کے لیے اس نے اپنے مخصوص موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے نگینہ کے سلسلے میں جو بات کی وہ بھی مختصر تھی۔

''فوری طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ نگینہ کی ملاقات رین بو کلب میں کس سے ہوئی تھی۔ وہاں وہ کتنی دیر ٹھہری اور پھر واپسی کس طرح ہوئی؟''

''سر...... کیا بیگم صاحبہ اپنی گاڑی پر......''

''نان سنس......'' سکندر علی شاہ نے جھلا کر کہا۔ ''جو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی معلومات کر کے جواب دو۔''

''رائٹ سر۔''

سکندر علی شاہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کا ذہن بری طرح وسوسوں کا شکار تھا۔ روز اول سے وہ نگینہ کے سلسلے میں محتاط ہی رہا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کس قماش کی تھی۔ شادی سے پہلے بھی اس کے ساتھ ہٹ اینڈ رن (HIT & RUN) کا کھیل، کھیل سکتا ہے لیکن شکرہ اس کا محسن تھا۔ اسی کے اشارے پر اس نے نگینہ کو اپنا لیا تھا پھر روز اول ہی سے اس نے نگینہ کو اس بات کا احساس بھی دلا دیا تھا کہ اگر اس کو حویلی میں گزر بسر کرنا ہے تو سکندر علی شاہ کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ خود نگینہ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اگر اسے حویلی چھوڑنی پڑی تو زندگی کوٹھی کے بجائے شاید کسی کوٹھے پر ہی بسر ہوگی۔ کوٹھی میں اس کی حیثیت سر کے تاج جیسی تھی کوٹھے پر جاتی تو پاؤں کی جوتی بن کر رہ جاتی۔ اس نے خود کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر اپنی سابقہ زندگی کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ سکندر علی شاہ کے دل میں جگہ بنالی تھی جس کا احساس خود سکندر علی شاہ کو بھی تھا لیکن آج...... آج خلاف توقع وہ کسی کے سنہری جال میں پھنس گئی تھی۔

فون کرنے والے کے سرد اور سفاک لہجے نے بھی سکندر علی شاہ کے وجود میں جیسے چنگاریاں بھر دی تھیں۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے جنہوں نے نگینہ کو فریب دے کر اغوا کیا تھا۔ ان کا مقصد کیا تھا؟ درمیان میں ایک ایسے آدمی کا نام کیسے آگیا جو اس کی اطلاع کے مطابق پولیس کے علاوہ فوجی انٹیلی جنس والوں کو بھی درکار تھا۔ ایک بار تمام اخبارات میں یہی خبر آئی تھی کہ شیخ حامد اپنے ہیلی کاپٹر سمیت گڈانی کے ساحل کے قریب کھلے سمندر میں غرق ہو گیا پھر ان ہی اخبارات نے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی اطلاع بھی دی تھی۔ ایسے بدنام زمانہ مجرم کا نام نگینہ کے ساتھ کس حوالے سے آگیا؟

اس کے علاوہ اور بھی کئی سوالات تھے جو سکندر علی شاہ کے ذہن میں ابھر رہے تھے لیکن آدھی رات گزرنے کے بعد جب ملازموں نے سفید دودھیا رنگ کا موٹے پلاسٹک کا تابوت نما تھیلا لا کر اس کے سامنے رکھا تو سکندر علی شاہ کے ذہن میں فون کرنے والے کی باتیں گونجنے لگیں۔ اس نے ملازموں کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ یہ حکم بھی پورے جلالی انداز میں سنا دیا کہ وہ اس تھیلے کے بارے میں اپنی زبانیں بند ہی رکھیں گے۔ خواب گاہ کو اندر سے بند کر کے اس نے تھیلا کھولا تو نگینہ سرتاپا کسی لباس کے بغیر بے ہوش ملی۔ اس کے برہنہ جسم کو دیکھ کر سکندر علی شاہ کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ جن افراد نے نگینہ کو ان حالات سے دوچار کیا ہوگا انہوں نے اس کی شرمناک تصاویر بھی ضرور محفوظ کر لی ہوں گی جن کے ذریعے وہ سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور بھی کر سکتے تھے۔ اس خیال نے اس کے وجود میں جیسے دہکتی چنگاریاں بھر دیں...... نگینہ کو اسی کیفیت میں چھوڑ کر وہ دبیز قالین پر بے چینی کی کیفیت دور کرنے کی خاطر ٹہلنے لگا۔ خاصی دیر تک وہ اسی سوچ میں غرق رہا کہ کون سا ایسا طریقہ اختیار کرے جو خود کو کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ اس کا ذہن مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر اچانک اس نے گھوم کر دوبارہ نگینہ کے وجود پر ایک گہری نظر ڈالی۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت کھلونا تھی جو منتشر ذہن کو سکون پہنچانے کا موثر ذریعہ بھی تھی لیکن اب حالات نے اس کی غرض وغایت بدل دی تھی۔ ''اگر اسے خاموشی سے کسی اندھے کنویں میں یا سمندر میں پھینک دیا جاتا تو پھر دشمنوں کی بلیک میلنگ کا خطرہ ٹل جاتا۔'' سکندر علی شاہ کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا جب فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ اس طرح چونکا جیسے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔

''اس وقت کس کا فون آسکتا ہے؟'' اس نے کچھ لمحے ذہن پر زور ڈالا پھر چوتھی گھنٹی پر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''کون ہے؟'' اس نے اپنی آواز سے ایسی جھلاہٹ کا اظہار کیا جیسے سوتے سے جاگا ہو۔

''شکرہ۔'' دوسری جانب سے سرسراتے لہجے میں کہا گیا۔ ''میں تم سے کبھی دور نہیں رہتا۔ اس وقت بھی تمہاری کیفیت سے ناواقف نہیں ہوں۔ تمہاری پریشانی کا احساس مجھے بھی ہے لیکن تم بتاؤ...... تم نے نگینہ کے سلسلے میں کیا سوچا ہے؟''

سکندر علی شاہ کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے۔ ہچکچا کر بولا۔ ''اگر اسے دریا برد کر دیا جائے تو......''

''نہیں۔'' بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا گیا۔ ''شکرہ تمہاری پشت پر ہے تو دوبارہ کبھی بزدلی کی باتیں نہ کرنا۔''

''وہ...... وہ مجھ سے جس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں...... میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''کوئی نام بھی ہوگا اس کا؟''

''شیخ حامد جو ایس پی اورنگ زیب کے حوالے سے آکٹوپس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔''

''میں نے اس کا نام بھی سن رکھا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کے قتل کے بعد پولیس کے اعلیٰ آفیسر بھی بوکھلا گئے ہیں۔ اس حادثے کے بھی کئی پہلو ہیں جس میں آکٹوپس کا علامتی نشان بھی ملا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب بھی بغلیں جھانک رہا ہے مگر...... تم پریشان نہ ہو...... جو لوگ نگینہ کو اٹھا لے گئے تھے وہ بھی میری نظر میں آگئے ہیں۔''

''کون ہیں وہ جنہوں نے سکندر علی شاہ سے ٹکرانے کی......'' سکندر علی شاہ کی پیشانی پر پھر شکنیں جال بننے لگیں۔

''جوش سے نہیں...... ہوش سے کام لو۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ نگینہ کو صرف حویلی تک محدود کر دو۔ اب بھی یہی کہوں گا۔ رہا اغوا کرنے والوں کا معاملہ تو میں اسے بھی دیکھ لوں گا، شیخ حامد کے بارے میں تم سے جو پوچھا جائے تو وہی جواب دینا جو تم پہلے دے چکے ہو۔''

''وہ آسانی سے میرا جواب ہضم نہیں کریں گے۔'' سکندر علی شاہ نے بے بسی کا اظہار کیا۔

''جانتا ہوں...... دو چار دن اور صبر کر لو...... میں دوبارہ تم سے رابطہ قائم کروں گا۔'' اس جواب کے ساتھ لائن بھی ڈس کنیکٹ کر دی گئی۔

سکندر علی شاہ نے جھلا کر ریسیور رکھا پھر دوبارہ نگینہ کو گھورنے لگا جس کے سینے کا زیروبم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

☆☆☆

آبادی سے دور اور جنگل کے قریب وہ چھوٹا سا تالاب بھی چکوری کے لیے بڑا اسندر تھا۔

پرتاب بھوشن اسی تالاب سے ذرا فاصلے پر برگد کے پرانے درخت کے تنے کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنے جاپ میں مگن تھا۔ چکوری نے تھوڑے فاصلے پر زمین صاف کر کے اپنے گزارے لائق جگہ بنا لی تھی۔ پرتاب بھوشن نے کہا تھا کہ وہ اکیس سورج کے ڈوبنے تک اپنے منڈل میں بیٹھا دیوی کے دھیان میں مگن رہے گا۔ چکوری ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ کچھ دنوں تک روکھا سوکھا حلق کے نیچے اتارنے میں اسے دشواری ضرور ہوئی پھر رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی بھی ہو گئی تھی۔

اس نے پرتاب بھوشن کو تن من دھن سے اپنا لیا تھا۔ ادھر مندر میں اس کے چاہنے والے بہت تھے، بڑا پجاری بھی اسے دانہ ڈالنے میں پیش پیش تھا لیکن چکوری جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک کو ڈھیل دی تو پھر سب ہی اس سے پیچ لڑانے کو اپنا ادھیکار سمجھ لیں گے۔ وہ دیوی درشن کی آس لیے مندر میں جیون بتانے گئی تھی۔ مدن چند ہی نے اسے بتایا تھا پرتاب دیوی کا سچا پجاری ہے لیکن یہ بتا کر اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔

پہلی نظر میں پرتاب چکوری کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن دیوی درشن کی پیاس نے آہستہ آہستہ اسے پرتاب کے قریب کر دیا۔ وہ اسی کا ہاتھ تھام کر مندر سے نکل پڑی تھی

اور اب اس ویران علاقے میں بھی اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ پرتاب منڈل سے باہر آئے تو وہ پھر ہاتھ باندھ کر دیوی کے درشن کرانے کی بنتی کرے گی۔

گزرتے دنوں کا حساب لگانے کے کارن، اس نے اکیس کنکری گن کر رکھ لی تھیں۔ روز سورج ڈھلتا تو وہ ایک کنکری ایک ڈھیری سے نکال کر دوسری طرف رکھ دیتی۔ وقت دبے قدموں گزرتا رہا۔ صبح اٹھ کر وہ تالاب کے پانی سے منہ پر دو چار چھینٹا مار کر اوڑھنی سے پونچھ لیتی۔ دو دن بیچ کر کے وہ ایک جوڑا اتار کر ادھر ادھر کی سن گن لینے کے بعد اسے دھو کر کسی جھاڑی پر ڈال دیتی پھر نہا کر دوسرے جوڑے سے تن ڈھانپ لیتی۔ شروع شروع میں اسے بڑی لاج آئی تھی۔ دل یہ سوچ کر دھڑکنے لگتا کہ کہیں قریب کوئی چھپ کر اس کے کندن بدن کو للچائی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ ڈر بھی دل سے نکل گیا۔ آہستہ آہستہ وہ ہر بات کی عادی ہو گئی۔ وقت کے دھارے میں زندگی گزارنے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اگر تعجب تھا تو اس بات پر کہ پرتاب بھوشن بغیر کچھ دانہ پانی کھائے اپنے منڈل میں آلتی پالتی مارے، آنکھیں بند کیے بیٹھا دیوی کے جاپ میں اتنا گم تھا کہ اسے کسی اور بات کا ہوش نہیں تھا۔

چکوری روز ایک کنکری ادھر سے ادھر کرتی رہی پھر...... جب اس نے آخری کنکری دوسری ڈھیری پر ڈالی تو کسی پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اس روز اس نے سورج ڈھلنے سے پہلے تالاب کے پانی سے اپنا بدن خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ سوکھا ہوا جوڑا تن پر چڑھا کر وہ منڈل کے قریب آ کر کسی پجارن کی طرح بیٹھ گئی۔ جیسے جیسے سورج ڈھلتا جاتا اس کے اندر دیوی درشن کی پیاس بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

سورج دیوتا کی آخری کرن بھی آکاش میں ڈوب گئی تو پرتاب بھوشن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا گرد آلود چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ چند لمحے وہ آسمان پر نظریں جمائے کسی سوچ میں گم رہا پھر اس نے نظریں گھما کر چکوری کو دیکھا جو منڈل کے قریب گھٹنوں کے بل ہاتھ جوڑے بیٹھی اسے نشیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''مہاراج......'' وہ پرتاب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کھل اٹھی۔ ''میں نے ایک ایک دن گن کر بتائے ہیں۔ دیوی سے بھی پرارتھنا کرتی رہی ہوں کہ وہ تمہاری بھگتی کو سیوکار کر لے...... ایسی شکتی دان کر دے کہ تمہارا دشمن خود چل کر تمہارے چرنوں تک آئے...... تم سے ہاتھ باندھ کر شما دینے کی بھیک مانگے اور تم...... تم اس پاپی کو جلا کر بھسم کر دو۔''

پرتاب بھوشن قدم اٹھاتا منڈل سے باہر آیا۔ اس نے آکاش کی گہرائیوں پر نظر ڈالی پھر چکوری کو بانہوں میں سمیٹ کر اس کے پھول جیسے ہونٹ چوم کر بولا۔

''تو نے دیوی سے جو مانگا ہے وہ اب اوش پورا ہو گا۔ مجھے بھی یہی اشارہ ملا ہے کہ اب اس مسئلے کا آخری سمے قریب آ رہا ہے۔ اب کی بار میرا اور اس پاپی کا آمنا سامنا ہوا تو اسے بھی چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''مجھے بھی دیوی درشن کی پیاس ہے مہاراج۔'' چکوری نے من کی گہرائیوں سے کہا۔ ''ایک بار اس کے درشن ہو جائیں تو میری اچھا (خواہش) بھی پوری ہو جائے گی۔''

''اوش ہو گی۔'' پرتاب نے اس کو بازوؤں میں سمیٹ کر کہا۔ ''پر...... دیوی درشن بالکوں کا کھیل نہیں ہے مورکھ...... اس کے لیے من کی آنکھوں کو روشن کرنا پڑتا ہے۔ رات دن اس کے دھیان کو من میں بسائے رکھنا بھی ضروری ہے اور...... جس کو تو گرو مان لے پھر اس کی ہر آگیاں (حکم) کا پالن بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''میں نے تم کو گرو مان لیا ہے مہاراج! نہ مانا ہوتا تو اتنی دور چل کر تمہارے ساتھ کیوں آتی؟'' چکوری نے بڑی نشیلی آنکھوں سے پرتاب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ادھر مندر میں رک جاتی تو بہت سارے پجاری مجھے دیوی مان کر میرے چرنوں میں بیٹھ کر مجھے پوجتے...... میرے شریر کے ایک ایک انگ کو چومتے، میری ایک مسکان پر وہ اپنا دھرم کرم بھول کر کسی پالتو جانور کی طرح دم ہلاتے رہتے۔''

''چڑھتی ندی پر اتنا مان بھی نہ کیا کر سندری......'' پرتاب بھوشن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر جواب دیا۔ ''ندی اتر جائے تو پھر کیکڑے بھی ادھر ادھر ٹھکانا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ پرانے درخت تلے پاؤں پسار کر پڑی رہے گی تو اس کی چھاؤں بھی تیرے کام آئے گی...... سمجھ رہی ہے میری بات۔''

''میں دیوی درشن کی پیاسی ہوں مہاراج...... ایک بار اس کے درشن کرا دو تمہاری بڑی کرپا ہو گی۔'' چکوری نے پھر ہاتھ باندھ لیے۔

''دھیرج رکھ...... میں نے وچن دیا تو دیوی بھی تجھے درشن اوش دے گی لیکن اس کے لیے تجھے ابھی بہت پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔'' پرتاب نے خلا میں گھور کر بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میری مثال تیرے سامنے ہے۔ ایک وحشت کو نرکھ میں بھونکنے کے کارن مجھے بھی بہت سے بیت گیا بار بار دیوی کے لیے جاپ کرنا پڑا ہے...... اسی یدھ میں مدھو پجارن بھی ماری گئی تھی، اس کا بوجھ بھی ہے میری چھاتی پر...... وہ بھی اتارنا ہے...... ادھر مندر میں بیٹھا مدن چند چین کی بنسری بجا رہا ہے اس نے کہا تھا کہ میں مسئلے کا دھیان من سے نکال دوں، نہیں تو مدھو کی طرح میں بھی کام آ جاؤں گا...... اسے بھی بتانا ہے مجھے کہ پرتاب بھوشن کس شکتی کا نام ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں مہاراج کہ تم اسی مسئلے کے دھیان میں الجھے ہوئے ہو...... میرا من بھی یہی کہتا ہے کہ دیوی تمہیں نراش نہیں کرے گی، جو تن من دھن سے اس کے کارن بھوگ بلاسا سارہ کر دھرتی کی سندرتا سے بھی منہ موڑ لے پھر وہ اسے نراش کیوں کرے گی؟''

''تیری باتیں بھی تیری ہی طرح سندر ہیں چکوری۔'' پرتاب بھوشن نے برگد کے تنے سے ٹیک لگا کر اسے بھی اپنے قریب کھینچ لیا۔ ''دیوی کے پجاری دھرتی کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کو راضی کرنے کے کارن جنگل، پہاڑوں اور برف کی گپھاؤں میں دھونی رما کر بیٹھے جاپ کرتے رہتے ہیں پر تو سب کو اس کا آشیرباد نہیں حاصل ہوتا...... کامیاب وہی ہوتے ہیں جن کی لگن سچی ہو، جس کے گیان دھیان میں کوئی لوبھ...... کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔''

''ایک بات پوچھوں مہاراج؟...... تمہیں اس مسئلے سے کیا بیر (دشمنی) ہے؟''

''اس نے ایک بار میرے کسی منتر کا انجانے میں توڑ کر دیا تھا۔''

''پھر...... اب تک وہ تمہارے کشٹ سے کیسے بچا؟''

''ہے کوئی چھایا جو اس کی سہائتا کر رہی ہے۔''

''تم نے اس چھایا کا کھوج لگایا؟''

''یہ دھرم کرم اور دیوی دیوتاؤں کی باتیں ہیں مورکھ...... ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔'' پرتاب بھوشن نے اٹھ کر جواب دیا پھر چکوری کے قرب کی تپش سے اپنی الجھن کا توڑ کرنے میں مگن ہو گیا...... چالیس دنوں کی تھکن بھی اتارنی تھی۔

☆☆☆

ایس پی اورنگ زیب اس وقت بھی اپنے آفس میں بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کی پوسٹنگ کو وہ صرف ایک کال میں ختم کرا کے دوبارہ اپنی سیٹ پر واپس آ جا سکتا تھا۔ کرنل احتشام نے بھی اس سلسلے میں اپنی مدد کا یقین دلایا۔ لیکن اورنگ زیب نے اسے بھی منع کر دیا تھا۔ وہ کچھ دنوں دشمنوں کو بھی اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ فی الحال عتاب میں ہے۔ اس طرح دور رہ کر وہ سکون سے بیٹھا ہر بات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے کارندے ایک ایک پل کی خبر دے رہے تھے، کسی قانونی رکاوٹ کو دور کرنے کی خاطر سراج کا بھرپور تعاون بھی اسے حاصل تھا۔ صرف ایک آئی جی تھا جس کو وہ اپنی مرضی کے خلاف بھگت رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے علم میں آ چکی تھی کہ خود آئی جی بھی کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے۔ وہ کون تھا؟ یہ بات خود کسی کے علم میں نہیں تھی۔

اس وقت بھی اورنگ زیب ایک پرانی فائل کے اوراق یونہی الٹ پلٹ رہا تھا جب اسے پینتھر کی کال ملی۔

''کیا خبر ہے؟'' فائل بند کر کے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ صرف اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نگرانی کرنے والے راؤنڈ دی کلاک پوری طرح چوکس ہیں۔ ابھی تک گھریلو ملازم یا ایک دو پڑوسی عورتوں کے سوا کسی اور کو اندر آتے جاتے نہیں دیکھا گیا۔''

''تمہارا ذاتی تجربہ کیا کہتا ہے؟''

''شاید اسے کہیں سے کوئی بھنک ضرور مل گئی ہے ورنہ آپ کے ماروی سے معاملات کرنے سے پیشتر وہ روزانہ باہر آتی جاتی رہی تھی۔''

''میں تمہاری اس بات کی تردید نہیں کروں گا۔'' اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس کے پاس آنے جانے والی فون کالز کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''وہ تو تجربہ کار لڑکی ہے سر، جس دھندے میں ملوث ہے اس میں بھی فون کے بجائے اب موبائل کا استعمال بڑھ گیا ہے۔''

''چھتے سے شہد نکالنے کا طریقہ جانتے ہو؟'' اورنگ زیب نے اس بار بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

''آپ حکم دیں سر۔ دھواں دینے کے علاوہ بھی کچھ ایسے طریقے جانتا ہوں جو کسی زہریلی ناگن کو بھی بلبلا کر بل سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔''

''گڈ۔'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ''فی الحال ہلکی ڈوز دینے کی کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے۔''

اورنگ زیب نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد کچھ سوچا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر سکندر علی شاہ کے نمبر ملائے۔

دوسری جانب سے فون ریسیو کرنے والے نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''کون بول رہا ہے؟''

''مجھے سکندر علی شاہ سے بات کرنی ہے۔'' اورنگ زیب نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''کیا نام ہے؟''

''ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں شاہ جی۔'' اورنگ زیب نے سنبھل کر اصل مقصد کا اظہار کیا۔ ''یہ بھی عرض کردوں کہ میں اپنی آفیشل حیثیت میں نہیں ذاتی اور باہمی دلچسپی کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہوں......'' کچھ توقف سے جواب ملا۔ ''میں مصروف آدمی ہوں، زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔''

''جانتا ہوں شاہ صاحب۔ اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ جو وقت دیں اسی وقت حاضر ہوجاؤں گا۔''

''اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو آج کل آپ کی پوسٹنگ ہیڈ کوارٹر میں ہے۔''

''جی ہاں۔''

''اوہ۔'' اس بار دوسری جانب سے برتری کا اظہار کیا گیا۔ ''آپ چاہیں تو میں آپ کے نئے پوسٹنگ آرڈر ایک فون کال پر بھی کروا سکتا ہوں۔''

''یہ بھی جانتا ہوں۔'' اورنگ زیب نے بہ دستور صبر سے کام لیا۔ ''لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ملاقات کی نوعیت آفیشل نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' پھر کچھ توقف سے کہا گیا۔ ''آج شام پانچ بجے میں حویلی پر چائے آپ کے ساتھ ہی پیوں گا۔''

''عزت افزائی کا پیشگی شکریہ۔''

دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی۔ اورنگ زیب نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اس کی پیشانی پر بس ایک پل کے لیے کچھ سلوٹیں ابھریں پھر وہ مسکرا کر دوبارہ پرانی فائل کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگا...... پھر

ٹھیک پانچ بجے وہ سکندر علی شاہ کی خوب صورت حویلی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر سکندر علی شاہ بھی اس کے سامنے موجود تھا۔ فیروزے کی تسبیح کے دانوں پر اس کی انگلیاں بھی متحرک تھیں۔ دو منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد اورنگ زیب نے سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں اس وقت آپ کے پاس اپنے لیے خصوصی دعا کی درخواست کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔''

''حیرت ہے۔'' سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ''آپ کو میری مریدی کا شوق کیسے ہوگیا؟''

''پہلے نہیں تھا لیکن آپ کے حلقے میں میرے ایک واقف کار بھی حاضری دیتے رہے ہیں۔ ان کو آپ کی دعاؤں سے جو فائدہ ہوا اس نے مجھے بھی متاثر کیا ورنہ......''

''آپ پولیس والے تو ہر مرض کا علاج ڈنڈے کے زور سے کرلیتے ہیں۔''

اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کے طنز کو محسوس کیا مگر اس نے بہ دستور انکساری سے کام لیا۔ ''آپ نے مجھے صرف پانچ منٹ کا وقت دیا ہے شاہ جی، اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کریں۔''

''دعا کی ضرورت کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟''

''ذہنی سکون۔'' اس بار اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ اس کے چہرے سے اندرونی کرب اور الجھن کے تاثرات بھی نمایاں ہونے لگے۔

سکندر علی شاہ ایک لمحے خاموش رہا۔ اس کی عقابی نظریں اورنگ زیب کے چہرے سے اس کی کہی ہوئی بات کا اندازہ لگا رہی تھیں جب اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی۔ نظر آنے والے نمبر دیکھ کر وہ چونکا تھا جسے اورنگ زیب نے بھی بطور خاص محسوس کیا پھر اس کی نظریں بھی بہ دستور سکندر علی شاہ کے چہرے پر مرکوز ہوکر رہ گئیں۔

''ہیلو۔'' سکندر علی شاہ نے موبائل آن کرکے جس انداز میں بات شروع کی وہ بھی اس بات کی غمازی کررہا تھا کہ فون کرنے والا کسی خاص اہمیت کا مالک تھا۔

''شگرہ بول رہا ہوں۔'' دوسری سمت سے سرسراتی آواز ابھری۔ ''میں نے نگینہ کے سلسلے میں بھی تم سے یہی کہا تھا کہ میں تم سے کبھی دور نہیں رہتا۔ جس پودے کو میں نے بڑی محنت سے کھاد اور پانی دے کر تناور کیا ہو اس کو ہمیشہ اپنی نظروں میں رکھتا ہوں۔ اس وقت تم غالباً ایس پی اورنگ زیب سے گفتگو میں مصروف ہو؟''

''کیا کروں مرید تو دعا کی خاطر آتے ہی رہتے ہیں۔''

''ایس پی جتنا زمین کے اوپر ہے اس سے دس گنا زیادہ گہرا ہے۔ محتاط ہوکر بات کرنا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔ مقدس کتاب میں ہر مرض کا موثر علاج بھی درج ہے۔''

''ایک ضروری بات اور سن لو۔'' پہلے سے زیادہ گمبھیر لہجے میں کہا گیا۔ ''ایس پی کے بارے میں کچھ اندرونی معلومات میرے پاس بھی ہیں۔ ایسی بات جو عام لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔ تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔''

''کہو، میں سن رہا ہوں۔'' سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

''محبت کی شادی اگر دو چار روز چل کر پرانی کار کی طرح ٹھپ ہوجائے تو ایک عام آدمی بھی فرسٹریشن کا شکار ہوجاتا ہے۔ ایس پی کی زندگی کا یہ حادثہ اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اس کا علم چند ایک افراد کے علاوہ کسی کو نہیں۔'' بات سنجیدگی سے جاری رکھی گئی۔ ''یہی احساس محرومی ہے جس نے ایس پی کو سخت گیر طبیعت کا مالک بنادیا ہے۔ جس عہدے پر ہے اس کی رعایتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک ناکامی کو عام زندگی کی کامیابیوں سے تسلی دینے کی کوشش کررہا ہے۔ تم نے جو فقروں کا نقاب اپنے مکروہ چہرے پر سجا رکھا ہے اس میں میری فراہم کردہ معلومات ایس پی کو چونکا دینے کے لیے کافی ہوں گی۔ تم اپنی شعبدہ بازی سے ایس پی کو کسی طرح فارم ہاؤس تک لانے کی کوشش کرو۔ ایک بار اس کے خلاف کوئی غیر اخلاقی ثبوت ہمارے ہاتھ آگیا تو پھر پوری طرح اپنی گرفت میں ہوگا۔'' دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا تو سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب سے کہا۔

''تھا ایک مرید جو اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔''

''شاہ جی، مجھے آپ کے قیمتی وقت کا احساس ہے اس لیے......''

''نہیں۔'' سکندر علی شاہ نے بات کاٹ کر فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں پولیس والوں سے ہمیشہ دور رہنے کا عادی ہوں لیکن آپ جس ضرورت کے لیے آئے ہیں اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔''

''یہ بھی آپ کی ذرہ نوازی ہے۔''

''ابھی آپ نے ذہنی سکون کے بارے میں کہا تھا۔'' سکندر علی شاہ نے بے حد سنجیدگی سے اورنگ زیب کے چہرے پر نظریں جما کر دریافت کیا۔ ''کیا آپ بتانا پسند کریں گے، آپ جس ذہنی انتشار کا شکار ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟''

''کام کی مصروفیت اور احساس ذمے داری۔'' اورنگ زیب کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے۔ ''جس محکمے میں ہوں وہاں کسی افسر کی ناکامی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور کامیابی کے حصول کے لیے ناپسندیدہ ہتھکنڈوں کو بھی اپنانا پڑتا ہے۔ ہیڈ کوارٹر کی پوسٹنگ کو میں بھی ایک فون کال میں منسوخ کروا سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔''

''آپ نے صاف گوئی سے کام لیا ہے تو میں بھی ایک بات عرض کردوں۔ شفا دینے والی ذات اوپر والے کی ہے۔ میں اپنے مریدوں سے بھی یہی کہتا ہوں پھر بھی وہ اصرار کرتے ہیں تو میں مقدس کتاب کی کوئی آیت پڑھنے کا مشورہ دے دیتا ہوں۔ اس کے حق میں دعا بھی کرتا ہوں، خدا کا کرم ہے کہ وہ اس فقیر کی لاج رکھ لیتا ہے۔''

''مجھے بھی کوئی مفید مشورہ دے کر میرے حق میں دعا کریں۔'' اورنگ زیب نے عاجزی کا اظہار کیا۔

''میں پھر حیرت کا اظہار کروں گا۔'' سکندر علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ جیسا کامیاب اور شہرت یافتہ پولیس آفیسر اور کسی فقیر سے دعا کی درخواست کرے...... کچھ عجیب سا لگتا ہے۔''

''اور کوئی وجہ ہوتی تو میں آپ کو زحمت نہ دیتا۔ فون پر میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ ذاتی اور باہمی دلچسپی کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

سکندر علی شاہ نے تسبیح ایک طرف رکھ کر اورنگ زیب سے کہا۔ ''ذاتی دلچسپی کا اظہار آپ نے کردیا، اب چائے پینے کے دوران میں کچھ باہمی دلچسپی کی باتیں بھی کرنا پسند کروں گا۔''

سکندر علی شاہ نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دینے کے بعد کہا۔ چائے کے دوران سکندر علی شاہ کی عقابی نظریں شگرہ کی فراہم کردہ اطلاع کی روشنی میں اورنگ زیب کو ٹٹولتی رہیں پھر چائے کے برتن واپس جانے کے بعد اس نے قدرے بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میرے فارم ہاؤس کے بارے میں قومی اور صوبائی محکموں کے اعلیٰ عہدیدار بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ وہاں آکر ایک دو دن کیوں گزارتے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ آپ بھی واقف ہوں لیکن مجھے اس کی پروا کبھی نہیں ہوئی۔ ذاتی طور پر بھی میں خوب صورت لڑکیوں کی موجودگی میں کچھ وقت اپنے مخصوص ریسٹ ہاؤس میں گزارتا ہوں۔ مقصد نفس کشی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ماروی بھی میری مہمان بن کر وہاں آئی تھی۔ بعد میں کیا ہوا اور کیا نہیں اس کا علم آپ کو ماروی سے ملاقات کے دوران ضرور ہوا ہوگا۔ بال کی کھال نکالنے کی خاطر آپ کے محکمے نے کچھ اور لڑکیوں پر بھی پہرے بٹھادیے ہیں۔ میری صحت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا مگر...... میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے یہ ضرور معلوم کرنا پسند کروں گا کہ خود ماروی نے آپ کو کیا کہانی سنائی ہے۔''

‘‘آپ نے دوست کہا ہے تو میں بھی بے تکلفی سے ہی بات کروں گا۔’’ اورنگ زیب نے سنبھل کر کہا۔ ‘‘جس دن ماروی فارم ہاؤس گئی اس روز آپ وہاں سرے سے نہیں گئے تھے۔ آپ کی عدم موجودگی میں کس نے فائدہ اٹھایا، خود ماروی بھی اس کی شکل نہیں دیکھ سکی البتہ اسے بے آبرو کرنے والے نے زبان بند رکھنے کی خوف ناک دھمکی ضرور دی تھی۔ ماروی نے روانی میں اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے کہنے پر ایک رات کے لیے فارم ہاؤس گئی تھی پھر...... ماروی نے کسی خوف سے اپنی زبان بند کرلی۔ اس رات کے بعد کون جیا، کون مرا یہ بھی میرے علم میں ہے مگر میں نے اس کی تفتیش بھی بوجوہ نہیں کی۔’’

‘‘اگر میں اس کی وجہ دریافت کرنا چاہوں تو؟’’ سکندر علی شاہ کی پیشانی پر ایک لمحے کو پسینے کی نمی محسوس ہوئی پھر وہ بھی غائب ہوگئی۔

‘‘ذاتی طور پر میرا مشاہدہ ہے کہ وہ پولیس آفیسر بہت جلد بدنام ہوجاتے ہیں جو قحبہ خانوں یا جوئے کے اڈوں سے بھتا وصول کرنا شروع کردیں۔’’ اورنگ زیب نے ایک لمحے توقف سے بات جاری رکھی۔ ‘‘میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی اس چوکی دار کی خودکشی کی خبر سن کر اس بات کا یقین نہیں آیا ہوگا کہ وہ آپ کے اعتماد کو دھوکا دے سکتا ہے۔’’

‘‘پھر......’’ سکندر علی شاہ چوکی دار کے سلسلے میں اورنگ زیب کا جواب سن کر چونکا۔ ‘‘اگر وہ ذمے دار نہیں تھا تو پھر اس نے خود کو موت کی آغوش میں کیوں سونپ دیا؟ کس نے اسے مجبور کیا ہوگا جب کہ وہاں کا سارا عملہ میرے اعتماد کا ہے۔’’

‘‘میں معذرت خواہ ہوں شاہ جی! اس سلسلے میں کچھ عرض نہیں کرسکوں گا۔’’

‘‘آپ کس وجہ سے معذرت خواہ ہیں؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس وقت بھی پولیس کی کوئی مصلحت آپ کے آڑے آرہی ہے۔’’

جواب میں اورنگ زیب نے جیب سے بال پین نکال کر اپنی ہتھیلی پر دو لفظ ‘‘یہاں نہیں۔’’ لکھ کر سکندر علی شاہ کو دکھایا پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔ ‘‘محض کسی شبہے کی بنا پر جس کی کوئی وجہ بھی میرے علم میں نہ ہو۔ میں زبان کھولنا پسند نہیں کرتا۔ آپ سے اب یہی درخواست کروں گا کہ ذہنی سکون حاصل کرنے کی خاطر مجھے کوئی حل تجویز کردیں۔’’

‘‘جب تک ذہنی انتشار کی اصل وجہ نہ معلوم ہو کوئی وظیفہ یا دعا کارگر نہیں ہوگی۔ مرض کی تشخیص بنیادی شرط ہے۔’’

‘‘میں اسے پولیس کی ملازمت اور اپنی اصول پسندی پر قائم رہنے کی وجہ ہی کہوں گا۔’’

‘‘قیافہ شناسی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟’’ سکندر علی شاہ نے، جس کے ذہن میں اورنگ زیب کی ہتھیلی پر لکھے لفظ بار بار ابھر رہے تھے، محتاط انداز میں سوال کیا۔

‘‘ذاتی طور پر میں علم الاعداد، قیافہ شناسی یا علم نجوم پر اعتقاد نہیں رکھتا۔’’ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

‘‘اور اگر میں آپ کو آپ کے ذہنی انتشار کی نفسیاتی وجہ بتادوں تو آپ کیا کہیں گے؟’’

‘‘ہم...... میں سمجھا نہیں۔’’ اورنگ زیب نے وضاحت طلب انداز اختیار کیا۔ ‘‘آپ کی قیافہ شناسی کیا کہتی ہے؟’’

‘‘زر...... زن اور زمین، یہ تینوں ہی چیزیں انسان کی بنیادی کمزوری اور فساد کی جڑ ہوتی ہیں۔’’ سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ دو تین منٹ وہ ٹھوڑی کو سینے سے لگائے عجیب انداز میں گم صم رہا پھر اس نے آنکھیں کھول کر سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

‘‘آپ کے ساتھ ماضی میں جو ہوا وہ اچھا نہیں ہوا...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟’’

‘‘ماضی کا احاطہ خاصا وسیع و عریض ہوتا ہے، آپ کس مخصوص بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں؟’’

‘‘انسان کسی کو دل سے چاہے، چاہ کر بڑے ارمانوں سے اپنائے اور پھر...... دوسرا فریق خلاف توقع روٹھ کر ناتا توڑ لے تو دل پر جو زخم لگتا ہے وہ ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ آپ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں جو اب بھی عملی زندگی میں مضبوطی سے قدم جمائے ہیں ورنہ ذہنی سکون کا انتشار بڑھ کر دیوانگی کی حد سے بھی گزر جاتا۔’’

اورنگ زیب اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا۔ اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن ذہن میں ایک سوال ضرور گونج رہا تھا کہ وہ مخصوص بات جو اس کے بیشتر عزیز داروں کے علم میں بھی نہیں تھی، جسے گزرے برسوں بیت گئے تھے۔ فاصلے بھی اتنے زیادہ بڑھ گئے تھے کہ اس نے خود بھی پلٹ کر کبھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا، وہ بات سکندر علی شاہ کے علم میں کیسے آگئی؟ سکندر علی شاہ کون تھا، کیا تھا؟ اورنگ زیب اس کی رگ رگ سے واقف ہوچکا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ مریدوں کی علت اس نے محض دنیا دکھاوے کے لیے پال رکھی تھی۔ فارم ہاؤس میں آئے دن نت نئی اور خوب صورت لڑکیوں سے دل بہلانے والا، بااثر افسران کو بلیک میل کرنے کی خاطر ان کو عیش و عشرت کے جال میں پھنسانے والا بہروپیا محض آنکھ بند کرکے کسی کے ماضی میں جھانک سکے...... یہ بات اورنگ زیب کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

‘‘کس سوچ میں گم ہوگئے؟’’ سکندر علی شاہ نے مسکرا کر سوال کیا پھر اپنے مکروہ چہرے پر کسی بزرگ کا ملمع چڑھا کر بولا۔ ‘‘کیا میں نے کچھ غلط کہا؟’’

‘‘مرض کی تشخیص کرلی ہے تو اس کا علاج بھی عرض کردیں۔’’ اورنگ زیب نے دوبارہ خود کو سچویشن کے سانچے میں ڈھال لیا مگر اس کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ کال بھی ابھرنے لگی جو کچھ دیر پہلے سکندر علی شاہ نے منہ بنا کر ریسیو کی تھی۔ یہ بات بھی اس کے ذہن میں تھی کہ سکندر علی شاہ حلقے اور کسی سے ملاقات کے دوران موبائل کالوں کو ریسیو کرنے کا عادی نہیں تھا پھر...... وہ کون تھا جس کی کال کو اس نے چہرے سے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اٹینڈ کرلیا تھا۔

‘‘ہیرے کو ہیرا ہی کاٹتا ہے اور زہر کا موثر علاج بھی زہر ہی ہے۔’’ سکندر علی شاہ کچھ اور کھل گیا۔ ‘‘آپ نے ایک کو محبت سے حاصل کیا پلکوں پر بٹھایا لیکن وہ ساتھ چھوڑ گئی۔ کسی دوسری کو پیسوں یا طاقت کے زور پر مسل کر رکھ دیں تو یہ انتقام مکمل تو نہ ہوگا لیکن جنون کی شدت میں کمی ضرور واقع ہوجائے گی۔’’

‘‘یہ...... یہ مشورہ آپ دے رہے ہیں؟’’ اورنگ زیب نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

‘‘ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتے ہیں ان میں بھی الکوحل استعمال ہوتی ہے، ذرا مختلف انداز میں۔ بالکل اسی طرح آپ کے علاج کی بنیادی وجہ علاج ہی ہوگی۔ اسے عیاشی نہیں کہا جائے گا۔’’

‘‘اوہ۔’’ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ‘‘لیکن جہاں میرے ہزاروں دوست ہیں وہاں کچھ دشمن بھی پل پل کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو علم ہوگیا تو میری ساکھ......’’

‘‘آپ اس وقت سکندر علی شاہ کے پاس ایک دوست کی حیثیت سے آئے ہیں تو مجھ پر دوست بن کر اعتماد بھی کریں۔ فارم ہاؤس تک میرے ملازموں کے سوا کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ بے شمار اعلیٰ عہدیدار وہاں محض تفریح کی غرض سے بھی آتے ہیں۔ ان کے لیے بھی کسی ایسے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے جب بات کسی اور کان تک نہ پہنچے۔’’ سکندر علی شاہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ‘‘کسی پر کیچڑ ہی اچھالنی ہو تو اس کے سوا دوسرے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ایک تجربہ کار اور ذمے دار پولیس آفیسر کی حیثیت سے آپ کے علم میں بھی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہوں گی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی عرض کردوں۔’’ سکندر علی شاہ کے لہجے میں اچانک تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ‘‘جو لوگ میرے اعتماد کو دھوکا دیں یا

نوکری

بے روزگاری سے تنگ آکر ایک نوجوان نے چڑیا گھر میں نوکری کرلی۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ مقررہ اوقات میں ریچھ کی کھال پہن کر پنجرے میں بیٹھا رہے۔ ریچھ کے پنجرے کے ساتھ شیر کا پنجرہ تھا۔ دونوں پنجروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ ایک دن اتفاق سے وہ دروازہ کھل گیا اور شیر، ریچھ کے پنجرے میں آگیا۔ ریچھ کی کھال والا شخص ڈر گیا اور چیخنے لگا۔ ‘‘بچاؤ، بچاؤ، شیر! شیر!’’

شیر جلدی سے اپنا منہ ریچھ کے کان کے قریب لایا اور آہستہ سے بولا ‘‘خود تو نوکری سے نکلے گا ہی ساتھ میں مجھے بھی نکلوائے گا۔’’

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

اقوال زریں

✂ محبت آپ کو ساری دنیا کے سامنے مضبوط بناتی اور اس کے سامنے کمزور کرتی ہے جس سے آپ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔

✂ برداشت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکثریت میں ہوں اور جرأت کا امتحان اس وقت جب ہم اقلیت میں ہوں۔

✂ انسان زندگی بھر دو چہرے نہیں بھول سکتا ایک جو مشکل حالات میں ساتھ دے اور دوسرا جو مشکل حالات میں ساتھ چھوڑ دے۔

مرسلہ: عزیز رحمان تارییجو، سانگھڑ

ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں میں ان کو ٹھکانے لگانے میں دیر بھی نہیں کرتا۔ محبت اور جنگ میں تمام حربے استعمال کرنے والی مثال آپ نے بھی سنی ہوگی۔‘‘

’’میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں لیکن ابھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ نے جو تشخیص کی ہے وہ سو فی صد درست ہے مگر اس کے علاج کے بارے میں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔‘‘

’’مسئلہ آپ کا ہے اس لیے میں اصرار نہیں کروں گا۔‘‘ سکندر علی شاہ نے بے پروائی سے جواب دیا پھر موضوع بدل کر کہا۔ ’’شیلا ورما کے بیوٹی پارلر کے سلسلے میں میرے فون کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا میں اس کی تعریف کروں گا۔ بائی دی وے کیا حملہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی اطلاع یا خبر آپ کے پاس بھی ہے؟‘‘

’’میں اور سراج ایک ہی ہیں۔‘‘ اورنگ زیب نے کھل کر کہا۔ ’’درپردہ وہ میرے ہی مشورے پر عمل کررہا ہے۔‘‘

’’لیکن آپ کی پوسٹنگ......‘‘

’’ہیڈ کوارٹر میں ہے۔‘‘ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ’’پولیس کے ایس پی کی حیثیت اور اختیار کے علاوہ وہ میرے پاس بہت اوپر سے جاری کیا گیا ایک مخصوص اجازت نامہ بھی ہے جس کی رو سے مجھے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔‘‘

’’اوہ...... پھر تو آپ سے دوستی اور بڑھانی پڑے گی۔‘‘ سکندر علی شاہ نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا پھر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ’’آپ دوبارہ جب بھی آنا چاہیں بلا تکلف آسکتے ہیں۔ میں دشمنی کے ساتھ دوستی کے تمام زریں اصولوں پر عمل کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیتا۔‘‘

پھر کھڑے کھڑے کچھ رسمی جملوں کے بعد اورنگ زیب حویلی سے باہر آگیا لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں وہی موبائل کال سوالیہ نشان بن کر بار بار ابھر رہی تھی جسے سکندر علی شاہ نے ریسیو کرتے وقت برا سا منہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی چبھ رہی تھی کہ جس راز کو اس نے طویل عرصے سے سینے میں دفن کر رکھا تھا اس کی ہوا کسی اور کو کیسے لگی؟ سکندر علی شاہ کی قیافہ شناسی والی بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتی پھر...... کیا جس کی کال درمیان میں آئی تھی وہ اس راز سے واقف تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو کون تھا جس کا علم اورنگ زیب کو بھی نہیں تھا؟

کچھ ضمنی سوالات اور تھے جو تادیر اورنگ زیب کے ذہن کو کچوکے لگاتے رہے۔ بیس بائیس سال پرانی یادیں جنھیں وہ خود بھی سینے کی گہرائیوں میں دفن کرکے فراموش کرچکا تھا، آہستہ آہستہ پھر سر ابھارنے لگیں۔

☆☆☆

ایک بار کشمیر فرنیچر کی تباہی کے بعد جگا نے اسے دوبارہ ماڈرن طور پر ڈیکوریٹ کرنے کے ساتھ ہی وہاں ایک گارڈ کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔ ایک کے بجائے اندر گاہکوں کو اٹینڈ کرنے کی خاطر ایک ملازم کا اضافہ بھی کرلیا تھا جو اس کے اپنے ہی گروہ کا ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ اسے علم تھا آکٹوپس کے زرخرید کتے بھی ادھر کی ٹوہ ضرور لیتے ہوں گے۔

اورنگ زیب کے اشارے کے بعد جگا نے شیخ حامد سے بدلہ لینے کا ارادہ ضرور وقتی طور پر ملتوی کردیا تھا لیکن اس کے وجود کے اندر انتقام کی سلگتی چنگاریاں کم نہیں ہوئی تھیں۔ شیخ حامد کی کوٹھی کی بربادی میں اس نے لوچن کے ساتھ مل کر دل کو جھوٹی تسلی بھی دے لی تھی لیکن وہ حساب چکتا کرنے کی خاطر براہ راست اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ اسی غرض سے اس نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کسی ڈائریکٹ ایکشن کے بجائے اورنگ زیب کو فرنیچر کے دکان کی تباہی کی اطلاع دی تھی۔ ایک بار لمبی سزا بھگت لینے کے بعد وہ دوبارہ اپنا پولیس ریکارڈ مزید خراب کرنے کی بھول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جیل سے واپس آنے کے بعد ایک بار سوچا ضرور تھا کہ ان بدمعاشوں کا روپ دھار لے جن پر ہاتھ ڈالنے سے پولیس بھی کتراتی ہے لیکن اس کے پڑوسی امداد علی نے جو پولیس کا سابقہ ہیڈ کانسٹیبل تھا اس کی مالی مدد کرکے اسے فرنیچر کے کاروبار کا مشورہ دیا تھا چنانچہ جگا نے جرائم کی دنیا میں دوبارہ قدم رکھنے سے توبہ کرلی تھی۔ یہ اس کی کوششوں اور ایمان داری کا ہی نتیجہ تھا کہ فرنیچر کے کاروبار میں خدا نے اس کی مدد کی۔ امداد علی کی رقم اس نے پہلی فرصت میں پائی پائی کرکے ادا کردی تھی اور کاروباری حلقوں میں اپنی ساکھ بھی بنالی تھی۔ اسی اچھی ساکھ کی بنیاد پر اسے قانونی اداروں سے تعلق رکھنے والوں نے رعایت بھی دی تھی۔ کچھ ذمے دار حلقوں میں اسے جانا پہچانا جانے لگا تھا لیکن شیخ حامد کے ساتھ وہ رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی خاموشی کو بزدلی اور نامردانگی کا نام بھی دیا جاسکتا تھا۔ ایک بار وہ نظریں جھکا لیتا تو پھر دشمن کے کرائے کے ٹٹو بھی اس کے سامنے سینہ تان کر چلنے کے عادی ہوجاتے۔ وقت اور حالات کی نزاکت کو بھانپ لینے کے بعد ہی اس نے لوچن سے بھی دوستی کا ہاتھ ملالیا تھا۔ نگینہ کے اغوا اور پھر اس کی سکندر علی شاہ تک واپسی میں بھی اس نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ ہرچند کہ اس بار لوچن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اسے خود بھی اس بات کا شبہ تھا کہ شیخ حامد نے مرنے کے بعد دوبارہ منظرعام پر آکر جس دیدہ دلیری سے کنول کو اغوا کروایا اس کی ماں کو مروادیا پھر کنول کو بھی بے عزت کرکے دھتکار دیا تھا، وہ محض تفریح کی غرض سے نہیں کیا ہوگا۔ اس کا مقصد ایک بار پھر وہی ہوگا جو پہلے تھا۔ وہ پولیس کے علاوہ کاروباری حلقوں میں بھی اپنی حیثیت کا سکہ جمانے کا خواہش مند ہوگا۔ کنول کے بیان کی اشاعت کے بعد ہر فرد کو یقین آگیا تھا کہ وہ ان ہی کے درمیان کہیں سانس لے رہا ہے۔ خود کو پولیس کی دسترس سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس نے کسی محفوظ اور مضبوط جگہ اور شخصیت کا انتخاب بھی ضرور کیا ہوگا۔ نگینہ کے حوالے پر جگا کے ذہن میں بھی سکندر علی شاہ کا نام سوالیہ نشان بن کر ابھرا تھا۔ اسی سبب اس نے لوچن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا پھر خود بھی پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا تھا۔

اس وقت بھی وہ فرنیچر ہاؤس کے عقبی مکان میں اپنے آفس میں بیٹھا ایک کاروباری آدمی سے فرنیچر کے موضوع پر کاروباری گفتگو کررہا تھا جب اس کے سامنے دروازے پر لگا بیٹری سائز کا سرخ بلب روشن ہوگیا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ جگا نے فوری طور پر دفتر میں موجود فرد سے کسی ضروری کام کا بہانہ کرکے اجازت چاہی پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی راستے کی سمت بڑھا جو فرنیچر ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔

سرخ بلب نے جس خطرے کی اطلاع دی تھی اس کا اندازہ اسے گودام میں قدم رکھتے ہی ہوگیا۔ شوروم میں اس کے کارندوں کے علاوہ دو تین آدمی اور بھی موجود تھے۔ جگا محتاط قدم اٹھاتا بند دروازے کے قریب چلا گیا۔

’’تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارا مالک ہماری اطلاع کے مطابق اس وقت بھی اندر موجود ہوگا۔‘‘ کسی کی کرخت آواز گونجی۔

’’آپ کا خیال غلط ہے جناب۔‘‘ ملازم نے جواب دیا۔ ’’وہ اس وقت بازار کی طرف گئے ہیں۔ اگر ہوتے جب بھی مول بھاؤ کی تمام تر ذمے داری انھوں نے منیجر کے سپرد کررکھی ہے۔‘‘

’’اور اگر ہم تمہارے منیجر کو منہ لگانے سے انکار کردیں تو؟‘‘ اس بار بھی غیر مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

’’آپ کی مرضی ہے جناب لیکن جہانگیر بٹ صاحب کے بارے میں جو بات میں نے آپ سے کہی ہے وہ بھی غلط نہیں ہے۔‘‘

’’پھر سوچ لو...... تمہاری حیثیت ہماری نظروں میں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ نہیں ہے اور ہم بادشاہ کا سر نیچا کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ ایک بار تمہارے اس کاروباری نام تو بڑے کا جو حشر ہوچکا ہے وہ بھی تمہارے علم میں ضرور ہوگا۔ اب اگر بات بڑھی تو ہم پھر حد سے گزر جانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔‘‘ جواب دینے والے کے لہجے میں گھن گرج کے علاوہ کھلا چیلنج بھی تھا۔

جگا نے دروازے کی جھری سے دوسری طرف دیکھا تو چونک اٹھا۔ اس کے سامنے جو آدمی موجود تھا وہ ایک مفرور اور پولیس کو مطلوب مجرم تھا۔ اس کے دوسرے آدمی نے منیجر کے سامنے سینہ تان رکھا تھا۔ تیسرا شخص دروازے کے قریب موجود باہر کی سن گن لے رہا تھا۔ گارڈ کو شاید وہ پہلے ہی قابو کرچکے تھے۔ جگا کو گروہ کا آدمی بھی سامنے نظر نہیں آرہا تھا۔

پچویشن کا اندازہ لگا کر جگا کسی زخمی درندے کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا اس نے سائلنسر لگے پستول پر اپنی گرفت پوری طرح جمالی، ایک پل میں وہ پچویشن پر قابو پاسکتا تھا لیکن دکان میں لاشوں کی موجودگی سے اس کی کاروباری ساکھ کے علاوہ اس کی ذاتی حیثیت بھی متاثر ہوسکتی تھی۔ دوسری طرف آنے والے پوری تیاری سے آئے تھے۔ باہر ان کے ساتھی موجود ہوسکتے تھے۔ جگا نے فوری طور پر جیب سے موبائل نکال کر اورنگ زیب کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اب اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ گہری ہورہی تھی جب سامنے کھڑے آدمی نے دروازے پر موجود اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

’’یہ لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھ رہے ہیں، تمہارا کیا حکم ہے؟‘‘

’’میرا نہیں، باس کا حکم یاد رکھو۔ اس نے یہی کہا تھا کہ اصل آدمی کے بخیے ادھیڑ کر اسے برہنہ حالت میں کسی کوڑے دان پر ڈال دو جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا کیا نہیں، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔‘‘

’’اب تمہارا کیا جواب ہے؟‘‘ سامنے موجود جرائم پیشہ نے سرسراتے لہجے میں ملازم کو گھورا۔ ’’شرافت سے سچ اگل دو ورنہ تم بھی کام آجاؤ گے۔‘‘

’’میرا جواب جو پہلے تھا اب بھی......‘‘

ملازم اپنا جملہ پورا نہ کرسکا، پیشہ ور مجرم کا ہاتھ برق رفتاری سے گھوما تو وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ منیجر نے بوکھلا کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نپی تلی ضرب نے اسے بھی زمیں بوس کردیا۔ اس کے ساتھ ہی باہر کہیں موجود دو تین آدمی اور دکان میں آ گئے۔ جگا نے ان کو بھی چہرے بشرے سے پہچان لیا۔ سب کے ہاتھ جیبوں میں تھے جو اس بات کی نشاندہی کررہے تھے کہ وہ اسلحہ سے بھی ضرور لیس ہوں گے۔

خطرے کی سنگینی بڑھتی جارہی تھی۔ جگا نے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔ ملازم سے چھٹکارا پانے والا اب دروازے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ جگا سامنے سے ہٹ کر دیوار سے چمٹ گیا پھر جیسے ہی وہ اندر آیا، جگا نے الٹا ہاتھ اس کی گردن میں پھنسا کر پستول اس کی کمر سے لگا دیا۔

”آواز نکالنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کردوں گا۔“

”بہتر ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کردو۔“ بے بسی کے باوجود جگا کی گرفت میں پھنسے ہوئے شخص نے بے جگری سے کہا۔ ”جو لوگ تمہیں سامنے نظر آ چکے ہیں ان کے علاوہ بھی ہمارے ساتھی باہر وین میں موجود ہیں۔ ہم خالی ہاتھ واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔“

جواب میں جگا نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف کیا پھر اس نے بڑی پھرتی سے پستول کا دستہ اس کے سر پر پوری قوت سے مارا، وہ لہرا کر گرا لیکن گرتے گرتے اس کا ہاتھ دروازے سے ٹکرایا تو باہر والے بھی ہوشیار ہو گئے۔ اس کے بعد جو چال انہوں نے چلی وہ جگا کے لیے بھی قابل غور تھی۔

فرنیچر شاپ کا شٹر اندر سے گرا لیا گیا پھر کسی نے باہر سے کرخت سی آواز میں کہا۔

”جگا...... ہاتھ اٹھا کر سامنے آجاؤ۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیرا جاچکا ہے۔ تم مر گئے تب بھی ہم تمہاری لاش کو گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ بلاوجہ تمہارے کچھ پڑوسی بھی کام آجائیں گے۔“

جگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ زیادہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ پستول میں آٹھ گولیوں کی میگزین بھری ہوئی تھی۔ وہ اندر آنے والوں کو بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن حتی الامکان وہ خون خرابے سے بچنا چاہتا تھا۔ زیادہ محتاط روی اس کے اپنے حق میں بھی خطرناک ہوسکتی تھی۔

”ہم صرف پانچ تک گنیں گے۔ اس کے بعد جو بھی صورت حال ہوئی اس کی ذمے داری تمہارے کاندھوں پر ہوگی۔ ایک......“ باہر سے گنتی شروع ہوگئی۔

”دو...... تین......“

جگا نے تلملا کر پستول کا رخ باہر کی سمت کرلیا۔ اب مرنے یا مار ڈالنے کے سوا کوئی تیسرا آپشن بھی نہیں تھا۔ باہر سے بلند آواز میں ”چار“ کہا گیا پھر گرے ہوئے شٹر کو کسی نے باہر سے کھڑکھڑایا۔ گنتی رک گئی۔ کسی نے شٹر کے قریب جاکر پوچھا۔

”کون ہے؟“

جواب میں کیا کہا گیا۔ جگا نہیں سن سکا لیکن شٹر کھول دیا گیا پھر جو بھی ہوا جگا کی توقع کے خلاف ہی تھا۔ آواز دینے والا اندر آیا۔ اس نے پلٹ کر شٹر دوبارہ گرادیا پھر ایک مانوس آواز جگا کے کانوں میں گونجی۔

”کسی قسم کی ہوشیاری دکھانے کے بجائے اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ چوہوں کی طرح کچل کر رکھ دوں گا۔“

جگا نے آڑ سے جھانکا تو آنے والے کے قد و قامت کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوگئیں۔ اس وقت بھی وہ میک اپ میں تھا اور کوئی مقامی بدمعاش لگ رہا تھا لیکن اس کی آواز اس کی شناخت کے لیے کافی تھی۔ وہ لوچن تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کی ری پیٹر رائفل دیکھ کر سب ہی کے ہاتھ جیبوں سے باہر آ کر فضا میں بلند ہوگئے تھے۔ جگا بھی لپک کر سامنے آگیا۔ سب سے پہلے ان کی جیبوں میں رکھا اسلحہ نکال کر فرنیچر کے ڈھیر پر اچھال دیا پھر اس نے لوچن سے کہا۔

”میں اورنگ زیب صاحب کو فون کرچکا ہوں۔ ان کے آنے میں دیر بھی نہیں لگے گی لیکن تم اس وقت......“

”دوستی کا ہاتھ ملانے والے ایک دوسرے سے کبھی غافل نہیں رہتے۔“ لوچن نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ایس پی کے آنے سے پہلے مہمانوں کی کچھ خدمت بھی کرلیں ورنہ ان کو بھی ہماری حیثیت اور مہمان نوازی سے شکایت ہی رہے گی۔“

اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لوچن کی رائفل بھی حرکت میں آگئی۔ ایک شخص کراہتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

”ایسے نہیں میرے یار۔“ جگا نے لوچن سے کہا۔ ”ان لوگوں کو بھی ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع دو۔“

اس کے بعد فرنیچر کا شوروم میدان جنگ بن گیا۔ آنے والے بھی سکہ بند بدمعاش تھے۔ وہ بھی سر سے کفن باندھ کر مرنے مارنے پر تل گئے۔ ایک نے جگا سے الجھ کر گھٹنوں کا استعمال کیا تو جگا کراہ کر دہرا ہوگیا۔ شدید تکلیف

نے جگا کے اندر بھی چنگاریاں بھر دیں۔ اس نے اچانک اپنے مقابل کے پیٹ پر سر کی ٹکر ماری تو وہ بلبلا کر رہ گیا پھر جگا نے اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ دیسی کشتی کا ایک آزمودہ داؤ آزمایا تو وہ چاروں خانے چت گرا۔ اس کے گرتے ہی جگا کے بوٹ کی ٹھوکر اس کے منہ پر لگی تو خون ابل پڑا۔ دوسری طرف لوچن نے دو آدمیوں کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑرہی تھیں۔ آنے والے دو آدمی اپنے تین آدمیوں کا انجام دیکھ کر شٹر کھولنے کی خاطر لپکے تھے۔ ایک کو لوچن نے بروقت ٹانگ درمیان میں ڈال کر اوندھے منہ گرادیا۔ دوسرے کو جگا نے جست لگا کر دبوچ لیا۔ دونوں جنگلی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے سے زور آزمائی کرنے لگے۔ لوچن نے اپنے بازوؤں کا حلقہ پوری قوت سے یکلخت تنگ کیا تو اس کا شکار بھی بے ہوش ہوکر جھول گئے۔ جگا کے نپے تلے ہاتھ بھی مشینی انداز میں حرکت کررہے تھے جب باہر سے شٹر کو دوبارہ کھولا گیا۔

آنے والا اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملحقہ تھانے کی نفری بھی تھی جنہوں نے مجرموں کو قابو کرلیا۔ ایس آئی لوچن کی طرف بڑھا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے روک دیا۔ اس نے اشارے سے لوچن کو وہاں سے چلے جانے کی ہدایت کی۔ لوچن مسکراتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔

”سر...... یہ کون تھا؟“ ایس آئی نے دبی زبان میں اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”مخبر۔“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا پھر اس کی ہدایت پر ایس آئی نے ضابطے کی کارروائی شروع کردی۔

باہر سڑک پر پاس پڑوس کے دکان داروں کے علاوہ کچھ راہ گیر بھی جمع ہونے لگے تھے۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد اورنگ زیب نے لوگوں کو یہی بتایا تھا کہ آنے والے ڈاکا مارنے کے ارادے سے آئے تھے جس کی خبر بروقت تھانے کو بھی مل گئی تھی پھر اورنگ زیب کے اشارے پر جگا بھی دکان بند کرکے اورنگ زیب کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

چار سو گز پر تعمیر بنگلوں کی چار دیواریاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ ایک فوت شدہ قومی لیڈر کے نام پر چالیس بنگلوز کا وہ بلاک ایک ہی تعمیراتی کمپنی نے بنایا تھا، اس لیے اس کے نقشے بھی ایک ہی جیسے تھے۔ زیادہ تر بنگلے ون یونٹ تھے لیکن بعد میں ان کے مالکان نے کچھ ترمیم بھی کرلی تھی۔ ان بنگلوں میں رہنے والے درمیانے درجے کے وہ لوگ تھے جو زمین خرید کر از خود تعمیراتی اخراجات یکمشت نہیں برداشت کرسکتے تھے۔ پہلے ایڈوانس پھر تعمیری مرحلوں کے مختلف طے شدہ پروگرام کے تحت رقوم کی ادائیگی اور قبضہ حاصل کرنے کے بعد دو سال کے اندر مکمل ادائیگی ہرچند کے کچھ زیادہ مہنگی ضرور پڑتی تھی لیکن تنگی ترشی سے بہرحال افورڈ بھی کی جاسکتی تھی۔

درمیانہ درجے کے لوگوں کے علاوہ بھی اس بلاک میں ایک چوتھائی رہائش ان سرکاری افسران کی بھی تھی جو اپنی کرسی کی اوپر کی آمدنی سے ہزار گز کے عالیشان مکان بھی تیار کرسکتے تھے لیکن اینٹی کرپشن والوں کے خطرے سے وہ بھی اپنی جائز آمدنی سے زیادہ پیر پھیلانے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اوپر کی آمدنی وہ گورنمنٹ کی مختلف اسکیموں میں غریب رشتے داروں یا فرضی نام سے انویسٹ کرکے فائدہ وصولتے رہتے تھے۔

دلربا اسی بلاک کے بنگلہ نمبر بی فورٹین میں رہتی تھی۔ اس کے والد کو فوت ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ ماں جو ایک اسکول میں ٹیچر تھی اس کی عمر بھی زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ گزرتے وقت اور شوہر کی جدائی نے اس کی کمر بھی توڑ دی تھی۔ والد کی پنشن اور اسکول کی تنخواہ پر گھر کا گزارہ چل رہا تھا۔ دلربا نے جیسے تیسے کرکے بارہ جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ میٹرک پاس کرنے تک اسے اپنی تنگ دامنی کا احساس بھی نہیں ہوا لیکن کالج میں قدم رکھتے ہی اسے اپنی غربت کا احساس اس قدر شدت سے ہوا کہ وہ اپنے ڈگمگاتے قدم سنبھال نہ سکی۔ مادر پدر آزاد تہذیب اور ماڈرن فیشن کے تقاضے اس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتے رہے۔ ہم جماعت سہیلیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ حسین خدوخال کی مالک ہونے کے علاوہ ذہین بھی تھی۔ دلربا کی ان خوبیوں کو سب سے پہلے اس کی ایک ہم جماعت سہیلی نے بھانپ لیا جو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ لڑکوں سے بھی فلرٹ کرنے کی عادی تھی پھر ایک بوائے فرینڈ کے بے حد اصرار پر اس لڑکی نے دلربا سے بھی دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کردیں۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی چمچماتی کار تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ دلربا نے جب پہلی بار اس کے ساتھ کالج سے واپسی کا سفر کیا تو یوں لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

مہینے دو مہینے کی ملاقاتوں کے بعد وہ فریال نامی لڑکی

سے اس حد تک گھل مل گئی کہ اس کے ساتھ بڑے بڑے ریسٹورنٹ میں بھی جانے لگی۔ گیارھویں جماعت کے امتحان کے دوران دلربا کی ملاقات فریال کے بوائے فرینڈ نجم سے بھی ہوئی جو خود بھی بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ فریال دلربا کی موجودگی میں بھی نجم سے خاصی بے تکلفی سے ملتی تھی۔ دلربا ان کی گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لیتی تھی لیکن نجم کی مردانہ وجاہت اور برجستہ چبھتے ہوئے جملوں سے وہ بھی متاثر ہوئی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ دلربا کے ذہن میں روشن معاشرے کی تہذیب کے جراثیم بھی داخل ہوئے تو اسے اپنی غربت کا احساس زیادہ شدت سے ہونے لگا۔ فریال نے دلربا کی اس کمزوری کو بھانپ کر اسے بڑی خوبی سے شیشے میں اتارنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس پر پوری طرح حاوی ہوگئی۔ گیارھویں جماعت کے دوران ہی ایک روز اس نے دلربا سے کہا تھا۔

”تم جو زندگی گزار رہی ہو مجھے اس کا احساس ہے لیکن دنیا ایسے لوگوں کو بیک ورڈ کہتی ہے۔ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی خاطر دولت کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ تم کسی پرائیوٹ فرم میں ملازمت کیوں نہیں کرلیتیں؟“

”ملازمت؟“ دلربا نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”سروس حاصل کرنے کے لیے تجربے کے علاوہ ڈگریوں کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ میں......“

”تم اس کی فکر نہ کرو، نجم کے والد جس عہدے پر ہیں ان کا صرف ایک فون ہی تمہیں دس بارہ ہزار روپے کی پارٹ ٹائم جاب دلوا سکتا ہے۔ ایک سال کا تجربہ اور ایف ایس سی کی سند حاصل کرنے کے بعد تم کو اچھی ملازمت بھی مل ہی جائے گی۔“

دلربا نے اس پیشکش کو چند لمحوں کی کمزور ہچکچاہٹ کے بعد قبول کرلیا۔ ملازمت کے لیے وہ تین گھنٹے نکالنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ کام بھی زیادہ نہیں تھا لیکن ماں کی اجازت لینے کے لیے اس کو منت سماجت کرنی پڑی تھی۔ پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے فریال اور نجم کو بھی ایک چائنیز ہوٹل میں دعوت دی تھی۔ اس موقع پر بل پے کرنے میں نجم نے جلدی کی۔ دلربا کی بے حد ضد کے بعد نجم نے فریال کے کہنے پر اس بات کی پیشکش کی کہ دلربا دوبارہ پارٹی دے تو وہ بل کی ادائیگی خود کردے۔

یوں دلربا اور نجم کی بے تکلفی بڑھنے لگی۔ نجم کے علاوہ اس کے باپ کی سفارش ہی کا نتیجہ تھا کہ دلربا کو تین گھنٹے پارٹ ٹائم کا معاوضہ پندرہ ہزار مل رہا تھا۔ پک اینڈ ڈراپ کی سروس نے بھی اس کے دفتر آنے جانے میں آسانی کردی تھی۔ دلربا ان حالات سے بہت خوش تھی۔ نجم نے اسے یقین دلایا تھا کہ ایف ایس سی کرلینے کے بعد وہ فل ٹائم جاب بھی دلوا سکتا ہے جس کی تنخواہ بھی چالیس پینتالیس ہزار سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ ملازمت کے ساتھ ہی پرائیوٹ امتحان دے کر وہ بی اے بھی کرسکتی تھی۔

دلربا کی ماں کو احساس تھا کہ بیٹی نے زندگی گزارنے کی خاطر جو راستہ اختیار کیا، وہ غلط ہے۔ اس نے ایک دو بار دلربا کو سمجھانے کی بھی کوشش کی لیکن دلربا اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑانے لگی تو ماں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ وہ بوڑھی ہوچکی تھی۔ گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا جو دلربا کو وقت اور حالات کے نشیب وفراز سے آگاہ کرسکتا۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھی جہاں خواہشات کا سمندر ہمیشہ ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا۔ خواہشات، امنگوں اور آرزوؤں کے تقاضے کم ہونے کے بجائے ہمک ہمک کر سر ابھارتے رہتے تھے۔

دلربا پر ملازمت دلوانے کے بعد نجم کی نوازشیں بھی بڑھنے لگیں۔ پہلے وہ، فریال اور نجم اکٹھا کہیں آتے جاتے تھے۔ اب وہ اکثر نجم کے ساتھ شاپنگ پر چلی جاتی تھی۔ فریال نے کبھی اعتراض بھی نہیں کیا۔ نجم اسے آئے دن کسی نہ کسی بہانے سے کوئی قیمتی چیز گفٹ کے طور پر دیتا رہتا پھر ایک دن دلربا اس کے ساتھ ساحلی علاقے میں اس کی ہٹ تک بھی چلی گئی جس کا علم اسے پہلے سے نہیں تھا۔ نجم نے بھی صرف سمندر کے کنارے ننگے پاؤں گھومنے کو کہا تھا۔ جب وہ اپنی ہٹ کے قریب جا کر رکا تو دلربا نے اس ہٹ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کس قدر خوب صورت ہٹ ہے۔ خاص طور پر اوپری حصے کا ٹیرس۔ لوگ یہاں آکر کیا کرتے ہیں؟ کیا یہ فضول خرچی نہیں ہے؟“

”یہ بڑے آدمیوں کے شوق ہیں۔“ نجم نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک ہفتے کی شہری زندگی کی ہلچل اور شوروغل سے تھک کر وہ یہیں پرسکون ساحل پر آکر ایک دن سکون سے گزارتے ہیں۔“

”تم یہاں آکر رک کیوں گئے؟“ دلربا نے احساس کمتری کا کھل کا اظہار کیا۔ ”لوگ کیا سوچیں گے؟ یہی کہیں گے کہ ہم اندر نہیں جاسکتے تو اس کے کھلے ورانڈے کی چھت کے نیچے بیٹھ کر کچھ وقت ہی گزار لیں گے۔“

”پھر کیا فرق پڑے گا؟“

”مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ لوگ ہمارے بارے میں کوئی ایسی ویسی باتیں کریں۔“

”وہ اس کے علاوہ بھی تو کچھ سوچ سکتے ہیں۔“ نجم کا جملہ معنی خیز تھا۔

”کیا؟“ دلربا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا سوچ سکتے ہیں وہ؟“

”یہی کہ ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے جو ہم یہاں بے تکلفی سے گھوم رہے ہیں۔“

”اوہ......“ دلربا مطلب سمجھ کر قدرے شرما گئی۔

”میں لوگوں کی زبان بند کرنے کی خاطر اس خوب صورت ہٹ کے تالے بھی توڑ سکتا ہوں تمہارے لیے۔“ نجم نے قدرے جذباتی انداز میں کہا پھر ہٹ کے ورانڈے میں گیا تو دلربا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں نجم پلیز نہیں، یہ اچھی بات نہیں ہوگی اگر...... اگر پکڑے گئے تو مفت کی بدنامی علیحدہ ہوگی۔“

”اور اگر میں یہ کہوں کہ اس ہٹ کے تالے تم توڑو تو......“

”میرے باپ کی توبہ۔“ دلربا نے مسکرا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

نجم نے اس کی جھیل نما نظروں کی گہرائی میں ڈوب کر دیکھا پھر جب اس نے جیب سے کی چین نکال کر ہٹ کا لاک کھولا تو دلربا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اندر جا کر اس نے وہاں کے قیمتی فرنیچر پر غور کیا تو دنگ رہ گئی۔ تعجب اور تجسس کی نظروں سے نجم کو دیکھا تو وہ کسی خیال سے شرما کر رہ گئی۔ ایسے میں نجم نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو دلربا کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں۔ اس نے دور ہونے کی کوشش کی تو نجم کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تم نے جس سوسائٹی کو اپنا لیا ہے وہاں تکلف سے کام نہیں لیا جاتا۔ کم آن مائی سویٹ ہارٹ۔“ نجم کی نگاہوں میں نشہ چھلکنے لگا۔ دلربا کے اندر خوف کی ایک لہر ابھری۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ طوفان گزر گیا تو نجم نے اس کی بھیگی پلکوں کو چوم کر کہا۔

”گھبراؤ مت، ہر کام پہلی بار مشکل نظر آتا ہے پھر آسان ہوجاتا ہے۔ فریال کا بھی پہلی بار یہی حال ہوا تھا۔ اب تو اکثر ویک اینڈ پر یہاں آنے کی خود فرمائش کرتی ہے۔“

اس وقت بھی دلربا کے ذہن میں زندگی کا وہی پہلا موڑ سر ابھار رہا تھا جب وہ باتھ روم سے بھیگے جسم کو تاول کے ڈریسنگ گاؤن میں لپیٹے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔ اس پہلے موڑ نے اسے زندگی کی جس بلندی پر پہنچادیا تھا اس کا تصور اکثر لڑکیوں کے لیے صرف ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے۔

آنسو

چار حروف پر مشتمل یہ لفظ یہ نمکین پانی کے چند قطرے جن کو ہم لوگ آنسو کہتے ہیں۔ اپنے اندر غم اور خوشی دونوں سمیٹے ہوتے ہیں۔ غم کے موقع پر آنسو نکلنا ایک عام سی بات ہے کیونکہ آنسو ہی غم کا اظہار ہیں اور یہ آنسو ہی غم میں انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر بہت زیادہ خوشی ملنے پر بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔ وہ آنسو خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آنسو بھی پھولوں کی مانند ہیں جو غم اور خوشی دونوں میں ہی انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ مختلف انداز میں آنکھوں سے بہتے ہیں۔ کسی کے بچھڑنے پر کسی کی جدائی پر یا کسی کے اچانک مل جانے پر یہ آنسو موتیوں کی طرح ہماری آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں اور ان دو دھاروں میں ہماری زندگی بہتی چلی جاتی ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

دلربا کے بعد فریال بھی کئی بار نجم کی ہٹ میں اس کے ہمراہ گئی تھی۔ وقت نے اسے بے باک اور بے حجاب کردیا تھا۔ کالج کے امتحان کے بعد ہی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو دلربا کو اپنی تنہائی کا احساس بھی ہوا لیکن اب اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا اس نے کبھی خواب دیکھا تھا۔

فریال کی معرفت ہی اس کی رسائی سکندر علی شاہ تک ہوئی جو پہلی ہی نظر میں اس کی خوب صورتی کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس نے دلربا کو اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ اسے زندگی کی... وہ تمام آسائشیں مہیا کردیں جن کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے عوض دلربا کا کام سکندر علی شاہ کے لیے لڑکیاں فراہم کرنا تھا۔ شروع شروع میں اسے اس کام میں دشواری ہوئی لیکن پھر اس نے معصوم لڑکیوں کی خوب صورتی اور غربت کو دولت کے سنہری جال میں شکار کرنے کا فن بھی سیکھ لیا تھا جس کے عوض اسے دنیا کی ہر آسائش مل گئی تھی۔ اب فریال اور نجم بھی اس کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔ سکندر علی شاہ کا نام ہی خوف کی علامت بھی تھا جس نے دلربا کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کر رکھا تھا۔

ماں کی زندگی میں ایک ذرا سی نگاہوں کی روک ٹوک جو تھی وہ بھی اس کے مرنے کے بعد ختم ہوگئی۔ نیچے کا کمرا اس نے اپنی ماڈرن ملازمہ کو دے رکھا تھا جو رات دن اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ کچن کے علاوہ نیچے کے سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ گارڈ اور ڈرائیور کی کارکردگی کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھی۔ دلربا کی آنکھوں کے اشاروں کو سمجھنا ان پر عمل کرنا بھی اسے آتا تھا۔ خوب صورت خدوخال کی مالک تھی اس لیے دیکھنے والے بھی اسے دلربا کی سیکریٹری ہی سمجھتے تھے۔ نو جماعتیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ اس لیے گھر کا سارا حساب کتاب بھی رکھنے کے سلیقے سے بہ خوبی واقف تھی لیکن دلربا کی اجازت کے بغیر اس نے کبھی اوپر جانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔

گزرتے وقت اور سکندر علی شاہ کی مہربانیوں نے دلربا کو بڑے اور بے فکرے لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کا فن بھی سکھا دیا تھا۔ وہ اپنے معمول پر عمل کرنے کی عادی تھی۔ صبح گیارہ بجے سو کر اٹھنا اور رات کو ساڑھے دس بجے غسل کرکے ڈنر کرنا اس کی عادت تھی۔ اپنے بیڈروم کو اندر سے لاک رکھنا بھی اس کی پرانی عادت تھی۔ اپنی پرائیوسی میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بھی رات کے ساڑھے دس بجے وہ سفید ناول کے گاؤن میں باتھ روم سے نکل کر سیدھی ڈریسنگ ٹیبل کے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ برش سے بالوں کو سنوارنے کے علاوہ اپنے نیم عریاں جسم پر بھی اس کی مسکراتی نگاہیں بھٹک رہی تھیں جب دروازے کے لاک سے ہلکی سی کلک کی آواز سن کر چونکی پھر اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ آنے والا چہرے بشرے سے بھی خطرناک نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ دو پانچ کے پستول نے بھی یہ بات واضح کردی تھی کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہوگا۔

"کون ہو تم؟" دلربا نے خود کو سنبھال کر آنے والے کو تیز نظروں سے گھورا۔ "یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟"

"خوب صورت چہروں اور تراشیدہ جسموں کی تصویریں رکھنا میری ہابی ہے۔" آنے والے نے جیب سے اپنا قیمتی موبائل نکال لیا۔ "یہاں تک جان ہتھیلی پر رکھ کر آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ اگر تم نے بات مان لی تو صرف ایک دو تصویریں اتار کر چلا جاؤں گا انکار یا شور مچانے کی حماقت کی تو پھر بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ سوچ لو، جب تمہارے گارڈ مجھے یہاں تک آنے سے نہیں روک سکے تو تم بھی کیا کرسکوگی؟"

بات دلربا کی سمجھ میں آگئی اس نے پھر بھی کشیدہ لہجے میں کہا۔ "تصویروں کے ذریعے تم لڑکیوں کو بلیک میل بھی کرتے ہوگے؟"

"سیدھی انگلی سے گھی نکل آئے تو تصویروں سے نگاہیں سینکتا ہوں دوسری شکل میں ان تصویروں کی اچھی خاصی قیمت بھی مل جاتی ہے۔ اس کے بعد میں درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔" آنے والے نے بے پروائی سے کہا۔ "جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ گاؤن کا اوپری حصہ ذرا کشادہ کرکے ایک توبہ شکن انگڑائی کا پوز بنالو، میں دو تصویریں لے کر الٹے قدموں واپس چلا جاؤں گا۔"

دلربا چند لمحے اسے تیز نظروں سے گھورتی رہی اس کے پاس حکم بجالانے کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ مطلوبہ پوز کی فرمائش پوری کردینے کی صورت میں وہ اسے بعد میں فیشن ماڈلنگ کا نام بھی دے سکتی تھی۔ اس نے سچویشن کو بھانپنے کے بعد آنے والے کی بات مان لی۔ اس کے انگڑائی لیتے ہی روشنی کے دو ہلکے جھماکے ہوئے پھر دلربا نے گاؤن ٹھیک کرکے اسے دوبارہ سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"تم اگر چاہو تو تصویروں کو میرے سامنے ڈیلیٹ کرکے اچھی خاصی رقم بھی حاصل کرسکتے ہو۔"

"پروفیشنل ہوتا تو منہ مانگی قیمت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وصول کرلیتا لیکن تمہاری تصویریں میری کلیکشن میں صرف اضافہ ہی کریں گی۔ اسے میری ہابی ہی سمجھو۔"

وہ اپنا جملہ مکمل کرکے تیزی سے باہر نکل گیا۔ دلربا نے اپنی ڈولتی ہوئی سانسوں کو سنبھالا اور پھر وہ نیچے گئی جہاں ڈائننگ روم میں خاص ملازمہ اس کی منتظر تھی۔ دلربا نے دو قدم بڑھا کر باہر کی سمت بھی جھانکا۔ ڈیوٹی گارڈ بھی چوکس نظر آرہا تھا۔ دلربا ڈائننگ ٹیبل پر آگئی۔ کھانے کے دوران اس کے ذہن میں دو ہی باتیں ابھر رہی تھیں۔

"یا تو آنے والا ملحقہ بنگلوں کا کوئی رہائشی تھا جو اوپر کی تقریباً ملحقہ چھتوں کے ذریعے اس کی خواب گاہ تک آسانی سے پہنچ گیا تھا یا پھر کسی اجنبی نے بھی ان ہی آسان راستوں کو استعمال کیا ہوگا مگر وہ کون تھا؟ دو ہاف نیوڈ (Half Nude) تصویریں اتارنا کیا واقعی اس کی ہابی تھی یا اصل مقصد کچھ اور بھی تھا؟"

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید
واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

نئی زندگی

تنویر ریاض

جانے کیوں تقدیر کو انسان کی چاہتوں سے بیر ہے... جب بھی انسان اپنے لیے کچھ سوچ لیتا ہے ہمیشہ اس کے برعکس ہی ہوتا ہے... جسے جینے کی تمنا ہو وہاں موت تعاقب کرتی ہے اور جو خود پر سانسوں کا دائرہ تنگ کرلے وہاں زندگی بانہیں پھیلائے خوش آمدید کہتی ہے... کچھ ایسا ہی تضاد اس منظر میں بھی دکھائی دے رہا تھا جس کا پس منظر انتہائی بھیانک تھا۔

پچھتاوؤں کی آگ میں جلنے والے

ایک انتقام کی روداد

ڈوسیلڈروف سے آنے والی لوکل ٹرین مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی کولون ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ اس وقت رات کے پونے نو بج رہے تھے لیکن اسٹیشن پر خاصی بھیڑ تھی۔ ٹرین سے اترنے والے مسافروں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ اپنے سازوسامان سمیت اگلی ٹرین کی روانگی کا انتظار بھی کررہے تھے۔ اس بھیڑ میں سفید پوش فقیر بھی تھے جو مسافروں کو جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر ان کی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش

کر رہے تھے۔ جیسے ہی ٹرین کے دروازے کھلے، چالیس پچاس مسافر باہر آئے اور ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے تیزی سے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں جلدی ہو، ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا بلکہ یہ اس ٹرین سے روزانہ سفر کرنے والے وہ لوگ تھے جو اپنے کام سے واپس گھروں کو آ رہے تھے۔

اس کے برعکس کرسٹین گرول سست رفتار سے پلیٹ فارم کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی کہ بعد میں اترنے والے مسافر بھی اس سے آگے نکل چکے تھے لیکن کرسٹین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید وہ ٹرین سے اترنے والا واحد مسافر تھا جسے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کا لباس خاصا بدوضع تھا۔ اس نے پرانی جینز، فوجیوں جیسی جیکٹ، پرانا ہیٹ پہن رکھا تھا اور اس کی پشت پر چھوٹا سا تھیلا لٹک رہا تھا جو بہ ظاہر دیکھنے میں خالی لگ رہا تھا۔

اس کی سست رفتاری دیکھ کر کئی سوالات ذہن میں آ سکتے تھے۔ کیا اس کی زندگی میں سب ٹھیک نہیں ہے؟ کیا اس کی کوئی منزل نہیں ہے لیکن دیکھنے میں وہ بے گھر نہیں لگ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی پرانی زندگی ترک کر چکا ہو اور اس جگہ نہیں جانا چاہتا ہو جو اس کا ٹھکانا تھی لیکن اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ ٹرین سے اترنے والے دوسرے مسافر بے یقینی اور حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے اور ان کی پریشانی بجا تھی۔ نوجوان کی ہر ادا ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کسی منزل کی جانب رواں دواں ہے لیکن رات کے اس پہر میں وہ اتنے سکون سے چل رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس پر شک ہو سکتا تھا تاہم اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنی منزل پر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔

یہ صرف کرسٹین گرول ہی جانتا تھا کہ اس کی آہستہ خرامی کی وجہ کیا ہے کیونکہ وہ اپنی موت کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ٹرین مقررہ وقت سے پہلے آ گئی تھی اگر دیر سے پہنچتی تب بھی اس کا ارادہ تبدیل نہ ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے اور وہ جانتا تھا کہ موت اس کا انتظار کر رہی ہے لہٰذا اس نے اپنی رفتار کم رکھی تھی تاکہ اس کی زندگی میں مزید چند منٹوں کا اضافہ ہو جائے۔

اس نے چلتے چلتے پلٹ کر اسٹیشن کی جانب دیکھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ اس کے ساتھ اترنے والے مسافروں میں سے کسی نے بھی یہ حرکت نہیں کی تھی۔ وہ سب تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے لیکن اس اسٹیشن سے اس کی گہری یادیں وابستہ تھیں جب وہ بچپن میں اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر بائیں جانب دیکھا۔ برابر والے پلیٹ فارم پر پرانے وقتوں کی ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ پہلے وہ اسے دیکھ کر نفرت سے ناک سکیڑ لیا کرتا تھا لیکن آج اسے دیکھ کر اس کے دل میں جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس ٹرین کو دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ قریب جا کر اسے غور سے دیکھنا چاہ رہا تھا لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ کہیں کوئی شناسا نہ مل جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے پہچانے۔

پلیٹ فارم پر جرمن اور انگریزی زبان میں ٹرینوں کی آمدورفت سے متعلق اعلانات نشر ہو رہے تھے جس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ زندہ بچ کر واپس آ جائے اور اسے واپسی کی ٹرین مل سکے۔ اس لیے اس نے ان اعلانات پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ایک بارونق بازار میں آ گیا جہاں زیادہ تر فاسٹ فوڈ ریسٹوران اور کیفے تھے، چند جنرل اسٹور بھی تھے جہاں پرفیوم، چاکلیٹ، کتابیں اور میگزین وغیرہ فروخت ہو رہے تھے۔

اس بازار میں پہنچ کر ایک بار پھر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہاں سے گزرتے ہوئے وہ دکانوں کے بالکل قریب سے گزرا اور بالآخر اس کے قدم ایک چاکلیٹ کی دکان کے سامنے رک گئے اور وہ کھڑکی میں سے جھانک کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا بیرونی شوکیس نئے سال کے کیلنڈروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اور اس کا بھائی اسٹیفن جب بھی وہاں سے گزرتے تو دکان دار انہیں ایک ایک پکڑا دیتا تاکہ وہ آپس میں جھگڑا نہ کریں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ بھائی کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی ہو لیکن ان کیلنڈروں کو دیکھ کر اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اسٹیفن کو فون کر کے یاد دلائے کہ وہ دونوں کتنے خوش ہوتے تھے جب بازار کی دکانیں ایک ایک کر کے کھلنا شروع ہوتیں۔ وہ بھاگ کر چاکلیٹ کی دکان کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور بار بار بیرونی کھڑکی میں سے اندر جھانکتے جب تک انہیں اپنا حصہ نہیں مل جاتا۔

اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ اسٹیفن کی جگہ کوئی اجنبی یہاں آ جائے اور وہ وہاں کھڑے ہو کر کھڑکی سے اندر جھانکیں اور اس طرح ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ وہ اس اجنبی سے چاکلیٹ کے بارے میں بات نہیں کرتا بلکہ کھلی کھڑکی میں جھانکنے سے جو راحت اور مسرت ملتی تھی اور وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب پیش قدمی کر کے کرسمس کی خوشیوں کو دوبالا کر سکتا ہے لیکن وہاں کوئی نہیں آیا تو مایوس ہو کر وہ بھی آگے بڑھ گیا۔ اسے شبہ تھا کہ یہ سارے کیلنڈر اگلے چھ روز میں فروخت ہو سکیں گے۔ نیا سال شروع ہونے کے بعد ان کی اہمیت ختم ہو جاتی اور وہ فالتو ہو جاتے۔ کرسٹین سوچ رہا تھا کہ یہ مدت گزر جانے کے بعد ان کیلنڈروں کا کیا مصرف ہوگا۔ شاید انہیں بھی فالتو سامان کی طرح پھینک دیا جائے۔ اس کی طرح ان کا وقت بھی پورا ہونے والا تھا۔

وہ اسٹیشن سے باہر آنے کے بعد نومبر کی خون جما دینے والی رات میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڑے گرجا کے پاس سے گزرتا چلا گیا جو اس کے بائیں جانب تھا۔ اس اسٹیشن پر آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہاں آخری بار کسی کرسمس بازار کا چکر لگا سکتا تھا جیسے وہ بچپن میں ان بازاروں میں گھومتا پھرتا تھا لیکن جب وہ گرجا کے عقب میں پہنچا تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور اسے لگا کہ آج رات اس کا یہ خواب پورا نہیں ہوگا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میلے کی رونق ماند پڑ چکی تھی اور اسٹال والے اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔

اس کے باوجود اس نے پورے بازار کا چکر لگایا اور لوگوں کی باتوں سے اسے معلوم ہو گیا کہ یہ بازار اگلے روز بھی کھلے گا۔ وہ دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ محض اس کی وجہ سے صبح کے اخبارات میں ناخوش گوار خبریں شائع ہوں اور ایک دو دن کے لیے یہاں کی فضا سوگوار ہو جائے اور اس سے یہاں کے لوگوں کا کاروبار بھی متاثر ہو سکتا تھا جو بدقسمتی کی بات ہوتی لیکن وہ ان کی خاطر اپنا ارادہ نہیں بدل سکتا تھا۔

کرسٹین نے مایوس ہو کر سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ موہلر کے بار کی جانب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موہلر روزانہ نو بجے کے قریب حساب کتاب دیکھنے کے لیے بار میں آتا ہے۔ یہ بات بھی اسے اسٹیفن نے بتائی تھی۔ ورنہ وہ تو موہلر کو ٹھیک طرح سے جانتا بھی نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس کے معمولات کے بارے میں علم تھا۔ وہ موہلر کے آ جانے کے بعد بار میں پہنچتا اور اسے گولی مار کر اپنے آپ کو بھی ختم کر دیتا۔ وہ حقیقت پسند شخص تھا اور جانتا تھا کہ موہلر کو قتل کر دینے کے بعد اس کی اپنی زندگی خطرات میں گھری رہے گی۔ موہلر کے گروہ کے لوگ قیامت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتے اور اس کی جان ہمیشہ سولی پر لٹکتی رہتی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ خود بھی اپنا خاتمہ کر لے۔ ویسے بھی اس کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی، صرف یادوں کا ہجوم تھا جس نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ یہ ان ناکامیوں اور نقصانات کی یادیں تھیں جنہیں وہ زندگی بھر بھگتتا رہا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک اس کے جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ اس دنیا کا کاروبار یونہی چلتا رہے گا۔ یہ مارکیٹیں اور بازار کل بھی اسی طرح گاہکوں سے بھرے ہوں گے۔ کرسٹین نے حیرت اور افسوس سے سوچا کہ اس کا اپنا خاندان اس دنیا سے اتنی جلدی کیوں رخصت ہو گیا۔ شاید اس کے ماں باپ کی قسمت ہی خراب تھی یا انہوں نے شادی کے بارے میں غلط فیصلہ کیا۔

جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو اس کی عمر آٹھ سال تھی لیکن اسے باپ کی موت کا واقعہ اچھی طرح یاد تھا اور اب وہ سوچا کرتا کہ اس کے باپ کو اس طرح نہیں مرنا چاہیے تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کام کی زیادتی کے سبب وہ بہت زیادہ تھک چکا ہے اور اس حالت میں اسے کار نہیں چلانی چاہیے لیکن اپنی بے پروائی یا گھر پہنچ کر بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش میں وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ شدید ذہنی اور جسمانی تھکن کی وجہ سے وہ اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور کار بے قابو ہو کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے کھمبے سے ٹکرا گئی۔

البتہ اس کی ماں نے اپنے لیے موت کا انتخاب خود نہیں کیا۔ کوئی بھی کینسر جیسے مہلک اور موذی مرض میں مبتلا ہو کر موت کو گلے لگانا نہیں چاہتا لیکن قدرت نے اس کے لیے اسی بیماری کا انتخاب کیا تھا۔ پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اس کی اذیت ناک موت کو نہیں بھول پایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ چھوٹے بھائی اسٹیفن کا خیال رکھے گا اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔ اس وقت وہ بیس سال کا تھا جبکہ اسٹیفن اس سے تین سال چھوٹا تھا وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا تھا اور یہ خلش اسے بے کل کیے ہوئے تھی مگر اب اس کی تلافی کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

مارکیٹ پیچھے رہ گئی تھی اور اب وہ نسبتاً پُرسکون علاقوں سے گزر رہا تھا۔ وہ اپنی یادداشت کے سہارے دریا کی طرف جانے والی سڑک پر ہولیا۔ اس وقت ٹریفک کافی حد تک کم ہوگیا تھا لیکن ایک کار کے ہارن کی آواز سن کر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آگیا۔ اس وقت وہ اپنے بھائی اسٹیفن کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے بہت چھوٹی عمر میں مارٹینا سے دوستی کرلی تھی اور جب اسے معلوم ہوا کہ مارٹینا منشیات کی عادی ہے تو وہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ مارٹینا کو اس لعنت سے چھٹکارا دلانے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن وہ اس کی دیکھ بھال کرنے میں اسی طرح ناکام رہا جیسے کرسٹین اسے کنٹرول نہیں کرسکا تھا۔

اس کے ذہن میں ماضی کے واقعات ایک ایک کرکے ابھرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش مارٹینا کو نشے کی لعنت سے آزاد کروانے کے لیے اسٹیفن اس منشیات فروش سے نہ الجھتا جو مارٹینا کو منشیات فراہم کرتا تھا۔ کاش وہ شخص اسٹیفن کی بات مان لیتا۔ کاش اسٹیفن اس کے ٹھکانے پر جاکر مار پیٹ نہ کرتا اور اس کا ذخیرہ تباہ نہ کرتا۔ اسٹیفن اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا چنانچہ اس نے اپنی حفاظت کے لیے گن خریدی۔

اسے اپنی پیٹھ پر لدے ہوئے تھیلے کا خیال آیا جس کے اندر تولیے میں لپٹی ہوئی گن موجود تھی۔ اس کے وزن سے تھیلا کچھ بھاری ہوگیا تھا اور چلنے کے دوران بار بار اس کی پیٹھ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے نہ صرف آزمانے کے لیے جنگل میں اس سے ایک فائر کیا تاکہ یقین ہوجائے کہ اسے پستول چلانی آتی ہے۔ اس نے مزید فائر کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ گولیاں ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس فالتو کارتوس نہیں تھے اور نہ ہی وہ جانتا تھا کہ یہ کہاں سے ملتے ہیں۔ اس لیے فی الحال اسے انہی گولیوں پر گزارہ کرنا تھا جو پستول میں موجود تھیں۔

جاتے وقت اسٹیفن یہ پستول کرسٹین کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ وہ مارٹینا کو لے کر ایسی جگہ چھپنا چاہ رہا تھا جو اس کے دشمن کی نظروں میں نہ آسکے۔ اس طرح مارٹینا بھی منشیات کی لعنت سے محفوظ ہوجاتی لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی مگر یہ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ مارٹینا کی طلب حد سے بڑھ جائے گی تو وہ منشیات فروش سے رابطہ کرسکتی ہے۔

اسٹیفن کی ساری احتیاط بےکار رہی اور دشمنوں نے موقع ملتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس کے مطابق اس کی لاش شہر کے باہر سڑک کے کنارے واقع ایک نشیب سے ملی تھی۔ اس سڑک پر گاڑیاں تیز رفتاری س گزرتی تھیں لہٰذا کسی کی نظر اس پر نہیں گئی البتہ چند روز پولیس کی پیٹرول کار نے اسے دریافت کرلیا۔ شاید مار کی جانب سے گم شدگی کی رپورٹ درج کروانے کے پولیس نے اس کی تلاش شروع کردی تھی۔ پوسٹ ما رپورٹ کے مطابق اس پر بری طرح تشدد کیا گیا تھا۔ کی تمام ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ کھوپڑی تین جگہ سے پچک چکی تھی اور ایک آنکھ باہر نکل آئی تھی۔ اسے گہری اندرو چوٹیں آئی تھیں۔ دشمنوں نے کسی ہتھیار کا استعمال کر کے بجائے تشدد کرکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

کرسٹین کو ماں اور باپ سے زیادہ بھائی کے بچھڑ کا صدمہ ہوا۔ اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ ماں سے کیے وعدے کے مطابق اسٹیفن کی حفاظت نہ کرسکا لیکن اس کچھ قصور بھائی کا بھی تھا۔ کاش وہ مارٹینا کے عشق مبتلا ہوکر مافیا کے لوگوں سے دشمنی مول نہ لیتا۔ اس معصو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں مطلوبہ شخص ان کی پہنچ سے دور نہیں جاسکتا۔ مارٹینا اس پاس تعزیت کے لیے آئی تو کرسٹین نے اسے دیکھ کر منہ پھ لیا۔ وہ حزن و یاس کی تصویر لگ رہی تھی۔ اس نے سیاہ لبا پہن رکھا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس بھرّائی ہوئی آواز میں کچھ کہا جسے کرسٹین سن نہ سکا۔ وہ کہ شاید مارٹینا تنہا ہوجانے کے بعد اس کا سہارا لینے آئی جبکہ کرسٹین کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی کیونکہ اس ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ صرف اس کی وجہ سے اسٹیفن مارا گیا۔

مارٹینا مایوس اور آزردہ ہوکر واپس چلی گئی۔ اس جانے کے بعد کرسٹین کو احساس ہوا کہ اسے مارٹینا کے سا سرد مہری سے نہیں پیش آنا چاہیے تھا۔ شاید وہ اس ذریعے اسٹیفن کے قاتلوں تک پہنچ سکتا۔ اسے مارٹینا ٹھکانے کا علم نہیں تھا لہٰذا اس سے دوبارہ ملنے کا امکان کم تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ مارٹینا کو تلاش کرنے کی کو کرے گا۔ شاید کسی بس اسٹاپ، ریسٹوران یا کلب نظر آجائے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسٹیفن موت کے دو ہفتے بعد وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق زیادہ مقدار میں منشیا لینے سے اس کی موت واقع ہوئی۔ مارٹینا کی ایک دو کہنا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ وہ اسٹیفن کی کا غم برداشت نہیں کرسکی اور اس نے خودکشی کرلی جبکہ کر اس پہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ عادی نشے باز تھی اور جب زیادہ طلب ہورہی ہو تو وہ منشیات کی مقدار بڑھا دیتی تھی۔ اسے یہ بات اسٹیفن نے بتائی تھی۔ اس لیے وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مارٹینا نے ارادتاً زیادہ مقدار میں منشیات لے کر خودکشی کرلی کیونکہ اسے اسٹیفن کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔

وہ دھیمی رفتار سے چلتا ہوا پل تک پہنچ گیا اور ریلنگ کے ساتھ لگی ہوئی فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ پل پر بھی گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی جبکہ کچھ لوگ سائیکل پر بھی سواری کر رہے تھے۔ پل کی دونوں جانب بنی ہوئی فٹ پاتھ پر چند لوگ پیدل چلتے ہوئے بھی نظر آئے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ شدید سردی کی وجہ سے لوگ گھروں تک محصور ہوکر رہ گئے تھے۔

وہ آدھا فاصلہ طے کرکے رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر کلیسا کے جڑواں میناروں پر نظر ڈالی جن کی روشنی میں ریل کا پل اور اس کے نیچے لگنے والا کرسمس کا بازار صاف نظر آرہا تھا۔ دکان دار گھروں کو روانہ ہونے سے پہلے سامان ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ یہ گویا ایک طرح سے صبح کی تیاری تھی۔ اس نے سوچا کہ دوسرے دن جب مارکیٹ کھلے گی تو یہاں کے لوگ یہ خبر سن کر حیران اور پریشان ہوجائیں گے کہ شہر کا سب سے بڑا منشیات فروش مارا گیا گو کہ اس سے ان کا کاروبار متاثر نہیں ہوگا لیکن شاید ان میں سے کئی ایک اس کی موت کا سن کر سکھ کا سانس لیں گے۔

پولیس دو ماہ گزر جانے کے باوجود بھی اسٹیفن کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ شہر میں منشیات فروشوں کے دو بڑے گروہ سرگرم عمل تھے اور یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ اسٹیفن پر جن لوگوں نے تشدد کیا ان کا تعلق کس گروہ سے تھا کیونکہ ان دونوں کے درمیان کاروباری رقابت تھی اور بعض اوقات ان کے کارندے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ جاتے تھے لیکن کرسٹین پولیس والوں کو بتا چکا تھا کہ اسٹیفن کسی گینگ میں شامل نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے گروہ کے کسی کارندے سے اس کے تنازعہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس نے جس کارندے کی پٹائی کی تھی وہ موہلر کا آدمی تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ اس کے بھائی پر تشدد کرنے والے موہلر کے آدمی ہی تھے لیکن پولیس کسی ٹھوس شہادت اور ثبوت کے بغیر موہلر جیسے بڑے بدمعاش پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی لہٰذا وہ کرسٹین کو تسلی دیتے رہے اور ہر بار ان کی زبان سے یہی الفاظ ادا ہوتے۔

”ہم پر بھروسا رکھو، تحقیقات جاری ہے اور ہم بہت جلد ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے جنہوں نے اسٹیفن کو مارا ہے۔“

کرسٹین کو مطمئن کرنے کے لیے یہ طفل تسلی ناکافی تھی۔ وہ حیران تھا کہ جب اس نے پولیس کو الف سے یے تک ساری کہانی سنادی کہ کس طرح اسٹیفن نے مارٹینا کو منشیات کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس سپلائر کو بھی کہا کہ وہ مارٹینا کو منشیات نہ دیا کرے لیکن اس شخص نے اسٹیفن کی بات ماننے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان شدید تلخ کلامی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک جا پہنچی۔ اسٹیفن اس شخص کے مقابلے میں جوان، صحت مند اور مضبوط جسم والا تھا لہٰذا اس نے منشیات فروش کی اچھی خاصی پٹائی کردی اور اس کا سارا ذخیرہ تباہ کردیا۔ جب اسٹیفن کو معلوم ہوا کہ وہ منشیات فروش، موہلر کا آدمی ہے جو بندہ تو ضائع کرسکتا ہے لیکن اپنا نقصان برداشت نہیں کرسکتا تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور موہلر کے عتاب سے بچنے کے لیے مارٹینا کو لے کر روپوش ہوگیا۔ موہلر کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ بالآخر وہ ان کے نرغے میں آگیا اور ان لوگوں نے اس کا جو حشر کیا۔ اس کے بارے میں سوچ کر ہی اسٹیفن پر کپکپی طاری ہوجاتی۔ وہ حیران تھا کہ اتنا سب کچھ جان لینے کے باوجود پولیس نے موہلر کو اس کیس سے علیحدہ رکھا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا تھا کہ اسٹیفن کی اس شہر میں کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ اس نے صرف موہلر کا نام سن رکھا تھا لیکن کبھی اس سے براہ راست ٹکراؤ نہیں ہوا تھا، اگر اسے پہلے سے معلوم ہوتا کہ وہ منشیات فروش، موہلر کا خاص ایجنٹ ہے تو وہ کبھی اس منشیات فروش سے ہاتھا پائی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے مال کو تباہ کرتا۔ اتنا کچھ جان لینے کے بعد پولیس کی خاموشی معنی خیز تھی اور کرسٹین سمجھ گیا تھا کہ ٹھوس ثبوت اور شواہد کے بغیر پولیس، موہلر کو گرفتار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔

اس نے گزشتہ ہفتے بھی پولیس اسٹیشن فون کرکے اسٹیفن کے قتل کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ جواب میں اس سے ایسا رویہ اختیار کیا گیا جیسے وہ خود ہی کوئی مجرم ہو۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ شہر میں دو بڑے منشیات فروشوں یعنی موہلر اور ترک کے درمیان کاروباری رقابت عروج پر ہے اور وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور نہ ہی وہ یہ ماننے کے لیے تیار تھا کہ

اس کا بھائی ان دونوں گروہوں کی باہمی چپقلش کا نشانہ بنا۔ وہ صرف تفتیش کی تازہ ترین صورتِ حال جاننا چاہ رہا تھا اور اس نے محض یاددہانی کے لیے فون کیا تھا۔ جواب میں اسے جو کچھ سننے کو ملا وہ خاصا حیران کن تھا اور اسے پولیس سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔ ٹیلی فون ریسیو کرنے والے افسر نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

"ہم سب بے حد مصروف ہیں اور ہمارے پاس صرف یہی ایک کیس نہیں ہے جس پر پورا وقت سر کھپاتے رہیں۔ ہمیں اور بھی معاملات دیکھنا ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کے جو بے گناہ ہیں۔"

گویا اس کا بھائی بے گناہ نہیں تھا۔ کم از کم پولیس آفیسر کے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے خیال میں اسٹیفن کا تعلق کسی نہ کسی طرح انڈر ورلڈ سے رہا ہوگا اور وہ ان گروہوں کی باہمی چپقلش کے نتیجے میں مارا گیا۔ اگر اس نے اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھا ہوا تھا اور اس کی دوستی ایک نشے کی عادی لڑکی سے ہوگئی تھی تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل غلط تھا کہ اس کا تعلق بھی ڈرگ مافیا سے ہوسکتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے پولیس کے مفروضے کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ موجود تھا کہ پولیس نے اس کے قاتلوں کو پکڑنے کے لیے کیا کارروائی کی۔ یہ جاننا اس کے وارثوں کا حق تھا۔ وہ مجرم ہی سہی لیکن ایک انسان بھی تو تھا اور اس کے قاتلوں تک پہنچنا پولیس کی پہلی ترجیح ہونا چاہیے تھی۔

وہ جان گیا تھا کہ پولیس اس معاملے میں بے بس ہے۔ موہلر یا اس کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ کرنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔ پولیس والے بھی انسان تھے۔ ان کے بھی بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ تھے۔ وہ کیوں ایک جرائم پیشہ شخص کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے جو آپس کی لڑائی میں مارا گیا تھا یا جس نے ایک آوارہ لڑکی کی خاطر موہلر کے کارندے سے دشمنی مول لی تھی اور جب یہ بات کرسٹین کی سمجھ میں آگئی تو اس نے خود ہی قانون کو ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ماں سے کیے گئے وعدوں کے مطابق اسٹیفن کی حفاظت نہ کرسکا لیکن اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر اس کا کفارہ تو ادا کرسکتا ہے۔

ٹرین کی آواز سن کر اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی جس کی رفتار اسٹیشن کے قریب آکر آہستہ ہوگئی تھی اور مسافر بے تابی سے اس کے رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پل پر سے گزرتے ہو جوڑوں نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ وہ سب ا دوسرے میں مگن تھے۔ وہ اپنی جگہ رک کر ان کی محبت ا خلوص کے تاثرات دیکھنے لگا اور اس کے چہرے مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس گہما گہمی اور رونق کو دیکھ کر اسے یقی ہوگیا کہ اس کے دنیا میں نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور یہ کاروبار یونہی چلتا رہے گا۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی منزل کی جا روانہ ہوگیا۔ ایک ٹرام اس کے پاس سے گزری اور اس غیر ارادی طور پر اپنی رفتار بڑھادی جیسے وہ اس کا پیچھا چاہ رہا ہو۔ چند ہی لمحوں میں وہ ٹرام بہت آگے نکل اور اس کی عقبی روشنیاں اس کی نظروں سے او ہوگئیں۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس نے محسوس کیا ک وہ اسی طرح چلتا رہا تو کہیں اس کے پہنچنے سے پہلے موہلر نہ جائے لہٰذا اس نے اپنی رفتار مزید بڑھادی۔ جب وہ کے دوسری جانب پہنچا تو سردی کی وجہ سے اس کی آنکھو سے پانی بہنے لگا تھا لیکن اس نے رکے بغیر اپنی آستین آنکھیں صاف کیں اور اسی رفتار سے چلتا رہا۔

پل سے اترنے کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گیا اطراف کی گلیوں کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس کی رف میں اس وقت کمی آئی جب اس نے اپنے آپ کو ایک بار سامنے پایا۔ بار کھلا ہوا تھا لیکن وہاں خاموشی چھائی ہو تھی۔ یہ ایسا بار نہیں تھا کہ جہاں عام گاہک آتے ہو وہاں زیادہ تر موہلر کے کارندے یا پھر آوارہ قسم کے لڑ ہی آیا کرتے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر وہاں رک کر اپ آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور یہ ظاہر کیا جیسے روزانہ وہاں آتا ہو۔ اسے موت کا خوف نہیں تھا بلکہ وہ بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں اسے موہلر تک پہنچنے سے پہ نہ روک لیا جائے یا وہ اس کے قریب پہنچ کر بھی اپ میں کامیاب نہ ہوسکے۔

اس نے ہمت کرکے بار کا داخلی دروازہ کھولا اندر داخل ہوگیا۔ ہال کے اندر موسیقی کی آواز آرہی لیکن وہ اس گانے کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ غالباً کی دہائی کا کوئی راک میوزک تھا۔ اندر بہت گرمی تھی نے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنے حواس مجتمع کیے۔ سخت سردی کے بعد یہ گرمی اس کے اعصاب کو سست کر تھی اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی، وہ مرکزی میں داخل ہوگیا جس کے بائیں جانب بہت بڑا بار بنا

جبکہ بقیہ جگہ میں میزیں لگی ہوئی اور دیوار کے ساتھ ساتھ کیبن بھی بنے ہوئے تھے۔ صرف دو میزیں بھری ہوئی تھیں اور وہاں بیٹھنے والوں کی تعداد نصف درجن سے بھی کم تھی اور وہ سب موہلر کے آدمی تھے۔ ایک میز پر تاش کھیلے جارہے تھے جبکہ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنے ایک ساتھی کی زبانی کوئی قصہ سن رہے تھے۔ شاید وہ اپنا کوئی کارنامہ بیان کررہا تھا جو اس نے حال ہی میں انجام دیا تھا لیکن جیسے ہی کرسٹین ہال میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہوگئے۔

وہ ان کے قریب سے گزرتا ہوا کاؤنٹر تک آیا اور بارمین سے بولا۔ "میں مسٹر موہلر سے ملنے آیا ہوں، انہیں میری آمد کا علم ہے۔"

بارمین نے کوئی جواب نہیں دیا بس خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کرسٹین ہال عبور کرکے اس سے ملحقہ کمرے کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

"اے لڑکے۔"

کرسٹین کا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اس کے پورے بدن میں خوف کی لہر سرایت کرگئی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ کسی سے جھگڑے بغیر موہلر تک پہنچنا چاہ رہا تھا لیکن غالباً اسے روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور اس نے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہال میں مدھم روشنی کی وجہ سے اس کے چہرے پر پھیلا ہوا خوف کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جو اپنے ساتھیوں کو کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ اس نے کرسٹین کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس سے کشتی لڑنا چاہ رہا ہو۔ میز کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور کرسٹین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ شخص اس گروہ میں کوئی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی نے اسٹیفن کے قتل کی منصوبہ بندی کی ہو۔ اسے دیکھ کر ہی کرسٹین کو کراہیت ہونے لگی اور وہ سوچنے لگا کہ کاش اس کے پاس کچھ فالتو راؤنڈ ہوتے تو وہ ایک گولی اس شخص کے سینے میں بھی اتار دیتا بلکہ وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو قتل کردیتا۔

"تم ترکش تو معلوم نہیں ہوتے؟" اس شخص نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اس پر وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ کرسٹین اپنے حلیے، چہرے مہرے اور چال ڈھال سے کسی طرح بھی ترک نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی موہلر کے حریف گروپ کا نام ترک تھا لیکن اس میں شامل تمام لوگ ترکش نہیں بلکہ البانیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ گویا ایک طرح سے اس شخص نے کرسٹین کے ساتھ دہرا مذاق کیا تھا۔

کرسٹین لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا پھر اس نے جواب میں سر پر سے چھوٹی سی ٹوپی اتار کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔ اسے بہت زیادہ گرمی لگ رہی تھی اور وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس گرمی کی وجہ سے اس کی موت واقع نہ ہوجائے اور وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوجائے۔

اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "جانتا ہوں کہ تم جرمنی کے رہنے والے ہو۔" وہ کرسٹین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو مذاق کررہا تھا لیکن اگر تم واقعی ترک ہوتے تو......"

یہ کہہ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا اس کی وضاحت کے لیے کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہی سب ساتھی ایک بار پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ اس بار تاش کھیلنے والے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ کرسٹین نے سر کو ہلکے سے جنبش دی، دروازے کی جانب مڑا اور پلک جھپکتے میں دروازے سے گزر گیا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی راہداری تھی اور اس کے اختتام پر اوپر کی منزل پر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں کے نزدیک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اوپری منزل پر موہلر کا محافظ کھڑا ہوا تھا۔ کرسٹین نے اسے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی اور نصف سیڑھیاں طے کرنے کے بعد بولا۔

"میں مسٹر موہلر سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔"

وہ محافظ بھاری تن و توش کا تھا۔ اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا اور اس نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے کرسٹین کو حقارت سے دیکھا اور رعونت بھرے لہجے میں بولا۔ "وہ مصروف ہیں۔"

"انہیں میری آمد کے بارے میں علم ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پیٹھ پر لٹکا ہوا تھیلا اتارا اور اسے کھولنے لگا۔ اس کے انداز سے بالکل ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ محافظ کو ڈرانے کے لیے تھیلے سے کچھ نکال رہا ہے۔ محافظ پر بھی اس حرکت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ البتہ وہ تھوڑا سا مشکوک

نظر آنے لگا۔

"میں رقم کی ادائیگی کے لیے آیا ہوں جو مجھ پر ادھار تھی۔" اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر یوں ظاہر کیا جیسے وہ پیسے ٹٹول رہا ہو جبکہ حقیقت میں اس نے تولیے میں لپٹا ہوا پستول تھام لیا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے محافظ کی جانب دیکھا اور بولا۔

"پورے ساڑھے تین ہزار ڈالرز ہیں۔ اتنی بڑی رقم میں کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

کرسٹین نے تھیلا دوسرے ہاتھ سے پکڑا اور پستول نکال کر محافظ کو گولی ماردی۔ تولیا میں لپٹے ہونے کی وجہ سے فائر کی آواز قدرے کم رہی لیکن پھر بھی اس کی توقع سے زیادہ تھی۔ اس نے محافظ کے سینے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی گردن کے ایک طرف لگی اور وہاں سے خون بہنے لگا۔ محافظ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس جگہ ہاتھ رکھنے کی کوشش کی جہاں سے خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں تربتر ہوگئیں لیکن وہ خون کے بہاؤ کو روکنے میں ناکام رہا۔

کرسٹین کو یقین نہیں تھا کہ اس نے نیچے سے کسی کے چلّانے کی آواز سنی ہے کیونکہ موسیقی کی آواز پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی اور اس کے شور میں کسی دوسری آواز کا سننا ممکن نہیں تھا۔ یقیناً انہوں نے فائر کی آواز سنی ہوگی لیکن کرسٹین کے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا اور اسے زیادہ تیزی کے ساتھ اپنا کام نمٹانا تھا۔

کرسٹین نے جلدی جلدی بقیہ سیڑھیاں طے کیں اور محافظ کی لاش پر سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے ابھی تک اپنے تھیلے سے بارود کی بو آرہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور دروازہ کھول کر موہلر کے دفتر میں داخل ہوگیا۔ اس نے اپنا تھیلا آہستگی سے فرش پر رکھا، پستول کی نال سیدھی کی اور کمرے کا دروازہ بند کردیا۔

موہلر دس فٹ کے فاصلے پر اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بالوں میں خضاب لگا رکھا تھا اور اس کا وزن قدرے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی قمیص اور سلیٹی رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور دیکھنے میں کاروں کا سیلز مین لگتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کی میز پر منشیات یا نوٹوں کے بنڈل کے بجائے موٹے موٹے رجسٹر نظر آرہے تھے اور وہ ان میں سے ایک کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ کرسٹین کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کی طرف گیا لیکن کرسٹین نے اسے ہتھیار نکالنے کی مہلت نہیں دی اور پستول کی نال کا رخ جانب کرتے ہوئے بولا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ گولی ماردوں گا۔"

موہلر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ کرسٹین نے ہٹ کر دروازے کو اندر سے لاک کردیا۔ ابھی تک اس کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں سنی تھی۔ گویا اس کی ہوئی گولی کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی تھی۔ البتہ دوسرے فائر کی آواز سن سکتے تھے لیکن اسے اس کی نہیں تھی۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں تک پہنچا تھا اور مو جان سے مار دینے کے بعد اس کا مشن پورا ہوجاتا۔ اس بعد وہ خوشی سے موت کو گلے لگا لیتا۔

"تم جانے پہچانے سے لگتے ہو؟" بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ تم ترک کے لیے کام کرتے؟ کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟"

کرسٹین نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ "میں تمہیں ایک دفعہ دور سے دیکھا تھا لیکن ہماری ملاقا نہیں ہوئی۔"

موہلر نے کندھے اچکائے اور کچھ کہنے ہی تھا لیکن کرسٹین نے اسے موقع نہیں دیا۔ اس کے پاس کم وقت تھا جسے وہ باتوں میں ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"شاید تم یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ میری شکل میر بھائی سے ملتی ہے۔ اسٹیفن کرول جسے تم نے مار ڈالا۔"

اسے توقع تھی کہ موہلر انکار کردے گا لیکن وہ اثبا میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بہ سے لوگ پولیس مقابلے میں بھی مارے جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص مرنا چاہتا ہو تو وہ ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ تمہارا بھائی بھی کوئی جرم کرکے فرار ہونے کی کوشش کر ہوگا کہ کسی پولیس والے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔"

"اسٹیفن مرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ تو اپنی گرل فر بھی منشیات کی لعنت سے بچانا چاہ رہا تھا اور اسی وجہ سے ا کی جان گئی۔"

موہلر کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ غصے سے بولا۔ "کیا سمجھتا تھا کہ میں اسے اپنا کاروبار تباہ کرنے کی اجاز دے دوں گا۔ اگر وہ اتنا ہی نیک تھا تو اس نے ایک آ اور منشیات کی عادی لڑکی سے دوستی کیوں کی۔ وہ ا دوست کو تو نشے سے باز نہ رکھ سکا اور میرے آدمی سے لڑ پہنچ گیا۔" اس کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ کرسٹین کو ڈر لگنے لگا وہ جان بوجھ کر اونچا تو نہیں بول رہا تا کہ اس کی آواز نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچ جائے۔ موہلر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اس نے کیا سوچ کر یہ قدم اٹھایا تھا کہ میں اس نقصان کے بعد اپنا کاروبار سمیٹ لوں گا جس سے سیکڑوں لوگوں کا روزگار وابستہ ہے، معاف کرنا اس نے میرے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔"

کرسٹین اس سے آگے کچھ نہ سن سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ نیچے کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ آوازیں پہلے سے مختلف تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ بار میں کچھ غیر معمولی نقل و حرکت ہورہی ہے۔ اب وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی وہ یہاں موہلر سے پوچھ گچھ کرنے یا اعتراف جرم کروانے نہیں بلکہ اسے سزا دینے کے لیے آیا تھا۔ اس نے موہلر کا نشانہ لیا اور گولی چلادی جو اس کے سینے میں لگی اور وہ کرسی پر پیچھے کی جانب ڈھلک گیا لیکن توقع کے مطابق خون نہیں نکلا۔ موہلر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کرسٹین نے دیکھا کہ وہ سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا ہاتھ کندھے میں لٹکے ہوئے ہولسٹر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

لمحہ بھر میں کرسٹین کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ موہلر دیکھنے میں وزنی لگتا تھا جبکہ اس نے قمیص کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس لیے کرسٹین کی چلائی ہوئی گولی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ کرسٹین نے اپنا پستول تھوڑا سا اوپر کیا اور موہلر کے چہرے کا نشانہ لینے لگا۔ اس نے ٹریگر پر انگلی رکھی تو موہلر زور سے چلّایا۔

"نہیں۔" لیکن گولی چل چکی تھی۔ کرسٹین جوش میں اندھا، بہرا، گونگا ہوگیا تھا۔ اسے گولی چلنے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ وہ مسلسل فائر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پستول کی گولیاں ختم ہوگئیں اور ٹریگر نے اس کی انگلی کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کردیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ موہلر ایک جانب لڑھک گیا تھا لیکن کرسی سے نیچے نہیں گرا۔ وہ مرچکا تھا اور اس کا چہرہ بہ مشکل پہچانا جاسکتا تھا۔ کرسٹین کے کانوں میں ابھی تک گولیوں کی آواز گونج رہی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ اور آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں مار پیٹ اور چیخ و پکار ہورہی ہو شاید موت اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اس نے ایک فائر کی آواز سنی جو نیچے بار کی جانب سے آئی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کر سیڑھیوں سے نیچے جھانکنے لگا۔ اس اثنا میں مزید فائر کی آوازیں سنائی دیں۔ بار کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور موسیقی کا شور تھم چکا تھا پھر کوئی زور سے چلّایا۔

"ٹکی۔" کرسٹین سمجھ گیا کہ موہلر کی حریف پارٹی ترک کے لوگوں نے حملہ کردیا ہے۔ یہ آواز تیر کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ بہت جلد وہ لوگ اوپر کا رخ کریں گے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور موہلر کے دفتر میں گھس کر اندر سے دروازے کو لاک کرلیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو موہلر کی میز کے عقب میں اسے ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور وہ دروازہ کھول کر ایک تنگ اور طویل راہداری میں آگیا جس کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسپرٹ کے باکس رکھے ہوئے تھے۔

راہداری کے اختتام پر اسے ایک کھڑکی نظر آئی۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ نیچے ایک کھلی جگہ تھی جہاں دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں گو کہ وہاں بالکل خاموشی تھی لیکن وہ اب بھی بار سے آنے والی آوازوں کا شور سن رہا تھا جبکہ کہیں دور سے پولیس سائرن کی آواز بھی آرہی تھی۔ کھڑکی بہت چھوٹی تھی اور اسے یقین تھا کہ موہلر کا کوئی بھی آدمی اس میں سے نہیں گزر سکتا۔ کرسٹین نے پستول تھیلے میں رکھا اور اسے کھڑکی سے نیچے پھینک دیا پھر اس نے اپنے بدن کو سکیڑ کر کھڑکی سے باہر نکالا اور دونوں ہاتھ سے پکڑ کر لٹک گیا۔ اس کے عین نیچے ایک مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ اس نے چھلانگ لگائی اور کار کی چھت پر گر پڑا۔ دوسری چھلانگ میں وہ زمین پر آچکا تھا۔ اس نے اچک کر دیکھا، کار کی چھت میں گہرا ڈینٹ پڑ چکا تھا۔ غنیمت تھا کہ اس کا الارم کام نہیں کر رہا تھا ورنہ کوئی بھی اس جانب متوجہ ہوسکتا تھا۔

اس نے اپنا تھیلا اٹھایا اور اس میں سے پستول نکال کر دوبارہ جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ بار کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا سڑک پر آگیا جہاں کئی لوگ بار میں سے آنے والی آوازوں کو سن کر مضطرب ہورہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہوگیا اور اپنے چہرے پر ان جیسے تاثرات پیدا کرلیے۔

بار کے باہر وہ کاریں بے ترتیب انداز میں کھڑی ہوئی تھیں جبکہ اندر سے اب بھی گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں جیسے بار والوں کی طرف سے زبردست مزاحمت ہورہی ہو۔ پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز قریب آتی جارہی تھی اور جونہی کرسٹین وہاں سے آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں بار کی جانب جارہی تھیں۔

کچھ دور چلنے کے بعد اس نے اپنا تھیلا سڑک کے

کنارے رکھے ہوئے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا۔ پل پر سے گزرتے ہوئے آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رک گیا اور ایک بار پھر گرجا پر نظریں جما دیں۔ اس نے جیب سے پستول نکالا اور دریا میں پھینک دیا اس کے بعد وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، اسے انتظار تھا کہ کوئی پولیس کار اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس پل سے گزرے۔ اسے اپنے پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ اپنے شہر، خاندان اور یادوں کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ موہلر کی موت کے بعد اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اسے مزید جینے کی خواہش نہیں تھی۔

اب وہ کیا کرے، اس بارے میں اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا کیونکہ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ کیا وہ گھر واپس چلا جائے۔ دوبارہ اپنی پڑھائی شروع کرے۔ اس نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں واپس آ رہا ہے اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہو چکی ہے۔ اس نے جیب سے ٹوپی نکال کر سر پر رکھی اور سوچنے لگا کہ کیا آج کی رات بھی وہ ناکام رہا ہے۔ ہاں وہ مرنے کی نیت سے آیا تھا جس میں وہ ناکام رہا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے ورنہ اس کا خیال تھا کہ موہلر کے آدمی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے تاہم اس کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ اس نے موہلر اور اس کے ایک محافظ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس لحاظ سے یہ اس کی کامیابی تھی۔

بار میں جو کچھ ہوا، ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں موہلر مارا جاتا لیکن اس کی موت کرسٹین کے ہاتھوں لکھی تھی اگر وہ وقت پر نہ پہنچتا تو ساری عمر یہ خلش رہتی کہ وہ موہلر سے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ نہ لے سکا۔ اب اسے کم از کم یہ اطمینان تھا کہ اس نے اپنے شہر کو ایک سفاک درندے سے پاک کر دیا جس نے نہ جانے کتنے گھر اجاڑ دیے اور کتنے لوگوں کی زندگی برباد کر دی۔ اسے کئی سالوں بعد اتنی بڑی کامیابی ملی تھی ورنہ اب تک زندگی میں وہ ہر قدم پر ناکام ہی رہا تھا۔

وہ اسی راستے سے مارکیٹ کی طرف واپس چل دیا جس سے آیا تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ درمیانی عمر کے ایک شخص کے برابر سے گزرا جو گتے کے تین باکس اٹھائے جا رہا تھا۔ دیکھنے میں ہی وہ باکس کافی وزنی معلوم ہو رہے تھے۔ کرسٹین نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر پیچھے دیکھا۔ وہ باکس اس کے ہاتھوں سے پھسل رہے تھے۔

وہ جلدی سے ایڑیوں کے بل گھوما اور لپک کر ان ڈبوں سہارا دیا تاکہ انہیں زمین پر گرنے سے بچایا جا سکے۔

"شکریہ۔" اس آدمی نے کہا اور اس سے پہلے کوئی اور بات کرتا۔ ان میں سے ایک باکس پھر پھسلنے لگا ان دونوں نے مل کر اسے زمین پر گرنے سے بچا لیا لیکن کوشش میں اس کا اوپری حصہ کھل گیا اور کرسٹین نے دیکھا وہ باکس لکڑی کے کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے بہ حفاظت زمین پر رکھا اور کرسٹین مسکراتے ہوئے بولا۔

"بچپن میں مجھے یہ کھلونے بہت پسند تھے۔"

وہ شخص بھی جواب میں مسکرایا۔ اس نے کھلا ہوا باکس دوسرے باکس پر رکھا اور انہیں اٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب بھی یہ کھلونے پسند ہیں۔" پھر اس نے کرسٹین کے بازوؤں میں رکھا ہوا تیسرا باکس دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اسے بھی دونوں ڈبوں کے اوپر رکھ دے۔

کرسٹین اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ "رہنے دو، میں اٹھا لوں گا۔"

"شکریہ۔" اس شخص نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہمیں زیادہ دور نہیں جانا ہے۔"

وہ دونوں مختصر فاصلہ طے کر کے اس کے اسٹال تک پہنچے۔ اس دوران وہ شخص اسے مارکیٹ اور اپنے کاروبار کے بارے میں بتاتا رہا مثلاً یہ کہ وہ کب سے یہ اسٹال لگا رہا ہے اور کام کی صورتِ حال کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اسٹال پر اس شخص کا بیٹا اور بیٹی پہلے سے موجود تھے۔ کرسٹین نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اس سے عمر میں چند برس تو چھوٹی ہوگی۔ اس شخص نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو کرسٹین بولا۔

"کوئی بات نہیں، میں بھی اسی طرف ہی آ رہا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

"امید ہے کہ اس سال یہ میلا تمہارے لیے خوش قسمت ثابت ہوگا۔"

وہ شخص ایک بار پھر مسکرایا جیسے اس کو کرسٹین کی یہ بات اچھی لگی ہو۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر اچانک ہی اسے کچھ خیال آیا اور اس کے دل میں اس نوجوان کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگے۔ وہ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کو اس طرح نہیں جانا چاہیے۔ اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی طرف دیکھا، وہ بھی اسے یوں دیکھنے لگے جیسے جان گئے ہوں کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ یہ اس کا پرانا طریقہ تھا اور وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔

"اے لڑکے!" اس نے پیچھے سے آواز لگائی، جب کرسٹین نے مڑ کر دیکھا تو وہ بولا۔ "میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

کرسٹین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا نام جان کر کیا کرے گا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "کرسٹین گرول۔"

"شاید تمہیں یہ سوال عجیب لگے لیکن کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ آج کل تم کیا کام کر رہے ہو؟"

کرسٹین نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور بولا۔ "میں آرٹ کا طالب علم ہوں لیکن فی الحال یہ سلسلہ رکا ہوا ہے۔"

"میں سمجھ گیا، یقیناً پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تمہاری تعلیم ادھوری رہ گئی ہوگی۔ ویسے تم کس طرح کا آرٹ تخلیق کرتے ہو؟"

"زیادہ تر مجسمے اور کبھی کبھی تصویریں بنا لیتا ہوں لیکن مجھے مجسمہ سازی سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ وہ گزشتہ بارہ ماہ میں تقریباً سب کچھ بھول چکا تھا لیکن لکڑی کے کھلونے دیکھ کر اس کے دل میں خواہش جاگی کہ وہ دوبارہ آرٹ اسکول چلا جائے۔ گو کہ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی لیکن جانتا تھا کہ اگر تھوڑا سا وقت اس فن کو دیدے تو اپنی پرانی زندگی میں واپس جا سکتا ہے۔

وہ شخص کرسٹین کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان دنوں میرا دوسرا بیٹا دنیا میں گھومنے کے لیے نکلا ہوا ہے لہٰذا اس مرتبہ ہمیں ایک آدمی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ میں تمہیں زیادہ معاوضہ تو نہیں دے سکتا لیکن تمہیں یہاں کام کر کے اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا جو مستقبل میں تمہارے کام آ سکتا ہے۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے اسٹال پر کام کروں؟" کرسٹین نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں نہیں، کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

کرسٹین نے اس کے بیٹے اور بیٹی کی جانب دیکھا جن کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ بھی یہی چاہ رہے تھے کہ کرسٹین یہ پیشکش قبول کر لے۔ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"دراصل ایک غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہوں۔ خود نہیں جانتا کہ میرا مستقبل کیا ہے اور کل کیا ہونے والا ہے۔"

"صرف چار ہفتے کی تو بات ہے۔ نئے سال کی تقریبات ختم ہونے کے بعد تم آزاد ہو گے۔ چاہو تو ہمارے ساتھ ہی کام کرتے رہو ورنہ آرٹ کلاس میں دوبارہ داخلہ لے لو۔"

کرسٹین کی نظر بے اختیار اس کی بیٹی کے چہرے پر گئی۔ کرسٹین کو اس کی آنکھوں میں ایک التجا نظر آئی جیسے کہہ رہی ہو۔ "رک جاؤ، مجھے بھی آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ ہم دونوں مل کر تخلیق کا نیا جہاں آباد کر سکتے ہیں۔"

اس کے چہرے کی معصومیت اور آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ کر اس کا دل موم کی طرح پگھل گیا اور اسے بالکل بھی یاد نہ رہا کہ اسے صبح کا سورج دیکھنے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ چند گھنٹوں کا مہمان تھا۔ موہلر کے آدمی بو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ جاتے تو اسے سانس لینے کی مہلت بھی نہ ملتی لیکن اب شاید ایسا نہ ہو۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ لڑائی میں وہاں پر موجود موہلر کے تمام ساتھی مارے جا چکے ہیں اور ان کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "میں بچپن میں یہاں بہت آیا کرتا تھا اور اب قسمت ایک بار پھر مجھے اس اسٹال پر لے آئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسٹال کے باہر کھڑے ہو کر حسرت سے ان کھلونوں کو دیکھنے کے بجائے خود انہیں تخلیق کیا کروں گا۔"

اس کے بعد وہ سب باتوں میں مصروف ہو گئے اور صبح کا پروگرام بنانے لگے۔ انہیں توقع تھی کہ کرسٹین کے آ جانے سے اسٹال کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔ صرف بیس منٹ میں وہ ان لوگوں میں گھل مل گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اس خاندان کا حصہ رہا ہے یا کم از کم ایسا موقع اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کبھی کولون آیا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے موہلر اور اس کے محافظ کو قتل کیا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس مہربان شخص اور اس کے خاندان نے کرسٹین پر بھروسا کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ ورنہ ایک قاتل ہونے کے ناتے اس کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا لیکن اب اسے اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی۔ واقعی اس لڑکی کی مسکراہٹ بڑی جان دار تھی۔ کرسٹین کو لگا کہ یہ دنیا اس کے لیے دوبارہ نئی ہو گئی ہے اور وہ کل کی شب بھی یہاں موجود ہوگا۔ اب وہ ناکامی کے بھنور سے نکل آیا تھا اور کامیابی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس معصوم لڑکی کی محبت کی صورت میں اسے ملنے والی تھی۔

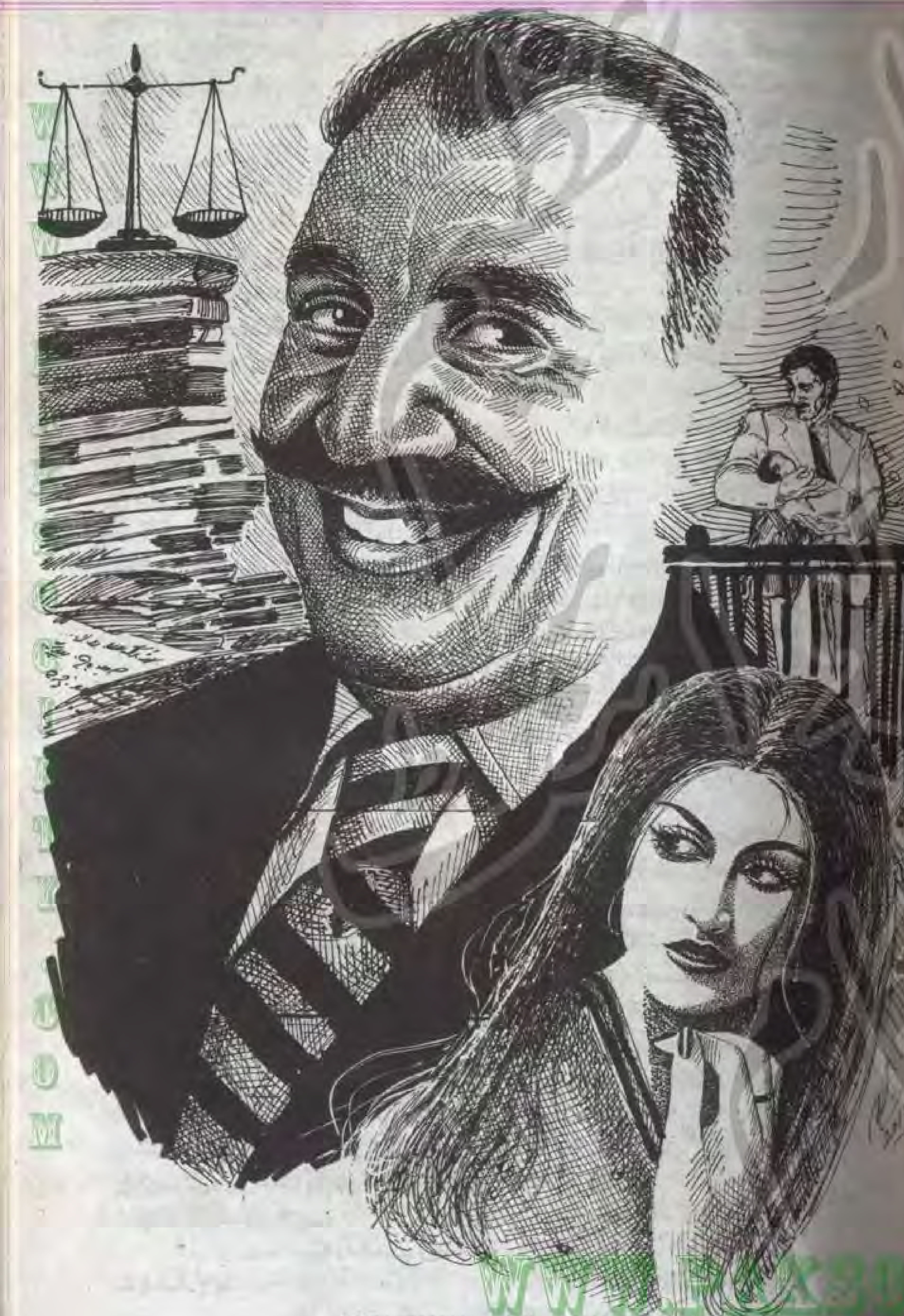

سعیِ حاصل

مرزا امجد بیگ

جھوٹی انا اور بے جا ضد کو اگر تباہی کے رستے کی جانب پہلا قدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا... اس کے بعد غلطیوں کی تکرار اور تدبر کے نام پر بے وقوفیوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا قصہ چھڑ جاتا ہے... بات بات پر الجھنا اور جان بوجھ کر کسی کی الجھنوں میں اضافہ کرنا کسی کا مشغلہ سہی لیکن... کبھی کبھی تماشا کرنے والے خود بھی اسی گردش کا حصہ اتنی خاموشی سے بن جاتے ہیں کہ خود انہیں احساس تک نہیں ہو پاتا... کچھ ایسا ہی عجب حال ان عقل کے اندھوں کا بھی ہوا جو خود کو عقلِ کل سمجھ کر دوسروں کی لگام اپنے ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے... پھر انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کب خالی ہاتھ، خالی دامن ہو بیٹھے۔

ناامیدی کے غار میں ایک سعی حاصل کا عبرت اثر احوال

موسم نے اچانک ہی کروٹ لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی معمولات زندگی میں بھی بڑا خوشگوار بدلاؤ دیکھنے کو ملا تھا۔ راتوں رات ہی گرم کپڑے نکل آئے تھے۔ سویٹرز، جیکٹس، ٹوپیاں، دستانے اور دیگر گرم ملبوسات کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ کراچی میں موسم سرما نہایت ہی مختصر مدت کے لیے پڑاؤ ڈالتا ہے اسی لیے اس شہر کے باسی گرم ملبوسات کے شوق کو پورا کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

ایسی ہی ایک ٹھنڈی ٹھار سہ پہر میں آفس پہنچا تو لابی میں تین چار افراد میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں سر کی خفیف سی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے چیمبر کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے اپنے مخصوص کمرے میں قدم رکھا تو یخ بستگی کا احساس ہوا۔ خوش گوار ٹھنڈک نے میرے جسم کے کھلے حصوں پر خنک بوسے دے ڈالے تھے۔ بے اختیار میری نگاہ ایئر کنڈیشنر کی جانب اٹھ گئی۔ اے سی آف تھا۔ میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب میری سیکریٹری ناہید تھی۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب میں نے خوش اخلاقی سے استفسار کیا۔

”سر! فیصل صاحب ایک گھنٹے سے آپ کے میں بیٹھے ہیں۔ انہیں اندر بھیج دوں......؟“

”ضرور بھیج دو۔“ میں نے سرسری انداز میں

”اللہ کی بندی، اس سے پہلے یہ بتاؤ، میرے آفس اسٹاف میں سب سے زیادہ گرمی کس کو لگتی ہے؟“

”اوہ......!“ ناہید کی متاسفانہ آواز میری سماعت ٹکرائی۔ ”شوکت نے غلطی سے آپ کے کمرے کا اے سی کر دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے بند کرایا ہے۔“

ناہید کو میرے پاس کام کرتے ہوئے زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن بہت کم وقت میں اس نے آفس کے میرے معاملات کو سنبھال لیا تھا۔ وہ نہایت ہی سمجھ دار موقع شناس لڑکی تھی۔ اس مختصر سی مدت میں، میں اس ذہانت اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا تھا۔ ابھی میں نے سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ...... سب سے زیادہ گرمی کس

ہے اور ناہید فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

شوکت علی کا تعلق ضلع ملتان سے تھا۔ اسے بھی میرے پاس چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ گھر سے بھاگ کر کراچی آیا تھا۔ میں نے ملتان سے اس کے گھر والوں کو کراچی بلا کر ان کے درمیان پائی جانے والی ناراضی دور کرا دی تھی اور اب سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے جس کا ذکر پھر کسی موقع پر کروں گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ آفس بوائے شوکت علی کو زیادہ گرمی لگتی تھی بہ الفاظ دیگر، سردی بہت کم محسوس ہوتی تھی تاہم میرے چیمبر کا اے سی آن ہو جانے میں اس کی غلطی سے زیادہ معمول کا دخل تھا۔ وہ روزانہ یہ کام کرتا تھا چنانچہ عادتاً آج بھی اس نے معمول کے مطابق اے سی آن کر دیا ہوگا۔ دو روز پہلے تک یہ اے سی بڑی باقاعدگی کے ساتھ چلایا جا رہا تھا۔

فیصل نامی اس کلائنٹ کی عمر پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ رنگ گندمی اور آنکھوں سے سادگی کا اظہار ہوتا تھا۔ فیصل نے شرعی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ پتلون اور شرٹ میں ملبوس تھا۔ شرٹ کے اوپر اس نے گرم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ خاصا الجھا ہوا اور پریشان نظر آتا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اپنی میز کے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تشریف رکھیے......''

اس نے تشریف رکھ دی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی آمد کی غرض و غایت کے بارے میں دریافت کیا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں......''

''وہ تو آپ شکل ہی سے لگ رہے ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرے پاس آنے والے افراد کو کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بہرحال......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''بٹ صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے مسئلے کے سلسلے میں پہلے بھی دو تین وکیلوں کو آزما چکا ہوں لیکن یہ معاملہ جہاں سے چلا تھا، ابھی تک وہیں کھڑا ہے......''

''آپ کن بٹ صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یونس بٹ صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔

یونس بٹ کا تعلق شوبزنس سے تھا۔ میرے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی کہا۔

''ٹھیک ہے فیصل صاحب! اب ذرا آپ مجھے اپنے اس معاملے کے بارے میں بھی بتا دیں جو ابھی تک ایک جگہ پر کھڑا ہے اور اس معاملے کو کسی کنارے لگانے کی غرض سے آپ میرے پاس آئے ہیں......؟''

''مجھے میری بیٹی چاہیے......'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے، آپ کی بیٹی کہاں چلی گئی ہے؟''

''عائشہ اپنی ماں کے پاس ہے۔''

''عائشہ یقیناً آپ کی بیٹی کا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''وہ اگر اپنی ماں کے پاس ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا، وہ آپ کی بیوی کے پاس ہے......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''جی ہاں...... فی الحال اس کا یہی مطلب ہے۔''

''اور...... آپ کی بیوی کہاں ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ اپنی ماں کے پاس ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا اور کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''تو یہ گھریلو ناچاقی کا معاملہ ہے......؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے وکیل صاحب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں ''ہے'' کی جگہ ''تھا'' استعمال کرنا چاہوں گا۔''

''گویا گھریلو ناچاقی سے معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے؟''

''جی ہاں...... ایسی ہی صورتِ حال ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کاغذ پر قلم گھسیٹتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''اپنی دو سالہ بیٹی عائشہ......!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''صرف بیٹی یا...... بیٹی اپنی ماں سمیت؟''

''صرف بیٹی!'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

''او کے......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''فیصل صاحب! آپ مجھے ان حالات سے آگاہ کریں جو آپ کی بیوی اور بیٹی کو آپ سے دور لے گئے ہیں۔ میں جب تک آپ کی کہانی نہ سن لوں، حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

آئندہ تیس منٹ میں فیصل نامی اس شخص نے مجھے اپنے پیش آمدہ حالات و واقعات کے بارے میں جو کچھ بتایا، میں اس میں سے غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے آغاز سے قبل آپ بھی اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

◆◆◆

فیصل ایک تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت شخص تھا۔ وہ ایک بینک میں باعزت پوسٹ پر کام کر رہا تھا اور اپنے اسٹاف کے درمیان آفیسر کہلاتا تھا۔ اس کا عہدہ منیجر کے بہت قریب تھا۔ وہ گلشن اقبال میں اپنی فیملی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ دو کشتیوں کا مسافر ہمیشہ پریشان اور مسائل زدہ رہتا ہے، سو فیصل بھی ایک ایسے ہی گمبھیر مسئلے سے دوچار تھا۔

جب یہ کیس مجھ تک پہنچا اس وقت فیصل کی شادی کو لگ بھگ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اپنی بیوی فرزانہ سے بے اندازہ محبت کرتا تھا۔ فرزانہ بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ اس مختصر سی فیملی کو کسی بھی نوعیت کی مالی تنگی کا سامنا نہیں تھا۔ بس ان کی زندگی میں ایک ہی کمی، ایک ہی غم تھا...... اولاد سے محرومی کا روگ۔ شادی کو ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی فرزانہ کی گود ہری نہیں ہو سکی تھی۔ چونکہ کسی قسم کی معاشی پریشانی نہیں تھی لہٰذا علاج معالجے کے ذیل میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مختلف ڈاکٹروں کے کلینکس اور اسپتالوں کے چکر کاٹنے کے بعد وہ صبر شکر کر کے بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹروں کا متفقہ فتویٰ یہی تھا کہ دونوں میاں بیوی میں کسی طرح کا کوئی میڈیکل نقص نہیں، بس قدرت ہی کی طرف سے دیر تھی۔ وہ مشیت خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے خاموش ہو بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ باہمی انسیت نے دونوں کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ کم و بیش چار سال پہلے ان کی زندگی میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اس بھونچال کا نام...... سفینہ تھا۔

سفینہ ایک ایسے آفس میں کام کرتی تھی جہاں بینک کے کام سے فیصل کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ سفینہ دل کش نقوش کی مالک ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ وہ خوب صورتی میں فرزانہ کا پاسنگ بھی نہیں تھی مگر اس کا کیا کیجیے کہ فیصل بہت تیزی سے اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد دونوں کو بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ لڑکی اور لڑکا یا مرد اور عورت جب ایک دوسرے کی الفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اگلا مرحلہ یقیناً شادی کا ہوتا ہے۔ وہ بھی قربت اور تعلقات کے حوالے سے اسی خطرناک زون میں داخل ہونے والے تھے۔

فیصل اپنی خواہش اور سفینہ کی مرضی سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایک روز جب وہ پُرسکون ماحول میں بیٹھے راز و نیاز کر رہے تھے کہ فیصل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''سفینہ! میں بڑی شدت سے اپنی زندگی میں تمہاری کمی محسوس کرنے لگا ہوں۔''

''کمی......!'' سفینہ نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تو تمہارے آس پاس ہی رہتی ہوں پھر کمی کا ایسا احساس کیوں؟''

''میں نے زندگی میں تمہاری کمی کی بات کی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے بہت قریب ہو لیکن معاشرتی طور پر تم میری زندگی کا حصہ نہیں ہو......!''

''تو بنا لو نا، مجھے اپنی زندگی کا حصہ!'' سفینہ اٹھلا کر بولی۔ ''تمہیں روکا کس نے ہے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو میرے گھر والوں کو بھی اس نیک کام سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''سارا مسئلہ تو میری جانب ہے......'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''کیسا مسئلہ فیصل؟'' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس نے پوچھ لیا۔

فیصل نے گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تم تو جانتی ہو سفینہ۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں شادی شدہ ہوں!''

''ہاں جانتی ہوں......!'' وہ سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگی۔

''جانتی ہو، پھر بھی سمجھ نہیں پا رہی ہو؟''

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے سے بولی۔ ''اگر تم شادی شدہ ہو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں فرزانہ کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری زندگی میں آنے کو تیار ہوں۔''

''لیکن...... شاید فرزانہ اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوگی۔'' فیصل کی آنکھوں میں پریشانی جھلکنے لگی۔

''اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں کر سکتی فیصل۔'' سفینہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اپنی سائڈ کو تمہیں خود ہی دیکھنا ہوگا......!''

فیصل نے امداد طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مگر تم مجھے کوئی اچھا سا مشورہ بھی تو دے سکتی ہو......؟''

''ہاں...... کیوں نہیں......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر دو......؟''

فیصل کی درخواست پر سفینہ نے اسے ایک دو قیمتی مشوروں سے نواز دیا۔ دونوں میں بہت اچھی ذہنی ہم آہنگی اور طبعی میلان پیدا ہو چکا تھا لہٰذا اس کا مشورہ فیصل کو بہت پسند آیا۔

آیندہ روز سے فیصل نے سفینہ کے مشورے پر عمل شروع کر دیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ فرزانہ کے لیے فیصل کی محبت میں کسی قسم کا کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ خلوص نیت سے اسے چاہتا تھا لیکن سفینہ کی طلب بھی اس کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جما چکی تھی اور وہ جلد از جلد اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے گھر کی چار دیواری کے اندر دیکھنا چاہتا تھا۔ پچھلے دنوں سے، جب سے وہ سفینہ کے بہت قریب ہوا تھا، اس کی اٹھک بیٹھک اور تال میل میں بہت زیادہ بدلاؤ آ گیا تھا۔ وہ ہر وقت آسودہ اور خوش باش دکھائی دیتا تھا۔ فرزانہ نے اس کے اندر پیدا ہونے والی اس تبدیلی کو فوری طور پر محسوس کر لیا تھا لیکن جب اس نے سفینہ کی ہدایت کے مطابق گھر میں اداکاری شروع کی تو فرزانہ چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک رات اس نے اپنی الجھن کا اظہار بھی کر دیا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹنے لگے تو فرزانہ نے پوچھا۔ ''فیصل! آپ کسی وجہ سے پریشان ہیں؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ بدکے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''آفس میں کوئی گڑبڑ ہے کیا؟''

''میرے بینک کا کوئی بھی معاملہ تم سے چھپا ہوا نہیں فرزانہ......!''

''جبھی تو میں بھی الجھ رہی ہوں۔'' وہ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جب بینک میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے تو پھر آپ کو کیا ہو گیا ہے......''

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' فیصل نے اسی کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیے۔

''آپ پچھلے کچھ عرصے سے بہت خوش اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔'' فرزانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو خوش دیکھ کر مجھے جو سکون ملتا ہے، اسے بیان نہیں کر سکتی لیکن......''

فرزانہ نے جملہ ادھورا چھوڑا تو فیصل نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن دو تین روز سے آپ بہت اداس اور بجھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، آپ کی خوشی کو کس کی نظر لگ گئی ہے......''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے اللہ کی بندی!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''تمہیں وہم ہو گیا ہے۔''

''نہیں، میں نہ وہمی ہوں اور نہ ہی مجھے کسی قسم کی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ بتانا نہ چاہیں تو الگ بات ہے لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ آپ کے ساتھ کچھ ہوا نہ ہو......''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ......!''

''کیا بات ہے فیصل؟'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فرزانہ بول اٹھی۔ ''آپ بتائیں مجھے۔ میں آپ کی شریک حیات ہوں۔''

''اسی لیے تو......!'' فیصل جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا اسی لیے تو؟'' فرزانہ کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''میں تمہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا فرزانہ......!''

''اور میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس لیے بتائیں، آخر معاملہ کیا ہے؟''

''وہ فرزانہ......!'' اتنا کہہ کر فیصل نے توقف کیا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کچھ دنوں سے، بڑی شدت سے اپنی محرومی ستانے لگی ہے......!''

''کون سی محرومی؟'' فرزانہ الجھن زدہ انداز میں اسے تکنے لگی۔

''ایک ہی تو محرومی ہے زندگی میں۔'' وہ بے حد اداس ہو گیا۔ ''ہم دونوں کی اکلوتی محرومی!''

''اوہ......!'' فرزانہ ایک مضمحل سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''فیصل، اولاد کی محرومی تو ہماری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے جسے بھرنا میرے بس میں ہے اور نہ ہی تمہارے بس میں......''

''لیکن ہم اس خلا کو بھرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نا......!''

''کیسی کوشش؟'' فرزانہ نے متذبذب انداز میں استفسار کیا۔ ''جو کچھ ہمارے بس میں تھا، وہ سب تو کر چکے۔ علاج معالجے، دم درود، ٹوٹکے اور ہر وہ ترکیب جو کسی کی بھی آزمودہ کار تھی۔ ہر طرف سے ناکام ہونے کے بعد ہی تو ہم چپ سادھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ جب اللہ ہی کو منظور نہیں تو ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔''

''میں تمہاری ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں فرزانہ۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں، ہم نے ابھی تک ایک آپشن کو تو چھیڑا ہی نہیں کیا۔''

''کون سا آپشن؟'' فرزانہ کی حیرت میں الجھن بھی شامل ہو گئی۔

''تم یہ تو مانتی ہو نا کہ رزق بیوی کے نصیب سے اور اولاد شوہر کے نصیب سے عطا ہوتی ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں مستفسر ہوا۔

''ہاں...... میں نے ایسا سن تو رکھا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

''تم بہت خوش نصیب ہو فرزانہ۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولا۔ ''جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو، میں مسلسل ترقی کی منزل کی جانب گامزن ہوں۔ تم سے شادی کے بعد میری آمدنی میں قابلِ فخر اضافہ ہوا ہے لیکن میں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے دزدیدہ انداز میں فرزانہ کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن...... میں ایسا بدنصیب ہوں کہ تمہیں کوئی اولاد نہ دے سکا۔''

''آپ کن فضول باتوں کو لے کر بیٹھ گئے ہیں۔'' فرزانہ موضوع کو تبدیل کرتے ہوئے بولی۔ ''جب اللہ کی ہی مرضی نہیں ہے تو آپ کیوں خود کو الزام دے رہے ہیں۔ یہ معاملات آپ کے اختیار میں تھوڑی ہیں۔''

''لیکن میں ایک آپشن کو استعمال کر کے اپنی قسمت کو نئے سرے سے آزمانا چاہتا ہوں۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم میرا ساتھ دو تو......!''

''آپ نے پہلے بھی کسی آپشن کا ذکر کیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''کھل کر بتائیں، آپ کے ذہن میں کیا ہے؟''

''وعدہ کرو، میرا ساتھ دوگی......؟''

''میں پچھلے گیارہ سال سے زندگی کے ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دے رہی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''بتائیں، کیا کرنا ہے۔ میں آپ کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں......!'' فیصل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا......؟'' فرزانہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''ہاں فرزانہ......!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''اور میں......؟'' فرزانہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''میں کہاں جاؤں گی فیصل......؟''

''تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''فرزانہ! تم تو میری زندگی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہارے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہر صورت میں میرے ساتھ رہو گی...... ہر حال میں۔''

''اور وہ......؟'' فرزانہ نے شاکی نظر سے اسے دیکھا۔

''میں اسے بھی اسی گھر میں رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''تم دونوں گہری سہیلیوں کی طرح ایک ہی چھت کے نیچے رہو گی۔ میں خود کو تقسیم کرنے کے حق میں نہیں ہوں......''

''فیصل!'' فرزانہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ''کوئی بھی عورت اپنی سوتن لانے کے لیے ہنسی خوشی شوہر کو اجازت نہیں دیتی لیکن میں......'' اس کی آواز میں نمی اتر آئی۔ ''میں...... آپ کی خوشی کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ کٹھن کام کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، دوپٹے کے پلو سے، آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''فیصل! میں نے آپ سے سچی محبت کی ہے اس لیے آپ کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی بھی مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں نے آپ کو دوسری شادی کی اجازت دیتے ہوئے ''کٹھن کام'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں ''زہر پینے'' کے نہیں......!''

''فرزانہ! تم عظیم عورت ہو۔'' وہ ستائشی نظر سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اولاد سے محرومی اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور ہم اس محرومی کے ساتھ گزشتہ گیارہ

حال سے جی ہی رہے تھے۔ میرے ذہن میں کبھی بھولے سے بھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا لیکن ابو کی خواہش نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔“

”ابو کی خواہش؟“ فرزانہ نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

فیصل نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”تو...... کیا آپ...... انکل کی خواہش پر...... دوسری شادی کر رہے ہیں؟“ فرزانہ کی آنکھوں میں حد درجہ تعجب تھا ”اور...... آپ نے اولاد والی جو بات کی ہے......؟“

”وہ بات بھی درست ہے۔“ فیصل نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”تم تو جانتی ہو نا، ابو کی طبیعت کتنی خراب ہے؟“

”ہاں، ہاں......“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اللہ انکل کو شفا دے......!“

”یہ بات تم بھی جانتی ہو، میں بھی جانتا ہوں اور باقی سب لوگ بھی جانتے ہیں کہ ابو اپنی زندگی کے نازک ترین لمحات سے گزر رہے ہیں۔“ فیصل نے اذیت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ان کی صحت کے حوالے سے کوئی بھی حتمی اور حوصلہ افزا بات نہیں کی جا سکتی۔ یہ انہی کا اصرار بلکہ حکم ہے کہ مجھے اولاد کے لیے ان کی زندگی میں ہی دوسری شادی کر لینا چاہیے......“

”اوہ......!“ فرزانہ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”تو یہ بات ہے۔“

فیصل اپنایت بھرے انداز میں اسے اپنی منصوبہ بندی کے بارے میں بتانے لگا۔ ساری بات سننے کے بعد فرزانہ نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”سفینہ کو آپ کب سے جانتے ہیں؟“

”لگ بھگ ایک سال سے......!“

”تو آپ دونوں کے بیچ یہ معاملہ ایک سال سے چل رہا تھا؟“

”کون سا معاملہ؟“ فیصل نے چونکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

فرزانہ نے تیکھے انداز میں جواب دیا۔ ”یہی باہمی پسندیدگی والا معاملہ...... اور کون سا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں فرزانہ“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میرا اکثر سفینہ والے آفس میں جانا ہوتا ہے لیکن اس سے شادی کا خیال پچھلے چند روز سے میرے ذہن میں آیا ہے...... ابو کی خواہش کے بعد سے۔“

”کیا ضروری ہے کہ سفینہ آپ سے شادی کے لیے تیار بھی ہو جائے۔“ فرزانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا اس سلسلے میں آپ نے اس سے بات کی ہے؟“

فیصل نے بتایا۔ ”وہ تیار ہے......!“

”اس کا مطلب ہے، سارے معاملات طے پا چکے ہیں......“ فرزانہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے سب سے آخر میں انفارم کیا جا رہا ہے۔“

فرزانہ کے الفاظ میں چھپی ہوئی شکایت کو فیصل نے فوراً محسوس کر لیا۔ ”ایسی بات نہیں ہے فرزانہ۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ابو کی خواہش سے مجبور ہو کر سفینہ کو اس سلسلے میں ٹٹولنے کی کوشش کی تو پتا چلا، وہ مجھے پسند کرتی ہے اور میرے شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی وہ مجھ سے شادی کو تیار ہے۔“

فرزانہ کے اندر کوئی نازک سی شے بے آواز چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر کرچیوں کی شکل میں بکھر کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ نکیلی اور کٹیلی کرچیاں اس کے دل و جگر کو خون کرنے لگیں۔ اس بے نام اذیت کے آثار اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔

یہ درست ہے کہ فرزانہ، فیصل کو بے پناہ چاہتی تھی اور اس کی خاطر ایک لمحے میں جان دینے کو تیار بھی ہو جاتی لیکن...... جان دینے اور جان کو ہلکان کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ فیصل کے یہ الفاظ اس کے لیے سوہان روح تھے کہ سفینہ فیصل کو پسند کرتی تھی۔ فرزانہ تو فیصل کو اپنی پراپرٹی سمجھتی تھی جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھی۔ فیصل کو کوئی اور بھی پسند کرے اور...... نہ صرف پسند کرے بلکہ اس کی بیوی بن کر گھر میں بھی آ جائے، اس کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ پتا پانی اور دل پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

محبت، محبت کرنے والوں کا امتحان لیتی ہے اور قربانی دیے بغیر اس امتحان میں سرخ روئی ممکن نہیں۔ فرزانہ کے اندر قربانی کا جذبہ تو تھا اور وہ فیصل کی خوشی کی خاطر سفینہ کو اپنی سوتن کی شکل میں قبول کرنے کو بھی تیار ہو گئی تھی مگر ایک انسان ہونے کے ناتے وہ انسانی فطرت اور جبلت کے بھی تابع تھی لیکن اس کے گوشت و پوست کے وجود میں شکست و ریخت کا عمل بھی اس معاملے کا لازمی جز تھا جس سے وہ دامن بچا سکتی تھی اور نہ ہی آنکھیں چرانا اس کے بس میں تھا......!

ایک ماہ کے بعد سفینہ فیصل کی دوسری بیوی کی حیثیت سے اس کے گھر میں آ گئی۔ اس سے اگلے ماہ فیصل کے والد منصور علی کا انتقال ہو گیا۔ بیٹے نے ایک علیل باپ کی خواہش کو کسی حد تک پورا کر دیا تھا۔ اس خواہش کا باقی حصہ سفینہ کو پورا کرنا تھا، فیصل کی اولاد کی صورت میں، جب ہی منصور علی کی روح کو قرار حاصل ہو سکتا تھا۔

اس شادی کے موقع پر سفینہ کی والدہ سلطانہ نے اپنی بیٹی کے تحفظ کی خاطر اسٹامپ پیپر پر فیصل سے کئی ایک کڑی شرائط پوری کرنے کا معاہدہ بھی کرایا تھا۔ مثلاً یہ کہ فیصل سفینہ کو زندگی کے ہر معاملے میں فرزانہ کے برابر درجہ دے گا اور سفینہ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دے گا کہ وہ محض اولاد پیدا کرنے کے لیے اسے اپنے نکاح میں لایا ہے۔ فرزانہ کو بھی سفینہ کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرنا ہوگا۔ فیصل اپنی دونوں بیویوں کے درمیان انصاف کے تمام تر تقاضے پورے کرنے کا پابند ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ......!

اس تحریری معاہدے میں کوئی بھی ایسی بات درج نہیں تھی جو فیصل کے لیے کوئی دشواری پیدا کرتی ہو۔ وہ معقول سوچ رکھنے والا ایک انصاف پسند اور صلح جو انسان تھا لہٰذا سفینہ کی آمد کے بعد گھر میں کسی قسم کے فتنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس سلسلے میں فرزانہ بھی فیصل کے ساتھ اپنی بساط سے بڑھ کر تعاون کر رہی تھی۔ اس نے کسی بھی مرحلے پر سفینہ کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کی سوتن بن کر گھر میں آئی ہے۔ وہ سفینہ کے ساتھ ایک سہیلی، ایک بہن جیسا برتاؤ کر رہی تھی۔ دونوں بیویوں کو ایک چھت کے نیچے خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ کر لوگ فیصل کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ بعض کو تو اس آنکھوں دیکھی حقیقت پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہ گویا ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے والا معاملہ تھا۔

لوگ فیصل اور اس کی دونوں بیویوں کے بارے میں چاہے کچھ بھی سوچیں مگر حقیقت وہی تھی جو نظر آتی تھی۔ اس میں کسی مبالغہ آرائی اور ریاکاری کی آمیزش نہیں تھی۔

ایک سال پر لگا کر گزر گیا۔ سفینہ اور فرزانہ نے مثالی اتفاق کا مظاہرہ کر کے دنیا والوں کو حیران کر دیا تھا۔ گھر کے کاموں کو انہوں نے اس طرح بانٹ لیا تھا کہ کہیں کوئی بدنظمی یا کمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ اپنی اپنی باری پر فیصل کی خدمت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ فیصل کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے لیے ہفتے کے تین، تین دن مقرر کر لیے تھے۔ ہفتے کا ساتواں دن یعنی اتوار وہ تینوں ایک ساتھ، ایک کمرے میں گزارتے تھے۔ ان لمحات میں فیصل کسی ایک بیوی کا نہیں بلکہ بہ یک وقت دونوں کا ہوتا تھا۔ جیسے بہار کا موسم پورا سال نہیں رہتا۔ اس کے بعد خزاں کی آمد بھی لازمی عمل ہے، بالکل اسی طرح انسان کی زندگی میں دکھ سکھ بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اسے چاہے کچھ بھی نام دے دیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اکثر لوگ برے وقت کو ”خوشیوں کو کسی کی نظر لگ جانا“ سے تعبیر کرتے ہیں اور اچھے وقت کو ”قدرت کی مہربانی“ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ جو کوئی جیسا بھی سوچتا ہے، یہ اس کا حق ہے۔

ان تین افراد کی ”ہیپی فیملی“ میں اس وقت انتشار نے آنکھ کھولی جب سفینہ نے فیصل کو خوش خبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس خبر نے فیصل کو نہال کر دیا تھا۔ اگرچہ فرزانہ اس اطلاع پر اندر سے بجھ سی گئی تھی تاہم اس نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصل اور سفینہ کی خوشی کو نہ صرف یہ کہ دل و جان سے قبول کیا تھا بلکہ اس خوشی میں وہ قدم قدم پر ان کے شانہ بہ شانہ کھڑی بھی نظر آتی تھی۔ ہر انسان اپنی فطرت اور بشری تقاضوں کے سامنے بے بس ہے۔ سفینہ کے ماں بننے کے امکان نے اگر فرزانہ کو اندر سے ملول اور آزردہ کر دیا تھا تو اس میں فرزانہ کی کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ وہ اپنی فطری محرومی اور بشری کمزوری کے سامنے مجبور تھی۔

سفینہ نے شادی کے بعد جاب کو خیرباد نہیں کہا تھا لیکن اب فیصل نے اصرار کیا کہ بچے کی ولادت تک وہ اسے آفس نہیں جانے دے گا۔ سفینہ جاب چھوڑ دے یا طویل رخصت لے لے بہرحال، وہ اسے جاب پر نہیں بھیجے گا۔ فیصل کی زندگی میں جتنی بڑی خوشی نے قدم رکھا تھا وہ اس کے استقبال اور تحفظ کی خاطر سفینہ کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ سفینہ نے اس کی بات مانتے ہوئے آفس سے طویل رخصت لے لی تھی۔

فرزانہ ایک گھریلو عورت تھی اور دن بھر گھر ہی میں رہا کرتی تھی۔ اب سفینہ بھی دن میں اس کے ساتھ ہوتی تھی لہٰذا انہیں پہلے سے دوگنا وقت ایک ساتھ گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ دو عورتیں جب ایک ساتھ وقت گزارتی ہیں تو سمجھو، ان کے بیچ باتوں کے انبار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ان کے درمیان بھی پیدا ہو گیا۔

سفینہ کو ایک لحاظ سے فرزانہ پر سبقت حاصل ہو گئی تھی۔ جو کام پچھلے بارہ سال میں فرزانہ نہیں کر پائی تھی وہ کارنامہ سفینہ نے اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے ہی سال میں انجام دے ڈالا تھا لہٰذا تفاخر اور برتری کا احساس ایک

فطری امر تھا اور اسی احساس نے سفینہ کو گفتگو میں خاصا غیر محتاط بھی بنا دیا تھا۔ وہ فرصت کے ان لمحات میں مزے لے لے کر فرزانہ کو اپنی اور فیصل کی محبت کے قصے بھی سنانے لگی تھی۔ انہی قصوں میں بیشتر واقعات فیصل سے اس کی شادی سے پہلے کے بھی تھے جب فیصل اپنے بینک کے کام سے سفینہ کے آفس جایا کرتا تھا۔

سفینہ کی اسی قصہ گوئی نے فرزانہ کو اندر سے بے چین کر دیا۔ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ وہ فیصل کی خوشی کی خاطر اپنی اوقات اور بساط سے بڑھ کر قربانی دے رہی تھی لہٰذا سفینہ کی ان غیر محتاط باتوں سے اسے تکلیف زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ جب اس کی برداشت جواب دے گئی تو ایک رات اس نے فیصل سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصل کی تقسیم کے لحاظ سے وہ فرزانہ کی رات تھی۔

”فیصل! آپ کو مجھ میں کیا کمی نظر آئی تھی؟“ فرزانہ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں فرزانہ!“ فیصل نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا میری وفا میں کوئی کھوٹ تھا؟“

”فرزانہ! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو......؟“

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ”میں نے کبھی آپ کا خیال رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ آپ کی ذرا ذرا سی خوشی اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو دنیا کی ہر شے پر مقدم جانا ہے پھر......“ اس کی آواز بھرا گئی ”پھر آپ نے ایسا کیوں کیا فیصل...... کیوں؟“

”فرزانہ!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے دوسری شادی سے پہلے ہی تمہیں بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میں کس مقصد بلکہ کن مقاصد کی خاطر یہ قدم اٹھانے جا رہا ہوں اور...... اور یہ سب کچھ تمہاری اجازت کے بعد ہی ہوا ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”اب...... جبکہ میری زندگی میں ایک عظیم خوشی کی آمد آمد ہے تو تم میری دوسری شادی کی فضول باتوں کو کھول کر بیٹھ گئی ہو......!“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں فیصل!“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

فیصل کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہو گئی۔ اس نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں آپ کی سفینہ سے شادی کی بات نہیں کر رہی ہوں!“

”پھر......؟“ فیصل کی حیرت دوچند ہو گئی۔

”میرا مطلب اس شادی سے پہلے والے واقعات سے ہے۔“ وہ بہ دستور فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”شادی سے پہلے والے واقعات؟“ وہ جھنجلا کر بولا۔ ”آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو......؟“

”میں ان دنوں کا ذکر کر رہی ہوں جب آپ صرف میرے شوہر ہوا کرتے تھے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چٹانی لہجے میں بولی۔ ”آپ اپنے بینک کے کام کے سلسلے میں سفینہ کے آفس جایا کرتے تھے اور وہیں پر آپ دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی۔“

”ہاں ہاں......!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ساری باتیں میں تمہیں، سفینہ سے شادی کرنے سے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

”ساری باتیں نہیں بلکہ ادھوری باتیں!“

”کک...... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

”آپ نے انڈر اسٹینڈنگ کا صرف ایک پہلو مجھے دکھایا تھا۔“ وہ تلخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”دوسرا پہلو تو اب سفینہ کی زبانی پتا چل رہا ہے......!“

”میں کچھ سمجھا نہیں!“ وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”جو بھی کہنا چاہ رہی ہو، کھل کر کہو...... یوں پہیلیاں نہ بجھواؤ۔“

”آپ نے سفینہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے انکل منصور علی کی ضد اور اپنی اولاد کی خواہش کی خاطر سفینہ کو پروپوز کیا تھا۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ ”اور اسی وقت آپ کو پتا چلا تھا کہ سفینہ چپکے چپکے کافی عرصے سے آپ کو پسند کر رہی تھی؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”یہی حقیقت ہے۔“

”یہ حقیقت نہیں ہے فیصل!“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

”پھر......؟“ وہ ایک لفظ سے آگے کچھ نہ بول سکا۔

”حقیقت تو اب سفینہ کی زبانی کھل کر سامنے آ رہی ہے فیصل۔“ وہ مجروح لہجے میں بولی۔ ”اور مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ مجھ سے بے وفائی کرتے رہے۔ میں اس اعتماد کے ساتھ روزانہ آپ کو گھر سے رخصت کرتی تھی کہ آپ صرف اور صرف میرے ہیں اور آپ......“ بولتے بولتے فرزانہ کی آواز میں نمی اتر آئی۔ ”آپ میرے خلوص، میری وفا کی امانت میں خیانت کرتے رہے۔ میرے اعتماد کو بڑی بے دردی سے ٹھیس پہنچاتے رہے؟“

”پتا نہیں، تم کیسی باتیں کر رہی ہو فرزانہ!“ وہ ہڑبڑا کر بولا۔ ”میری تو سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا......“

”آپ سب سمجھ رہے ہیں فیصل!“ وہ شاکی لہجے میں بولی۔ ”آپ کو بہ خوبی اندازہ ہے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔“

وہ نگاہ چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر خفت محسوس کر رہا تھا۔ فرزانہ نے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ شادی سے پہلے آپ سفینہ کے ساتھ کئی مرتبہ سی ویو کی طرف گئے ہیں......؟“

فیصل کی پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”آپ لوگ گاہے بہ گاہے ایک ساتھ تنہائی میں وقت گزارتے رہے ہو۔“ فرزانہ کے لہجے میں کڑواہٹ بھی شامل ہو گئی۔ ”کبھی اوپن ایئر پارلر میں آئس کریم کھاتے ہوئے اور کبھی کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے ہوئے اور...... آپ دونوں کے بیچ یہ تعلق محض ”واقفیت“ تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ ایک دوسرے کی محبت میں گردن گردن تک دھنس چکے تھے...... فیصل! میں آپ پر اندھا بھروسا کرتی رہی اور آپ میری محبت اور میری وفا کی توہین میں مصروف رہے...... کیوں...... آخر کیوں؟“

”شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی......!“

”نہیں فیصل!“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرزانہ نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ یہ ساری باتیں مجھے خود سفینہ نے بتائی ہیں ”امید“ کی خوشی نے اسے خاصا مغرور، بے پروا اور غیر محتاط بنا دیا ہے۔ وہ مجھ پر برتری ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ مجھے سفینہ کے اس نئے رویے کا ذرا شکوہ نہیں مگر اس نے آپ کی ذات کے حوالے سے جو اذیت ناک انکشافات کیے ہیں انہوں نے مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے...... کاش! آپ نے یہ سب نہ کیا ہوتا۔“

اتنا کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی اور آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے لگی۔ فیصل گومگو کی کیفیت میں مسلسل اسے تکے جا رہا تھا۔ چند لمحات اسی خاموش اور بوجھل فضا میں گزر گئے پھر فرزانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”فیصل! اگر آپ کو میری باتوں کا یقین نہ ہو تو میں گواہی کے لیے دوسرے کمرے سے سفینہ کو بھی بلوا سکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی......“

فیصل نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔

”میں نے آپ کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سوال کو پڑھ لیا ہے فیصل۔ آپ یہی جاننا چاہتے ہیں نا کہ...... میں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے سفینہ کو یہاں کیوں نہیں بلوانا چاہتی......؟“

فیصل منہ سے کچھ نہیں بولا تاہم اس کی آنکھوں میں یہ سوال مجسم رہا۔ ”کیوں؟“

”میں اس لیے سفینہ کو یہاں نہیں بلواؤں گی کہ میں نے آپ سے سچی محبت کی ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے گوارا نہیں کہ میری محبت کی یوں تذلیل ہو۔ آپ نے جو کیا وہ آپ کا ظرف ہے لیکن شاید......“ بولتے بولتے وہ خیالوں میں کھو گئی۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

”شاید آپ محبت کرنے والی کسی عورت کے ظرف کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار کسی مرد سے محبت کرتی ہے۔ پھر اپنا تن، من، دھن...... سب اس پر نچھاور کر دیتی ہے۔“

”آئی ایم رئیلی ویری سوری فرزانہ......!“ فیصل نے تہ دل سے کہا۔

”اب مجھے اور شرمندہ نہ کریں فیصل!“ فرزانہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ”میں اسے آپ کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر بھول جاؤں گی کیونکہ مجھے یقین ہے، آپ صرف اور صرف میرے ہیں......“

فیصل کے چہرے اور آنکھوں میں محبت، عقیدت، چاہت اور شکر گزاری کے تاثرات چمکنے لگے۔ وہ پیار بھری نظر سے یک ٹک فرزانہ کو دیکھتا چلا گیا۔

سفینہ کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ماہ چند دن کے لیے اپنے میکے جایا کرتی تھی۔ یہ عموماً وہی دن ہوا کرتے تھے جب فیصل ایک طے شدہ پروگرام کے تحت فرزانہ کے حصے میں ہوا کرتا تھا۔ اس ماہ بھی سفینہ اپنے میکے گئی لیکن معمول کے مطابق واپس نہیں آئی تو فیصل تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

فیصل خود ہی سفینہ کو میکے چھوڑنے جاتا تھا اور وہاں سے واپس بھی خود ہی لایا کرتا تھا مگر اب کی بار جب وہ اپنی سسرال پہنچا تو وہاں کا موسم ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ اس کی ساس سلطانہ بیگم نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

”سفینہ ایک ہی شرط پر واپس جائے گی فیصل میاں...... اور وہ شرط ہے، فرزانہ کی طلاق......!“

◆◆◆

فیصل یہاں تک پہنچنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے چونک کر پوچھا ''آپ کی ساس نے یہ کس قسم کی شرط عائد کردی تھی؟''

''نہایت ہی بے ہودہ اور واہیات قسم کی شرط!'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ''اس روز مجھے پتا چلا تھا کہ میری ساس کیسی احمق عورت ہے۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی فیصل صاحب!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''جب آپ سفینہ کو اس کے میکے چھوڑنے گئے تھے تو کیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا؟''

''ایک دم ٹھیک ٹھاک وکیل صاحب!'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''سب کچھ معمول کے عین مطابق تھا۔''

''یہاں آپ کے گھر میں فرزانہ کے ساتھ سفینہ کا کوئی جھگڑا ہوا ہو؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سب امن و امان تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سفینہ کے میکے پہنچ کر مجھے اس قسم کی صورت حال کا سامنا ہوگا۔''

''آپ نے اپنی ساس صاحبہ سے سوال نہیں کیا کہ وہ کس جرم کی سزا کے طور پر فرزانہ کو طلاق دینے کے لیے کہہ رہی ہیں؟'' میں نے فیصل سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''میں نے سوال کیا تھا......''

''پھر سلطانہ بیگم نے کیا جواب دیا؟''

''نہایت ہی نامعقول جواب۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کہنے لگیں، فیصل میاں! تمہیں دو میں سے ایک بیوی کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر سفینہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو تو فرزانہ کو طلاق دینا ہوگی۔ اس کی موجودگی میں، میں اپنی بیٹی کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔''

''اس موقع پر آپ کی سیکنڈ وائف سفینہ نے کیا موقف اختیار کیا تھا؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''جس روز یہ ایشو اٹھا اس وقت سفینہ کی اپنی کوئی رائے دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی تھی۔'' فیصل نے بتایا۔ ''لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی ماں کی ہم نوا بن گئی۔ اس نے بھی واضح الفاظ میں مجھ سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر میں اسے اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں تو پھر مجھے فرزانہ کو اپنی زندگی سے نکالنا ہوگا...... اور اگر میں فرزانہ کو طلاق دینے پر تیار نہیں ہوتا تو پھر اس کا خیال دل سے نکال دوں......''

''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''لگ بھگ ڈھائی سال۔'' فیصل نے جواب دیا۔ ''عائشہ کی عمر اس وقت کم و بیش دو سال ہے۔ عائشہ اپنی ننھیال ہی میں پیدا ہوئی تھی۔''

''اوہ......!'' میں نے رف پیڈ پر قلم گھسیٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب ماں بیٹی ایک ہی سبق دہرانے لگی تھیں تو اس موقع پر آپ نے کیا موقف اختیار کیا تھا؟''

''میں نے اپنی ساس کو سمجھانے اور اپنی بیوی کو منانے کی کوشش کی تھی......''

''تو کیا آپ کی بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی؟''

''وکیل صاحب! اگر میری بات ان میں سے کسی ایک کی سمجھ میں بھی آگئی ہوتی تو آج سفینہ اور عائشہ میرے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتیں اور مجھے عائشہ کے حصول کے لیے کسی قسم کی قانونی مدد لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔''

''ایک بات کہوں فیصل صاحب!'' میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......؟''

''نیور مائنڈ وکیل صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں......''

''آپ نے مجھے اپنی زندگی کی جتنی کہانی سنائی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں۔''

''کون سے نتیجے پر وکیل صاحب؟''

''سفینہ اور آپ کی شادی جن بھی حالات میں ہوئی ہو۔'' میں نے کہا ''لیکن یہ شادی ہوجانے کے بعد سفینہ اور اس کی ماں نے ایک مخصوص ذہن بنا لیا تھا۔ انہیں ایک خاص وقت کا انتظار تھا......''

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''عورت چاہے کتنے بھی وسیع دل کی مالک ہو اور وہ کسی مرد سے کتنی بھی محبت کیوں نہ کرتی ہو......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ کسی شادی شدہ مرد سے شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچتی ہے اور جب تک کوئی اہم مقصد اس کے پیشِ نظر نہ ہو وہ یہ خطرناک قدم نہیں اٹھاتی۔''

میں نے لمحاتی توقف کرکے فیصل کی جانب دیکھا۔ وہ یک ٹک مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے فیصل صاحب۔ آپ کی سفینہ سے شادی ہوگئی۔ جتنی وسیع القلبی سے فرزانہ نے سفینہ کو قبول کیا، ایثار کا ایسا مظاہرہ سفینہ کی طرف سے دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ بہ ظاہر فرزانہ کو ایک بہن اور ایک سہیلی سمجھتی رہی تاہم اس نے دل سے فرزانہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ فرزانہ کی اس کمزوری سے بہ خوبی واقف تھی کہ وہ آپ کے لیے اولاد پیدا نہیں کرسکی تھی لہٰذا سفینہ بڑے صبر و سکون سے اس وقت کا انتظار کرتی رہی جب وہ امید سے ہوجائے۔ آپ نے اولاد کے حصول کی خاطر دوسری شادی کی تھی چنانچہ فطری طور پر آپ کا جھکاؤ اسی بیوی کی جانب زیادہ ہوتا جو آپ کے لیے اولاد پیدا کرنے جارہی تھی......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں، سفینہ اور اس کی ماں سلطانہ بیگم نے ایک گہری سازش کے تحت آپ کو پھانسا ہے۔ وہ دونوں آپ کی نفسیاتی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں پتا ہے، آپ اپنی بچی کی خاطر سفینہ کی جانب جھکیں گے اور وہ آپ کو مجبور کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی کہ آپ فرزانہ کو طلاق دے دیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ قطعاً غلط نہیں کہہ رہے وکیل صاحب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''انہوں نے اب تک میرے ساتھ وہی کیا ہے جو تجزیہ آپ نے پیش کیا ہے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے وہ ماں بیٹی ابھی تک مجھے شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکیں اور اب تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کیوں......!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب ایسا کیا ہوگیا ہے فیصل صاحب؟''

''میں نے ایک حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسا فیصلہ؟''

''میں نے سفینہ پر لعنت بھیج کر اپنی بچی کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے وکیل صاحب!'' وہ بڑے ٹھوس انداز میں بولا۔

''فیصل صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے بھی آپ دو تین وکلا سے ملاقات کرچکے ہیں لیکن آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں، میں نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دو وکلا کا تجربہ تو انتہائی تلخ رہا ہے۔ اب تیسرے سے واسطہ ہے اور یہ کیس بھی عدالت میں ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر عجیب سے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! میں نے سنا ہے، ہمارے ملک کی عدالتوں میں سب کچھ ممکن ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

''میں سمجھا نہیں......!'' میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ یہاں پیسے کی طاقت سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنا بہت آسان ہے......'' اس نے جواب دیا۔

''بعض کیسوں میں یقیناً ایسا ہوتا ہوگا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر آپ اس نیت سے میرے پاس آئے ہیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی فیصل صاحب! میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو پیسے کے زور پر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔

''پھر آپ نے مجھ سے کیوں ایسا سوال کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ بات کرتے ہوئے آپ کے ذہن میں کیا تھا؟''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سن رکھا ہے، جب تک بچے کی عمر آٹھ سال نہ ہوجائے، عدالت اسے ماں کی تحویل میں رکھنے کا حکم دیتی ہے اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ اگر پیسا بھی خرچ کرنا پڑے تو میں تیار ہوں۔ کوئی ایسا چمتکار دکھائیں کہ میری بیٹی عائشہ مجھے مل جائے۔''

''دیکھیں فیصل صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ آپ نے چائلڈ کسٹڈی (بچے کی تحویل) کے بارے میں جو بھی سنا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ اس سلسلے میں بچے کی عمر آٹھ نہیں، سات سال مقرر ہے اور یہ کوئی فارمولا نہیں کہ عدالت اس مخصوص مدت تک بچے کو ماں کی تحویل میں دینے کا حکم دیتی ہے۔''

''پھر؟'' میں لمحے بھر کے لیے تھما تو اس نے سوال داغ دیا۔

''جب چائلڈ کسٹڈی کا کوئی کیس عدالت میں جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس بچے کے والدین میں علیحدگی ہوچکی ہے یعنی ان میں رشتہ ازدواج باقی نہیں رہا۔ ایسی صورت میں مذکورہ بچہ عدالت کی ذمے داری بن جاتا ہے اور قانون کی زبان میں ''مائنر'' کہلاتا

ہے۔ عدالت ماں اور باپ کو نظرانداز کر کے صرف اور صرف مائنر کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ ماں اور باپ کے معاشی اور معاشرتی سیٹ اپ کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے اور عدالت کی نظر میں صحت، تعلیم، خوراک اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے جہاں کا ماحول زیادہ مفید اور موزوں ہو، بچہ اسی ماحول کے حامل فرد کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ فرد ماں بھی ہو سکتی ہے اور باپ بھی......''

''اور اگر بچے کی ماں اور باپ دونوں عدالت کے مقررہ معیار پر پورے نہ اترتے ہوں تو......؟'' اس نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''عموماً ایسا ہوتا نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ماں اور باپ میں سے کوئی ایک بچے کے لیے نسبتاً زیادہ موزوں ثابت ہو ہی جاتا ہے اور بالفرض محال......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہی ہو جیسا آپ بیان فرما رہے ہیں تو پھر مذکورہ بچے کو عدالت بچوں کے کسی فلاحی مرکز کے حوالے کر دیتی ہے۔''

''اوہ......!'' اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات چمکنے لگے۔ ''اگر یہی صورت حال ہے تو عدالت یقیناً عائشہ کو میری کسٹڈی ہی میں دے گی۔''

''اس کا مطلب ہے، عائشہ صحت، تعلیم، خوراک اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے آپ کے پاس زیادہ محفوظ ثابت کی جا سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرے اور میری سسرال کے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''یعنی آپ کے گھر کا ماحول ان کے گھر کے ماحول سے بہتر ہے؟''

''صرف بہتر نہیں...... بہت بہتر اور محفوظ و مضبوط۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

''عدالت میں اس امر کو ثابت بھی کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''میں بہت آسانی سے ثابت کر سکتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''مجھے تو ایک وکیل صاحب نے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''کیا مطلب فیصل صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے اس کیس کے سلسلے میں جن وکیل صاحب سے سب سے پہلے رابطہ کیا تھا انہوں نے پتا ہے، مجھ سے کیا کہا تھا......!''

''بتائیں، کیا کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے پوری توجہ سے میری کہانی سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا تھا، آپ فکر ہی نہ کریں فیصل صاحب! اس کیس کا فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوگا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ جب انہوں نے کیس تیار کر لیا اور مجھے پڑھنے کے لیے دیا کہ ایک نظر میں بھی دیکھ لوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں کوئی الجھن پیش نہ آئے۔ میں نے وہ کیس پڑھا تو چونک اٹھا اور حیرت بھرے لہجے میں ان وکیل صاحب سے کہا۔

''وکیل صاحب! اس میں تو نوے فیصد باتیں جھوٹی لکھی ہوئی ہیں۔ ایسا تو کچھ نہیں!''

''میاں فیصل......!'' انہوں نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور کہا۔ ''اگر آپ یہ کیس جیتنا چاہتے ہیں تو اپنے سچ کو عدالت سے دور ہی رکھیے گا ورنہ آپ کا پیسا اور میری محنت ضائع ہو جائے گی۔''

''میں سمجھ گیا، ان وکیل صاحب نے کیس کی بنیاد کس نقطے پر رکھی ہوگی۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

فیصل متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''انہوں نے آپ کی بیوی سفینہ کو بدکردار اور فاحشہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی نا؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا بیگ صاحب؟''

''ایسے پتا چلا کہ......'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''چائلڈ کسٹڈی کے کیسز میں نوے فیصد وکلا یہی حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ بچہ باپ کی تحویل میں دلوانے کے لیے اس کی ماں کو بدکردار اور فاحشہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ایک گھٹیا اور غیر اخلاقی ہتھکنڈا ہے۔ صحیح اور مستحسن عمل وہی ہے جو میں نے تھوڑی دیر پہلے بیان کیا ہے۔ عدالت کو کبھی کمزور اور بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے۔''

''میں نے ان وکیل صاحب سے جان چھڑائی اور دوسرے وکیل صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔'' فیصل نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وکیل صاحب بڑے غیر محسوس انداز میں فریقِ مخالف سے جا ملے اور کیس ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا مجبوراً مجھے ان سے بھی جان چھڑانا پڑی اور اب میرا کیس جاوید ترمذی صاحب کے پاس ہے۔''

''اوہ، جاوید ترمذی کے پاس ہے......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"بیگ صاحب! میں ترمذی صاحب کی کارکردگی سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔" فیصل نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "اسی لیے اب میں یہ کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔"

"جاوید ترمذی صاحب وکیل کم اور سیاست داں زیادہ ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انہیں خبروں میں رہنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک مقامی اخبار میں وہ کالم نویسی بھی فرماتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے، انہوں نے آپ کا کیس لے کیسے لیا۔ ان کی تو دیگر سیاسی مصروفیات ہی اتنی زیادہ ہیں کہ اس قسم کے چھوٹے موٹے کیسوں میں وہ ہاتھ ہی نہیں ڈالتے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک تو وہ میرے کیس کے سلسلے میں ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ انہوں نے میرا معاملہ اپنے ایک اسسٹنٹ وکیل کے حوالے کر رکھا ہے......" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ترمذی صاحب سے ان کے آفس ہی میں دو چار مرتبہ میری ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے جب بھی اپنے کیس کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تو بڑی سنجیدگی سے یہ کہہ دیتے ہیں...... فیصل صاحب! آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔ آپ کا کیس میرے ذہن میں ہے۔ میں بس ایک بار عدالت جاؤں گا اور ایک جملہ بولوں گا۔ اسی وقت اس کیس کا فیصلہ ہوجائے گا لیکن وہ ایک دن آکر نہیں دے رہا جب وہ عدالت میں پہنچ کر وہ تاریخ ساز جملہ بولیں گے......"

"اب تک آپ کے کیس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوچکا اسے بھول جائیں۔ میں کل عدالت جاکر آپ کے کیس کی اسٹڈی کرلوں گا۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "آپ مجھے اپنے کیس کا نمبر، اندراج کی تاریخ، ماتحت عدالت اور آخری پیشی کی تاریخ نوٹ کرادیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتادیں کہ آئندہ پیشی کب ہے......؟"

اس نے آئندہ پانچ منٹ میں، میری مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔ میں مزید پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر فیس وصول کرنے کے بعد اسے رخصت کردیا۔

◆◆◆

فیصل سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق، جب سفینہ روٹھ کر میکے جابیٹھی تھی تو اس نے اسے واپس لانے کے لیے ہر وہ جتن کرڈالا تھا جو اس کے بس میں تھا۔ سمجھانے بجھانے سے لے کر منت سماجت تک ہر حربہ آزما لیا گیا لیکن اسے ایک ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔ سفینہ اور اس کی ماں سلطانہ بیگم "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کی عملی تفسیر بن کر رہ گئی تھیں۔ فیصل کے پاس اس تحریری معاہدے کی نقل موجود تھی جو سلطانہ بیگم نے سفینہ کی شادی سے قبل فیصل سے ایک اسٹامپ پیپر پر تیار کرایا تھا۔ اس معاہدے کے مندرجات فیصل کے حق میں جاتے تھے کیونکہ وہ اپنی بیوی کو واپس لے جانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے یونین کونسل میں اپنا مسئلہ پیش کردیا۔

یونین کونسلر نے فیصل کو حق بہ جانب ٹھہراتے ہوئے سفینہ کو اس کے ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی لیکن سلطانہ بیگم نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یونین کونسل کے فیصلے کو مسترد کردیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ایما پر بعض غنڈا صفت لوگوں نے فیصل کو دھمکیاں دینا بھی شروع کردیں۔ اس صورت حال نے فیصل کو بوکھلا کر رکھ دیا اور اس نے اپنے ایک مخلص دوست سے تذکرہ کیا۔ اس کا مذکورہ دوست خاصا چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا اور بڑی حد تک وہ فیصل کے خانگی حالات سے واقفیت بھی رکھتا تھا۔ اس نے فیصل کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ بتاؤ، تم نے ابھی تک بھابی کو طلاق تو نہیں دی نا؟"

"میری ساس کی کوشش تو یہی ہے کہ میں یا تو اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں یا پھر دوسری بیوی کو بھول جاؤں۔" فیصل نے اپنے دوست کے سوال کے جواب میں بتایا۔ "لیکن میں نے ابھی تک ان دونوں میں سے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا۔"

"گویا سفینہ بھابی ابھی تک تمہارے نکاح میں ہیں۔" دوست نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔ "وہ تمہاری بیوی ہیں؟"

"بالکل...... اس میں کیا شک ہے۔" فیصل نے پورے تیقن سے جواب دیا۔

دوست ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" فیصل بھونچکا نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

"لیاقت آباد چلتے ہیں۔" دوست بڑے عزم سے بولا۔ "تمہاری سسرال میں۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے لباس میں سے ایک خطرناک گن برآمد کرلی۔ فیصل نے ہراساں انداز میں پوچھا۔ "تم...... تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"تم میرے ساتھ چلو۔ ہم ابھی بھابی کو لے کر آرہے ہیں۔" دوست خوفناک انداز میں گن کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "جس سالے سسر نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی اس کی لاش گرادوں گا۔"

فیصل اپنے دوست کے تیور دیکھ کر سہم گیا، جلدی سے بولا۔ "ابھی اس قسم کی جارحانہ کارروائی کی ضرورت نہیں۔"

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے فیصل!" وہ سنگین لہجے میں بولا۔ "تم نے شرافت اور انسانیت کا ہر کلیہ قاعدہ استعمال کرکے دیکھ لیا نا۔ یہ گھی سیدھی انگلی سے نکلنے والا نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ پھر دیکھو، میں کس طرح اس معاملے کو نمٹاتا ہوں۔"

"نہیں...... نہیں......" فیصل نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "تم اپنے منصوبے کو چند روز کے لیے موقوف کردو۔ اگر تمہاری ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں ضرور زحمت دوں گا۔"

"چند دن......!" دوست نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "چند دن میں کیا ہونے والا ہے فیصل؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ......" فیصل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک صاحب ہیں...... فیضان۔ وہ ہم دونوں کے مشترکہ واقف کار ہیں۔ میں نے ان کو بیچ میں ڈالا ہوا ہے۔ وہ ہماری صلح کرانے کی کوشش کررہے ہیں۔ مجھے امید ہے فیضان صاحب کی بات سفینہ اور سلطانہ بیگم کی سمجھ میں آجائے گی۔"

"سب بے کار ہے فیصل۔" دوست نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہارا یہ کام ہوتا نظر نہیں آرہا۔ بہرحال......" اس نے معنی خیز انداز میں کندھے اچکائے اور بے پروائی سے بولا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔ میں کوئی زور زبردستی تھوڑی کرسکتا ہوں۔"

اپنے دوست کو تو فیصل نے کسی بھی نوعیت کی ہنگامی کارروائی سے روک دیا تھا لیکن فیضان پر وہ اندھا اعتماد کیے ہوئے تھا۔ فیصل بنیادی طور پر ایک شریف اور صلح جو انسان تھا۔ ہر شریف آدمی عموماً بزدل واقع ہوا ہے۔ وہ دنگا فساد اور افراتفری کے کاموں سے دامن چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال فیصل کا بھی تھا۔ اس نے ایک مخلص اور جذباتی دوست کا ساتھ دینے سے تو انکار کردیا تھا تاہم وہ فیضان پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کررہا تھا جبکہ فیضان اس سے زیادہ مخالف پارٹی کا وفادار تھا۔ وہ فیصل کی زبان سے نکلنے والی ایک ایک بات سلطانہ بیگم تک پہنچا رہا تھا۔ جب فیضان کی اصلیت فیصل پر کھلی تو پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ اس نے فی الفور فیضان سے قطع تعلق کرلیا۔ تاہم فیضان کی ذات سے فیصل کو جو نقصان پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا تھا۔ اسی فتنہ پروری کے باعث یہ کیس عدالت تک پہنچا تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ اس معاملے میں مسلسل ناکامیابی کے بعد فیصل نے ایک سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ سفینہ کو واپس اپنے گھر لانے کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سفینہ واپس آجاتی تو اس کے ساتھ ہی عائشہ کو بھی آنا پڑتا۔ اسٹامپ پیپر پر تحریر شدہ معاہدہ اس سلسلے میں فیصل کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا تھا لیکن قبل اس کے کہ فیصل اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتا، دوسری جانب سے پہل کردی گئی تھی۔

فیصل نے اپنے منصوبے سے فیضان کو بھی تفصیلاً آگاہ کردیا تھا۔ فیضان نے اس کے ارادے کی تائید بھی کی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی فیضان نے مخالف پارٹی کو فیصل کے منصوبے کے بارے میں بتادیا تھا۔ اگر فیصل اپنی بیوی اور بچی کے حصول یا واپسی کے لیے پہلے عدالت سے رجوع کرلیتا تو یقیناً اس کا پلا بھاری رہتا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ فیصل اپنی سوچ کو عملی شکل دینے کی منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا کہ سفینہ کی جانب سے خلع کا کیس دائر کردیا گیا۔

یہ صورت حال اس حوالے سے فیصل کے لیے سودمند تھی کہ خلع مانگنے کی صورت میں سفینہ کو مہر سمیت اپنے تمام تر حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا لیکن اس کے ساتھ ہی تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ خلع کی ڈگری ہوجانے کے بعد سفینہ، فیصل کے ہاتھ سے نکل جاتی اور یقیناً عائشہ بھی اس کے ساتھ ہی جاتی۔ چنانچہ فیصل نے چائلڈ کسٹڈی کے لیے کیس فائل کردیا تھا۔ جبکہ سفینہ کی جانب سے خلع کے علاوہ بچی کے اخراجات وغیرہ کا بھی کیس دائر تھا۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن ابھی تک تمام تر کیسز کی مد میں کوئی قابل ذکر کارروائی عمل میں نہیں لائی جاسکی تھی اور...... اب یہ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے آئندہ روز عدالت جاکر اس کیس کا بہ غور مطالعہ کرلیا پھر فیصل کو اپنے آفس بلاکر اس سے کچھ معلومات لیں اور نئے سرے سے اس کیس کی تیاری میں لگ گیا۔

◆◆◆

اگلی پیشی پر میں عدالت میں حاضر ہوا اور اپنا وکالت نامہ دائر کردیا۔ جج نے زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا کیونکہ

وکلا کی تبدیلی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں سمجھی جاتی۔ میرے وکالت نامہ دائر کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اب اس کیس کی پیروی میں کروں گا۔

اپنی باری پر میں نے دلائل کا سلسلہ شروع کیا۔ ”جنابِ عالی! یہ کیس حال ہی میں میرے ہاتھ آیا ہے لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس کی اسٹڈی کا بھرپور موقع مل گیا اور یہ جان کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ ایک معمولی سے کیس کو اتنے عرصے تک لٹکا کر رکھا گیا ہے میں سمجھتا ہوں، اس تاخیر کا ذمے دار صرف اور صرف وہ وکیل ہے جو مجھ سے پہلے مسٹر فیصل کی وکالت کر رہا تھا......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے اپنے دلائل جاری رکھے۔

”یور آنر! جیسا کہ معزز عدالت بہ خوبی جانتی ہے کہ میرے موکل کی سیکنڈ وائف مسماۃ سفینہ کی جانب سے خلع کا دعویٰ دائر کیا گیا ہے۔ میرے موکل نے مسماۃ سفینہ کو اپنے گھر میں بسانے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی۔ یہ معاملہ یونین کونسل سے ہوتے ہوئے اس عدالت تک پہنچا اور مسماۃ سفینہ کی طرف سے خلع کا مطالبہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے شوہر یعنی میرے موکل کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ اپنی تمام تر کوششوں میں ناکامی کے بعد میرا موکل بھی بالآخر اسی فیصلے پر پہنچا ہے کہ اگر مسماۃ سفینہ اس کی زندگی سے خارج ہونا ہی چاہتی ہے تو اب وہ بھی اسے روکنے کی تگ و دو نہیں کرے گا۔ گویا یہ کیس اپنے منطقی انجام کو پہنچتا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ اس بات کا مطالبہ کرنا مسماۃ سفینہ کے وکیل کا فرض بنتا ہے کہ خلع کا دعویٰ پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے لیکن میں اپنے کیس کو مدِنظر رکھتے ہوئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ چائلڈ کسٹڈی والا معاملہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب مسماۃ سفینہ اور مسمی فیصل کے بیچ پایا جانے والا تعلق کسی حتمی شکل کو اختیار کرلے لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ اس کیس کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کی جائے۔“

خلع کا دعویٰ چونکہ سفینہ کی جانب سے فائل کیا گیا تھا چنانچہ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں اس کا وکیل کسی قسم کی راہِ فرار اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے دعوے کے حق میں دلائل دینے پر مجبور ہوگیا۔

خلع کے کیسز کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں کی مار ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کیس کی ابھی تک ایک بھی باقاعدہ سماعت نہیں ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی وجہ سے معاملہ ٹل جاتا اور اگلی پیشی کے لیے تاریخ دے دی جاتی۔ آج پہلی مرتبہ ڈھنگ سے عدالتی کارروائی ہورہی تھی۔

کوئی بھی کام جب ڈھنگ سے کیا جائے تو اس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوتے ہیں لہٰذا اس دن کی سماعت کے اختتام پر عدالت نے سفینہ کو خلع دے دی۔ گویا اب وہ قانونی طور پر فیصل کی بیوی نہیں رہی تھی۔

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

”دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!“

◆◆◆

اب یہ کیس ایک مخصوص ٹریک پر آگیا تھا۔ فیصل کی دو سالہ بچی عائشہ اپنی ماں کی کسٹڈی میں تھی اور مجھے اسے وہاں سے نکال کر فیصل کی تحویل میں لانا تھا۔ آئندہ دو پیشیوں پر سفینہ نے دانستہ ایسا رویہ اپنایا کہ فیصل اپنی بچی کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ فیصل کی کمزوری سے بہ خوبی واقف تھی اور عائشہ کو وہ ایک خطرناک ہتھیار کے طور پر فیصل کے خلاف استعمال کررہی تھی۔

اس سے بعد کی دو پیشیوں پر فیصل، عائشہ سے مختصری ملاقات کرنے میں کامیاب تو رہا لیکن یہ ”ملاقاتیں“ جس نوعیت کی ہوتی ہیں اور جس قسم کے ماحول میں کرائی جاتی ہیں وہ افسوسناک ہونے کے علاوہ بچے کی نفسیات کے لیے بھی انتہائی ہولناک اور تباہ کن ہے۔ ایک میلے اور گندے سے کمرے میں باپ ڈھیروں کھلونے سجائے اپنی اولاد کے ساتھ ملن کی چند گھڑیوں میں سے سکون اور خوشی کو کشید کرنے کی کوشش میں لایعنی اور عجیب و غریب حرکتیں کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی سمندر سے زیادہ گہری اور آسمان سے زیادہ وسیع و عریض محبت کو چند لمحات میں اپنے جگر گوشے پر نچھاور کرنا چاہتا ہے اور اس کی یہ کوشش دیکھنے والوں کو بڑی بھونڈی نظر آتی ہے۔ بچے کے قریب ہی ایک جانب اس کی ماں اپنے سابق شوہر سے منہ موڑے بیٹھی غم و غصے اور اکتاہٹ کی تصویر بنی دکھائی دیتی ہے۔ اس پر مستزاد خوفناک چہروں والے پولیس اہلکار جن کی نگرانی میں یہ ملاقات کرائی جارہی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ متوحش اور قابلِ رحم وہ بچہ نظر آتا ہے۔ اس کا معصوم دماغ اور پھول سوچ یہ سمجھنے سے قاصر رہتی ہے کہ والدین کے ان اختلافات میں آخر اس کا قصور کیا ہے۔ ماں نے اس کے باپ کو اور باپ نے اس کی ماں کو اس کے کس گناہ کی پاداش میں اس سے چھین لیا ہے۔ اگر کوئی بھی صاحبِ دل مرد یا عورت بچے کی

حالت کو آنکھوں سے دیکھ لے تو زندگی میں کبھی اپنے شریکِ حیات سے الگ ہونے کے بارے میں نہ سوچے۔ میں نے اہلِ دل والدین کی بات کی ہے، انسان نما چلتی پھرتی مشینوں کی نہیں۔

اگلی پیشی پر میں نے اس انتہائی نازک اشیو کو جج کے سامنے اٹھایا۔ ”جنابِ عالی!“ میں نے نہایت ہی احترام کے ساتھ کہا۔ ”ہماری عدالتوں میں بچوں کی ان کے والدین سے ملاقات کے لیے جو ماحول اور طریقہ کار سال ہا سال سے رائج ہے وہ بہت ہی شرمناک اور غیر انسانی ہے۔ اس مقصد کے لیے عدالت کے احاطے میں ایک پلے لینڈ بنایا جاسکتا ہے جہاں کے پُرسکون ماحول اور خوشگوار فضا میں یہ ملاقات یادگار کی حیثیت اختیار کرسکتی ہے۔“

جج نے میری تجویز پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، محض سر ہلانے پر اکتفا کیا اور منتظر نگاہ سے مجھے تکنے لگا کہ میں آگے کچھ بولوں۔

میں نے کہا۔ ”یور آنر! جیسا کہ عدالت جانتی ہے، میرے موکل مسٹر فیصل نے دوسری شادی ایک خاص مقصد کے تحت کی تھی۔ پہلی بیوی سے اس کی اولاد نہیں تھی۔ دوسری شادی کے موقع پر میرے موکل اور اس کی سابق بیوی کی ماں سلطانہ بیگم کے درمیان باقاعدہ اسٹامپ پیپر پر ایک معاہدہ تحریر کیا گیا تھا۔ اس تحریر کے اندر بھی دوسری شادی کی وجوہ کا ذکر موجود ہے......“ میں نے توقف کر کے وکیلِ مخالف کی جانب دیکھا اور سلسلۂ دلائل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس معاہدے کی کاپی کیس فائل کے اندر لگی ہوئی ہے۔ میرے موکل نے ہر قدم پر اس معاہدے کی پاسداری کی ہے اور عدالت یہ بھی جانتی ہے کہ خلع والے معاملے سے پہلے تک میرے موکل کی پہلی اور آخری کوشش یہی رہی تھی کہ کسی طرح مصالحت ہوجائے۔ وہ اپنی بیوی اور بچی کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن دوسری جانب تو نہایت ہی منصوبہ بندی کے ساتھ میرے موکل کو کارنر کیا جارہا تھا۔“

میں ایک مرتبہ پھر رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”یور آنر! میرے موکل کی سیکنڈ وائف اور اس کی والدہ سلطانہ بیگم کے دل میں پہلے ہی سے کھوٹ تھا۔ سفینہ اس وقت تک بڑی کشادہ دلی سے مسٹر فیصل کی پہلی بیوی کو برداشت کرتی رہی جب تک وہ امید والی نہیں ہوگئی۔ اس کے اندر امید کی کرن جاگتے ہی ماں بیٹی کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی۔ سفینہ ایسی اپنے میکے آئی کہ پھر جانے کا نام ہی نہیں لیا۔ اس کی والدہ سلطانہ بیگم کا ایک ہی مطالبہ رہا کہ پہلے فیصل اپنی فرسٹ وائف کو طلاق دے، پھر سفینہ اس کے گھر جائے گی۔ فیصل کے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ وہ ایک معقول، سمجھ دار اور متوازن شخص ہے۔ اس نے ان ماں بیٹی کے مطالبے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا اور سفینہ کی واپسی کی کوششوں میں مصروف رہا تاہم یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اب یہ دونوں ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے۔ سفینہ سے فیصل کا ہر تعلق اور رشتہ ختم ہوچکا ہے لیکن عائشہ تو فیصل کی بیٹی ہے۔ یہ رشتہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا لہٰذا......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر روئے سخن جج کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

”لہٰذا...... معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ معصوم عائشہ کو میرے موکل فیصل کی تحویل میں دیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر......!“

وکیلِ مخالف اٹھ کر کھڑا ہوا اور استہزائیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جنابِ عالی! میرے فاضل دوست نے اپنی خوش کلامی کے آغاز پر بچوں کی اپنے والدین سے ملاقات کے سلسلے میں جو گراں قدر تجاویز دی ہیں ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن موصوف شاید اس خطے اور اس قوم کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ ہم بہت مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ شہنشاہ، شاہ جہاں کی چہیتی بیوی زچگی کے دوران چل بسی تھی۔ شاہ جہاں اپنی اس بیوی سے بے اندازہ اور طوفانی محبت کرتا تھا۔ اس کی یاد میں شاہ جہاں نے سلطنت کا تمام تر خزانہ پانی کی طرح بہا کر تاج محل تعمیر کرایا تھا۔ شاہ جہاں ہی کے زمانے میں کسی انگریز کی بیوی بھی زچگی کے دوران میں زندگی ہار گئی تھی۔ وہ انگریز بھی اپنی بیوی کو بے پناہ چاہتا تھا۔ اس نے بیوی کی یادگار کے طور پر کوئی تاج محل کھڑا نہیں کیا بلکہ فوری طور پر ایک میٹرنٹی ہوم قائم کردیا تاکہ زچگی کے دوران میں عورتوں کی زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ بچانے کی کوشش کی جاسکے......“ وہ اس واقعے کو سنا کر متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یور آنر! ہم لوگ بنیادی طور پر مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ زندگی میں انسانوں کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور موت کے بعد ان کے مقبرے اور مزار تعمیر کر ڈالتے ہیں۔ اگر میرے فاضل دوست کی تجویز کے مطابق بچوں کے لیے کوئی ویسا پلے لینڈ بنا بھی لیا گیا تو سب جانتے ہیں اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ جس طرح میرے ہم پیشہ دوست کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے تجویز

گروہ پلے لینڈ کا کیا انجام کیا ہوگا اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ایک دوسالہ بچی کو ماں سے چھین کر باپ کی تحویل میں دینا سراسر ناانصافی اور غیرانسانی عمل ہوگا...... ایک معصوم بچہ اپنی ماں کے ساتھ ہی خوش رہ سکتا ہے۔“

وکیل مخالف گھما پھرا کر بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ ایک آسان سی بات کہنے کے لیے اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا ڈالے تھے۔ میں نے اس کی اس کوشش پر مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور جواباً کہا۔

”میں اپنے فاضل دوست کی تقریر دل پذیر سے بہت متاثر ہوا ہوں اور ان کے اٹھائے ہوئے اس پوائنٹ سے بھی مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ ایک معصوم شیرخوار بچے کے لیے اس کی ماں کی آغوش سب سے محفوظ پناہ گاہ ہے لیکن اگر اسی آغوش مادر میں اچانک ببول کی جھاڑی نمودار ہوجائے تو ماں پہلی فرصت میں اپنے بچے کو گود سے نکال باہر کرے گی۔ ایک ماں اپنے لخت جگر کو ایک معمولی سا کانٹا چبھنے کی تکلیف کا تصور نہیں کرسکتی کجا یہ کہ ببول کی پوری جھاڑی......!“ میں نے رک کر ایک جھرجھری لی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن سفینہ جیسی بعض مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں اپنی آغوش میں اگ آنے والی ببول کی جھاڑی کا مطلق احساس ہوتا ہے اور نہ ہی ادراک۔ وہ اپنی اندھی محبت میں بچے کو گود میں بھینچے بیٹھی رہتی ہیں اور ان کی اس حماقت نما چاہت سے معصوم بچے کا بدن لہولہان ہوجاتا ہے لہٰذا......“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد یوں اضافہ کیا۔

”لہٰذا ایسی پاگل اور عقل کی اندھی ماؤں کو اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ پہلی فرصت میں ان کی زہریلی گود میں سے بچے کو نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کردینا چاہیے۔“

”آپ...... آخر...... کہنا کیا چاہ رہے ہیں......؟“ وکیل مخالف کی بکھری ہوئی آواز ابھری۔ ”سفینہ کی آغوش میں ببول کی جھاڑی کہاں سے آگئی؟“

”یہ جھاڑی صرف انہی لوگوں کو نظر آسکتی ہے جو دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہوں۔“ میں نے وکیل مخالف کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تو آپ کا خیال ہے، میری آنکھیں نہیں ہیں......؟“ وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا میرے فاضل دوست!“

”پھر......؟“ اس کی حیرت الجھن میں بدل گئی۔

جج نے اس موقع پر مخل ہونا ضروری جانا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے، ٹھہرے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”بیگ صاحب! ببول کی جھاڑی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ذرا اس کی وضاحت کردیں......؟“

”اوکے سر!“ میں نے سر کو تعظیمی انداز میں جنبش دی پھر نہایت ہی سنجیدگی سے بولنا شروع کیا۔

”جناب عالی! ببول کی جھاڑی اور مسماۃ سفینہ کی آغوش کو میں نے محض سمجھانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جیسے اشاروں کنایوں میں سمجھانے کے لیے مختلف اشیاء سے مدد لی جاتی ہے لیکن صد افسوس کہ میرے فاضل دوست نے میری بات کو سمجھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں ذرا سی بھی کوشش کی ہوتی تو ان کے ذہن میں یہ سوال ابھر ہی نہیں سکتا تھا جو انہوں نے مجھ سے کیا ہے......“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ وضاحت کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! ان تمام تر تمثیلات سے میں صرف ایک حقیقت کو سامنے لانا چاہتا ہوں کہ معصوم عائشہ کے لیے اس کی ماں کی آغوش اور اردگرد کا ماحول انتہائی مہلک اور زہریلا ہے۔ اگر وہ ننھی جان اس جان لیوا فضا میں سانس لے کر پروان چڑھی تو اس کے ذہن اور نفسیات پر انتہائی خطرناک اور برے اثرات مرتب ہوں گے، آگے چل کر جن کا علاج ممکن نہیں رہے گا اسی لیے...... اسی لیے میں بہ صد اصرار معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ ننھی عائشہ کو اس کے باپ مسٹر فیصل کی تحویل میں دیے جانے کے احکام صادر کیے جائیں۔ اس گھر میں فیصل کی پہلی بیوی فرزانہ موجود ہے۔ وہ بڑی ذمے داری اور احتیاط کے ساتھ عائشہ کو سنبھال لے گی۔“

جج نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔

اسی لمحے وکیل مخالف کی طنز میں بجھی ہوئی آواز عدالت کے کمرے میں ابھری۔ ”واہ وا...... سبحان اللہ! میرے فاضل دوست نے کیا خوب تجویز پیش کی ہے۔ ایک معصوم دوسالہ بچی کو اس کی سگی ماں سے چھین کر ایک ایسی عورت کی گود میں ڈال دیا جائے جو درحقیقت اس کی ماں کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ اس قسم کی صلاح کاہے کو سننے کو ملی ہوگی......!“

جج نے وکیل مخالف کے آبجیکشن کو سرے سے نظر انداز کردیا اور بہ دستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

”بیگ صاحب! آپ نے سفینہ کی آغوش اور اس کے گھر کے ماحول کو انتہائی مہلک اور زہریلا قرار دیا ہے۔ عدالت آپ کے بیان کی وضاحت چاہتی ہے؟“

”یور آنر!“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب والدین میں علیحدگی کا کوئی کیس عدالت میں جاتا ہے تو عدالت اور انصاف کی نظر مائنر پر فوکس ہوتی ہے۔ دونوں جانب کے بیانات اور دونوں پارٹیوں کے وکلا کے دلائل کو سننے کے بعد عدالت اس پارٹی کے حق میں فیصلہ دیتی ہے جو مائنر کے لیے زیادہ مفید ہو۔ ایم آئی رائٹ سر؟“

میں نے توقف کرکے سوالیہ نظر سے جج کی جانب دیکھا تو وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ”یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ......!“

”تھینک یو سر!“ میں نے سر کی خفیف سی جنبش سے جج کا شکریہ ادا کیا پھر اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! جب مائنر کے مفادات کا ذکر ہوتا ہے تو اس میں مائنر کی صحت، خوراک، تعلیم، تربیت، پرورش اور نشوونما کو سرفہرست گردانا جاتا ہے یعنی مائنر کے ماں باپ میں سے جو کوئی بھی اسے یہ تمام تر چیزیں زیادہ بہتر انداز میں مہیا کرسکتا ہو، فیصلہ اسی کے حق میں سنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد گھر کا ماحول، علاقے کی فضا اور آب وہوا کا نمبر آتا ہے......“ میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ٹٹولتی ہوئی نظر سے وکیل مخالف کی جانب دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ میرے موکل مسٹر فیصل کی معاشی اور معاشرتی حالت مسماۃ سفینہ کی بہ نسبت دوسو گنا زیادہ بہتر اور مضبوط ہے۔ مسٹر فیصل اور ان کی مسز فرزانہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ ہیں۔ وہ دونوں مل کر ننھی عائشہ کو بہتر خوراک، عمدہ صحت اور اعلیٰ تعلیم دے سکتے ہیں پھر مسٹر فیصل، مسماۃ سفینہ کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے اور صحت افزا علاقے میں رہتے ہیں جہاں ننھی عائشہ کی زیادہ بہتر انداز میں تربیت کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی نہایت ہی اہم پہلو بھی ہے جناب عالی......!“ میں ڈرامائی انداز میں بولتے بولتے تھم گیا۔

”کون سا پہلو......؟“ وکیل مخالف کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

جج نے بھی دلچسپی لیتے ہوئے اصرار کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ کس پہلو کا تذکرہ کررہے ہیں؟“

”جناب عالی!“ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے ابھی جس پہلو کا تذکرہ کیا ہے اس کی وضاحت کے لیے مسماۃ سفینہ کا عدالت میں موجود ہونا ضروری ہے۔ میں ان سے چند نہایت ہی اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

اتفاق سے اس روز سفینہ عدالت نہیں آسکی تھی۔ جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ جج نے وکیل مخالف کو ہدایت کی کہ آئندہ پیشی پر مسماۃ سفینہ کو عدالت میں پیش کیا جائے۔ وکیل مخالف نے جج کے احکامات کی تعمیل کا یقین دلایا تو جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

◆◆◆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں عائشہ کی والدہ اور میرے موکل کی سابق، دوسری بیوی سفینہ کھڑی تھی۔ سفینہ ایک قبول صورت اور چالاک عورت تھی۔ اس وقت وہ انتہائی سنجیدہ اور چپ چپ نظر آرہی تھی۔

جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور سفینہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”سفینہ صاحبہ! میں آپ کے ماضی بعید میں جھانکنے کی کوشش نہیں کروں گا تاہم ماضی قریب کا تذکرہ کیے بغیر حال کے بارے میں گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوگا لہٰذا میں چند ایسے سوالات کرنے پر مجبور ہوں جو ہوسکتا ہے، آپ کو پسند نہ آئیں یا ناگوار گزریں......“

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی، خاموش نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔

میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”سفینہ صاحبہ! کیا یہ درست ہے کہ شادی سے پہلے آپ ایک ایسے ادارے میں کام کرتی تھیں جہاں کام کے سلسلے میں آپ کے سابق شوہر فیصل کا آنا جانا تھا؟“

”جی ہاں یہ درست ہے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیا یہ بھی صحیح ہے کہ وہیں پر آپ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ دونوں میں پیدا ہونے والی انڈراسٹینڈنگ نے رنگ دکھایا اور بالآخر آپ شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”جب آپ کے وجود میں امید کی کرن جاگی تو آپ کے سابق شوہر فیصل نے آپ سے عارضی طور پر وہ جاب

چھڑوا دی تھی۔ ”میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے طویل رخصت لے لی تھی حالانکہ شادی کے بعد آپ نے جاب کا سلسلہ جاری رکھا تھا......؟“

”جی ہاں، آپ جو بھی فرما رہے ہیں وہ سو فیصد درست ہے۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

”اور یہ بھی درست ہے کہ آپ آج کل بھی وہ جاب کر رہی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”عائشہ کی پیدائش کے بعد کچھ عرصہ آپ نے آرام کیا تھا پھر جاب کو کنٹینیو کر لیا تھا؟“

”جی ہاں......!“ اس نے مختصراً بتایا۔

”گویا ایک معصوم اور دودھ پیتی بچی اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں اپنی ماں سے بچھڑ گئی تھی۔“ میں نے چبھنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ سارا دن آفس میں ہوتی تھیں اور بے چاری عائشہ گھر میں آپ کے بغیر...... بلکہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے...... ہیں نا؟“

”اگر میں جاب کے لیے گھر سے نکلتی ہوں تو یہ میری مجبوری ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور یہ غلط ہے کہ عائشہ میری غیر موجودگی میں گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ گھر میں اس کا خیال رکھنے کے لیے کئی افراد ہوتے ہیں۔“

”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ ننھی عائشہ کو گھر میں تنہا چھوڑ کر جاب کے لیے چلی جاتی ہیں بلکہ میرے الفاظ تھے...... آپ سارا دن آفس میں ہوتی تھیں اور بے چاری عائشہ گھر میں آپ کے بغیر......!“

”ہاں...... شاید آپ نے ایسا ہی کہا تھا۔“ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

”شاید نہیں، یقیناً میں نے ایسا ہی کہا تھا۔“ میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”اپنے لختِ جگر کو گھر میں چھوڑ کر آپ نوکری پر چلی جاتی ہیں اور گھر میں موجود افراد اس کا بہت خیال رکھتے ہیں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب...... یہی حقیقت ہے۔“

”کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے اور عائشہ کے سوا گھر میں اور کتنے افراد رہتے ہیں؟“ میں نے غیر محسوس انداز میں اسے گھسنا شروع کیا۔

”چار افراد......“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی آپ کی امی، آپ کے ابو، آپ کی بڑی بہن اور آپ کا بھائی؟“

”جب آپ کو سب کچھ معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟“ وہ بیزاری سے بولی۔

”سفینہ صاحبہ! میرے ذہن میں موجود معلومات یہ عدالت تسلیم نہیں کرتی۔“ میں نے زیرِ لب مسکرا ہوئے کہا۔ ”جب آپ یہاں موجود ہیں تو آپ کی زبانی کر عدالت کو زیادہ پختہ یقین آئے گا......“

وہ کچھ نہ بولی وٹنس باکس میں کھڑے کھڑے پہلو بدل کر رہ گئی۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھ ہوئے سوال کیا۔

”سفینہ صاحبہ! آپ نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جاب کے لیے گھر سے نکلنا آپ کی مجبوری ہے۔ کیا یہ مجبوری انہی چار افراد کی سے ہے؟“

”میں سب سے پہلے اپنی اور عائشہ کی زندگی کے لیے گھر سے نکلتی ہوں۔“ وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”باقی سب اس کے بعد آتے ہیں۔“

”آپ کے والد تصدق حسین کیا کام کرتے ہیں؟“ میں نے اچانک پوچھ لیا۔

”وہ رنگ و روغن وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن اکثر ان کی صحت خراب رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک دن کام پر جاتے ہیں تو تین دن چھٹی کرتے ہیں؟“

”یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔“ وہ سرسری لہجے میں بولی۔

”آپ کو اپنی امی، ابو بھائی اور بہن سے بہت محبت ہے نا؟“

”جی ہاں...... اس میں کیا شک ہے......!“

”آپ کو جاب کے لیے اس لیے بھی گھر سے نکلنا پڑتا ہے کہ اس گھر کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یہ حقیقت ہے اور...... اس میں غلط کیا ہے؟“ وہ الٹا مجھی سے سوال کر بیٹھی۔ ”اپنے والدین کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔“

”جی ہاں...... بالکل بالکل۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے آپ کے جذبے کی سچائی پر کوئی شک ہے اور نہ ہی اعتراض۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”آپ کے چھوٹے بھائی نوید کو دیکھ کر آپ کا دل کڑھتا رہتا ہے نا......؟“

”جی...... میں اس کے لیے بہت پریشان رہتی ہوں۔“

”غلط صحبت انسان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”وہ کتنا خو

صورت اور [illegible] جسم تو جوان تھا۔“

”جی ہاں...... نشے نے نوید کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا کر رکھ دیا ہے۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔

”سفینہ صاحبہ!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے کہنا تو نہیں چاہیے کیونکہ یہ خالصتاً آپ کا گھریلو معاملہ ہے مگر...... کیا یہ سچ ہے کہ نوید نشے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اکثر گھر سے مختلف اشیا بھی چوری کرتا رہتا ہے......؟“

”جی ہاں۔“ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ”بعض اوقات اس قسم کے واقعات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔“

”سفینہ صاحبہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ درست ہے کہ میں آپ کا مخالف وکیل ہوں لیکن اس کے باوجود بھی میں آپ کی ہمت اور برداشت کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتا......“

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وکیلِ مخالف اور حاضرینِ عدالت کی نظریں بھی مجھی پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نہایت ہی غیر محسوس انداز میں جملہ جملہ اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ سفینہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استفسارات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نوید کی حالت تو اپنی جگہ ایک افسوس ناک اور تکلیف دہ حقیقت ہے ہی لیکن پچھلے کچھ عرصے سے زرینہ بھی آپ کے گھر میں قیام پذیر ہے اور اب اسے زندگی بھر وہیں رہنا ہے۔“

”کیا کر سکتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ دکھی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جس خدا نے ہمیں مصیبت میں ڈالا ہے وہی اس مصیبت سے نکالے گا بھی۔“

”زرینہ آپ سے کتنے سال بڑی ہے؟“ میں نے جرح کے سلسلے میں یک دم تیزی لاتے ہوئے سوال کیا۔

میری معلومات کے مطابق، زرینہ سفینہ کی بڑی بہن تھی۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ”باجی مجھ سے چار سال بڑی ہیں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی زرینہ باجی کو ان کے ایک خطرناک مرض کے باعث طلاق ہوئی ہے؟“ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”باجی کی بیماری تو اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔“ وہ اٹل انداز میں بولی۔

”لیکن میں سمجھتی ہوں، باجی کی طلاق میں ان کے سابق شوہر کی کم ظرفی اور بے حسی کا زیادہ ہاتھ تھا۔“

”کیا مطلب......؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرے سابق بہنوئی کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر باجی کسی ذہنی اور نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو ہی گئی تھیں تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ باجی کا پراپر علاج کراتے۔ اب دیکھیں، ہم بھی تو انہیں مہنگے ڈاکٹروں کو دکھا ہی رہے ہیں......“

”میں نے تھوڑی دیر پہلے اسی لیے تو کہا تھا کہ آپ بہت ہمت والی ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”سفینہ صاحبہ! کیا یہ درست ہے کہ زرینہ باجی کو آپ ہی ایک معروف نفسیاتی اسپتال لے کر جاتی ہیں؟“

”جی ہاں، یہ درست ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور جب اس نفسیاتی اسپتال میں آپ کی زرینہ باجی کو الیکٹریکل شاکس لگائے جاتے ہیں اور ان کی کیفیت کو دیکھ کر آپ کا کلیجا منہ کو آنے لگتا ہے......؟“

”ج...... جی...... مجھے ان کی حالت دیکھ کر بہت اذیت پہنچتی ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ”باجی کی بے بسی پر میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔“

”اکثر انہیں گھر میں بھی دماغی دورے پڑتے ہیں؟“

...... سفینہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور آپ کی زرینہ باجی کی وجہ سے پورے گھر کا سکون درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے......؟“ میں نے جرح کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے پوچھا۔

”ظاہر ہے......!“ اس نے مختصر الفاظ میں تصدیق کر دی۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”جنابِ عالی! جس مختصر سے گھر میں مسائل اور مصائب کا میلا لگا ہو وہاں دو سالہ ایک معصوم بچی کی کیا خاک تعلیم و تربیت ہو سکے گی۔ وہ اپنے ماموں کی نشے کی عادت سے کیا سیکھے گی، اپنی خالہ کو دماغی دورے کی حالت میں پا کر اس کے معصوم دماغ پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور...... اور جس ماں کا یہ مطالبہ ہے کہ ننھی عائشہ کو اس کی تحویل میں دیا جائے اس کے پاس تو اپنے بال سنوارنے کی فرصت نہیں، وہ اپنی بچی کا کیا خیال رکھے گی اور اس کی نگہداشت کب کرے گی۔ اسے تو ایک گھر میں

دو دو مریضوں کو سنبھالنا ہے، بوڑھے والدین کی بھی دیکھ بھال کرنا ہے اور اس گھر کی معاشی گاڑی کو چلانے کے لیے آٹھ گھنٹے کی ایک جاب بھی کرنا ہے......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! حالات و واقعات کی روشنی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مائنر یعنی ننھی عائشہ کو اس کے درخشندہ حال اور تابناک مستقبل کی خاطر اس کے باپ یعنی میرے موکل فیصل کی تحویل میں دیا جائے...... دیٹس آل یور آنر!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

◆◆◆

آیندہ پیشی پر نہایت ہی مختصر سی کارروائی کے بعد عائشہ کو اس کے باپ فیصل کی تحویل میں دینے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔

میں نے پچھلی پیشی پر اپنے دلائل کی طاقت سے معزز عدالت کو یہ باور کرا دیا تھا کہ ننھی عائشہ کا مستقبل صرف اور صرف میرے موکل فیصل ہی کے پاس محفوظ رہ سکتا ہے لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ اس کیس کا فیصلہ فیصل کے حق میں آئے اور...... ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

اس روز اس کیس سے متعلق تمام افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ فیصل کو اس جیت پر بے تحاشا خوش و خرم دکھائی دینا چاہیے تھا لیکن جب وہ مجھے انتہائی سنجیدہ نظر آیا تو میں چونک اٹھا۔

"کیا بات ہے فیصل۔" میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "تمہیں کیس جیتنے کی خوشی نہیں ہوئی......؟"

"یقیناً بہت خوش ہوں۔" وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ پھر میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "بیگ صاحب! میں جج صاحب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے اسے گھورتا رہا پھر اس کی خواہش کو جج تک پہنچا دیا۔

فیصل وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا۔ جج سمیت عدالت میں موجود ہر شخص کی نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ چند لمحات تک وہ متذبذب نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سر!" اس کا مخاطب جج تھا۔ "میں ایک انسان ہوں اور میرے سینے میں ایک انسانی دل ہے جس میں زیادہ نہ سہی مگر تھوڑی بہت انسانیت ضرور پائی جاتی ہے اور اسی انسانیت نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کیا ہے......" وہ رکا، تھوک نگل کر حلق کو تر کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھا ہوئے بولا۔

"یہ ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت ہے کہ اب سفینہ میر بیوی نہیں رہی لیکن اس سے بھی بڑی اور اہم ایک حقیقت ہے کہ وہ اب بھی عائشہ کی ماں ہے۔ خدا کے بعد اس میں کسی بھی بچے کے لیے سب سے اہم رشتہ اس کی ماں ہوتا ہے۔ ایک معصوم دو سالہ ننھی سی بچی کو اس کی ماں سے کر دینا میری نظر میں کائنات کا سب سے بڑا جرم اور سنگین گناہ ہوگا......"

"لیکن......!" جج نے بے حد تعجب سے فیصل طرف دیکھا۔ "مسٹر فیصل! چائلڈ کسٹڈی کا کیس آپ طرف سے دائر کیا گیا تھا اور اس کیس کا فیصلہ بھی آپ کے حق میں ہو چکا ہے اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ بچی کو اس ماں سے جدا کرنا ناانصافی ہوگی؟"

"جی...... میرا یہی مطلب ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ "اور اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

"کیسی تجویز......؟" جج نے پوچھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ اس کیس کا فیصلہ میرے حق میں ہوا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور میں اپنی بچی اپنی تحویل میں رکھنے کا حق رکھتا ہوں لیکن میں یہ چاہوں گا کہ عائشہ ایک ماہ میرے پاس رہے اور ایک ماہ اپنی ماں کے پاس۔ تاکہ اسے ماں اور باپ دونوں کی محبت اور شفقت ملتی رہے۔ جب یہ بچی سن شعور کو پہنچے تو یہ فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے کہ آگے چل کر اسے ماں کے ساتھ رہنا ہے یا باپ کے ساتھ...... عائشہ جو بھی فیصلہ کرے گی مجھے منظور ہوگا۔"

"واہ واہ...... سبحان اللہ......" عدالت کے کمرے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ہر شخص فیصل کے تجویز نما فیصلے کی تعریف کر رہا تھا۔ بڑا جذباتی منظر تھا۔ سفینہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بار بار عائشہ اور فیصل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں، ان لمحات میں صرف ایک ہی پچھتاوا تھا۔

"کاش! میں نے اتنے عظیم انسان کو نہ کھو ہوتا...... کاش!"

"کاش" ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کے بعد کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ سفینہ بھی اس وقت تہی دست و داماں نظر آ رہی تھی......!

(تحریر: حسام

روبی نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو ایک بھرے پُرے گھر میں پایا۔ دو تایا، دو تین چچا تھے پھر ان کے بچے تھے، گھر میں ہر وقت ہلا گلا رہتا تھا۔ وہ اپنے چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ دونوں بھائی اور ایک بہن اس سے چھوٹے تھے۔ بڑا ہونے کی وجہ سے اسے والدین، دادا، دادی اور نانا نانی کی محبت بھی زیادہ ملی۔ ویسے بھی وہ اچھی شکل کی تھی۔ بالکل چھوٹی عمر میں ہی اسے احساس تھا کہ وہ پیار کیے جانے کے قابل ہے۔ گورا رنگ، اچھے نقوش اور

انکشاف

طاہر جاوید مغل

اکثر چاہتوں میں دھوکا کھانا جان لیوا ثابت ہوتا ہے مگر جب... یہی عمل انسان کی بے خبری میں جاری ہو تو ایسی محبتوں میں دل قربان ہو جانے کو چاہتا ہے... گویا دونوں ہی صورتوں میں جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اسے بھی زندگی کے اس مقام پر شکست ہوئی جہاں ہارنے کا گمان تک نہ تھا۔ اسے اپنے انتخاب پر بہت غرور تھا لیکن آگاہی کے ان خاص لمحات نے اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا... وہ جو آسمانوں میں محوِ پرواز تھی اچانک مخالف ہواؤں کی زد میں آگئی... آگاہی کے فقط ایک لمحے نے اسے عرش سے فرش پر لا پھینکا۔

ایک فقیر کے بے ربط جملوں میں زندگی کی متلاشی ایک حسینہ کی خوش گمانیاں

سب سے زیادہ اس کی خوب صورت باتیں۔ وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اپنے ابو کی تو وہ جان تھی۔ ان کی گود میں بیٹھ کر ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی۔ ان کی سیاہ ڈاڑھی میں انگلیاں چلاتی اور ہر وقت ان پر اپنی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کی یلغار رکھتی۔ اس کے ابو دفتر میں ملازم تھے اور تنخواہ اتنی تھی کہ ایک چھوٹے گھرانے کی گزر بسر آسانی سے ہوسکتی تھی۔

اپنے کزنز کے ساتھ کھیلتے کودتے وہ اسکول کی عمر کو پہنچ گئی۔ وہ ایوریج اسٹوڈنٹ تھی لیکن اس میں پڑھنے اور خود کو بہتر کرنے کی لگن تھی۔ اسکول میں اس کی کارکردگی بہتر ہوتی تو وہ اندر سے کھل جاتی۔ ابو کو اپنی کارکردگی دکھانے میں اسے سب سے زیادہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ اسے اندر سے نہال کرڈالتی۔

بچپن اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں، چھوٹی چھوٹی خوشیاں، جھولوں پر چڑھنا، گرنا سنبھلنا، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا، آنکھ مچولی، باغوں کی سیریں، پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ وہ بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوگئی ہے۔ امی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔ ''روحی! یونہی چھلانگیں لگاتی بازار میں نہ جایا کر۔ کوئی چیز منگوانی ہو تو بھائی شکیل سے کہا کر۔''

اس نے پہلی بار خود کو آئینے میں غور سے دیکھا اور اسے لگا کہ وہ اب چھوٹی سی بچی نہیں ہے۔ اس نے اپنی کزن باجی فائزہ کی طرح بڑے انداز سے دوپٹا اپنے سر پر ڈال لیا اور خود ہی مسکرادی۔ اب گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اسے اندازہ ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں ردوبدل ہورہا ہے۔ اب وہ پہلے جیسی آزادی، بےفکری اور بھاگ دوڑ اس سے دور ہورہی تھی۔ اسے یہ تبدیلی اچھی نہیں لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ چڑ بھی جاتی۔ کیا بڑا ہونا کوئی گناہ ہے۔ کیا لڑکی ہونا کوئی جرم ہے۔ وہ اب بھی پہلے ہی جیسی ہے۔ اپنے کزنز کے ساتھ کرکٹ کھیل سکتی ہے۔ سائیکل چلاسکتی ہے، دھینگامشتی کرسکتی ہے اور وہ یہ سب کچھ کرنا بھی چاہتی تھی۔ اسے چھوئی موئی بن کر رہنا بالکل پسند نہیں تھا۔ چند کزنز نے تو لڑکپن میں ہی شرعی پردہ شروع کردیا تھا روحی کو اسکول میں پڑھنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ صاف ستھری یونیفارم پہن کر جب وہ اپنے بھائی اور ابو کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسکول جاتی تو اسے ایک عجیب سی خوشی اور ترنگ کا احساس ہوتا۔

روحی کے ایک تایا شاہد علیحدہ گھر میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں ان کا زیادہ آنا جانا تھا۔ تائی روحی سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ اس کی چھوٹی موٹی شرارتیں ان دل کو بھاتیں۔ وہ روحی کو نت نئی چیزیں دے کر اور کھلا کھلا کر خوش ہوتی تھیں۔ تایا بھی پیار کرنے والے تھے۔ زیادہ بات تو نہیں کرتے تھے مگر روحی جانتی تھی کہ وہ اسے پیار کرتے ہیں، وہ اس گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح ہوجاتی تھی۔

تایا شاہد کے ایک بیٹے کا نام اشباح تھا۔ وہ روحی سے بڑا تھا اور فرسٹ ایئر میں تھا۔ ایک دن روحی کو اندازہ ہوا کہ اس کے والدین اور تایا تائی چپکے چپکے کوئی پروگرام رہے ہیں اور اس پروگرام کا تعلق اس سے اور اشباح سے ہے...... جلد ہی روحی کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے ابو امی چاہتے ہیں کہ مستقبل میں روحی، تایا شاہد کے گھر جائے اور اشباح کی بیوی بنے۔

یہ احساس روحی کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ اشباح کو دوسرے بھائیوں کی طرح ہی سمجھتی تھی لیکن اس واقعے کے بعد اس کی سوچ اور نگاہ کا انداز بدل گیا۔ دوسری طرف اشباح کو بھی احساس ہوچکا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ایک نیا رشتہ جنم لے رہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک نامعلوم سی جھجک پیدا ہوگئی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک جاتے۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے اور ہنسنے بولنے کا انداز بدل جاتا۔ کبھی کبھی اشباح کو دیکھ کر روحی کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہوجاتی۔ اشباح کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی۔

وہ اب میٹرک کا امتحان پاس کرچکی تھی، تاہم نمبر اس کی توقع کے مطابق نہیں تھے۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ پھر اسے اپنے ابو کی بے پناہ معاونت اور محبت حاصل تھی۔ وہ اور زیادہ محنت سے پڑھنے لگی۔ آگے بڑھنے کی لگن میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگیا۔ اشباح کے ساتھ کبھی کبھار اس کی بات ہوجاتی تھی۔ کبھی فون پر کبھی آمنے سامنے۔ ان دونوں میں ایک معصوم وخوب صورت تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مستقبل کے حسین سپنے تھے۔ ان سپنوں میں خوب صورت موسم تھے، خوشیوں کے رنگ تھے، تھے۔ اوپر اور اوپر جاتے ہوئے سنہری رستے تھے جن کے کناروں پر سات رنگوں کے پھول کھلتے تھے اور شرارتوں تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ وہ آنے والے دنوں کے سہانے مناظر تخلیق کرتے اور ان مناظر میں کھوجاتے۔ روز وہ ایک بار میں آئس کریم کھانے گئے۔ گاڑی پار

دی تو ایک عمر رسیدہ فقیر بغور ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے روحی کو گڑبڑادیا۔ ''یہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟'' اس نے اشباح سے پوچھا۔

''تم اس سے ہی پوچھ لو۔'' اشباح نے مسکرا کر جواب دیا۔

روحی نے کچھ پوچھنے کے بجائے شولڈر بیگ میں سے دس کا نوٹ نکالا اور عمر رسیدہ شخص کی طرف بڑھادیا۔ اسے اندازہ ہورہا تھا کہ اس نے پہلے بھی اس شخص کو یہاں دیکھا ہے۔

اس شخص نے روپے لے کر دعائیں دیں...... اور اشباح کی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے اس کا قلم مانگا۔ اشباح چند لمحے تو تذبذب میں رہا پھر اس نے چیسٹ پاکٹ سے قلم نکال کر عمر رسیدہ شخص کی طرف بڑھادیا۔

عمر رسیدہ شخص نے سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ پھاڑا اور اس کے اندر کی طرف کچھ لکھنے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے تحریر روحی کی طرف بڑھادی۔ تین چار بے معنی سے فقرے تھے۔ پہلا فقرہ کچھ یوں تھا۔ ''جو درخت ساتھ ساتھ اگتے ہیں، اور ان کی شاخیں ملتی ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہیں۔''

دوسرا فقرہ تھا۔ ''جو درخت اکھاڑ کر لائے جاتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں ان کی لکڑی میں سرخ رنگ کا ایک داغ آجاتا ہے۔''

تیسرا فقرہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ اس میں ایک تاریخ درج تھی اور کسی بچھو قبیلے کا ذکر تھا۔

روحی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اشباح کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ ''یہ کیا ہے بزرگو؟'' اشباح نے فقیر سے پوچھا۔

''تمہیں نظر نہیں آتا؟ اگر نہیں آتا تو غور کرو۔ نظر آجائے گا۔'' عمر رسیدہ شخص نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر ''حق ہو'' کا نعرہ بلند کیا اور بے پروائی سے جھومتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دور جاکر وہ مڑا اور اس نے ایک بار پھر بڑے دھیان سے ان دونوں کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ ہجوم میں گم ہوگیا۔

اشباح نے ایک بار پھر ناقابل فہم تحریر کو پڑھا۔ وہ سگریٹ کے اس پھٹے ہوئے پیکٹ کو باہر پھینکنا چاہ رہا تھا مگر روحی نے روک دیا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی، اس نے یہ پیکٹ شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ایک دوسرے کا تعاقب کرتی رہیں۔ اشباح اور روحی میں اکثر فون پر بات ہوتی رہی۔ روحی نے بہت سنا تھا کہ اس طرح کے طویل رابطے کبھی کبھی بیزاری کا سبب بن جاتے ہیں۔ فون پر ہونے والی میسجنگ اور گفتگو بھی بگاڑ کا باعث بنتی ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو پہاڑ کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں روحی کو بھی محسوس ہورہا تھا کہ اسی قسم کی صورت حال پیدا ہورہی ہے۔ اشباح اس کا شوہر نہیں تھا بلکہ ابھی باقاعدہ منگیتر بھی نہیں تھا۔ فقط دونوں فیملیوں میں ایک انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ اس کے باوجود روحی کو لگتا تھا جیسے اشباح اس کو گائڈ کرنے اور کبھی کبھی حکم چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ روحی! تم نے ویسے کپڑے کیوں پہنے تھے؟ روحی! تم نے فلاں جگہ اسکارف کیوں پہن لیا تھا؟ تم فلاں کے گھر کیوں گئی ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ روحی کے لیے الجھن کا باعث ہوتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی وہ خود بھی اس قسم کا رویہ اختیار کرتی ہو اور اشباح سے کسی بات پر بازپرس کرتی ہو، مگر ایسا کم ہوتا تھا۔ ویسے وہ اشباح کا بہت خیال رکھتی تھی۔ سالگرہ، تہوار، ویلنٹائن ڈے اور اس طرح کے دیگر مواقع۔ وہ کسی بھی جگہ چوکتی نہیں تھی۔ تحائف کا تبادلہ اسے پسند تھا اور وہ اشباح کے تحائف دل سے لگا کر رکھتی تھی۔

فطرتاً وہ ایک روشن خیال اور روایت شکن لڑکی تھی۔ اسے بے جا پابندیاں پسند نہیں تھیں۔ وہ انفرادیت اور جدت چاہتی تھی۔ اس کے رہن سہن، لباس اور بول چال میں یہ انفرادیت اور جدت موجود تھی۔ وہ اب میٹرک کے بعد اے سی ایس کر رہی تھی، اس نے پڑھائی میں اپنی خامیاں کافی حد تک دور کرلی تھیں اور اب اپنے ابو کی مدد سے مزید بہتری کی امید رکھتی تھی۔ اس کے ابو کی آمدنی لامحدود نہیں تھی، اس کے باوجود انہوں نے کبھی ان بہن بھائیوں کو کسی چیز کے لیے ترسایا نہیں تھا۔ ان کی ہر خواہش فوراً پوری ہوتی تھی۔

روحی کا دل چاہتا تھا وہ اپنے ابو امی کی ہر خواہش اور امنگ پر پوری اترے۔ کچھ ایسا کرے کہ ان کو اپنی بیٹی پر فخر ہو۔ وہ اپنی کزنز کی طرح پڑھ لکھ کر گھر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں تو یہ تعلیم کو ضائع کرنے والی بات تھی۔ وہ نئے دور کی لڑکی تھی۔ نئے دور کے تقاضوں کو جانتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی پڑھائی مکمل ہو تو اسے کوئی باعزت جاب ملے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے۔ اپنے گھر والوں کا اور پھر اپنے ہونے والے شوہر کا سہارا بنے۔ ایک دن اس موضوع پر اشباح سے اس کی طویل گفتگو ہوئی۔

اشباح نے کہا۔ ''میں لڑکیوں کے جاب کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آج کل دفتروں کا ماحول بہت خراب

ہے۔ لڑکیوں میں صرف قابلیت ہی نہیں دیکھی جاتی اور بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔"

روحی نے کہا۔ "ہر جگہ ماحول ایک جیسا تو نہیں ہوتا۔ ویسے بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں ابو کے دفتر میں ہی کام کروں، مجھے امید ہے، وہاں مجھے کسی طرح کی کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

"مگر روحی" "انوائرمنٹ" بندے پر اثر تو کرتا ہے نا؟"

"نہیں اشباح، انسان خود مضبوط ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے روحی! عورت اتنی مضبوط نہیں ہے۔ اللہ نے اسے نسبتاً نازک بنایا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ محنت نہیں کر سکتی لیکن اس کی محنت کے کچھ مخصوص میدان ہیں۔ اگر وہ مردوں کی طرح ہر کام کرنا چاہے گی تو اس کے لیے مشکل ہوگی۔ مغرب کی عورت اسی لیے تو مشکلوں کا شکار ہے۔ اس کے چہرے کی تازگی سخت محنت کی دھوپ میں جھلس رہی ہے اور وہ وقت سے پہلے بوڑھی بھی ہو رہی ہے۔"

روحی ہنسی۔ "آپ جیسے مردوں کو بس یہ پسند نہیں ہے کہ عورت مردانہ اثر سے باہر نکلے، اپنے پاؤں پر کھڑی ہو، اپنا اور اپنی فیملی کا سہارا بنے۔ میں اپنے حق میں آپ کو ایک سو ایک دلیلیں دے سکتی ہوں لیکن آپ مانیں گے نہیں۔ کیونکہ آپ ماننا چاہتے ہی نہیں۔"

اس طرح کی بحثیں روحی اور اشباح میں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔

کبھی کبھی اپنی الماری کی دراز میں سے کوئی چیز نکالتے یا رکھتے ہوئے روحی کی نگاہ سگریٹ کے اس پھٹے ہوئے پیکٹ پر پڑتی جو ڈھائی تین برس سے دراز میں رکھا تھا۔ اس کی تحریر روحی کے لیے ناقابل فہم تھی۔ اس نے اپنی کئی سہیلیوں کو بھی یہ جملے دکھائے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اس نے اپنے کالج کی ایک ٹیچر کو بھی یہ تحریر دکھائی۔ وہ بھی کافی دیر سر دھنتی رہیں لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکیں۔ عجب بے ڈھنگے سے فقرے تھے۔ "جو درخت ساتھ ساتھ اگتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہیں۔ جو درخت اکھاڑ کر لائے جاتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں، ان کی لکڑی میں سرخ رنگ کا ایک داغ آجاتا ہے۔"

آخر میں ایک تاریخ درج تھی، لکھا تھا۔ "بچھو قبیلہ انار کے ایک ہزار دانے کھاتا ہے۔ پھر اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ پھر وہ سرخ داغ دیکھتا ہے، بس وہی دیکھتا ہے۔"

یوں تو یہ سارے فقرے ہی ناقابل فہم اور پُرتجسس تھے لیکن یہ آخری فقرہ روحی کے تجسس کو زیادہ ابھارتا تھا۔ "بچھو قبیلہ انار کے ہزار دانے کھاتا ہے پھر اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور وہ سرخ داغ دیکھتا ہے۔ بس وہی دیکھتا ہے۔"

یہ کیا تھا؟ کیا یہ کوئی علامتی تحریر تھی۔ کیا بالکل بے معنی الفاظ تھے جو ایک دیوانے نے کاغذ پر گھسیٹے تھے...... یا پھر ان فقروں میں کوئی ایسا ادھوراپن تھا جس کی وجہ سے مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس نے اپنے ابو کو بھی یہ تحریر دکھائی تھی لیکن وہ بھی کچھ جان نہ پائے تھے۔ کبھی کبھی روحی کے جی میں آتا کہ وہ پھر اسی آئس کریم بار پر جائے اور دیکھے، شاید وہ عمر رسیدہ فقیر اب بھی وہاں آتا ہو۔ لیکن وہ اپنے اس خیال کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکی۔

وقت گزرتا رہا۔ روحی اب یونیورسٹی میں تھی۔ وہ بی ایس کر رہی تھی۔ اس میں آگے بڑھنے کی فطری لگن موجود تھی۔ اس کی شخصیت بھی اس لگن میں اس کی مدد کرتی تھی۔ اس نے ایک اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ جب پہلی تنخواہ اس کے ہاتھ میں آئی تو اسے ایک عجیب خوشی کا احساس ہوا۔ یہ اس کی محنت کے پیسے تھے۔ اس کی صلاحیت کا اعتراف تھا۔ بہ ظاہر یہ عام سے کرنسی نوٹ تھے لیکن ان کے لمس میں ایک ایسی مسرت چھپی ہوئی تھی جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بازار جائے اور اس رقم کو اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ بہت سی خوشیاں خریدے اور اپنوں میں بانٹ دے...... وہ اشباح کے لیے بھی کچھ انوکھا خریدنا چاہتی تھی مگر دوسری طرف صورت حال کچھ مختلف تھی۔ اشباح ان حالات سے کچھ خوش نہیں تھا۔ ایک مرد کی حیثیت سے وہ خود کمانا چاہتا تھا۔ اپنا خون پسینہ بہانا چاہتا تھا۔ روحی کو ایک محفوظ چار دیواری دے کر اس کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک عجیب سا ٹکراؤ تھا ان دونوں کے درمیان۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ حساس طبع روحی کے لیے یہ معمولی باتیں بہت اہم تھیں۔ کسی وقت وہ محسوس کرتی کہ اشباح کے گھر میں اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو اشباح کی بڑی بھابی کو دی جاتی ہے۔ کسی وقت کسی بے معنی بات پر اشباح سے اس کا جھگڑا ہو جاتا اور وہ جو خوشی خوشی ان کے گھر گئی تھی، آنسو بہاتی واپس آجاتی۔ اشباح کو پڑھائی میں بھی کچھ دشواری کا سامنا تھا۔ کسی وقت روحی کو لگتا پتا نہیں کہ وہ اس میدان میں کوئی کامیابی حاصل بھی کر سکے گا یا نہیں۔ اشباح محنتی تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس میں ذہانت نہیں تھی لیکن اس سے اپنے سلسلۂ تعلیم کے دوران میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔ پہلے اس نے بی ایس سی کیا۔ اس کے بعد ایم بی اے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایم بی اے کے چند سمسٹر کرنے کے بعد اس نے پھر ٹرن لیا اور اے سی سی اے میں داخلہ لے لیا۔ شاید یہ بھی اس کے اندر کی بے قراری تھی۔ وہ بہتر سے بہتر بننا چاہتا تھا روحی کے لیے...... اور اسی کوشش میں اس کا وقت بھی ضائع ہوا۔

روحی اور اشباح کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں محبت نہیں کرتے تھے مگر کوئی ان دیکھی چیز ان دونوں کے درمیان حائل ہو رہی تھی۔ کوئی دراڑ سی تھی جو بے وجہ پھیل رہی تھی۔ کسی وقت تو روحی کو ایسا لگتا کہ وہ شاید اشباح کے ساتھ خوش نہ رہ سکے گی۔ اس نے اپنی اس کیفیت کا تذکرہ امی سے بھی کیا تھا اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ابو سے بھی۔ اتنا طویل تعلق تھا پھر یہ آہستہ آہستہ ختم کیوں ہو رہا تھا۔ شاید اس تعلق کی طوالت ہی اس کے زوال کا باعث بن رہی تھی۔ عام سی باتیں تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں لیکن یہ دلوں میں جمع ہو ہو کر میل کی طرح جم گئی تھیں۔ وہ دونوں دس پندرہ برس سے ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ اب ان کی باقاعدہ منگنی کو بھی کئی ماہ ہو چکے تھے۔

ایک دن روحی نے امی سے سب کچھ کہہ ڈالا۔ وہ رو رہی تھی اور اس کے دل میں دکھ کا غبار تھا۔ اس نے اپنے تمام اندیشے بیان کر دیے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اس کی شادی اشباح سے ہو گئی تو وہ شاید خوش نہ رہ سکے گی۔

یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا جو روحی کے امی ابو کو برداشت کرنا پڑا۔ دوسری طرف اشباح اور اس کے والدین کو بھی یہ برداشت کرنا پڑا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ روحی کے ابو نے اشباح کو بلایا اور اسے بتایا کہ وہ شدید صدمے میں ہیں اور اشباح کو چاہیے کہ وہ روحی سے بات کرے اور ان دونوں کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ اشباح تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ وہ روحی کو بہت چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس چاہت کے اظہار میں اس کی طرف سے کمی ہوئی ہو یا یہ اظہار اور اس جذبے کی شدت ویسی نہ ہو جیسی روحی چاہتی ہو لیکن اس نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ روحی کی طرف سے اس دیرینہ تعلق کو یکلخت ختم کر دیا جائے گا اور وہ شادی سے انکار کر دے گی۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے تو بس دن رات ایک ہی منظر کا تصور کیا تھا۔ وہ دلہن بن کر اس کے گھر میں اتر رہی ہے۔ اپنی روشنی سے اس کی زندگی کو جگمگا رہی ہے۔ بس ایک ہی منظر، بس ایک ہی سپنا، بس ایک ہی سوچ۔

اس نے تنہائی میں روحی سے بات کی۔ سیکڑوں گلے شکوے ہوئے۔ بس وہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ پھر پتا نہیں کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کیوں کر رہی تھی۔ اشباح نے اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ گاہے بہ گاہے ایسا بھی نظر آیا کہ اشباح کی باتیں اسے قائل کر رہی ہیں لیکن ہر بار جیسے ایک آنچ کی کسر رہ جاتی۔

اشباح نے کہیں پڑھا تھا کہ پیار کرنے والے آسانی نہیں مشکل چاہتے ہیں۔ وہ کسی آسان رستے پر چل کر ایک دوسرے کو حاصل کر لیں تو انہیں لگتا ہے کہ انہوں نے پیار ہی نہیں کیا، وہ پہلے راستوں کو مشکل اور سفر کو ناممکن بنا دیتے ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو نئے سرے سے سوچتے ہیں، پھر سے منزل کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اکثر ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔ کیا یہاں بھی وہی ہو رہا تھا۔ ایک عجیب دلدل سی جس میں ہر کوئی دھنس جاتا ہے۔

ایسے موقعوں پر خاندان میں باتیں بنائی جاتی ہیں۔ رائی کے پہاڑ بنانے والے کم نہیں ہوتے۔ وہ حالات کو بہتری کی طرف لے جانے کے بجائے بگاڑ کی طرف لے جاتے ہیں۔ باتوں سے بتنگڑ بنا کر ہوا میں اڑائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سب کچھ ہوا۔ دوریاں بڑھتی گئیں۔ اشباح اور روحی کی پے در پے تین چار ملاقاتیں ہوئیں...... اور پھر گرما کی ایک اداس اداس سی شام کو سب کچھ ختم ہو گیا۔ راستے جدا ہو گئے۔ سورج کے ساتھ ہی آس کی آخری کرنیں بھی ڈوب گئیں۔ منظر بکھر کر رہ گیا...... روحی اور اشباح کی بات ختم ہو گئی۔ انگوٹھیاں واپس ہو گئیں۔ سامان کا تبادلہ ہو گیا لیکن یادوں کا تبادلہ نہ ہو سکا، روحی کا کچھ سامان، شادی سے پہلے ہی تایا شاہد کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ سامان جب زینے سے اترتا ہوا واپس گیا تو اشباح دیر تک سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔

روحی کے والدین نے اس کے لیے ایک رشتہ تلاش کیا۔ اچھا لڑکا تھا۔ مناسب قد، قبول صورت، پڑھا لکھا، اچھے خاندان سے، اس کا مستقبل روشن نظر آتا تھا۔ اس کا نام ولید تھا۔ دونوں فیملیز میں چند ملاقاتیں ہوئیں پھر روحی کی منگنی ہو گئی۔ اس مرتبہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔

روحی کے والدین اور خود روحی بھی چاہتی تھی کہ یہ سلسلہ زیادہ لمبا نہ ہو۔ شاید اس سلسلے کی طوالت ہی اس کی خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔ بے معنی باتیں دھیرے دھیرے ایک ایسا پھندا تیار کر دیتی ہیں جن میں دو محبت کرنے والے پھنس کر رہ جاتے ہیں، نکلنا چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے۔

ولید کی شخصیت میں وہی سحر اور اس کی محبت میں وہی گرمجوشی تھی جس کی تمنا روحی جیسی لڑکی کو ہو سکتی تھی۔ وہ توجہ مانگتی تھی۔ جذبے کی شدت مانگتی تھی اور اپنی خوبیوں کے لیے بجا طور پر توصیف اور ستائش چاہتی تھی اور اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہی تھی کہ وہ ایک پریکٹیکل لڑکی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ وقت کو بے عملی میں یا کمتر کاموں میں ضائع کرنا گناہ سمجھتی تھی۔ پڑھائی سے فارغ وقت کو بھی وہ کسی نہ کسی مصرف میں لاتی تھی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے کئی ہنر سیکھے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گھر میں ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ یہ اس کا شوق تھا۔ اس ٹیوشن سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس انکم کو وہ اپنی مختلف ضروریات کے لیے استعمال کرتی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی لڑکی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے ناراض بھی ہو جاتی تھی۔ ولید نے اس کی یہ ادا بھانپ لی اور وہ اکثر اسے خوش رکھنے میں کامیاب رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے روحی کو ولید میں اپنے خوبصورت تصورات کا عکس نظر آنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ جو وہ چاہتی تھی اسے ملنے والا ہے۔ اشباح کا خیال بتدریج اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وقتی طور پر اسے بھی رشتہ ختم ہونے کی تکلیف تو بہت ہوئی لیکن اب وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ ایک ٹھیک فیصلہ ہی تھا۔ ساری زندگی ایک نامناسب شخص کے ساتھ گزارنے کے بجائے ایک عارضی صدمہ سہہ لینا بہتر تھا۔ رشتے کے اس خاتمے کی وجہ سے قریبی عزیزوں میں خاصی دوریاں بھی پیدا ہو گئی تھیں مگر ان دوریوں، تلخیوں سے بچنے کے لیے وہ اپنی ساری زندگی تو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ کسی کا دل توڑنے والی لڑکی نہیں تھی مگر پتا نہیں کیوں اشباح کا تصور بھی اس کے لیے محال ہو گیا تھا۔

تین چار ماہ بعد ولید سے اس کی شادی ہو گئی۔ وہ بیاہ کر اپنے سسرال میں آ گئی۔ یہاں اسے وہ سب کچھ ملا جو وہ چاہتی تھی اور سب سے بڑھ کر ولید کا پیار۔

شادی کے بعد وہ خود بھی اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ اس کے شب و روز پر بس ولید ہی کا سایا تھا۔ اسے دفتر سے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ موبائل کو مستقل کان سے لگا لیتی۔ اگر کال نہ ملتی تو دروازے پر کھڑی ہو جاتی تک ولید کی گاڑی کا ہارن سنائی نہ دے جاتا اس کی سانس اٹکی رہتی۔ ان گنت اندیشے ذہن میں سر اٹھاتے۔ وہ آ جاتا تو اس کی دنیا مکمل ہو جاتی۔ اسے لگتا، اب دنیا میں سب ٹھیک ہے، قیامت بھی برپا ہو جائے تو کوئی پروا نہیں۔ دوسری طرف ولید کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ روحی کے بغیر ایک ایک پل گن کر گزارتا۔ گھر میں ولید کے علاوہ صرف روحی کے ساس سسر تھے اور ایک ادھیڑ عمر ملازمہ زینب تھی۔ ساس سسر محبت کرنے والے تھے۔ سسر توقیر احمد ڈاکٹر تھے۔ ذرا سخت گیر لیکن بہت اچھے دل کے تھے۔ اس سے پہلے ان کی تین بہوئیں تھیں۔ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ بیرون ملک تھیں۔ ڈاکٹر توقیر نے سب شادیاں خاندان سے باہر کی تھیں۔ وہ قریبی عزیزوں میں شادی کے خلاف تھے۔ یہ ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ روحی، ولید کے ساتھ ایک اچھی اور صاف ستھری زندگی کی شروعات چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ولید کو اشباح کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا اور آخر میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ کس طرح وہ آہستہ آہستہ اس کے دل سے اتر گیا اور کس طرح اب وہ اس کے لیے ایک بھولی بسری کہانی بن چکا ہے۔ ولید نے روحی کی صاف گوئی کو بہت پسند کیا تھا۔ ردعمل کے طور پر ولید نے بھی روحی کے سامنے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کر دی تھی۔ ولید کے مطابق کالج کے دور میں دو تین لڑکیوں سے اس کی دوستی ہوئی...... اکھٹے گھوما پھرا گیا۔ لیکن یہ دوستی کبھی پیار محبت وغیرہ میں نہیں ڈھلی۔ اس حوالے سے اس کی زندگی کورے کاغذ کی طرح صاف شفاف تھی۔

ولید بہت فراخ دل اور کوآپریٹو شوہر ثابت ہوا۔ اس نے جاب کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ روحی پر چھوڑ دیا۔ روحی نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ان کا گھر کافی بڑا تھا۔ گھر کا ایک پورشن تقریباً خالی پڑا تھا۔ روحی نے اس کو ٹھیک ٹھاک کیا اور وہاں ایک انگلش میڈیم اکیڈمی کی بنیاد رکھ دی۔

ایک روز وہ اپنی الماری کی دراز میں اپنی پرانی اشیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر ایک لفافے پر پڑی۔ اس میں وہی سگریٹ کا پھٹا ہوا پیکٹ تھا جس پر چند ناقابل فہم فقرے لکھے تھے۔ وہ ایک بار پھر اس شکستہ تحریر کو پڑھنے لگی۔ "جو درخت ساتھ ساتھ اگتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔" پھر اکھاڑے ہوئے درختوں کی بات تھی اور بچھو قبیلے کے لوگوں کی بات تھی جن کی آنکھیں انار کے ایک ہزار دانے کھانے کے بعد روشن ہو جاتی ہیں اور وہ لکڑی کا سرخ داغ دیکھ سکتے ہیں۔ نیچے لکھی ہوئی تاریخ چند مہینے بعد کی تھی اور مہینا تھا اکتوبر کا۔

رات کو ولید دفتر سے آیا تو روحی نے اسے بھی یہ تحریر دکھائی۔ وہ بھی دیر تک سر کھپاتا رہا۔ کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ ایک عمر رسیدہ مجہول شخص کے لکھے ہوئے بے معنی الفاظ ہیں، جو الجھن پیدا کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کرتے۔

بات ایک بار پھر آئی گئی ہو گئی لیکن اس بار روحی کے ذہن سے یہ بات پوری طرح نکلی نہیں۔ اس کے ذہن میں ہر وقت یہ الفاظ گونجتے رہے۔ پاس پاس اُگے درخت۔ لکڑی کے اندر سرخ رنگ کا داغ جو کسی بیماری کی طرح تھا...... اور پھر بچھو قبیلہ، انار کے ایک ہزار دانے......

اس تحریر نے اسے وہمی سا کر ڈالا تھا۔ ویسے بھی وہ آج کل ہر وقت عجیب سی سوچوں میں مبتلا رہتی تھی۔ اس کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ ابھی کسی بچے کی آمد بھی نہیں ہوئی تھی۔ زندگی ایک لگے بندھے معمول سے گزر رہی تھی۔ اشباح کے بارے میں پھر کبھی ولید اور روحی کے درمیان بات نہیں ہوئی لیکن کبھی کسی وقت کہیں باتوں میں اشباح کا نام آتا تو روحی کو لگتا کہ ولید کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر جاتا ہے۔ ایک دوبار روحی کو لگا کہ وہ اشباح کے بارے میں روحی سے کچھ مزید پوچھنا چاہتا ہے لیکن عملی طور پر اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اگر کوئی الجھن ہو گی تو اس کے دل میں ہی ہو گی۔ کسی وقت روحی تنہا ہوتی تو ایک دم ماضی کے شب و روز اس پر یلغار کرتے۔ بکھری بکھری یادیں جمع ہوتیں اور اس کا گھیراؤ کرنے لگتیں۔ جیسے کوئی دھول اڑاتا ہوا لشکر ہو اور اس کا محاصرہ کر رہا ہو۔ اس دھول کے اندر اسے کسی وقت اشباح کا دھندلا سا چہرہ نظر آتا۔ ویران آنکھوں اور خشک ہونٹوں والا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ کچھ پوچھتا نہیں تھا پھر بھی سرتاپا سوال نظر آتا تھا۔ وہ اس کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیتی اور وہ ساری تلخ باتیں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتی جو اس دور میں کہیں سنی گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے چہرہ اوجھل ہو جاتا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ اس کے خدوخال واضح ہونے لگتے۔ ایسے میں اگر کہیں سے ولید آ جاتا تو روحی گڑبڑا سی جاتی۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگتی۔ سوچتی کہ اسے قدرت نے کتنا پیار کرنے والا شوہر دیا ہے۔ مخلص اور صاف شفاف...... ایک آئینے کی طرح۔ پھر وہ کیوں اس طرح اپنے بے کار ماضی کے راستے میں سوچنا شروع کر دیتی ہے۔ اگر اس طرح کی کیفیت ولید کی طرف ہو تو وہ کتنا برا محسوس کرے گی۔ جو چیز وہ ولید کے لیے غلط سمجھتی ہے، اپنے لیے غلط کیوں نہیں سمجھتی۔ وہ خود کو بری طرح جھاڑ پلاتی اور اندر ہی اندر خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی۔ ولید کا پیار اس کی اس کوشش کو سہارا دیتا اور وہ پھر سے معمول پر آ جاتی۔

ولید کی سالگرہ آ رہی تھی۔ روحی اس سالگرہ کو یادگار بنانا چاہتی تھی اور اسے کوئی ایسا تحفہ دینا چاہتی تھی جو خود ولید ہی کی طرح یکتا ہو۔ اس نے اپنی ایک دوست کے ذریعے کالج آف فائن آرٹس میں ایک مصور کا پتا کیا۔ وہ ولید کی کچھ تصویریں اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے معروف مصور سے ولید کا ایک زبردست پورٹریٹ بنانے کا کہا۔ مصور آرٹسٹ نے جو معاوضہ مانگا، روحی نے بخوشی دے دیا۔

ایک روز وہ ولید کی سالگرہ کی شاپنگ کے لیے نکلی۔ وہ اس کے لیے سرپرائز شاپنگ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے پسندیدہ پرفیومز، پسندیدہ برانڈ کی جینز اور شرٹس اور پھر ایک شاندار تھری ڈے کیمرے والا موبائل فون جو آج کل ولید کا کریز بنا ہوا تھا۔ ولید نے اسے ایک چھوٹی گاڑی لے دی تھی۔ وہ اکثر گھریلو ملازمہ زینب کو ساتھ لے کر اکیلی ہی شاپنگ وغیرہ کر لیتی تھی۔ زینب بہت قابل بھروسا عورت تھی۔ تہجد گزار، ملنسار اور خدا خوفی سے لبریز، پینتالیس پچاس سال کی ہو چکی تھی پھر بھی غیر مردوں کے سامنے چہرہ ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ گھر کے کام کاج کے بعد فارغ وقت میں وہ عبادت میں مصروف رہتی۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں کرتی رہی اور خود اس کی شادی کی عمر نکل گئی۔ بہرحال وہ اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن تھی۔ اسے دیکھ کر روحی کو نجانے کیوں اپنی مرحومہ دادی کی یاد آتی تھی۔

اس دن بھی زینب گاڑی میں ہی بیٹھی رہی اور روحی لبرٹی میں شاپنگ کرتی رہی، وہ بہت دنوں بعد لبرٹی آئی تھی۔ شاپنگ کرتے کرتے وہ کافی آگے نکل گئی۔ یکایک اس کی نگاہ دور ایک نیون سائن پر پڑی۔ یہ وہی آئس کریم بار تھا جہاں کبھی اشباح اور روحی آیا کرتے تھے۔ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ یہیں پر روحی اور اشباح کو ایک دن وہ عمر رسیدہ شخص ملا تھا جس نے ایک ناقابل فہم تحریر لکھ کر انہیں الجھن میں مبتلا کیا تھا۔

نجانے روحی کے دل میں کیا آئی۔ اس نے سوچا کہ وہ آئس کریم بار پر جا کر دیکھے۔ ہو سکتا ہے، وہ بوڑھا آج بھی وہاں صدا لگا رہا ہو......

وہ تھکی ہوئی بھی تھی، تھوڑا فریش ہونا چاہتی تھی۔ اس کے قدم جیسے خودبخود ہی بار کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ قریباً نصف کلومیٹر پیدل ہی طے کرکے وہ بار میں جا پہنچی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ شروع ستمبر کا سورج آگ بکھیرنے کے بعد اب ٹھنڈے سائے دے رہا تھا۔ ہلکی سی ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک دو فقیر تو نظر آئے لیکن سفید ڈاڑھی اور خمیدہ ناک والا وہ عمر رسیدہ شخص کہیں دکھائی نہیں دیا۔ روحی بار میں جا بیٹھی۔ اس نے آئس کریم کا آرڈر دیا اور کھوئی کھوئی نظروں کے ساتھ دیوار گیر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ ایک دم بہت سی بھولی بسری یادیں یلغار کرنے آگئیں...... وہ اور اشباح وہاں گاڑی پارک کیا کرتے تھے، وہاں اس میز پر بیٹھا کرتے تھے۔ اس بیل کے بارے میں اشباح نے فلاں بات کہی تھی اور اس نے فلاں جواب دیا تھا۔ ویران آنکھیں اور خشک ہونٹ۔ اپنی توجہ ان سوچوں سے ہٹانے کے لیے روحی نے ایک ویٹر کو آواز دی۔ ''جی میڈم'' اس نے قریب آکر اور جھک کر کہا۔

روحی نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''یہاں پارکنگ کے اس کونے میں ایک باباجی کھڑے ہوتے تھے، بالکل سفید بال تھے۔ ہاتھ میں ایک لاٹھی سی ہوتی تھی۔''

ویٹر مسکرایا۔ ''ایکسکیوزمی۔ میرا خیال ہے آپ کافی دنوں بعد آئی ہیں۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' روحی بولی۔ ''میں یہاں نہیں تھی، قریباً پانچ سال ہوگئے ہیں۔''

''باباجی تو پچھلے سال فوت ہوگئے تھے۔ اب ان کی جگہ وہ سفید چغے والا بندہ کھڑا ہوتا ہے۔ شاید ان کا کوئی بھتیجا یا بھانجا ہے۔''

آئس کریم ختم کرنے کے بعد روحی باہر آگئی۔ وہ قدرے فربہ اندام شخص پولیو زدہ تھا اور ایک پول کے سہارے کھڑا تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس چھتیس سال رہی ہوگی۔ روحی کے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ باباجی پچھلے سال دسمبر میں فوت ہوئے ہیں۔

''ان کی جگہ تم آئے ہو؟'' روحی نے پوچھا۔

''نہیں بی بی جی۔ ان کی جگہ چاچا پیر نے لی ہے۔ وہ ان کے گدی نشین بنے ہیں، میں تو بس چاچا پیر کا چاکر ہوں، ہمارا ڈیرا اُدھر مینارِ پاکستان کی طرف، گورا قبرستان کے پچھواڑے ہے۔''

''پچھواڑے کہاں؟''

''کچی آبادی ہے جی...... وہاں کا ایک چھوٹا سا قبرستان ہے۔'' اس نے روحی کو پورا ایڈریس دے روحی نے سمجھ بھی لیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک بار فقیروں کے اس ڈیرے پر جائے۔

دو تین دن تو وہ کہیں نکل نہیں سکی۔ ولید کو بخار تھا۔ رات دن اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر روحی کی جان پر بن جاتی تھی۔ دوسری طرف بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ روحی کو کچھ ہوجاتا تو ولید چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاتا۔ اتنی فکر کرتا کہ وہ پریشان ہوجاتی بلکہ اپنے آپ میں شرمندہ ہونے لگتی۔ وہ اسے ایسے درجے پر فائز کر رہا تھا جس کی وہ شاید پوری طرح اہل نہیں تھی۔ اس کی زندگی کے ایک بڑے حصے پر اشباح کا سایا رہا تھا اور یہ سایا کبھی کبھی اب بھی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ اشباح نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے پاس بیرون ملک جاچکا تھا۔

تیسرے چوتھے دن ولید صحت یاب ہوکر دفتر گیا تو روحی نے زینب کو گھر کی دیکھ بھال سونپی اور خود گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ جب بھی گاڑی میں بیٹھتی تھی۔ زینب دیر تک پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتی تھی۔ زینب کی دعائیں روحی کے اندر ایک طرح کی توانائی پیدا کرتی تھیں۔ شروع میں اسے دعاؤں وظیفوں وغیرہ پر اتنا اعتقاد نہیں تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ابو سے بہت متاثر تھی اور اس کے ابو نوجوانی سے ہی مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ وقت کے ساتھ ان کے اس چلن میں مزید پختگی آئی تھی۔

روحی لوئر مال روڈ پر آئی اور پھر گورا قبرستان کا چکر کاٹ کر عقبی آبادیوں میں پہنچ گئی۔ اسے مطلوبہ قبرستان ڈھونڈنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ گاڑی ایک درخت کے نیچے پارک کرکے وہ قبرستان میں داخل ہوگئی۔ اس نے اپنے نصف چہرے کو چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ ایک کٹیا کے پاس نیم کے گھنے پیڑ تھے۔ پیڑوں کی چھاؤں میں چند فقیر منش افراد بیٹھے تھے۔ ستر برس عمر کا ایک شخص ان میں نمایاں تھا۔ اس کی پنڈلیاں ننگی تھیں اور وہ ایک چولا نما لباس میں تھا۔ روحی کے دل نے گواہی دی کہ یہی باباجی کا گدی نشین چاچا پیر (پیر عرفات احمد) ہے۔ روحی نے اسے سلام کیا۔ اس نے اپنی سوئی سوئی آنکھوں سے روحی کو دیکھا اور سفید ڈاڑھی میں انگلیاں کر سلام کا جواب دیا۔ روحی نے پاؤں جوتی سے نکالے آواز میں فقیر کے سامنے ہی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکی اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے تینوں چاروں حواری اٹھ کر دوسری طرف چلے گئے۔ چاچا پیر یعنی پیر عرفات کے پاس ہی ایک اخبار پڑا تھا اور ایک کتاب بھی رکھی تھی، عنوان تھا ''باتیں دانش و حکمت کی۔'' اپنی شکل وصورت سے بھی چاچا پیر عام فقیروں ملنگوں سے مختلف نظر آتا تھا۔

روحی نے مختصر تعارف کے بعد اپنا شولڈر بیگ کھولا اور اس میں سے وہی پھٹا پرانا پیکٹ نکال لیا جس پر مرحوم باباجی کی تحریر تھی۔ ''یہ کیا ہے بٹیا جی؟'' پیر عرفات نے پوچھا۔

''یہ چند فقرے ہیں جی۔ بڑے باباجی نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے۔ یہ کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں...... آج تک...... ان کو سمجھ نہیں سکی ہوں جی۔ یہ مجھے بڑی اُلجھن میں رکھتے ہیں۔''

روحی نے کانپتے ہاتھ سے تحریر بوڑھے گدی نشین کی طرف بڑھا دی۔ اس نے اپنے سفید چولے کی جیب میں سے ایک پرانی طرز کی عینک نکالی اور آنکھوں پر جما کر تحریر کو دھیان سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ تحریر دو تین بار پڑھی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر روحی کی طرف دیکھا۔ اس نے روحی سے چند سوال پوچھے۔ یہ تحریر باباجی نے کب لکھی؟ کہاں لکھی؟ کب اسے دی، اور کیا اس کے ساتھ زبانی بھی کچھ کہا؟

روحی نے ان سوالوں کے جواب دیے اور وہی کچھ بتایا جو ہوا تھا۔ بعدازاں اس نے روحی کی ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ اس کی تاریخ پیدائش، اس کی شادی کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟ پسند کی تھی یا ماں باپ کی پسند کی، وغیرہ وغیرہ۔ روحی نے ان سوالوں کے بھی درست جواب دیے۔

پیر عرفات گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس کے کمزور چہرے پر جھریاں نمودار ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ بہ ظاہر وہ ایک قناعت پسند اور مست حال شخص نظر آتا تھا، عام فقیروں سے ذرا ہٹ کر۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر روحی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ جیسے روحی کی طرف نہیں اس سے کہیں آگے دیکھ رہا تھا، کسی نامعلوم وسعت میں۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے کہا۔ ''بیٹا جی! میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا وہ تمہیں عجیب لگے گا لیکن یہ عجیب ہے نہیں۔ یہ وہی ہے جو ہوتا ہے...... اور وہی ہے جو ہونا ہے۔ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو ابھی ہم انسانوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ کالجوں

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ
سرگزشت
شمارہ ستمبر 2013ء کی جھلکیاں
آزادی کا متوالا
برصغیر کی آزادی کے لیے جان قربان کرنے والے کی داستان
زندگی جیت گئی
ایک حیرت انگیز روداد، وہ صحرا میں بھٹک گئے تھے
ڈیٹ
لڑکے لڑکیوں کی خفیہ ملاقاتوں پر ایک سبق بھری سچ بیانی
اس کے علاوہ
دلچسپ سفر کہانی ''ترکی نمی دانم''، لہو رنگ سرگزشت ''سراب''، فلم نگری کی ان کہی روداد ''فلمی الف لیلہ'' اور علم کی دولت سے مالا مال افراد کے لیے انعامی سلسلہ ''علمی آزمائش''
مزید
20 سے زائد سچے واقعات، سچ بیانیاں اور سچے قصے
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں
خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے لوگ اسے بالکل نہیں مانتے لیکن ان کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں سکتی نا۔ ہمارے اردگرد انہونیاں ہوتی رہی ہیں۔ اب بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ بابا جی جیسے لوگ اپنے اندر کی آنکھ سے ان انہونیوں کو دور ہی سے دیکھ لیتے ہیں اور پھر لوگوں کو بھی بتاتے ہیں لیکن اکثر لوگ ان باتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر کوئی تمہارے جیسا پہنچتا بھی ہے تو یقین نہیں کرتا یا پھر ویسے ہی ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔"

"آپ بتایئے بابا جی! میں پوری توجہ سے سن رہی ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں میرے دل میں بڑے بابا جی کی اس تحریر کی وجہ سے ہمیشہ سے احترام موجود رہا ہے۔"

چاچا پیر یعنی پیر عرفات نے اشارے سے روحی کو کچھ اور قریب بلایا۔ وہ پیر عرفات کے ساتھ ہی تحریر پر جھک گئی۔ پیر عرفات نے کہا۔ "بیٹا جی! یہ فقیری اشاروں کی زبان ہے، اسے کوئی فقیر منش ہی سمجھ سکتا ہے، یہ دیکھو، یہ پہلا فقرہ "جو درخت ساتھ ساتھ اگتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں، وہ بڑے خوش قسمت ہیں، اس کے پیچھے ایک پورا مطلب ہے۔"

"کیا مطلب ہے بابا جی؟" روحی نے بے حد تجسس سے پوچھا۔

پیر عرفات نے ایک گہری سانس لی۔ "بیٹا جی! اس میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے، جو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، یعنی وہ مرد اور عورتیں جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، ان لوگوں کی محبت کا آغاز بہت شروع سے ہوجاتا ہے۔ لڑکپن سے یا بالکل نوعمری سے اور پھر یہ محبت اپنے منطقی انجام تک بھی پہنچتی ہے، یعنی دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ یہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ ان کا اندر شیشے کی طرح صاف شفاف ہوتا ہے اور یہ دیکھو یہ دوسرا فقرہ...... یہ کیا ہے؟ تم خود پڑھو۔"

پیر عرفات کے حکم پر روحی نے دھیمی آواز میں فقرہ پڑھا۔ "جو درخت اکھاڑ کر لائے جاتے ہیں اور ان کی شاخیں ملتی ہیں ان کی لکڑی میں اکثر سرخ رنگ کا ایک بدنما داغ آجاتا ہے۔"

"ہاں بیٹا جی! یہ پہلے فقرے سے آگے کی بات ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ جو رشتے جوان ہونے کے بعد طے ہوتے ہیں، مثلاً تئیس چوبیس یا ستائیس اٹھائیس سال کے بعد ان رشتوں میں اکثر ایک کمی ہوتی ہے۔ لڑکے لڑکی نے جوان ہونے تک جو عمر گزاری ہوتی ہے، وہ بالکل سادے کاغذ کی طرح نہیں ہوتی۔ اس پر کسی نہ کسی کا سایہ ضرور ہوتا ہے۔ کوئی کزن، کوئی کلاس فیلو، کوئی اڑوسی پڑوسی یا قریبی رشتے دار۔ یہاں دیکھو "اکثر" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی سب کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے، یہ ایک فطری عمل ہے۔ اس عمل کو اور اس تعلق کو اندر سے سرخ داغ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ داغ ہمیشہ جسم کے اندر رہتا ہے۔ کسی فرد میں یہ چھوٹا ہوتا ہے کسی میں بڑا، کسی میں زیادہ بڑا۔ یہ ایک چور کی طرح مرد اور عورت کے جسم کی بغل میں چھپا رہتا ہے۔ اس کو ہم جھوٹ کا داغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں یہ پہلی محبت کا داغ ہوتا ہے۔"

بات ختم کرکے پیر عرفات نے بوسیدہ تکیے سے ٹیک لگائی اور موٹے فریم والی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہاں تک بات سمجھ میں آگئی ہے؟"

روحی نے کہا۔ "ہاں بابا جی! کچھ کچھ تو سمجھ میں آرہی ہے۔"

"اکیلے میں غور کرو گی تو پوری سمجھ میں آجائے گی، ضرور آجائے گی...... اب ہم اس تیسرے فقرے کی طرف آتے ہیں۔ یہ زیادہ الجھا ہوا ہے اور زیادہ حیران کرنے والا بھی۔ لیکن یہ جو بھی ہے، ایک سچ ہے اور یہ سچ تمہارے سامنے بھی آئے گا۔ کیونکہ تم خود بھی تو بچھو قبیلے سے ہو......"

"بچھو قبیلہ؟ میں سمجھی نہیں؟"

"یہ ستاروں اور برجوں کی طرف اشارہ ہے۔ ستارے اور برج سمجھتی ہو نا تم؟"

"جی ہاں...... آپ ہوروسکوپ کی بات کررہے ہیں۔"

"ہاں...... تمہارا برج عقرب ہے۔ اس کو بچھو بھی کہتے ہیں۔ یہ دیکھو، یہاں لکھا ہے، بچھو قبیلہ انار کے ایک ہزار دانے کھاتا ہے پھر اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں پھر وہ سرخ داغ دیکھتا ہے۔ بس وہی دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عقرب لوگ اپنی آنکھوں سے اس لال رنگ کے داغ کو دیکھ سکتے ہیں جو کچھ انسانوں کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن ہر وقت نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا ایک وقت مقرر ہے۔"

"مم...... میں کچھ سمجھ نہیں پارہی جی۔" روحی کا خشک ہورہا تھا۔

پیر عرفات نے عجیب لہجے میں کہا۔ "انار کے ایک ہزار دانے کھانے کے بعد عقرب لوگ اس داغ کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں انار کے ہزار دانوں سے مطلب ہے...... ایک ہزار سال بعد...... ہاں ایک ہزار سال بعد۔ یعنی ہزار سال کے بعد وہ وقت آتا ہے جب عقرب لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ انسانوں کے اندر موجود اس سرخ

آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ایسا زیادہ دیر کے لیے نہیں ہوتا، صرف ایک آدھ گھڑی کے لیے۔ یعنی 24 منٹ سے بھی کم۔ اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا ہوتا ہے...... جب وہ گھڑی آتی ہے۔ قدرت عقرب لوگوں کی آنکھوں میں وہ توانائی پیدا کردیتی ہے کہ وہ اس سرخ داغ کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھ پاتے ہیں۔ اگر وہ رات کے اس حصے میں جاگ رہے ہوں اور توجہ دیں تو انہیں عام انسانوں میں وہ داغ صاف نظر آتا ہے۔ وہ داغ یا ہیولا ایک انسانی چہرے کی صورت میں ہوتا ہے۔ بغور دیکھنے سے اس کے خدوخال بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔ مردوں میں وہ عورت کا ہیولا ہوگا اور عورتوں میں کسی مرد کا ہوگا۔"

روحی کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ اکیسویں صدی کی ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ سائنس کی طالبہ رہی تھی۔ ایسی باتوں پر بھروسا کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا، لیکن پیر عرفات کا لب ولہجہ اور انداز بھی نظر انداز کیے جانے والا نہیں تھا۔ قبروں پر درختوں کے سائے پھیل رہے تھے۔ کٹیا سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک افسانوی سا ماحول بن گیا تھا۔

پیر عرفات نے اپنا سفید سر اس بوسیدہ پرانی تحریر پر جھکا رکھا تھا۔ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو بیٹا جی، یہ وہ تاریخ درج ہے، اس تاریخ میں وہ کرشمہ رونما ہوگا۔ رات کے آخری پہر...... ہاں، رات کے آخری پہر، عقرب اس قابل ہوجائیں گے کہ وہ انسانوں میں موجود وہ داغ دیکھ سکیں۔ وہ جان سکیں گے کہ مردوزن کی محبت کے حوالے سے کس کے دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔"

☆☆☆

پیر عرفات سے ملے ہوئے روحی کو پانچ چھ دن گزر چکے تھے۔ اس کے کانوں میں ہروقت اس گفتگو کی بازگشت رہتی جو اس نے وہاں قبرستان میں پیر عرفات سے کی تھی، وہ وہمی لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی کمزور عقیدے کی تھی۔ ماورائی باتوں پر بھی اس نے بھروسا نہیں کیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی روز بہ روز اس کا یقین پختہ ہوتا جارہا تھا کہ اس تحریر کے حوالے سے جو کچھ پیر عرفات نے بتایا ہے، وہ درست ہے۔ اکتوبر کی انتیس تاریخ کو ضرور کوئی نہ کوئی انہونی ہوگی۔ کوئی ایسا واقعہ جو ہمیشہ کے لیے اس کے دل ودماغ پر نقش ہوجائے گا۔ اس نے پنجاب پبلک لائبریری میں جاکر کچھ کتابیں بھی دیکھی تھیں۔ ایک پرانی انگلش کتاب میں اسے اس موضوع پر تھوڑا سا اور بھی پڑھنے کو ملا تھا۔ ہوروا سکوپ کی اس کتاب میں عقرب لوگوں کی ایک دو ماورائی صلاحیتوں کا ذکر تھا۔ ان میں انسان کے اندر دیکھنے کی صلاحیت بھی تو ایک بہت طویل عرصے کے بعد تھوڑے سے وقت کے ان میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ طویل عرصہ کہیں ہزار سال کہیں کہیں پانچ سو سال۔ قدیم زمانوں میں بھی اس کے ثبو ملتے تھے۔ تو کیا پھر وہ سب کچھ ہوگا جس کا ذکر پیر عرفا نے کیا ہے؟ وہ جب اس انداز سے سوچتی تو ایک اور خیا اس کے لیے سوہان روح بن جاتا تھا اور بری طرح جھنجھو دیتا تھا۔ ولید بھی تو عقرب تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش 31 اکتوبر تھی۔ اگر یہ ساری انہونی باتیں درست تھیں تو پھر اس مطلب تھا کہ مقررہ تاریخ 29 اکتوبر کو رات کے آخری پہ ولید بھی اس قابل ہوگا کہ وہ روحی کے اندر جھانک سکے۔ کانپ جاتی تھی۔ وہ لاکھ انکار کرتی لیکن یہ حقیقت تھی ک اشباح آج بھی اس کے دل کے چور خانے میں کہیں موجو تھا۔ وہ اس کا نام تو اپنے حافظے سے کھرچ سکتی تھی، ان یادوں کو کیسے کھرچتی جو ماضی کے ماہ وسال میں بکھری ہو تھیں۔ چھوٹی چھوٹی یادیں، رنگین تہوار، خوشگوار سفر، شادی بیاہ کے پرمسرت موقعے، سیروتفریح کے سہانے دن بدلتے موسموں کے لمس، وہ سب کچھ ناقابل فراموش تھ روحی نے وہ سب کچھ دل کی گہرائیوں میں کہیں دفنا دیا لیکن گہرائی کتنی بھی ہو، تھا تو وہ دل کے اندر ہی، تو کیا ا کرشمے کی رات، ولید وہ سب کچھ دیکھ لے گا؟ وہ جان لے گا کہ روحی اپنے اندر ایک سرخ داغ چھپائے پھر رہی ہے ایک ہیولا اور شاید اشباح کا ہیولا۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ تو بے پناہ یقین رکھتا تھا اس پر۔ ہزار جان سے فدا ہو تھا...... اس کی دعاؤں میں، نیک تمناؤں میں اور روز وش میں صرف وہ تھی۔

وہ رات واقعی اگر تھی، تو قریب آرہی تھی۔ صرف پانچ روز درمیان میں تھے، وہ ہروقت سوچتی کہ اسے کیا چاہیے۔ وہ دیوانی سی ہورہی تھی۔ اس حوالے سے معمولی رسک بھی لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رات بھی وہ ولید کے ساتھ ایک ہی کمرے میں ہوگی۔ کے آخری پہر ولید اکثر اٹھ بھی جاتا تھا۔ اسے سگریٹ طلب ہوا کرتی تھی یا پھر ویسے ہی کچھ دیر کے لیے وہ کمر کی کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کو اندر آنے کا رستہ دیا کرتا بہت سوچنے کے بعد روحی اس نتیجے پر پہنچی کہ کچھ بھی ہو وہ پُراندیش رات میں ولید کے ساتھ نہیں ہوگی۔

اس کے لیے بہترین طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اس را اس سے ایک دن پہلے اپنے میکے چلی جاتی، لیکن مسئلہ یہ اس کے سارے گھر والے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں اس کے ابو کو کوئی دفتری کام تھا۔ وہ باقیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ گھر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ سوچ بچار کے بعد روحی نے یہ کیا کہ انیلا کو اپنے ہاں بلانے کا فیصلہ کیا۔ انیلا ولید کی خالہ زاد بہن تھی۔ اس کی والدہ فوت ہوچکی تھیں۔ وہ ولید کی والدہ کو اپنی والدہ کی طرح ہی سمجھتی تھی، اور آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں لیکچرار تھی اور آج کل اس کے رشتے کی بات چیت چل رہی تھی۔ روحی خود بھی ایک پریکٹیکل لڑکی تھی اس لیے انیلا کے ساتھ اس کی خوب بنتی تھی۔ روحی کو پتا تھا کہ جب انیلا ہوگی تو انیلا اس کے ساتھ علیحدہ کمرے میں سوئے گی اور یوں اسے وہ رات ولید سے علیحدہ گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ روحی نے ابھی تک کسی کو بھی پیر عرفات کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر وہ بتاتی بھی تو کوئی اس کی بات پر یقین نہ کرتا۔ شاید الٹا اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔

☆☆☆

اور پھر وہ انوکھی رات آگئی۔ شام ہی سے روحی کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ خود کو کسی قدیم قصے کہانی کا حصہ محسوس کر رہی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہوسکے گا؟ کیا سچ مچ کوئی انہونی اس کے سامنے آئے گی۔ ایک ہزار سال پورے ہوچکے تھے اور آج وہ رات تھی جب کچھ دیر کے لیے کچھ لوگوں کی نگاہوں کو ایک خاص توانائی ملنے والی تھی اور وہ ان لوگوں میں شامل تھی...... اور اس کے ساتھ ساتھ ولید بھی۔

اس نے نماز پڑھی اور دیر تک سربہ سجود رہی۔ خود کو روحانی سکون پہنچانے کی کوشش کرتی رہی۔ رات کے کھانے کے بعد باقی لوگ تو جلدی سوگئے۔ انیلا اور روحی ٹی وی دیکھتی رہیں اور باتوں میں مصروف رہیں۔ ولید کے ابا جان کے ڈر سے انہوں نے اپنی گفتگو کا والیم بہت کم رکھا ہوا تھا۔ بارہ ایک بجے کے لگ بھگ انیلا بھی جماہیاں لینے لگی لیکن روحی کے لیے یہ رات بہت مختلف تھی۔ وہ ایک انہونی کی منتظر تھی جو بقول پیر عرفات ایک ہزار سال کا سفر طے کرکے آج کی رات انسانی آبادیوں پر اتر رہی تھی اور عقرب قبیلے کے لوگ اس کا تجربہ کرسکتے تھے۔

وہ خود کو سمجھانے لگی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ تو وہم ہے یا پھر ILLUSION ہے۔ یہ کوئی سپنا نہیں ہے، جیتی جاگتی زندگی ہے۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کررہی ہیں۔ اس چار دیواری سے باہر لاہور کی سڑکوں پر اونگھتی ہوئی زندگی حرکت میں ہے...... دور کہیں کسی جلسہ گاہ سے مقرر کی مدھم آواز ابھر رہی ہے، آج کتنے عقرب لوگوں کو پتا ہوگا کہ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ آج کرشمے والی رات ہے انہیں جاگنا چاہیے، کچھ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سب واہمہ ہے...... کتاب میں بھی تو بس MYTH ہی بیان کی گئی تھی۔ کوئی ٹھوس بات تو وہاں بھی نہیں لکھی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگتی رہیں۔

انیلا کچھ دیر تک غنودہ آواز میں باتیں کرتی رہی۔ اپنی جاب کی باتیں، جاب کے مسائل کی باتیں۔ پھر وہ اس کے پہلو میں سوگئی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ بھی لیٹی رہی اور دل کی دھڑکنیں گنتی رہی۔ رات اب اپنے آخری پہر میں تھی اور آگے کو سرک رہی تھی، اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ۔ کچھ بھی تو انوکھا نہیں تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ اس کے اردگرد زندگی کی ٹھوس حقیقتیں تھیں۔ کچھ بھی ہٹ کر نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے روحی کی بے قراری کم ہوتی گئی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ کچھ انہونا نہیں ہوگا۔ یہ رات بخیریت معمول کے مطابق اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔

اس نے سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں سے سگریٹ کا پھٹا ہوا پیکٹ نکالا اور ایک الجھی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ یہاں کچھ نہیں تھا۔ وہی بے معنی الفاظ تھے۔ یکا یک وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اٹھی اور پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ سگریٹ پر کوئی تحریر نہیں تھی۔ لفظ اڑ چکے تھے۔ جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ صرف تاریخ لکھی تھی، صرف تاریخ۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ دیدوں کو سکیڑا۔ تاریخ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یکا یک اسے لگا کہ کمرے میں اور کھڑکیوں سے باہر ایک عجیب سی روشنی نمودار ہوگئی ہے۔ جیسے کسی نے صحن میں مرکری بلب جلایا ہو۔ لیکن ایسا بلب تو صحن میں تھا ہی نہیں۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے بستر سے اٹھی اور پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آسمان کا رنگ عجیب ہورہا تھا۔ ہر طرف ایک چمکیلی روشنی سی نظر آرہی تھی۔ اس روشنی نے سوئے ہوئے شہر کو جیسے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے دیکھا صحن سے آگے سڑک پر دو گارڈز پاس پاس کھڑے باتیں کررہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹ میں ان کی نیلی وردیاں نظر آرہی تھیں۔ ان کی رائفلیں ان کے کندھوں پر تھیں۔ روحی کی نگاہوں نے ایک منظر دیکھا اور اس کی حسیات سکتہ زدہ رہ گئیں۔ اسے لگا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر جائے گی۔ اس نے مضبوطی سے کھڑکی

کی چوکھٹ کو تھام لیا، اس نے ایک گارڈ کا سینہ دیکھا۔ وہ آئینے کی طرح تھا۔ اس کے اندر ایک سرخ ہیولا تھا...... ہاں وہ سرخ ہیولا تھا اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی...... عورت کا ہیولا تھا۔ اتنی دور سے اس کے نقوش تو نظر نہیں آتے تھے مگر وہ عورت تھی، پیر عرفات کے الفاظ روحی کی سماعت میں گونجے...... یہ پہلی محبت کا ہیولا ہوتا ہے......

”اوہ میرے خدا...... اوہ میرے خدا۔“ اس نے سر تھام لیا اور اکڑوں بیٹھ گئی۔ اس کا منہ بالکل خشک ہو رہا تھا۔ تب اس کی نگاہ اپنے آپ پر پڑی۔ اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اسے اپنا سینہ نظر آیا۔ اسے لگا کہ اس کا سینہ شیشے کا بنا ہوا ہے۔ اس شیشے کے آر پار وہ دیکھ سکتی ہے اور اس نے دیکھا۔ اس نے اپنی دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے سینے میں بھی سرخ ہیولا موجود تھا۔ گہرا سرخ اور حجم میں کافی بڑا۔ یہ کس کا ہیولا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ کس کا ہیولا ہے۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اس نے خود کو اپنی شال میں لپیٹنا چاہا۔ شال کے لپیٹے جانے سے ہیولا کچھ مدھم ہو گیا لیکن اوجھل نہیں ہوا۔ وہ غلاف میں شمع کی طرح روشن تھا۔ اس میں سے جیسے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

روحی کو لگا وہ واقعی بے ہوش ہو جائے گی۔ اس نے سوچا وہ انیلا کو جگا دے، اس نے مڑ کر انیلا کی طرف دیکھا۔ وہ چادر اوڑھے سیدھی سو رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب روحی کو ایک اور زبردست شاک لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہو گئی ہے، خلاؤں میں اڑتی اور گھومتی چلی جا رہی ہے۔ انیلا کے سینے میں بھی ایک روشن ہیولا موجود تھا۔ گہرا سرخ اور نہایت واضح...... یہ اس کے شوہر ولید کا ہیولا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو سکیڑا، اپنی توجہ مرکوز کی۔ وہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ ولید کا ہیولا تھا۔ یہ اسی کے نقوش تھے۔ وہ دیوانی سی ہو گئی۔ قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ دل جیسے اس کی کنپٹیوں میں اور اس کی آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں زور سے بند کیں...... اور پھر کھولیں۔ کیا یہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہے؟ نہیں، یہ جو کچھ ہے سامنے ہے۔ ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ آج اس زمین پر کیسی انوکھی شب اتری تھی۔ سینے آشکار ہو گئے تھے۔

”اوہ گاڈ...... اوہ گاڈ!“ وہ بڑبڑائی۔

اس کے بے پناہ تحیر اور خوف کو ایک طرح کے دکھ نے ڈھانپ لیا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر پیدا ہوئی اور اس لہر نے ہی شاید اس کی ڈوبتی نبضوں کو سہارا دیا، اسے بے ہوش ہونے سے بچایا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اب...... ولید کو بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی دروازے کی طرف بڑھی۔ شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر اس نے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھولا اور ننگے پاؤں کوریڈور میں آئی۔ ساتھ والے کمرے میں اس کے ساس سسر سوئے ہوئے تھے۔ کمرے میں انوکھی روشنی تھی۔ وہی روشنی جو ہر شے سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ساس سسر کے سینے بھی آئینے کی طرح نظر آتے تھے۔ اسے ان کے سینوں میں کوئی سرخی دکھائی نہیں دی، کوئی ہیولا نہیں تھا۔ وہ کمرے کے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آئی۔ ادھیڑ عمر زینب نماز پڑھ رہی تھی۔ شاید تہجد کی یا پھر نوافل تھے۔ وہ چادر میں لپٹی لپٹائی التحیات پر بیٹھی تھی۔ سامنے جائے نماز پر موٹے دانوں کی تسبیح پڑی تھی۔ لیکن زینب کے سینے میں بھی سرخ ہیولا چھپا ہوا تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گھونگریالے بالوں اور اونچی ناک والے کسی نوجوان کا چہرہ، پہلی محبت کا چہرہ۔ زینب کو یہ نظر نہیں آ رہا تھا شاید اس لیے کہ وہ عقرب نہیں تھی۔ روحی لڑکھڑاتے ہوئے اپنے اور ولید کے بیڈروم تک پہنچی۔ پہلے وہ دروازہ کھولنا چاہتی تھی مگر پھر کھڑکی کی طرف آئی۔ ایک پردہ سرکا ہوا تھا۔ وہ اندر دیکھ سکتی تھی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ولید شاید میوزک سنتے سنتے سو گیا تھا۔ روحی نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔ ولید کے سینے میں گہرا سرخ ہیولا موجود تھا۔ اس نے جیسے اس کے پورے سینے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ روحی نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ یہ انیلا کا ہیولا تھا۔

کمرے میں ولید کے پسندیدہ گیت کے بول گونج رہے تھے۔

اب کے سال پونم میں جب تو آئے گی ملنے
ہم نے سوچ رکھا ہے رات یوں گزاریں گے
دھڑکنیں بچھا دیں گے شوخ تیرے قدموں میں
ہم نگاہوں سے تیری آرتھی اتاریں گے

روحی ایک سسکی لے کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ پھر کمروں میں اور کھڑکیوں میں موجود پراسرار روشنی کم ہوتی چلی گئی۔ روحی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح تھا، کسی صندوق کی طرح بند۔

لرزہ خیز انکشافات کی گھڑی گزر چکی تھی۔

انوکھا انتقام

سلیم انور

ریمنگٹن کی آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر کھلی۔ اس کے ففتھ ایونیو کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے باہر تیز دھوپ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت مجھے کون فون کر سکتا ہے؟ ساتھ ہی اس کا ہاتھ بیڈ سائیڈ ٹیلی فون کو ٹٹولنے لگا۔

کیا لوگوں کو احساس نہیں کہ تھیٹر کے ایک بڑے تنقید نگار کی صبح کی نیند سے بیداری عام لوگوں کے صبح جاگنے کے

کچھ لوگوں کو خود پر یہ گھمنڈ ہوتا ہے کہ دنیا گویا انہی کے سہارے چل رہی ہے... خواہ وہ خود کتنی ہی لاٹھیوں کے محتاج ہوں۔ ایسے لوگوں کا فقط یہی علاج ہے کہ انہیں اپنی خوبیوں سے مات دے دی جائے... اور یہی بہترین انتقام بھی ثابت ہوتا ہے... اس نے بھی ہمت نہ ہاری اور اپنی صلاحیتوں سے اس گھمنڈی کو زمین کی خاک چٹوا دی۔

انتقام کی درست سمت پر چلنے والی ایک باشعور فنکارہ کا قصہ

اوقات سے قطعی مختلف ہوتی ہے؟

اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ہیلو؟“

”مسٹر ریمنگٹن؟“

”ہاں، بول رہا ہوں؟“ ریمنگٹن نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسری جانب سے کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی جس کا لہجہ نہایت دلکش تھا۔ آج کل اسے عورتیں کم ہی فون کیا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے ہلکے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں درست کیا جیسے کہ وہ عورت ٹیلی فون پر اسے دیکھ رہی ہو۔

”میں تانیا لیمور ہوں۔ شاید میں تمہیں یاد نہ ہوں، لیکن میں نے گزشتہ سال اوڈین تھیٹر میں اے سونگ فارنڈ نائٹ نامی اسٹیج ڈرامے میں لیڈنگ رول ادا کیا تھا۔ میں نے ڈرامے کی اوپننگ نائٹ پر اپنی پرفارمنس کے بارے میں تمہارے تبصرے کا مطالعہ کرنے کے بعد میڈیا کے روبرو چند ہتک آمیز باتیں کہی تھیں اور میں نے معذرت کے لیے فون کیا ہے۔ پلیز، میری بات ضرور سنیں!“

”تانیا لیمور!“

ریمنگٹن کو تانیا لیمور اچھی طرح یاد تھی۔ سنہری زلفوں والی، خوب صورت اور دراز قامت!

اور وہ تانیا لیمور کی اداکاری سے متعلق اپنے دل آزار تبصرے کو بھی نہیں بھولا تھا۔ گو تانیا نے اپنا کردار نہایت عمدگی سے ادا کیا تھا لیکن ریمنگٹن کی رائے میں نو آموز اداکاروں کو اپنے فائدے کے لیے سختی تو سہنا ہی پڑتی ہے۔ خود کو منوانے کے لیے ان کو جدوجہد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اسی لائق ہوتے ہیں۔ فوری کامیابی انہیں ضائع کر دیتی ہے۔

اے سونگ فارنڈ نائٹ نامی وہ اسٹیج ڈراما اپنے ابتدائی ہفتے کے بعد ہی بند ہو گیا تھا۔ ایسا بارہا ہوتا تھا جب وہ کسی ڈرامے کے بارے میں اپنا منفی تبصرہ لکھتا تھا۔ اس ڈرامے کے بعد سے اس نے تانیا لیمور کو اسٹیج پر اداکاری کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اس کے متعلق کالم گاہے بہ گاہے پڑھتا رہتا تھا۔

تانیا لیمور رومانٹک اداکاری کے میدان میں کامیابی کے زینے طے کرتے ہوئے اب ایک اسٹار بن چکی تھی اور اسٹیج کے ساتھ ساتھ فلموں اور ٹی وی میں بھی اس کا نام تھا۔

”تم مجھے اچھی طرح یاد ہو، مس لیمور۔ معذرت کی چنداں ضرورت نہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ ریمنگٹن نے شائستہ لہجے میں کہا۔

”تم نہایت ہی مہربان شخصیت ہو مسٹر ریمنگٹن میں اس احساس ندامت کے بوجھ کو ایک سال سے اپنے ذہن پر لیے پھر رہی ہوں اور میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس کے بارے میں کئی مہینوں سے سوچ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ میں نے ایک ایسا راستہ تلاش کر لیا ہے جس سے ہم دونوں خوش ہو جائیں گے۔“ تانیا لیمور نے اپنے مخصوص دلکش لہجے میں کہا۔

”تو پھر پلیز ابھی اور فوراً اپنے اس احساس ندامت کے بوجھ کو اپنے ذہن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دو اور مجھے اپنے پلان کے بارے میں بتاؤ!“ ریمنگٹن کا لہجہ پرتپاک تھا۔

ایک برس پہلے کے درشت تبصرے اور سخت الفاظ کے بعد اب تانیا کے ساتھ اس کے نرم رویے کا جواز موجود تھا۔ اسے اپنا نام برقرار رکھنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ تانیا لیمور نے اسے فون کر کے اس کے ساتھ ایک بڑی عنایت کی تھی، گو یہ فون کال ریمنگٹن کے لحاظ سے اس کے سونے کی اوقات میں کی گئی تھی۔

”کیا تم مجھے اس بات کا موقع دو گے کہ میں اپنے اس احساس ندامت کے بوجھ کو آج رات ذاتی طور پر روبرو معذرت کر کے اپنے ذہن سے اتار پھینکوں؟“ تانیا لیمور نے پوچھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا ہے، مس لیمور؟ فی الوقت میری شبوں کا پروگرام پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔“ ریمنگٹن نے اپنے اس جواب پر دل ہی دل میں خود کو داد دی کہ اس نے نہ تو ہاں کہا اور نہ ہی نہ کہا۔ پھر وہ یہ جاننے کے لیے بے تابی سے آگے کی جانب جھک گیا کہ وہ آگے کیا کہتی ہے۔

”میں امید کرتی ہوں کہ تم میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گے۔ ڈیجبری میں میری ایک چھوٹی سی پناہ گاہ ہے اور وہاں کے پیلس آرنز ہوٹل کا شیف زبردست کھانے بناتا ہے۔ کیا تم آج شب ڈرائیو کر کے وہاں ڈنر پر مجھے میزبانی کا شرف بخشو گے؟“

ریمنگٹن تذبذب میں پڑ گیا۔ گو تانیا کے لہجے سے اطمینان اور آسودگی کا اظہار ہو رہا تھا لیکن ریمنگٹن کی ہچکچاہٹ کی وجہ ڈیجبری تھا جو کہ مڈٹاؤن سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ ادھر براڈوے پر آج رات آٹھ بجے ڈیز آف گلوری نامی اسٹیج ڈرامے کی اوپننگ ہو رہی تھی جس کی اسٹار اور مرکزی کردار ایشلے ٹائنس نامی ایک نووارد اداکارہ تھی۔

”پلیز سر۔ یہ میرے لیے نہایت عزت افزائی کا باعث ہوگا!“ تانیا کے لہجے میں التجا تھی۔

ریمنگٹن مسکرا دیا۔ اسے پہلے سے علم تھا کہ نووارد ایشلے ٹائنس کی اداکاری کے متعلق اس کا تبصرہ کیا ہوگا۔ تو پھر وہ حسین و جمیل تانیا لیمور کے ہمراہ ایک متوقع پر لطف شب گزارنے کا موقع ہاتھ سے کیوں جانے دے اور انکار کیوں کرے؟ یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی اگر وہ تانیا کے احساس معذرت کو ایک یادگار شب میں بدلنے میں کامیاب ہو جائے۔

”یہ میرے لیے انتہائی مسرت بخش لمحہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں اتنا سوچا اور خیال کیا۔ میں تمہاری اس پرخلوص پیشکش کو قبول کرتا ہوں۔“ ریمنگٹن نے جواب دیا۔

”مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کیا ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا؟“

”ٹھیک ہے!“

”ہم ڈنر ہوٹل میں کریں گے۔ پھر میٹھے کے لیے میری پناہ گاہ آ جائیں گے۔ میں چاکلیٹ چپ پائی بناؤں گی۔ میں نے پڑھا ہے کہ یہ تمہاری پسندیدہ ڈشوں میں سے ایک ہے۔“

”یقیناً پسندیدہ ہے، مس لیمور۔ تمہاری خیال داری کا شکریہ!“ ریمنگٹن نے کہا۔

پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور سائن کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنے والی شب کے حسین تصور میں کھو گیا۔

وہ وقتاً فوقتاً اپنے تبصرے حقیقت میں پرفارمنس دیکھے بغیر ہی لکھ دیا کرتا تھا۔ بعض ڈرامے، بعض اداکار قابل پیش گوئی ہوتے تھے...... ایسی بکواس اناڑی پن کی اداکاری اور ڈرامے کو دیکھنا اپنے قیمتی وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے اور شب کے ڈرامے کو دیکھنا اور وقت ضائع کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

وہ بستر سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنا معمول کا ناشتا کیا جو اس کی ہاؤس کیپر فراہم کرتی تھی۔ پھر وہ اپنی میز پر بیٹھ گیا اور شب کو براڈوے پر پیش کیے جانے والے ڈرامے ڈیز آف گلوری پر اپنا تبصرہ لکھنے لگا۔

تبصرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے جیک اورانس کا سیل نمبر ملایا۔ جیک اس کا بااعتماد میسنجر تھا۔ وہ اور جیک ایک دوسرے کو بہ خوبی سمجھتے تھے۔

کائنات

مشہور فلسفی خلیل جبران نے ایک لڑکی سے سوال کیا جو اس وقت پینٹنگ کرنے میں مصروف تھی۔

”اس کائنات کی صرف سات لفظوں میں تعریف کرو۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”خدا، محبت، امن، زندگی اور زمین۔“ یہ کہہ کر لڑکی خاموش ہو گئی۔

خلیل جبران نے حیران ہو کر کہا۔ ”دوسرے دو الفاظ......؟“

تو اس نے کہا کہ دوسرے دو الفاظ ”تم“ اور ”میں“ ہیں کیونکہ اگر یہ دو الفاظ نہ ہوں تو باقی کے پانچ الفاظ کی معنوی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔“

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

دوسری جانب سے فون اٹھانے پر اس نے جیک سے کہا۔ ”جیک، میرے پاس ایک لفافہ ہے جو میں آج رات تمہارے ہاتھوں ”دی ٹائمز“ کو ڈیلیور کرانا چاہتا ہوں۔ دھیان رہے کہ وہ لفافہ رات ٹھیک گیارہ بجے وہاں موصول ہو جائے۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ اوکے!“

گڈ اولڈ جیک، ریمنگٹن مسکرا دیا۔ گزشتہ کئی برسوں سے وہ جیک کو فراخ دلی سے بخششیں دیتا چلا آ رہا تھا جس کی بنا پر اسے جیک پر مکمل اعتماد تھا کہ اس سے جیسا کہا جاتا ہے وہ ویسا ہی کرتا ہے، اپنا منہ بند رکھتا ہے اور کوئی سوال نہیں پوچھتا۔ وہ برسوں سے اکٹھے کام کرتے چلے آ رہے تھے۔

ریمنگٹن نے اپنا بقیہ دن اپنی ڈیٹ کی تیاری میں گزار دیا۔

وہ اپنی ہیئر اسٹائلنگ کے لیے ہینری کے پاس گیا۔

کیسی جو سے اس نے ایک سپریم مساج کرایا۔

مونیکا نے اس کی ناخنوں کی اسپیشل تراش میں کئی اضافی منٹ صرف کیے۔

وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ جب بھی کہتا تھا تو سروس کرنے والے یہ لوگ اچھل کود شروع کر دیتے تھے۔

بعد میں ریمنگٹن ایک گوچی اسٹور میں چلا گیا اور وہاں سے ایک نئی بیلٹ، جوتوں کا جوڑا اور ایک اوور نائٹ کیس خریدا۔ تمام تفصیلات اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں اور وہ اس شب کو ایک شاندار، یادگار شب بنانے کا ارادہ

رکھتا تھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ حسین و دلکش تانیا لیمور نے شب کے لیے اس کی رفاقت کی خواہش کی ہے۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد رہا کہ وہ میٹھے میں چاکلیٹ چپ پائی کا بے حد شوقین ہے۔

ٹھیک چھ بجے دربان نے اس کی پورشے کار پورچ میں لاکر کھڑی کردی۔ ریمنگٹن چمڑے کی نرم ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور اپنی پُرآسائش کار کو شہر کے ہیوی ٹریفک میں چلاتا ہوا شہر سے باہر نکل آیا۔

ڈیبجری پہنچ کر اس نے کار کا ایک بٹن دبایا تو ایک بھاری آواز نے پیلس آرمز ہوٹل تک اس کی رہنمائی کردی۔

ہوٹل کے لاؤنج میں بچھا ہوا زرد رنگ کا قالین اتنا دبیز تھا کہ ریمنگٹن کے جوتے اس میں دھنسے جارہے تھے۔ اس کے داہنی جانب ایک مرد گلوکار پیانو بار پر مون ریور گا رہا تھا۔

ریمنگٹن نے مارٹینی کا آرڈر دیا اور اپنا جام لے کر ویلوٹ کے بنے ہوئے ایک صوفے پر ایسی جگہ جا بیٹھا جہاں سے وہ ہوٹل کے پیتل اور اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے داخلی دروازے کا صاف نظارہ کرسکتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر تانیا لیمور کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس سے قبل کہ تانیا اسے دیکھ پائے، وہ تانیا کو دیکھ لے۔ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتا تھا کہ ایک عورت کو پہلے دیکھنے سے اسے قدرے برتری کا احساس ہوجاتا تھا اور ان کی شب کی رفاقت کے آغاز ہی سے اسے اس ملاقات پر مکمل کنٹرول حاصل رہتا تھا۔

لاؤنج کی ہلکی روشنی انتظار کے لحاظ سے ایک خوش گوار اسپاٹ ثابت ہو رہی تھی۔ گویا وہ تمام پرانے گیت گا رہا تھا جو ریمنگٹن کو بے حد پسند تھے...... نائٹ اینڈ ڈے، مائی فنی ویلنٹائن، اسٹارڈسٹ......

"ایک اور ڈرنک، سر؟" ایک ویٹر نے اس کے پہلو میں آکر اچانک پوچھا۔

ریمنگٹن نے اپنے سامنے رکھے ہوئے تین خالی گلاسوں کی طرف دیکھا۔ تانیا یقیناً لیٹ ہوگئی تھی۔ اس نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہاں سے تانیا اس کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کی نگاہ مستقل داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ذہن کو کلیئر کرنے کے لیے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ کیا تانیا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے؟ وہ جس بزنس سے وابستہ ہے اس میں ہر کوئی وقت پر پہنچنے کی اہمیت کو بہ خوبی سمجھتا ہے۔ اس نے ایکسیڈنٹ کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ نہیں، اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہوگا۔ وہ اپنی سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی خود کو بنا سنوار رہی ہوگی اور خود کو آخری ٹچ دے رہی ہوگی تاکہ ریمنگٹن کو اچھی طرح متاثر کرسکے۔

اس نے ویٹر کی لائی ہوئی نئی مارٹینی بھی حلق سے نیچے اتار لی۔

پھر چند منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھ کر رجسٹریشن ڈیسک کی جانب چل دیا۔

"میرا نام ریمنگٹن پارک ہے!" اس نے ڈیسک اٹینڈنٹ سے کہا۔ "کیا کسی نے میرے بارے میں دریافت کیا ہے؟ میں ایک لیڈی کا منتظر ہوں۔" یہ پوچھنے کے بعد اس نے اپنی دستی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو ہوا چاہتے تھے۔ اگر اسے کسی بات سے چڑ تھی تو وہ، وہ عورت ہوتی تھی جو اسے انتظار کراتی تھی۔

حتیٰ کہ حسین و دلکش تانیا لیمور کو بھی اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اس کی اچھی فطرت کا ناجائز فائدہ اٹھائے۔

"آپ جس خاتون کا انتظار کر رہے ہیں غالباً انہیں آنے میں دیر ہوگئی ہے۔" ڈیسک اٹینڈنٹ نے کہا۔ "کیا وہ خاتون ہماری رجسٹرڈ مہمان ہیں؟"

"نہیں۔ وہ ڈیبجری کی مقامی رہائشی ہیں۔ ہم نے یہاں ڈنر پر ملاقات طے کی تھی۔ میرے لیے ایک اور مارٹینی منگوا دو، پلیز۔" وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھنے کے لیے پلٹ گیا۔ "اور ذرا جلدی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔"

اسے چاہیے تھا کہ تانیا لیمور سے اس کا فون نمبر لے لیتا۔ اسے اپنی اس نادانی پر خود پر غصہ آنے لگا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ اٹھا اور قدرے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اس جانب چل دیا جدھر فون بوتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ فون ڈائریکٹری میں تانیا لیمور کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

لیمور...... لیمور...... اس نے عینک درست کی اور دوبارہ ڈائریکٹری چھان ماری لیکن اس کا نام کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یقیناً اپنی پرائیویسی کے تحفظ کی خاطر تانیا لیمور نے اپنے لیے ایسا فون نمبر لیا ہوگا جو فہرست میں درج نہ ہو۔

پھر اس نے آپریٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

"مس تانیا لیمور کا نمبر، پلیز۔"

فون پر کچھ دیر تک بھنبھناہٹ سنائی دیتی رہی۔ پھر آپریٹر کی آواز ابھری۔ "آئی ایم سوری، سر۔ میرے پاس لسٹ میں مس تانیا لیمور کا کوئی نام نہیں ہے۔"

ریمنگٹن نے ریسیور پٹخ دیا۔ "احمق آپریٹر!" وہ غصے سے بڑبڑایا۔

پھر وہ اپنے صوفے پر پلٹ آیا۔ اس نے اپنا نیا جام ختم کرلیا اور مزید ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔

"نسر۔" بارٹینڈر نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ ہوٹل کی جانب سے کافی کا ایک کپ قبول کرلیں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ میں کیا پینا چاہتا ہوں اور وہ یقیناً کافی ہرگز نہیں ہے۔"

بارٹینڈر چلا گیا اور چند منٹ بعد ہوٹل کا باوردی منیجر ریمنگٹن کے پاس آگیا۔

"سر، آئی ایم سوری۔ اب ہم آج کی شب آپ کو مزید ڈرنکس سرو نہیں کرسکیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا ارادہ ڈرائیونگ کرنے کا نہیں ہوگا۔"

"میں آج کی شب اس ہوٹل میں قیام کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔" اس نے تانیا لیمور کی اس چھوٹی سی پناہ گاہ کا تصور کرتے ہوئے جھوٹ بولا، جس کا تذکرہ تانیا نے کیا تھا۔

"میں آپ کے لیے کمرے کا انتظام کرتا ہوں۔" منیجر نے کہا۔

ہوٹل کا ایک خدمت گار ریمنگٹن کی کار سے بیگ نکال کر لے آیا اور لفٹ تک لے جانے اور اس کے کمرے تک پہنچانے میں اس کی مدد کی۔

"اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مجھے طلب کرلیجیے گا، سر!" خدمت گار نے روشنی مدھم کرتے ہوئے ٹیلی وژن آن کردیا اور کمرے سے چلا گیا۔

ریمنگٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سو تانیا لیمور کا اس سے معافی مانگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ کھڑا سوچتا رہا۔ وہ احمق عورت اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی اور یہ اس کے بدلہ لینے کا ایک انداز تھا۔ غصے سے ریمنگٹن کے گال تمتمانے لگے۔ عورتیں ریمنگٹن پارک کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ اپنی اس ہتک کا بدلہ کس طرح لیا جائے۔ اس کے قدم ایک لمحے کے لیے ڈگمگائے۔ پھر وہ دھم سے بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ اس نے اس پاجامے، چغے اور سلیپرز پر کوئی دھیان نہیں دیا جو خدمت گار اس کے لیے رکھ کر گیا تھا۔

وہ لباس تبدیل کیے بغیر جوتوں سمیت سوچکا تھا۔

اگلے روز صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور جسم کا ہر ایک عضو جیسے چلّا رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی تو ٹیلی وژن کے نیوز اناؤنسر کی بیزار کن آواز اسے بری طرح کھلنے لگی۔

ہوں! اس نے اس لعنتی شے کو یقیناً رات بھر کھلا چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے بند کرنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ ٹیلی وژن کے سوئچ تک نہیں پہنچ سکا۔

نیوز اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

"گزشتہ شب براڈوے کے فیسٹیول تھیٹر میں پیش کیے جانے والے ڈرامے، ڈیز آف گلوری کے اوپننگ شو میں اپنی بہترین پرفارمنس پر ناظرین نے اداکارہ تانیا لیمور کے لیے کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں اور پُرجوش خراج تحسین پیش کیا۔ پردہ گرنے کے بعد ناظرین کی طرف سے اداکارہ کو بار بار اسٹیج پر بلانے کے لیے اصرار کیا گیا۔ اس سے قبل گزشتہ روز صبح ڈرامے کی اسٹار ایشلے ٹائٹس پر اچانک ورم نرخرہ کی بیماری کا حملہ ہوا تو اس کی جگہ نوآموز اداکارہ تانیا لیمور کو ڈرامے کا لیڈنگ رول سونپ دیا گیا۔ تانیا لیمور نے اپنی شاندار پرفارمنس سے ثابت کردیا کہ وہ تھیٹر کی ان بہترین اداکاراؤں میں سے ایک ہے جو تھیٹر کے شائقین کو اس عشرے میں دیکھنے کو ملی ہیں۔"

ریمنگٹن کے ذہن کو اس اناؤنسمنٹ کا بھرپور اثر لینے میں چند منٹ لگ گئے۔

تانیا لیمور نے لیڈنگ رول ادا کیا۔ تماشائیوں نے کھڑے ہوکر اور تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کیا۔

پردہ گرنے کے بعد ناظرین کی طرف سے اداکارہ کو بار بار اسٹیج پر بلانے کے لیے اصرار کیا گیا۔

اور پھر ریمنگٹن کا دھیان اپنے اس تبصرے پر چلا گیا جو اس نے ڈراما دیکھے بغیر تحریر کیا تھا اور صبح کے اخبارات میں چھپ چکا تھا۔ لوگ اس وقت اپنی صبح کی کافی کے ساتھ حیرت سے اس دل آزار تبصرے کو پڑھ رہے ہوں گے جس میں اس نے لکھا تھا کہ ایشلے ٹائٹس کی بھونڈی اداکاری کی بنا پر تھیٹر کی عقبی تمام نشستیں بھی پُر نہیں ہوسکیں گی۔

ریمنگٹن بیڈ پر کروٹیں بدلنے لگا۔ وہ اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں جا کر چھپ جائے۔

تانیا لیمور نے نہ صرف اپنا انتقام لے لیا تھا بلکہ اس کا بہ طور تنقید نگار کیریئر ہی تباہ کردیا تھا۔

اس نے بے بسی کے عالم میں اپنا منہ تکیے میں چھپالیا۔

■

محفلِ شعروسخن

❁ جنید احمد ملک……گلستان جوہر، کراچی
کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام ودر
یہ وہی دیار ہے دوستو، جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

❁ مدحت……کراچی
خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

❁ محمد فراز……کورنگی، کراچی
کُھلی ہے آنکھ حقیقت کی، انتقال کے بعد
میں زندگی تجھے سمجھا ہوں دیکھ بھال کے بعد

❁ سعید عباسی……بہاولپور
ہم تم کو بھول جائیں گے مگر شرط ایک ہے
گلشن میں چل کے پھول سے خوشبو جدا کرو

❁ حسیب احمد چنائے……الکڈی کرک
اپنا اسے بناتا اگر میرے بس میں ہوتا
لوٹ آتا لوٹ آتا اگر میرے بس میں ہوتا
آنکھوں میں ان کی جاتا صورت بدل بدل کر
خوابوں میں آتا جاتا اگر میرے بس میں ہوتا

❁ محمد صفدر……خانیوال
بیٹھو گی اگر جوڑنے ٹوٹے ہوئے رشتے
آئے گی بہت یاد ملاقات ہماری

❁ محمد خواجہ……کورنگی، کراچی
عجیب رنگ میں گزری ہے زندگی اپنی
دلوں پہ راج کیا اور پیار کو ترسے

❁ ایم کامران خالد……چھب
محبت کی سزا بے مثال دی اس نے
اداس رہنے کی عادت سی ڈال دی اس نے
میرے وجود پہ جب اتنے زخم دیکھ چکا
پھر جان بوجھ کر کانٹوں کی شال دی اس نے

❁ ادریس احمد خان……ناظم آباد، کراچی
بس یہ ہی بات کہ لوگوں کو نہ چاہو دل سے
تجربے اس کے سوا عمر کو کیا دیتے ہیں

❁ ظفر اقبال……ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
خود تو پیتے رہے بھر بھر کے جام
ہم نے شرم سے مانگی نہیں ساقی کو خیال نہ آیا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر……نئی منڈی،
اپنی ہر اک شام ہر اک رات بیچ کر
ہمیں آگیا ہے جینا اپنی ذات بیچ کر
ہم بھی کتنے عجیب ہیں کڑی دھوپ بیچ کے
صحرا خرید لائے ہیں برسات بیچ کر

❁ قیصر اعوان……ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مجھ سے کھیلتی رہی دنیا تاش کے پتوں کی طرح قیصر
جس نے جیتا اس نے پھینکا، جس نے ہارا اس نے بھی پھینکا

❁ سرِبابر عباس……گلیانہ روڈ، کھاریاں
میں کس طرح تجھے لفظوں کا پیرہن بخشوں؟
مرے ہنر کی بلندی تو سرنگوں ہے ابھی
ترے بدن کے خدوخال میرے بس میں نہیں
میں کس طرح تجھے سوچوں، یہی جنوں ہے ابھی!

❁ قاضی عرفان احمد عاجز……آڑہ، چکوال
دل کا حرم تو اس طرح سے سجا ہے
تو اک سمت میں ہے اک سمت میں خدا ہے
گر یہ گناہ بھی ہے تو رب ہی جانتا ہے
دونوں سے عشق میرا بس یہ مجھے پتا ہے

❁ محمد کمال انور……اورنگی ٹاؤن، کراچی
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو

❁ زوہیب احمد……گلستان جوہر، کراچی
رونے والے تجھے رونے کا سلیقہ ہی نہیں معلوم
آنسو پینے کے لیے ہوتے ہیں بہانے کے لیے نہیں

❁ سہیل قائم خانی……میرپورخاص
دریا میں اک بوند کی طرح گم ہوجاؤں
میں اپنے آپ سے نکلوں اور تم ہوجاؤں

❁ محمد رشید سیال……روہڑی
حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتے
ٹوٹے بھی جو تارے تو زمیں پر نہیں گرتے
گرتے ہیں بڑے شوق سے سمندر میں کئی دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتے

❁ محمد اقبال……کراچی
داستانِ عشق جب بکھری تو لامحدود تھی
اور جب سمٹی تو اس کے نام ہوکے رہ گئی

❁ بلاول حسین……سرگودھا
کتنی تشریح کروں اس ظالم کے حسن کی
ہونٹوں پہ ہی رقم اک پوری کتاب ہوگئی

❁ ذوالفقار احمد……لاہور
کاش گزرتی شب مجھ پہ مہرباں ہوجائے
کچھ ایسا ہوجائے کہ اچانک تم چلے آؤ

❁ شبانہ……لاہور کینٹ
ہر لفظ کو کاغذ پہ اتارا نہیں جاتا
ہر نام سرِعام پکارا نہیں جاتا
ہوتی ہیں محبت میں کچھ راز کی باتیں
ایسے ہی تو اس کھیل میں ہارا نہیں جاتا

❁ کمیل عباس……گلیانہ روڈ، کھاریاں
اجاڑ بستی کے باسیو، ایک دوسرے سے پرے نہ رہنا
ہوا درختوں سے کہہ گئی ہے، کسی بھی رُت میں ہرے نہ رہنا
میں اپنے روٹھے ہوئے قبیلے کی سازشوں میں گھرا ہوا ہوں
تم اجنبی ہو تو میرے آنگن کی وحشتوں سے ڈرے نہ رہنا

❁ بابر عباس……گلیانہ روڈ کھاریاں
ہجر کی صبح کے سورج کی اداسی مت پوچھ
جتنی کرنیں ہیں وہ اشکوں کی طرح پھوٹتی ہیں
تجھ سے پہلے بھی کئی زخم تھے سینے میں مگر!
اب کے وہ درد ہے دل میں کہ رگیں ٹوٹتی ہیں

❁ رضیہ خاتون……کراچی
یہ کائناتِ شمس و قمر آپ ہی سے ہے
تا بندگیِ شام وسحر آپ ہی سے ہے

❁ ظہور احمد……میرپورخاص
ہاتھ خالی ہیں تو دانائی کا اظہار نہ کر
ایسی باتوں کا بڑے لوگ برا مانتے ہیں

❁ انیلا ٹوانہ……جیکب آباد
تم بھی بدل ہی جاؤ زمانے کے ساتھ ساتھ
میرا نہ ساتھ دو کہ برا مانتے ہیں لوگ

❁ محمد امجد ریاض……چیچہ وطنی، ساہیوال
بے نور ہوچلی ہے بہت شہر کی ہوا
تاریک رستوں پہ کہیں کھو نہ جائیں ہم
اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
محسن چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

❁ آفتاب احمد……ناظم آباد، کراچی
جھولا پڑا نہ چھاؤں میں بیٹھا کوئی فقیر
شیشم کا پیڑ شہر میں بے آبرو ہوا

❁ عزیز پراچہ……اسلام آباد
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

❄ قیصر اقبال گچہ......ضلع بھکر
مجھ سے ناراض ہے، تو چھوڑ دے تنہا مجھ کو
زندگی! دیکھ مجھے روز تماشا نہ بنا

❄ محمد واجد علی گچہ......ضلع بھکر
تیری طلب یوں جلادے سارے آشیانے
کہاں رہوں میں، تیرے دل میں گھر بنانے تک

❄ رضوان تنولی کریڑوی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
تیرے خاموش ہونٹوں پر محبت گنگناتی ہے
تو میری ہے میں تیرا ہوں، بس یہی آواز آتی ہے

❄ محمد سبحان......جہلم
کوئی تعویذ ایسا دو صاحب کہ میں چالاک ہوجاؤں
بہت نقصان دیتی ہے مجھے یہ سادگی میری

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
اک حد میں ساتھ تھے تو بے حد قریب تھے
بے حد ہوئے قریب تو قصہ ہوا تمام

❄ نوراللہ......ملیر، کراچی
امتزاجِ یار میں رنگوں کا امتزاج تو دیکھ
سفید جھوٹ ہیں ظالم کے سرخ ہونٹوں پہ

❄ محبت الحق......نارتھ کراچی، کراچی
مسلسل غم اٹھانے سے یہ بہتر ہے اگر مانو
کنارہ کرنے والوں سے کنارہ کرلیا جائے

❄ نسیم احمد......سیالکوٹ
یہ واجباتِ عشق ہم پہ ہی قرض کیوں؟
وہ بھی ادا کرے محبت اسے بھی تھی

❄ شگفتہ یاسمین......لاہور
رنجشیں بڑھتی ہی جارہی ہیں آج کل
صدقہ دوں، منت مانگوں یا نظر اتاروں محبت کی

❄ جبران احمد......گلشن اقبال، کراچی
بے وفائی کے سب الزام اپنے سر لے کر
میں اسے آج حیرت میں ڈال آیا ہوں

❄ رحیمہ سرور......ساہیوال ڑی، لاہور
ٹوٹ کر بھی یہ کم بخت دھڑکتا رہتا ہے
میں نے اس دنیا میں دل سے زیادہ کوئی وفادار نہیں دیکھا

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
تیرے ہاتھوں کی چوڑیاں اے دوست
نغمۂ عید گنگناتی ہیں......

❄ یاسمین جبار......کوئٹہ
آنکھوں میں ہے تبسم ہونٹوں پہ مسکراہٹ
چہرے سے ہے یہ ظاہر یادِ بہار آئی

❄ زینب......حیدرآباد
پھر پلٹ آئی ہیں ساون کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں جلنے کے زمانے آئے

❄ کاشف عمیر......کراچی
میں ہوں، تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے

❄ ذاکر خان......ملتان
پڑھ تو لیا ہے ان کو مگر کیسے پھینک دوں
خوشبو تمہارے ہاتھ کی ان کاغذوں میں ہے

❄ دانش عمیر......کراچی
بھیگ جاتی ہیں جو پلکیں کبھی تنہائی میں
سوچتا ہوں میرا درد کوئی جان نہ لے

❄ ڈاکٹر عمران فاروق......جھنگ
اسے کہنا کہ پلکوں پر نہ ٹانکے خواب کی جھالر
سمندر کے کنارے گھر بنا کر کچھ نہیں ملتا

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
اب تو تنہائیاں بھی پوچھتی ہیں
ہے تیرا بھی کوئی صنم بابا

❄ قاسم نصیب......صفدر آباد
کہا ساتھی کوئی دکھ درد کا تیار کرتا ہے
جواب آیا کہ یہ دریا اکیلے پار کرنا ہے

کوپن
برائے
شمارہ
اکتوبر
2013

مُحفلِ شِعر وسُخن

نام : --

پتا : --

مقابلہ

روبینہ رشید

انسان کو یونہی اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا... اس خالق کو معلوم تھا کہ میری یہ مخلوق چٹکی بھر عقل کے گھوڑے یوں دوڑائے گی کہ زندگی پرت پرت حیران رہ جائے گی... کچھ ایسا ہی حال ان ذہانت کے بیوپاریوں کا بھی تھا جو شریکِ سفر تو تھے مگر شریکِ راز نہ تھے... ایک ہی رستے کے مسافر تھے مگر جانے کیوں اپنی منزلوں کو ظاہر نہ کرتے تھے... جنہیں اپنے فن میں کمال حاصل تھا، جو ایک دوسرے کی محبتوں میں پور پور ڈوبے ہوئے تھے مگر صلاحیتوں اور مقاصد کے حصول میں ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے... بنانے والے نے جانے یہ کیسا جوڑا بنایا تھا جو ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکن اور جذبات سے تو واقف تھے مگر من کے بھید چھپائے پھرتے تھے... بالآخر سانسوں کا شمار بھی کچھ اس طرح ہوا کہ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ... گویا رشتے کی ڈوری سانسوں کی ڈوری پر سبقت لے گئی...

ذہانت کی جنگ میں دو انسانوں کی کیمسٹری کا حیرت انگیز امتزاج

لیزلی اپنی لیب میں موجود قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو توصیفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت عورت تھی، اس کی سیاہ چمکتی آنکھیں مشرق کی پُراسراریت لیے ہوئے تھیں۔ اس کے بھرپور ہونٹ ہروقت مسکراتے ہوئے محسوس ہوتے۔ خوب صورت ستواں سی نازک ناک گویا بیضوی چہرے کے حسن کو مکمل کرنے کے لیے ہی بنی تھی۔ ایک ہندوستانی دوست کی نقل میں اس نے ناک میں باقاعدہ سوراخ کروا کر کیل بھی پہنی

تھی جو اس کے چہرے پر بہت جچتی تھی خصوصاً آرٹی کو وہ اس پر بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے اس کی 29 ویں سالگرہ پر اس کے لیے بہت خوب صورت سونے کی نگینے جڑی بالی کا تحفہ خریدا تھا جسے لیزلی خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی۔ سنہرے چمکدار بالوں کا ہالا گویا اس کے حسن کا تاج تھا۔ اس نے نہایت نزاکت اور فخر سے اپنے بالوں کو چھوا۔ وہ آج بھی اتنی ہی دلفریب اور دلربا نظر آ رہی تھی جیسا کہ آرٹی سے پہلی ملاقات کے وقت تھی۔ وہ 5 سال قبل ایک بین الاقوامی انجینئرنگ کانفرنس میں ملے تھے یہ غالباً پہلی نظر کی محبت تھی بلکہ زیادہ بہتر الفاظ میں یہ ان کے درمیان آرٹیفیشل انٹیلی جنس کے موضوع پر ہونے والے پہلے دھما کا خیز معرکے یعنی ڈسکشن کے دوران یکایک ہو جانے والا عشق تھا جو کسی سیلاب بلاخیز کے مانند ان دونوں کو اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔ وہ دونوں اپنے شعبوں میں نہایت ممتاز سمجھے جاتے تھے، دونوں ہی الیکٹریکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی تھے۔ آرٹی یعنی آرتھر MIT جیسی عظیم الشان درس گاہ کا صف اوّل کا طالب علم تھا تو لیزلی کا شمار بھی اسٹین فورڈ کے ممتاز طلبہ میں ہوتا تھا۔ ان دونوں میں زیادہ اسمارٹ کون تھا؟ یہ سوال گویا ان کے لیے ان کا پسندیدہ ترین کھیل بن گیا تھا جسے وہ روزانہ نہایت ذوق وشوق سے کھیلا کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ سب ایک مذاق کے طور پر شروع ہوا تھا مگر پھر ایک نشہ سا بن گیا جس کے بغیر جینے کا تصور بھی مشکل تھا۔ ان کی شادی کو ساڑھے چار سال گزر چکے تھے اور وہ اپنی زندگی سے بے حد خوش تھے۔

دونوں کی اپنی الگ الگ ریسرچ لیبس تھیں جو ان کے طویل وعریض گھر کے مختلف حصوں میں واقع تھیں۔ پاس کوڈز اور ریٹنل (آنکھوں کی پہچان) اسکینرز نے ان کی لیبس کو مکمل طور پر محفوظ بنا رکھا تھا۔ ان سالوں میں ان میں سے کسی نے دوسرے کی لیب میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ دونوں ہی حکومت کے انتہائی اہم اور خفیہ سائنس دانوں کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان کی ریسرچز ملکی اور قومی سلامتی کے حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل گردانی جاتی تھیں اور انہیں اپنی ذمے داریوں کا پوری طرح احساس بھی تھا مگر اس کے باوجود یہ بھی سچ تھا کہ دنیا کی خدمت اور ملکی آزادی کو برقرار رکھنے کے تجربات بھی ان کے لیے ایک دوسرے کو ہرانے کی کوشش کے کھیل سے اہم اور دلچسپ نہیں تھے۔ یہ ایک جنگ تھی جس میں وہ سالوں سے عشق کی پوری دیوانگی کے ساتھ جتے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس کھیل کو ”مملکت ذہانت“ کا نام دے رکھا تھا۔ ہر روز کے اختتام پر اس دن کے ذہانت کے کھیل میں جیتنے والے کو اگلے 24 گھنٹوں کے لیے مملکت کا فرماں روا قرار دے دیا جاتا اب خواہ وہ کنگ آرتھر ہوتا یا کوئن لیزی۔ دنیا میں اقتدار کی بقیہ جنگوں کے مانند یہاں بھی تخت یا تختہ میں سے کوئی ایک ہی ہاتھ آتا تھا یا تو آپ ”مملکت ذہانت“ کے فرماں روا بن سکتے تھے یا پھر ایک غلام۔ اس کے علاوہ کوئی درمیانی راستہ نہیں تھا۔ غلام قرار پانے والے کو آنے والے 24 گھنٹوں میں ”مملکت ذہانت“ کے فرماں روا کی چاکری کرنا پڑتی تھی، نہ صرف وہ اس کا ہر حکم ماننے کا پابند ہوتا بلکہ وہ جیتنے والے کو صرف ”جہاں پناہ“ کہہ کر ہی مخاطب کر سکتا تھا۔

اور آج کی جہاں پناہ لیزلی تھی، وہ مسکرائی اور کچن کی جانب چل پڑی۔

آرٹی کچن میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ لیزلی کے مقابلے میں قدرے بلند قامت تھا، اس کی بھوری آنکھوں میں ذہانت اور سنجیدگی کی ملی جلی چمک تھی۔ اس کے بال سنہری تھے، باقاعدہ ورزش اور فٹ بال کے شوق نے اسے صحت مند کسرتی جسم کا مالک بنا دیا تھا۔ جب وہ مسکراتا تو اس کے ایک گال میں ڈمپل سا پڑ جاتا جو اس کی شخصیت کی سنجیدگی کو یکدم بچوں جیسی معصومیت میں بدل دیتا تھا۔ ”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں جہاں پناہ؟“ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”خاموش۔“ لیزلی نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر آرام سے کرسی پر بیٹھنے کے بعد بولی۔ ”اب تم بات کر سکتے ہو غلام......“

”میں آپ کے لیے شاہانہ آملیٹ بنا رہا ہوں، جہاں پناہ۔“

”آج...... مگر آج تو میں ہاف فرائی انڈا کھانا پسند کروں گی۔“ ظاہر ہے کہ غلام کی بات مان لینا جہاں پناہ کی شان کے خلاف تھا۔

”مگر آملیٹ آپ کا پسندیدہ ناشتا ہے جہاں پناہ اور اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ ہاف فرائی آپ کو خاصا ناپسند ہے۔“

”پھر بھی......“ وہ اسے گھور کر بولی۔ ”جب میں نے کہا کہ ہاف فرائی تو مطلب ہاف فرائی ہی بننا چاہیے۔“

”بہتر جہاں پناہ...... ہاف فرائی حاضر ہوتا ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر مکارانہ تابعداری سے بولا۔ چند لمحوں میں وہ پہلے سے تیار شدہ ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔ ناشتے میں آرٹی

کو اپنا پسندیدہ آملیٹ مزے لے لے کر کھاتے دیکھنا لیزلی کے لیے خاصا صبر آزما تجربہ تھا مگر بات چونکہ شاہانہ وقار کی تھی اس لیے اس نے صبر سے ناشتا شروع کر دیا۔

''تمہارا پسندیدہ پروجیکٹ کہاں تک پہنچا؟'' اس نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''وہی کنٹرولنگ وائرس والا جو کمپیوٹر سسٹم میں داخل ہوکر میسج پڑھنے والے کے دماغ کو ہپناٹائز کردے گا؟''

''جی ہاں، وہی جو تمہارے خیال میں کبھی تمہیں اس قابل کردے گا کہ تم اپنے میچنگ ہاپنوٹنگ سسٹم سے میرے دماغ پر قابو پالوگے۔''

''ہوں...... وہ زبردست جارہا ہے۔ شاید الگورتھم پر چند ٹویکس کے بعد ہی میں اس قابل ہوجاؤں گا کہ......'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرادیا۔

''کہ تم مجھے اپنا غلام بنا سکو گے؟''

''نہیں نہیں جہاں پناہ! میں چاہوں گا کہ آپ میری کنیز خاص بنیں۔''

''لگتا ہے کہ MIT کا معیار بالکل ہی گر گیا ہے انہوں نے تمہیں یہ تک نہیں سکھایا کہ بادشاہ کنیز نہیں بنا کرتے۔'' لیزلی نے اپنی نازک سی ناک چڑھائی۔

''مگر آپ ضرور بنیں گی جہاں پناہ...... اور میرا ہر حکم بھی مانیں گی اور وہ بھی نخرے کیے بغیر......''

''اپنی زبان سنبھالو غلام، تمہیں مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنے ہوش وحواس میں رہنا چاہیے۔'' وہ مصنوعی جلال سے بولی۔ آرٹی جواب میں کورنش بجالایا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد ہی بالآخر وہ موقع آ گیا تھا۔

آرتھر نے اپنے ہاپنوٹنگ وائرس کی فائنل ٹیسٹنگ مکمل کرلی تھی اور اب مشن کے سب سے مشکل حصے پر کام شروع کردیا تھا۔ اسے لیزلی کے کمپیوٹر کی آہنی فائروال میں جگہ بنانی تھی۔ کئی گھنٹوں کی ناکام کوششوں کے بعد بالآخر وہ لیزلی کو اپنے مخصوص پیٹرن میں پیغام بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ پیغام کچھ یوں تھا ''جہاں پناہ! آپ کا غلام آپ سے درخواست کرتا ہے کہ آپ آج اسے ہمارے پہاڑی والے کیبن میں شرف ملاقات عطا کریں، میری تجویز یہ ہے کہ ہم وہاں الگ الگ جائیں اور وہاں اجنبیوں کی طرح ملیں، یقیناً یہ تجربہ ہم دونوں کے لیے بڑا مہم جویانہ اور دلچسپ ثابت ہوگا۔''

اسے معلوم تھا کہ لیزلی کو اس کیبن سے نفرت ہے، اسے بلندی کا سفر ہمیشہ سے برا لگتا تھا اور وہ وہاں کبھی بھی جانے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی تھی۔ اب اگر وہ اس کی دعوت قبول کرلیتی ہے تو اس کا صرف ایک مطلب تھا اور وہ یہ کہ اس کا تجربہ مکمل طور پر کامیاب ہوگیا ہے اور اس کے نتائج بھی بالکل ویسے ہی نکلیں گے جو کہ وہ چند روز قبل لیزلی کو مذاق مذاق میں بتاچکا تھا یعنی ہر حکم کی تعمیل اور وہ بھی کچھ سوچے اور نخرے کیے بغیر......

وہ انتہائی بے چین تھا۔ اپنے تجربے کا نتیجہ جاننے کی گھبراہٹ اسے کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ لیزلی اس کے اس پیغام کا کیا جواب دے گی؟ کیا اس کا شعور اور لاشعور غیر محسوس ہپناٹزم کا شکار ہوجائیں گے؟ کیا وہ کامیاب ہوجائے گا؟ اس کے ذہن میں سوالات کی بھرمار تھی، وہ جانتا تھا کہ لیزلی بھی کئی سال سے ایک بہت اہم تجربے میں لگی ہوئی تھی شاید وہ کوئی روبوٹ تیار کررہی تھی۔ اسے اس بارے میں زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا مگر وہ یہ بہرحال جانتا تھا کہ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگئی تو یقیناً آرتھر کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔ آرٹی اس سے پہلے ہی اسے حیران کردینا چاہتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اسے لیزلی کا جوابی پیغام موصول ہوگیا تھا۔ اس نے لکھا تھا ''یہ ایک اچھا پروگرام محسوس ہورہا ہے، میں نکل رہی ہوں تم اپنا کام ختم کرکے ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جانا۔''

آرتھر چند لمحے اپنی کمپیوٹر اسکرین کو گھورتا رہا پھر وہ گویا خوشی سے ناچ اٹھا۔ اس کا تجربہ کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ اس کی مکمل فتح تھی، اب وہ یقیناً کم ازکم ایک ماہ تک ''مملکت ذہانت'' کا جہاں پناہ بنا رہ سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھا، اتنا کہ تیاری کے دوران وہ مسلسل سیٹی بجاتا رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ فاتحانہ انداز میں اپنا ہپناٹک وائرلیس پیغام اور لیزلی کا جواب دوبارہ پڑھنا نہیں بھولا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر بار بار فاتحانہ مسکراہٹ جگمگا رہی تھی، اسے اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ لیزلی کو اپنے تجربے اور اس کی کامیابی کے متعلق بتائے گا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ ایک گھنٹا لیزلی کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے اس تمام معاملے کے متعلق بتادے گا مگر پھر اس نے اس خیال کو رد کردیا۔ چند گھنٹوں بعد جیسے ہی ہپناٹک اثر ختم ہوجائے گا اور وہ خود کو آرٹی کے ساتھ کیبن میں دیکھ کر حیران رہ جائے گی، وہ وقت اس تفصیل کے لیے بہترین رہے گا۔ وہ لیزلی کے حسین چہرے پر بکھرے ہارے تاثرات کے بارے میں سوچ کر باقاعدہ ہنس پڑا تھا۔ آج کے دن کے لیے وہ مہینوں سے محنت کررہا تھا۔

لیزلی کے دیے ہوئے وقت پر وہاں پہنچنے کے لیے اسے اب نکل جانا چاہیے تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مسلسل سیٹی بجا رہا تھا۔ کیبن کی طرف جانے کے لیے انہیں ایک لمبا پل عبور کرنا پڑتا تھا۔ درحقیقت یہی وہ جگہ تھی جس سے لیزلی خوفزدہ رہتی تھی۔ یہ پل ایک گہری کھائی پر بنایا گیا تھا۔ پل کے عین درمیان میں سڑک بند کی گئی تھی، ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب وہاں کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ یوں وہ ایک محفوظ سڑک تھی۔ دونوں جانب قدرے بلند ریلنگ موجود تھی چونکہ یہ سڑک پہاڑی پر موجود قصبے کو شہر سے ملاتی تھی اس لیے یہاں عموماً ٹریفک چلتا رہتا تھا، اس وقت البتہ اس کے پیچھے کوئی دوسری کار موجود نہیں تھی۔ اس نے ایک سائیڈ پر اپنی کار روکی۔ وہاں تین پولیس کاریں پہلے سے موجود تھیں اور ایک سیاہ سیڈان بھی کھڑی تھی۔ آرتھر کار کے پاس کھڑے پولیس افسر کی طرف بڑھا۔

''آفیسر کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟''

''جی ہاں۔ ایک افسوسناک حادثہ ہوگیا ہے، ایک گاڑی ریلنگ توڑ کر کھائی میں جاگری ہے۔''

''اوہ...... وہ کس طرح کی گاڑی تھی۔'' آرتھر کا دل حلق میں آ گیا تھا۔ ''کیا کسی نے اس حادثے کو ہوتے دیکھا ہے؟ گاڑی کون چلا رہا تھا؟''

''جی ہاں...... یہ صاحب اس حادثے کے عینی شاہد ہیں۔'' پولیس افسر نے سیاہ سیڈان کے ساتھ کھڑے ایک ادھیڑ عمر شخص کی جانب اشارہ کیا۔ ان کی گاڑی اس بدقسمت گاڑی کے عین پیچھے تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ گلابی رنگ کی رولز رائس تھی اور اسے سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت خاتون چلا رہی تھیں، اس کے علاوہ گاڑی میں کوئی اور نہیں تھا۔'' سارجنٹ نے تفصیل سے بتایا۔

آرٹی کا دل یکدم گویا ساکت سا ہوگیا۔ اسے اپنے اردگرد کی چیزیں غائب ہوتی نظر آرہی تھیں۔ اس کے کانوں میں لیزلی کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں، اس کی شرارتی ہنسی، نخرے سے اچکتی ناک، اس کی چال، وہ تمام دن، مہینے، سال جو انہوں نے ساتھ گزارے تھے سب ایک لمحے میں اس کی ذہن کی اسکرین پر جگمگانے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

دست شناسی

گاما۔ ''نجومی صاحب، میرے دائیں ہاتھ میں خارش ہورہی ہے۔''

نجومی۔ ''خوش نصیب ہو، تمہیں جلد دولت ملنے والی ہے۔''

گاما۔ ''نجومی صاحب، میرے بائیں ہاتھ میں بھی خارش ہورہی ہے۔''

نجومی۔ ''افسوس، وہ دولت تم سے چھن جائے گی۔''

گاما۔ ''نجومی صاحب، میرے دائیں پاؤں میں بھی خارش ہورہی ہے۔''

نجومی۔ ''میاں! عنقریب تمہیں سفر درپیش ہوگا۔''

گاما۔ ''نجومی صاحب، میرے بائیں پاؤں میں بھی خارش ہورہی ہے۔''

نجومی۔ ''دفع ہوجا اوئے! تمہیں تو خارش پڑی ہوئی ہے۔''

مرسلہ: رحیمہ سرور، ساہوواڑی، لاہور

سارجنٹ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں مسٹر؟ کیا آپ اس خاتون سے واقف ہیں؟''

''وہ...... وہ میری بیوی تھی۔'' وہ بہ مشکل بولا۔

''اوہ، مجھے بہت افسوس ہے، شاید انہیں ڈرائیونگ میں مہارت نہیں تھی یا پھر ان کی گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہوگئی تھی۔'' آفیسر ہمدردی سے بولا۔

آرتھر نے اپنا سر ہلایا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لیزلی ایک بہترین اور ماہر ڈرائیور تھی اور وہ خود گاڑیوں کی سروس اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال کے حوالے سے بہت محتاط رہا کرتا تھا۔ ان کے کام کی نوعیت کے حوالے سے حکومت نے انہیں بہترین سہولیات فراہم کی ہوئی تھیں۔

اس کے ہپناٹک سافٹ ویئر نے بہترین کام کیا تھا۔ اس میں کہیں کوئی کمی یا غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بڑی کامیابی سے لیزلی کے کمپیوٹر اور سیکیورٹی سسٹم کو متاثر کیا تھا اور اس کی فائروال کو توڑ کر اسے ہپناٹائز کردیا تھا جس کے بعد وہ اس کے پوسٹ ہپناٹک مشورے پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا مگر کہیں کوئی بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ کہاں؟ اس سے کہاں غلطی ہوئی تھی؟ کیا اس ہپناٹزم کے عمل نے لیزلی کی ڈرائیونگ کی مہارت کو متاثر کردیا تھا؟ کیا وہ توجہ کے ارتکاز میں ناکام ہوگئی تھی؟ کچھ تو ہوا تھا، اس

کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”سر......“ پولیس آفیسر نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”آپ یہاں گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ مجھے آپ کی حالت ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی۔ کیا آپ کا کوئی اور رشتہ دار ہے جسے اس حادثے کی اطلاع دی جا سکے۔“ پولیس افسر کی آواز ایک شور بن کر اس کی سماعت تک پہنچ ضرور رہی تھی مگر وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور مصروف تھا۔

”یہ سب کیا ہو گیا؟ مجھ سے ایسی غلطی، اتنی بھیانک خطا کیسے ہو گئی۔ یہ سب تو صرف ایک کھیل تھا۔“ لیزلی کے بغیر زندگی کا تصور بھی اس کے لیے ناممکن تھا کاش...... کاش اس نے یہ تجربہ نہ کیا ہوتا، کاش وہ اس احمقانہ کھیل کے چکر میں ہی نہ پڑے ہوتے، کاش یہ سب کوئی خوفناک خواب ہوتا، کاش یہ سب کچھ ایسے نہیں ہوا ہوتا، کاش وہ بیتے لمحوں کو واپس لا سکتا۔ وہ اپنی پوری زندگی لیزلی کا غلام بن کر جینے کو تیار تھا...... کاش...... وہ واپس آ سکتی...... کاش۔

”سر......سر۔“ اس بار پولیس افسر کی آواز اتنی بلند تھی کہ آرتھر اپنے خیالات سے گویا جاگ اٹھا۔

”اگرچہ...... اگرچہ میں نے یہ آخری شرط جیت لی ہے میری پیاری لیزلی مگر سچ یہ ہے کہ تم ہمیشہ ہماری ”مملکت ذہانت“ کی فرماں روا رہو گی، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا...... جہاں پناہ......!“ وہ خالی الذہنی کے عالم میں بڑبڑایا۔

آفیسر اسے غور سے دیکھ رہا تھا، ”جہاں پناہ“ کہتے ہی اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

”سر کیا آپ چند سوالوں کا جواب دینا پسند کریں گے؟“

آرتھر اس کی بات کا جواب دیے بغیر آگے کی طرف چل پڑا تھا۔

”جناب! میں آپ سے بات کر رہا ہوں...... پلیز یہاں آیئے، میری بات سنیے۔“

مگر آرتھر کی رفتار پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ مشینی انداز میں تیزی سے بھاگتا ہوا ٹوٹی ہوئی ریلنگ کی جانب بڑھا۔ ”واپس آ جایئے...... وہاں خطرہ ہے، رک جایئے۔“ کئی پولیس آفیسر اس کی طرف لپکے تھے مگر آرتھر کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ برق رفتاری سے دیگر پولیس والوں اور عینی شاہد کی گاڑی کے پاس سے گزر کر ریلنگ کے پاس جا پہنچا۔ وہاں دور کھائی میں گلابی رولز رائس جل رہی تھی، آرتھر ریلنگ کے قریب رک کر پھیپھڑوں کے بل چلّایا۔ ”جہاں پناہ!“ اور اگلے ہی لمحے اس کا جسم فضا میں بلند ہو کر موت کی وادی کی جانب محو پرواز تھا۔ پولیس آفیسرز اور وہاں موجود لوگ ششدر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کو اسے روکنے یا اپنی جگہ سے ہلنے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

وہ سب ایک کار کے رکنے کی تیز آواز سے چونکے تھے۔ سنہرے بالوں والی اس خوب صورت خاتون نے اپنی کار آرتھر کی کار کے آگے روکی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں گویا خوف سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

”کیا...... کیا ہوا ہے یہاں؟ کیا کسی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟ اس...... اس گاڑی کا مالک کہاں ہے؟“ وہ آرتھر کی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”ہاں، عجیب حادثہ بلکہ حادثے ہوئے ہیں۔“ سارجنٹ اپنے کار ریڈیو کو نکالتے ہوئے انتہائی تاسف سے بولا۔ ”پہلے ایک جوان عورت کی گاڑی ریلنگ سے ٹکرا کر کھائی میں جا گری اور پھر......

”اور...... پھر......؟“ وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

”اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شوہر نے نیچے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی، ایسی محبت اب تو صرف کہانیوں میں ہی سننے کو ملتی ہے، یقیناً وہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہوں گے۔“

اس دوران عینی شاہد ان کے قریب آ گیا تھا، وہ بہت غور سے عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اوہ...... نہیں!“ لیزلی کے ہونٹوں سے کراہ نما چیخ نکلی تھی۔

”ہاں...... میں تو اب تک اس تجربے سے لرز رہا ہوں۔“ عینی شاہد بولا۔ ”مگر اس سب میں سب سے زیادہ حیران کن اور جذباتی کر دینے والے اس کے آخری الفاظ تھے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ اپنی بیوی سے کتنا پیار کرتا ہوگا۔ بہت خوش نصیب تھی وہ اس معاملے میں۔“

”کیا......؟ کون سے الفاظ؟ اس نے کیا کہا تھا؟“

”جہاں پناہ......!“

اس لفظ کو سنتے ہی عورت کی آنکھیں یکدم ڈبڈبا گئی تھیں، اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ وہ گواہ اور پولیس افسر وہ دونوں ہی اس کے تاثرات دیکھ کر گڑبڑا سے گئے تھے۔ اچانک...... بالکل اچانک اس عورت نے ریلنگ کی جانب دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

”اسے روکو...... روکو اسے...... کسی بھی طرح روکو......“

سارجنٹ چلّایا۔ ایک پولیس والے نے لپک کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اسے روک نہیں پایا۔ وہ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے ریلنگ تک آ پہنچی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ وہاں رکی تھی اور پھر گہرائیوں کے سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ چھلانگ لگانے سے پہلے وہ زور سے پکارنا نہیں بھولی تھی...... ”جہاں پناہ!“

☆☆☆

ملک کے دو مایہ ناز سائنس دانوں کی اس طرح اچانک موت کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ ان کی شدید اور دیوانہ وار محبت گویا ایک مثال بن گئی تھی۔ ان کے نام حسن و عشق کی روایتی داستانوں کے مانند امر ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں پیدا ہونے والے بے شمار بچوں کے نام ان کے ناموں پر آرتھر یا لیزلی رکھے گئے تھے۔

ملک کے تین بڑے اور نامور کمپیوٹر ایکسپرٹس ہفتوں آرتھر اور لیزلی کے کمپیوٹر پر کام کرتے رہے تھے۔ کئی ہفتوں بعد وہ آرتھر کے ایجاد کردہ ہاپنوٹک وائرس کوڈ کو ڈی کوڈ کرنے اور اس کے تجزیے میں کامیاب ہو پائے تھے۔ یہ ایک انتہائی مشکل اور طاقتور پروگرام تھا۔ حکومت نے اس کی تمام تر تفصیلات کو ٹاپ سیکریٹ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیزلی کو درحقیقت فوری طور پر علم ہو گیا تھا کہ آرتھر کے وائرس نے اس کے کمپیوٹر سسٹم میں نقب لگائی ہے اسے شکست دینے کا سب سے بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ اس وائرس کو دوبارہ آرتھر کے کمپیوٹر پر باؤنس بیک کر دے اور اسے یہ کام اس طرح کرنا تھا کہ آرتھر کو اس کا علم نہ ہو سکے اور لیزلی نے یہی کیا تھا۔

جب اس نے آرتھر کی کیبن پر ملنے کی تجویز کو قبول کر لیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ہپناٹائز ہو گئی تھی بلکہ اس نے آرتھر کو اس کے اپنے کھیل میں شکست دینے کا پلان بنایا تھا۔

آرتھر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ لیزلی کا روبوٹک تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ سالوں سے اس مشن پر کام کر رہی تھی اس کا تیار کردہ یہ روبوٹ بالکل خود اس کے مانند تھا اور اب وہ ایجنٹ ہو کر کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ اسے یہ دیکھنا تھا کہ آرتھر کتنی دیر میں یہ سمجھ پاتا ہے کہ وہ لیزلی سے نہیں اس کے روبوٹ سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کا پلان یہ تھا کہ وہ آرتھر کے کیبن پہنچنے کے بعد وہاں پہنچے گی اور کیبن کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھے گی۔ پھر وہ ایک دم آرتھر کے سامنے آ کر اسے حیران کر دے گی۔ آرتھر کے چہرے پر شکست کے تاثرات دیکھنے کا لطف وہ ہرگز گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی ان ساڑھے چار سالوں کی سب سے بڑی فتح ہوتی اور وہ یقیناً کئی مہینوں تک ”مملکت ذہانت“ کی ملکہ بن سکتی تھی۔

لیزلی نے تمام حفاظتی پیش بندیاں مدنظر رکھی تھیں، اسے اپنے روبوٹ کی کارکردگی پر پورا یقین تھا اور وہ مطمئن تھی کہ اس کی روبوٹ ”لز 2“ بہ آسانی گاڑی چلا کر کیبن پہنچ جائے گی اور پروگرام کے مطابق آرتھر کو خوش آمدید کہے گی مگر پھر نہ جانے کہاں کیا غلطی ہوئی کہ گاڑی کھائی میں جا گری۔ شاید روبوٹ کی آنکھوں یا اس کے تجزیے کرنے کی طاقت میں کوئی کمی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آ گیا۔

آرتھر نے سڑک پر پولیس کو دیکھا، لیزلی کی گاڑی کے بارے میں سنا اور اسی فیصلے پر پہنچا کہ لیزلی اس حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے۔ اسے لیزلی کے روبوٹک تجربے کے بارے میں تھوڑا بہت علم ضرور تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہو چکی ہے اور اس نے اپنا ہمشکل روبوٹ بنایا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لیزلی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس ہپناٹزم وائرس پروگرام کا شکار ہو چکا ہے۔ لیزلی وہ وائرس اپنے پیغام کے ساتھ اس کے سسٹم پر بھیج چکی تھی لہٰذا جب اس نے پوسٹ ہاپنوٹک ”کی ورڈ“ دہرایا۔ وہ خود اپنے ہپناٹزم پیغام کا شکار ہو گیا۔

لیزلی اگرچہ اس وائرس کی آمد بھانپ چکی تھی اور اس نے اس پر ہی اپنا نیا پلان بھی بنا ڈالا تھا مگر اس کا اپنا لاشعور بھی ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ آرتھر کا ہپناٹزم پیغام اس کے دماغ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر حاوی ہو چکا تھا۔

یوں دونوں جینئس ایک ہی تیر کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں جا سوئے تھے۔

آرتھر کا اصل ہپناٹزم پیغام یہ تھا۔ ”اپنے ساتھی کا ہر حکم مانو، جو کہے وہ کرو، جو وہ کرے وہ بغیر سوچے تم بھی کرو، ہر حکم کی تکمیل اور وہ بھی نخرا کیے بغیر۔“

اور ”کی ورڈ“ تھا ”جہاں پناہ۔“

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 19

گل و گلزار سے راہ پر خار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہالے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں میں پھوپی کبریٰ بھی رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ کر دیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسماء کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسماء کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا وریام خان چونکہ ایک متلون مزاج شخص تھا اس لیے

نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ مجھے کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا۔ پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا، غلط فہمی میں اس نے مجھے مارنا چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد و سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان سوبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی۔ میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم کی راہنمائی میں، میں نے دل جیت سے باز پرس کی۔ ایک خون ریز لڑائی میں اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اسی دوران اس کے اڈے پر حملہ ہوا۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم رات حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ البتہ موجو کو لے آیا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائیداد کی خاطر، بخت خان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار، حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہی تو میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا۔ وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے سوبی کا دوست زور آور تھا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائیداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور میرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس کے بعد پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہماری دسترس سے دور نکل گیا تھا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا اور ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انور وز بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی

میں پیرو اور دریا پار سے واپس آ چکا تھا اور ملاح دریا کے کنارے میں ہو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے ذبح کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جا کر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک کِل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہو گیا۔ وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کر کے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت سے مڈبھیڑ ہوئی اس سے سخت تگ و دو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خان زادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کر کے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوا لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کر کے اس ہوٹل میں ملاقات طے کر لی حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوا لینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم میری منتظر تھی۔ پھر سنگین و رنگین لمحات کے دوران میڈم شکیلہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیر زادی کی ناجائز اولاد تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی مچھیرے گامن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیر زادی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گامن نے اسے اسکول میں داخل کرایا اور اس کو چندو ماہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہونے پر میر ظفر حیات کے بیٹے عمر حیات نے اس سے چھیڑ خانی کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا عمر حیات اس کا قصور وار گامن اور چندو کو ٹھہراتا تھا اور انتقام پر بضد تھا اسی کوشش میں اس نے گامن کو فائر کر کے زخمی کر دیا۔ مجبوراً چندو اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی جہاں اس نے اسے مارا پیٹا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن گامن اور اس کا گھرانا چندو سے سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے اپنانے کا عہد کیا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے تھے کہ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی انہوں نے دروازے پر دیکھا تو بھونچکا رہ گئے۔ عمر حیات کی ماں اس کی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہاں کچھ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس کی ماں ان دونوں کی شادی پر راضی ہو گئی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے چندو اپنی تعلیم مکمل کرے گی حویلی میں رہ کر۔ حویلی میں آ کر اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور میٹرک میں بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران عمر حیات کا ماموں رضوان کے ہاں آیا جو گوشہ نشین اور دین دار شخص تھا۔ اس نے چندو کے مستقبل کے بارے میں تشویش ناک اور حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ پھر ایک غلط فہمی کے نتیجے میں عمر حیات نے چندو پر تشدد کیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اسے لینے آیا لیکن چندو نے انکار کر دیا اسی دوران ملک افراسیاب کی گاڑی وہاں سے گزری جو کہ ایک بدمعاش اور عیاش آدمی تھا اس نے عمر حیات کو گولی مار دی اور چندو کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے آیا جہاں اس کے گرگوں نے چندو کو یارن خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا پلان بنا لیا اور رات کی تاریکی میں شراب کے نشے میں اس کے پاس پہنچ گئے۔ جانو اور لالو نے باری باری اسے پامال کیا اور پھر سنوار کر یارن خان کے کارن سے رنگو کے حوالے کرنے کی کوشش کی اسی دوران جانو نے لالچ میں لالو کو قتل کر دیا لیکن رنگو جو لالو کا دوست تھا اسے بھی جان سے مار دیا۔ یارن خان کے بعد حیدر خان کے پاس سے ہوتے ہوئے چندو میاں دلبر حسین کے پاس پہنچی سب نے اس کے ساتھ ایک ہی سلوک کیا جس کے باعث وہ حاملہ ہو گئی دلبر حسین نے اسے اپنے نوکر مظہر کے حوالے کر دیا۔ وہاں فرار کی کوشش کے بعد مظہر کو چندو نے قتل کر دیا۔ یہاں ڈاکٹر شاہ جی نے اس کی مدد کی اور اس کے بچے کو اپنا نام دینے کے لیے پناہ کے ساتھ ہی شادی پر بھی تیار ہو گیا۔ لیکن صرف کاغذی حد تک۔ اسی دوران اس کے بیٹی پیدا ہوئی جسے ڈاکٹر نے چندو کی مرضی سے اپنے دوست کے حوالے کر دیا پھر پلان کے مطابق اس کو طلاق دے کر نرسنگ ہاسٹل میں داخل کرا دیا۔ جہاں اس کی ملاقات جوزفین سے ہوئی جس نے اسے اجمل گیلانی کے متعلق بتایا جو مالدار آدمی تھا اور قریب المرگ تھا لیکن شادی کرنا چاہتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رجو اپنے شوہر سوہنا خان کی فطرت سے آگاہ تھی۔ فوری طور پر بھانپ گئی کہ وہ کلہاڑا سونت کر یارن خان کی حویلی میں گیا ہو گا۔ اسے یارن خان کی کمینگی کی خبر تھی۔ لوگوں سے سنی سنائی ہوئی باتوں کو ذہن میں رکھ کر ننگے پاؤں اپنے دیور کے گھر دوڑی۔ اسے سوتے سے اُٹھایا اور ہنگامی طور پر سوہنے خان کے پیچھے دوڑا دیا۔ چراغ دین ابھی قریشیوں کی حویلی کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اسے سوہنا خان کلہاڑا کندھے پر رکھے سر نیہوڑائے آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے بھائی کے سوالوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رجو، چراغ دین اور اس کی بیوی اس کے گرد چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ شدید غصے کے عالم میں مشکی ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ ”بے غیرت کا بچہ! مجھے پیٹھ دکھا کر بھاگ گیا۔ ہاتھ لگ جاتا تو صبح کا بجھ (سورج) دیکھنا اس کے نصیب میں نہ ہوتا۔ پر خیر! کل، پرسوں……

کبھی نہ کبھی تو میرے ہتھے چڑھ ہی جائے گا۔ بل سے نکال ہی لوں گا اس حرامی کو......"

وہ اپنا غصہ نکال کر سلگتی آنکھوں کو دیوار پر چپکا کر بیٹھ گیا۔ چراغ دین اور اس کی بیوی نے اُسے بہتیرا سمجھایا، چھوٹے چھوٹے بچوں کی سلامتی اور ان کے مستقبل کا حوالہ دیا مگر وہ بالکل خاموش بیٹھا نصیحتیں اور مشورے سنتا رہا۔ اس کی آنکھیں بتاتی رہیں کہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر جا رہا تھا۔ اس کے ضدی دل نے بس یارن خان کا خون کرنے کی دھن پکڑ لی تھی اور جب تک وہ یارن خان کو قتل نہ کرلیتا، چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جب دونوں میاں بیوی اُٹھ کر جانے لگے تو اس کے منہ سے نکلا۔ "چراغ دینا! میڈے شہرے اُتے پری کوں تاں سانبھ گھنسیں ناں؟"

(چراغ دین! میرے شہریار اور پروین کو تو سنبھال لو گے ناں؟)

"حیڈا دماغ پرتی گیا اے۔ کملا نہ بن۔ سیاناں تھی ونج ہن تاں...... اپنے آپ کو سنبھالو اور عقل کے ناخن لو۔ وَن کی گچھی الجھ جائے تو نرم ہاتھوں سے ہولے ہولے سلجھائی جاتی ہے ناں کہ جھٹکا دے کر رسی توڑ دی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو سکھی رکھو اور ہمیں بھی کسی نئی مصیبت کا منہ نہ دکھاؤ۔" چراغ دین نے قدرے غصے سے کہا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رجو حویلی کا دروازہ بند کرنے کے لیے اُٹھی تو سوہنے نے بازو تھام لیا۔ کبیدہ خاطر تھا۔ دُکھ سے بولا۔ "چوری تھی گئی تاں وَل جندرے مارن دا فیدہ؟"

(چوری ہو جانے کے بعد تالے لگانے کا کیا فائدہ؟)

رجو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا سوہنا نہ صرف شعلہ بن گیا تھا بلکہ اس کے سینے میں غیرت کا دُکھ بھی گھلا ہوا تھا۔

یارن خان بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ساری رات جاگتا رہا، چھپا رہا۔ خوف سے نیند کوسوں دور ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لیے اس نے سوہنے خان کو جان سے مارنے کا فیصلہ کرلیا اور پو پھٹنے سے پیشتر ہی نور پور چھوڑ کر لاہور سدھار گیا۔

اُسے ایک ایسے پیشہ ور قاتل کی تلاش تھی جو پیسے لے کر سوہنے خان کا قضیہ تمام کر دیتا تاکہ یارن خان پر قانون اور خاندان کی طرف سے آنچ نہ آتی۔ اس کا یہ مسئلہ اس کے سیاست دان دوست میاں دلبر حسین نے چٹکی بجاتے میں حل کر دیا۔ "اوئے یارن خان! انسان کے پاس پیسا ہو اور پیسا خرچ کرنے کا ڈھنگ بھی ہو تو دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ چند سیکنڈوں میں حل ہو جاتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں
اوئے رحیم داد! اس مردود رنگو کے پاس جا اور اسے میرا پیغام دے کہ وہ کل کسی وقت آ کر مجھ سے مل لے۔"

"ابھی چلا جاؤں صاحب؟"

"ہاں ہاں! دیر نہ کر۔ دیکھ نہیں رہا کہ میرا یار دُکھی کر آیا ہے۔"

رحیم داد فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر رنگو قسائی کو اُس کا پیغام دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میاں دلبر حسین نے ولایتی شراب کا ڈبل پیگ بنایا۔ یارن خان کی طرف کھسکایا۔ اسے ایک نظر دیکھا۔ وہ متفکر انداز میں پیشانی سہلا رہا تھا۔ میاں دلبر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا "نہیں میرے دوست! فکر کی کوئی بات نہیں...... تمہیں ڈر ہے کہ وہ چوہا تمہیں قتل کر دے گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟ چوہا ہاتھی کا بگاڑ بھی کیا سکتا ہے؟...... تم اس وقت نور پور جاؤ گے جب اس کا مردہ قبر میں گل سڑ چکا ہوگا۔ یہ لو! جھوم کے پیو...... غم بخت ہر غم غلط کر دیتی ہے۔ پھر بھی احمق لوگ اسے غلط قرار دیتے ہیں......"

یارن خان نے میاں دلبر حسین کو سوہنا خان کے قتل کی سپاری دی تھی۔ وہ ایک تیر سے ایک ہی شکار کر کے خود کو موت کے خوف سے نجات دلانا چاہتا تھا مگر جب اس کی ہدایت پر رنگو قسائی اپنے ساتھی ظہور عرف جورے لادی کے ہمراہ حیدر خان کے بیلے والی حویلی پر پہنچا اور حیدر خان کو بتایا کہ وہ سوہنے خان کو راستے سے ہٹا کر یارن خان کا اُتارنے کے لیے اس علاقے میں آیا ہے تو اس کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے رنگو قسائی کی جھولی نوٹوں سے بھر دی اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔ "چن! یارن دے نال نال ایں یار دے بارے وی کجھ سوچ ناں!"

(یارن کے ساتھ ساتھ اس یار کے لیے بھی کچھ سوچو ناں!)

رنگو قسائی نے کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر نوٹ جیب کر ایک طرف رکھ دیے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مستفسر ہوا۔

حیدر خان نے کہا۔ "اکیلے سوہنے خان کے بجائے سارے ٹبر (خاندان) کی کہانی ختم کر دو۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری......"

اب رنگو چونکے بنا نہ رہ سکا، بولا۔ "مگر اس سے فائدہ ہوگا؟"

حیدر خان نے مکاری سے کام لیا۔ "دیکھ بھئی رنگو! سردار یارن لاہور میں بیٹھا ہے۔ سیانا کوا ہے۔ واردات والے دن وہ سرکاری گواہی شواہی کا بندوبست بھی کیے بیٹھا ہوگا۔ اس لیے سوہنے کے قتل کا الزام اُس پر نہیں آئے گا۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ سوہنے اور میری اَٹ سٹ وسیب سے چھپی نہیں رہی، اس لیے قانون اور برادری والے مجھ پر شک کریں گے۔ شک بھی کیا، پک کریں گے۔"

"پھر؟" رنگو نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"پھر کیا؟ میں مفت میں مارا جاؤں گا۔"

"نہیں خان جی! محض اتنی سی بات پر کوئی آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" رنگو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وثوق سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر جب مجھ پر برادری والے شک کریں گے تو کل کلاں سانپ کا بچہ جوان ہو کر مجھے ڈنگ مارنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ میں جیل جانے سے بچ گیا تو کتے کا پلا میرا سر لے جائے گا۔"

رنگو بظاہر خاموش رہا مگر اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے خان جی کی تاویل ہضم نہیں ہوئی تھی۔

حیدر خان بھانپ گیا۔ پینترا بدل کر بولا۔ "یار! سدھی پدھری (سیدھی سادی) بات یہ ہے کہ میں تمہیں رجسٹری کے اسٹامپ پیپرز دوں گا۔ تم ان پر سوہنے اور اس کی ذال (بیوی) کے انگوٹھے لگواؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیٹی اور دونوں سنپولیوں کو بھی ٹھکانے لگا دو گے۔ اس کی تمام زرعی جائداد میرے ہاتھ لگ جائے گی۔ بس! اب تو تمہیں ساری رام کہانی کی سمجھ لگ گئی ہے ناں؟"

سوہنے خان نے شادی کے موقع پر اپنے حصے کی آدھی زمین رجو کے نام کر دی تھی۔ یہ رجو کی ماں کی شرط تھی۔ سوہنے خان کا عشق ایسی رکاوٹوں کو خاطر میں کہاں لاتا تھا۔ اس نے نکاح کی اس سسرالی شرط کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ آدھی زمین کے بیان بھی رجو کو دے دیے۔ اس لیے پوری جائداد ہتھیانے کے لیے سوہنے کے ساتھ ساتھ رجو کے انگوٹھے کے نشانات بھی حیدر خان کو درکار تھے۔ ان دونوں کی [illegible] کی نقول پٹواری سے چار نوٹوں کے بدلے بآسانی مل سکتی تھیں۔

رنگو نے اُلجھن آمیز نظروں سے خان جی کو گھورا، کہا۔ "خان جی! اس ماں کے...... رنگو قسائی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ اگر سوہنے اور اس کی ذال کے انگوٹھے لگوا کر صرف سوہنے کی گردن کاٹ دوں تو بھی جائداد آپ کو مل جائے گی۔ اس کی بیوی اور دو معصوم بچوں کو ماروں یا زندہ چھوڑ دوں، ایک ہی بات ہے۔"

حیدر خان کی ہنسی خباثت سے بھرپور تھی۔ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "رنگو! تم پیڑ نہ گنو بلکہ آم کھاؤ۔ یہ باریک باتیں تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ او بھلے بندے! کیا تم اس بات کا ثبوت چھوڑ کر آؤ گے کہ تم نے سوہنے اور اس کی بیوی کو قتل کرنے سے پہلے انگوٹھے لگوائے تھے؟ سوہنے کی ذال رجو نہ صرف مقدمے کی مدعیہ بن جائے گی بلکہ پولیس فوری طور پر مجھ تک بھی پہنچ جائے گی۔ واہ میاں واہ! تم اپنی کھوپڑی کو ناحق تکلیف نہ دو اور جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔"

رنگو قسائی نے کندھے اُچکائے۔ خان نے ذرا ہاتھ ہلکا رکھتے ہوئے ڈانٹا۔ "تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ اس لیے یہاں کے معاملات مجھ سے بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتے ہو۔ ویسے بھی میں نے تمہیں کام کی اجرت دی ہے، کم ہے تو اور مانگو مگر یہ فضول کی بک بک نہ کرو۔ ہاں! میں تمہیں ایک جی دار بندہ بھی دوں گا تاکہ میری اور یارن خان کی آنکھوں میں چبھنے والا کانٹا آسانی سے نکل جائے۔ بولو، منظور ہے؟"

رنگو قسائی اس کا پابند نہیں تھا۔ وہ صرف میاں دلبر حسین کی مانتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں سوچا کہ وہ سوہنے خان کو قتل کرنے آیا تھا۔ علاقہ اس کے لیے اجنبی تھا جبکہ حیدر خان یہاں کا بلاشرکت غیرے بادشاہ تھا۔ اگر اس سے بگاڑ مول لیتا تو شاید اپنا کام بھی مکمل نہیں کر پاتا۔ حیدر خان جیسے منتقم مزاج شخص سے یہ بعید بھی نہیں تھا کہ وہ اُسے رنگے ہاتھوں پھنسا دیتا۔ یہی سوچ کر اس نے نوٹ کھرے کرنے کی سوچی اور ہامی بھر لی۔ جہاں ایک خون کرنا تھا، وہیں تین اور گلے کاٹ دینے کیا معانی رکھتے تھے۔ کاغذات کی تیاری کے لیے حیدر خان نے اُس سے دو چار دنوں کی مہلت لی جن پر سوہنے خان اور رجو کے انگوٹھے ثبت کروائے جانے مقصود تھے۔

دستاویز کی تیاری میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ سوہنا خان اپنی جانب بڑھتی ہوئی بھیانک موت سے بے خبر اپنے معمولات میں مصروف تھا اور رنگو قسائی، جورے لادی اور حیدر خان کی حویلی میں مستقل بنیادوں پر روپوش رہنے والے شیر علی عرف شیرو بھٹی کی صورت میں ڈراؤنی موت ایک رات کی تاریکی میں سوہنے خان کے گھر کی چار دیواری پھاند آئی۔

اندازے کے مطابق عین اسی وقت سوہنا خان رفع حاجت کرنے یا پانی پینے کے لیے بیدار ہوا تھا۔ دیوار پر سے کودنے والوں کی چاپ سن کر یا محض چھٹی حس کے خبردار کرنے پر اُس نے دروازے کی درزوں سے باہر صحن میں جھانکا۔ بزدل ہوتا تو پتا پانی ہو جاتا، اوسان خطا ہو جاتے مگر وہ بہادر مرد تھا۔ لحظہ بھر میں ہی بھانپ گیا کہ آنے والے محض چور ڈاکو نہیں تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے سے پیشتر اس نے میرے اور پروین کے بارے میں سوچا۔ اولاد انسان کی کمزوری ہوتی ہے۔ جونہی رنگو قسائی کمرے کے دروازے پر پہنچا، اس نے اپنی کمزوریوں کو سوتے میں اُٹھایا اور بجلی کی سی مستعدی سے گندم کے ادھ بھرے بھڑولے میں پھینک دیا۔ اس نے تو رجو کو بھی بڑی جستی پیٹی کے پیچھے چھپا دیا تھا مگر وہ اپنے سائیں کو تین ہٹے کٹے غنڈوں کے رحم وکرم پر خون میں نہاتے ہوئے دیکھ کر چھپی نہ رہ سکی۔ چیختی چلاتی باہر نکلی۔ شیرے بھٹی کی آہنی گرفت میں آتے ہیں اس کی چیخ و پکار بے صدا ہو گئی۔

موت سے کون چھپا رہ سکتا ہے؟...... وہی، جسے زندگی اپنی غلام گردشوں میں چھپا لیتی ہے۔ مجھے اور پروین کو زندگی نے موت کی آنکھ سے اوجھل کر دیا جبکہ سوہنا خان اور رجو کی جوانیوں کو قبائے خون میں لپیٹ کر لقمۂ اجل کر دیا گیا۔ ابھی دونوں کی سانسیں تھمی نہیں تھیں کہ جورے نے کالی روشنائی والے اسٹیمپ پیڈ کو کھول کر عرضی نویس کے رجسٹر اور اسٹامپ پیپرز پر دونوں کے انگوٹھے لگا لیے۔ انگوٹھوں پر لگی ہوئی سیاہی سارا پول کھول سکتی تھی۔ اس لیے شیرے بھٹی نے دونوں کے انگوٹھوں کو انہی کے خون سے تر کر دیا۔ مقتولین کے اپنے ہی لہو نے اسٹیمپ پیڈ کی سیاہی کو سرخ کر دیا۔

جس بھیانک رات میں میرے ماں باپ کا بخت سو گیا تھا، اسی شب بھڑولے کے سوراخ کے سامنے آتے ہی رنگو قسائی کے بخت کو غنودگی کا پہلا جھٹکا لگا اور اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج میری بیدار بختی کے قدموں میں پڑا لہو چاٹ رہا تھا جبکہ اپنے یار جورے لادی اور شیرے بھٹی سمیت یارن خان اور حیدر خان کے نام بتا کر عبرت انگیز انجام ان کے سرہانوں تلے رکھ چکا تھا۔

داستان تمام ہو گئی۔ بولنے والے کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔

اس دوران چہرے سمیت میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اپنی درد آگہی کی اس کیفیت کو میں کوئی نام نہ دے سکا۔ عجیب خالی الذہنی کی کیفیت مجھ پر سوار تھی۔

ایسے میں مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ میو ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا گلاس تھامے کھڑا تھا۔ میں نے گلاس تھاما اور حلق میں انڈیل لیا۔

ذہن پر چھائی ہوئی بے عنوان دھند چھٹی۔ میں نے میڈم کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ متوجہ پا کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”شہریار! تمہارا دشمن تمہارے پیر چاٹ رہا ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے، یہ فیصلہ بھی تمہی کو کرنا ہے۔“

میں نے رنگو کی طرف قدم بڑھایا تو یک بارگی یوں لگا جیسے بدن کی تمام قوتیں ایک دم نڈھال پڑ گئی تھیں۔ میں نے رنگو قسائی کی اکلوتی آنکھ میں جھانکا۔ پھر بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور فرش پر اکڑوں بٹھا دیا، کہا۔ ”رنگو! تمہیں بھیانک موت مارنے کا فیصلہ تو میں نے اُس گھڑی ہی کر لیا تھا جس گھڑی میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آج چونکہ تم نے میرے دوسرے دشمنوں کے چہروں پر پڑے نقاب کو اُتار کر مجھ پر احسان کیا ہے، اس لیے تمہیں تمہارے احسان کا صلہ دیتے ہوئے آسان موت ماروں گا۔“

میری آواز میں عمر بھر کا انتقام پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔

اس کی اکلوتی آنکھ میں موت کا خوف اور زندگی کی طلب بیک وقت بیدار ہوئی۔ منت آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس طرح تم اپنی باس کے حکم پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہو، اسی طرح میں بھی آزاد ہاتھوں پیروں والا غلام تھا۔ کل بھی اور آج بھی۔ مجھے میاں صاحب نے یارن خان کی آگ بجھانے کے لیے بھیجا تھا اور میں چلا گیا تھا۔ قسم رب سوہنے کی! تمہارا حقیقی دشمن میں نہیں، وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے تمہاری حویلی میں بھیجا تھا۔ ورنہ میں نے تو تمہارے باپ کو زندگی میں کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس سے مجھے دشمنی کیونکر ہو سکتی تھی۔ تم جاؤ...... جا کر انہیں مارو جنہیں مار کر تمہارے دل میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ بجھ سکتی ہے۔ مجھے کیوں مارتے ہو؟“

”تو کیا میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں؟“

”ہاں! اس کے بدلے میں تمہاری دی ہوئی زندگی کو تمہاری غلامی میں دے دوں گا۔“ اس نے مجھے نئی راہ دکھائی۔

میڈم شکیلہ جلدی سے قریب آ گئی، بولی۔ ”یعنی تم میاں دلبر حسین کو چھوڑ کر میرا گروپ جوائن کر لو گے؟“

اس نے نقاہت بھرے انداز میں پہلے میڈم کو، پھر مجھے دیکھا اور غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں...... مم...... میں شہریار کی بات کر رہا ہوں۔“

میڈم نے میرا ہاتھ تھاما، تھوڑا دور لے گئی۔ سمجھانے کے سے انداز میں گویا ہوئی۔ ”تمہارا انتقام بنے یا میرا، ایک ہی بات ہے۔ اسے مارنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ زندہ رہے گا تو ہم اس سے کئی کام لے سکیں گے۔ اس کی مدد سے تم ان کمینے سرداروں کی گردن ماپ سکو گے اور آسانی سے انتقام لے سکو گے۔ کیا خیال ہے؟“

مجھے میڈم کی سوچ پر حیرانی ہوئی۔ احتجاجی انداز میں اسے دیکھ کر کہا۔ ”مگر یہ میرے بے گناہ ماں باپ کا قاتل ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“

اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ آواز مزید دھیمی کر لی۔ ”زندگی کی اونچ نیچ کو سمجھنے والا زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ تم اب عام آدمی نہیں رہے بلکہ خاص ہو چکے ہو، اس لیے خاص انداز میں سوچو۔ اسے آخری شکار سمجھ کر زندہ رکھو۔ بکری بنا کر اپنی مچان کے نیچے باندھو اور درندوں کو للچا کر مچان کے قریب لاؤ۔ احمقانہ انداز میں اسے قتل کر دو گے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

میں نے شکوے بھرے انداز میں اُسے گھورا۔ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا رنگو قسائی کے پاس پہنچا۔ اس نے شاید میرا چہرہ دیکھتے ہی موت کا نوشتہ پڑھ لیا تھا۔ تبھی ایک لمبی سانس لے کر اپنی آنکھ موند گیا۔

میں نے جھک کر اس کے کانپتے ہوئے وجود کو بانہوں میں سمیٹا۔ وہ بھاری وجود کا مالک تھا اس لیے اسے اُٹھانے میں میری پوری قوت صرف ہو گئی۔ سینے کے برابر ہوا میں بلند کرنے کے بعد میں نے اچانک اپنی بانہیں کھول دیں۔ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گرا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اسے پھر اپنی بانہوں میں جکڑ کر ہوا میں اُٹھا لیا۔ پہلے کی طرح زمین پر پھینکنا چاہا مگر وہ عین موقع پر بری طرح تڑپا۔ میری گرفت سے نکلتے نکلتے اٹک گیا۔ اب میری بانہیں اس کی کمر میں حائل تھیں اور اس کا سر نیچے کی طرف جبکہ دونوں ٹانگیں میرے سر کے اوپر فضا میں لہرا رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت اس نے شاید از خود اپنی پوزیشن کا انجام بھانپ لیا تھا، تبھی حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”نہیں...... مجھے مت مارو...... نہیں......“

میں نے دانت بھینچ لیے۔ دشمن زندگی کی بھیک مانگ کر میرے انتقام کے شعلوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میڈم شکیلہ تیزی سے میرے قریب آئی۔ ”شہریار! آئی سے یو اسٹل یور سیلف!“

(شہریار! میں کہتی ہوں اپنے آپ کو روک لو)

زندگی استاد سے مختلف رویہ رکھتی ہے۔ استاد سبق پڑھا کر امتحان لیتا ہے اور ناکامی پر سزا دیتا ہے جبکہ زندگی سزا دیتی ہے، پھر امتحان لیتی ہے اور بعد میں سبق دیتی ہے۔

مجھے اعتراف تھا کہ میڈم شکیلہ زندگی کے ہاتھوں مجھ سے کہیں زیادہ سبق پڑھ چکی تھی مگر اس وقت میں اس کی بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے اسے دیکھے بغیر کہا۔ ”میڈم! آپ ایک طرف ہٹ جائیں پلیز!“

وہ ہٹنے کے بجائے جھٹ سے میرے سامنے آ گئی۔ سخت لہجے میں بولی۔ ”میں کہہ رہی ہوں، چھوڑ دو اسے......“

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”یو شٹ اَپ......“

یہ کہتے ہی میں نے رنگو کی کمر میں حائل اپنی بانہوں کی گرفت کو سخت کیا۔ جست بھرنے کے سے انداز میں اوپر اچھلا۔ جنونی قوت کی بدولت رنگو کے بھاری وجود سمیت دو اڑھائی فٹ کی بلندی تک چلا گیا۔ نیچے گرنے سے قبل میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پوری وسعت میں پھیلا دیں۔ رنگو سر کے بل فرش پر گرا۔ اس کے اپنے جسم کے غیر معمولی وزن پر میرا بوجھ بھی لدا ہوا تھا جس کے نتیجے میں ’کڑاک‘ کی زوردار آواز کے ساتھ اس کا منکا ٹوٹ گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ اتنی دردناک اور کریہہ تھی کہ ہال کی فضا جھنجھنا اُٹھی۔ میرے اندر جلتے ہوئے بھانبھڑ پر بارش کی تیز واچھڑ (بوچھاڑ) آن گری اور میں بے جان انداز میں اس پر لیٹ گیا۔ اس کا زندگی کو الوداع کہتا ہوا جسم چند جھٹکے لینے کے بعد ٹھنڈا پڑنے لگا۔

میں نے اپنی سانسوں کے غیر معمولی شور میں میڈم کی تأسف بھری آواز سنی۔ ”تم نے مجھے ’یو شٹ اپ‘ کہا، میرا حکم بھی نہیں مانا...... او مائی گاڈ! یہ کیوں ہوا؟...... اور تم نے میرا کہا نہ مان کر اچھا نہیں کیا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پھر بولی۔ ”ڈرٹی مین! یہ مر چکا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ میو! کم آن...... رنگو کی لاش کو ٹھکانے لگا دو۔ ہری اَپ!“

رنگو کو دیکھے بغیر ہی مجھے یقین تھا کہ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا جبکہ میڈم شکیلہ حکم عدولی پر مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ میں نے تساہلانہ انداز میں اپنی بانہیں اس کے نیچے سے نکالیں اور ہتھیلیاں فرش پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ گویا ایک دم بوڑھا ہو گیا تھا۔

میڈم کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز قدموں سے چلتا ہوا بیڈروم میں گیا۔ منہ ہاتھ دھویا، ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پیا اور اپنے آپ کو معتدل کرتے ہوئے پلٹا۔ میڈم شکیلہ کو اپنے عقب میں کھڑے پایا۔ سر جھکا کر کہا۔ ”سوری میڈم! وہ

دراصل...... میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔“

اس کا چہرہ سپاٹ رہا، بولی۔ ”مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں نادان نہیں ہوں، سب سمجھتی ہوں۔“

مجھ پر شرمساری کا احساس غالب تھا۔ میں نے اس کے مرتبے کا خیال کیے بغیر میو کی موجودگی میں ’یوشٹ اَپ‘ جیسا غیر مہذب جملہ اچھال کر اچھا نہیں کیا تھا مگر منہ سے نکلا ہوا لفظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ روکنے کے سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کر میری چھاتی پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”شہریار! میں انسان اور مشین کے فرق کو سمجھتی ہوں۔ تمہاری جگہ پر اگر میں ہوتی تو شاید یہی کچھ...... یا پھر اس سے بھی زیادہ شدید ردِعمل ظاہر کرتی۔ خیر! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ میں چاہوں گی کہ آئندہ تمہارے منہ سے ایسا جملہ کبھی نہ نکلے۔ اوکے؟“

”یس میڈم! آئی ایم سوری......“

میں نے ایک نظر اُس کے گداز ہاتھوں کو پھر اُس کے تابناک چہرے کو دیکھا۔ اس شبِ گزشتہ کا ایک ایک لمحۂ وصال اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ نہیں بھولا تھا تو یاد اُسے بھی سب کچھ تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ میرے حواس پر سوار تھی اور میں اُس کی ذات کے طلسم سے باہر نہیں آسکا تھا جبکہ وہ اس رات کی پرچھائیوں سے چھٹکارا پا کر نارمل ہو چکی تھی۔

میرے سینے پر اس کے ہاتھوں کے دباؤ میں کچھ اضافہ ہوا اور وہ تھوڑی اور قریب ہو گئی۔ میرے چہرے پر اپنی سانسیں چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ایک رات جاگ کر ہیر وارث شاہ کا قصہ پورے ترنم کے ساتھ گایا اور تمہیں سنایا۔ یاد ہے؟“ میرے اثبات میں سر ہلانے پر ایک ذرا مسکرائی، بولی۔ ”تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ ہیر عورت تھی یا مرد؟“

میں اس کے سوال کی گیرائی کو سمجھ نہیں پایا، بولا۔ ”وہ عورت ہی تھی، مگر میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ قدرے مسرور لہجے میں کہا۔ ”تم ابھی چالاک نہیں ہوئے ہو۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے پوری کہانی سننے کے بعد یہ سوچنے کی زحمت کی کہ میں تمہیں کیوں پسند کرتی ہوں؟...... تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے کیوں کر تمہیں وہ سب کچھ بتانے کا تردد کیا تھا جو بہ ظاہر غیر ضروری اور بے محل تھا؟“

مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ تبھی میں نے کہانی کو بس کہانی ہی سمجھ کر سنا اور بعد میں سوچا تھا کہ وہ محض اپنا دل نکال رہی تھی۔ میں نے بے چارگی کے عالم میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے نچلا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھایا۔ اپنی خوبصورت آنکھوں کو تھوڑا میچ کر مچلی اور بانہیں کھول کر میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کی گرفت ایسی نہیں تھی میری سانس بھنچ جاتی...... مگر سانس بھنچ گئی اور دل جیسے تھم سا گیا۔ ایسے میں اس نے میری چھاتی پر اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے دایاں ہاتھ آہستگی سے بڑھایا۔ کسی فتح یاب سالار کی طرح ہاتھ رفتہ رفتہ بڑھاتے ہوئے میری آنکھ تک لائی۔ ہاتھ رُکنے سے پیشتر میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی انگلی کی اگلی پور میری بند آنکھ پر آکر رُک گئی۔ میرا دل بھی گویا رُک گیا اور اس کی انگلی کی حرکت کے ساتھ ہی میری سانس تھم سی گئی۔

اس کی انگلی سے پھوٹنے والی برقی روئی میری بند آنکھ پر موجود ننھے سے سیاہ تل میں سرایت ہو رہی تھی اور میں دم بخود کھڑا سوچ رہا تھا۔ وہ جو مجھے اپنی مردانہ وجاہت کا مان رہا تھا، وہ ایک سیکنڈ میں ٹوٹ گیا۔ وہ مجھ سے نہیں، اُس تل سے پیار کرتی تھی جو اس کی زندگی کے لیے ماموں رضوان کی طرف سے نشان زد کیا گیا قسمت کا ستارہ تھا۔ وہ مجھے نہیں، اپنی خوش بختی کو پوجتی آئی تھی۔ مجھ سے پہلے اسے یہی ستارہ ڈاکٹر منور علی شاہ کی بائیں آنکھ پر دکھائی دیا تھا۔ وہ اُس پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ پھر اُسے بستر مرگ پر پڑے ہوئے اجمل گیلانی کا تل دکھائی دیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے، ڈاکٹر منور علی شاہ کی نصیحتوں سے روگردانی کرتے ہوئے وہیں رُک گئی تھی...... اور اَب اسے اپنی قسمت کا درخشاں ستارہ میری بند آنکھ پر جگمگاتا ہوا نظر آ رہا تھا اور وہ میری چھاتی سے لگی اُسے سراہ رہی تھی۔ بھول گئی تھی کہ میں نے چند لمحے قبل اُسے نہایت درشت انداز میں ”یوشٹ اَپ“ جیسا توہین آمیز جملہ کہا تھا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے پار ہال میں میو دکھائی نہیں دیا۔ وہ رنگو کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں کہیں مشغول تھا۔ میں نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور کہا۔ ”میڈم! آپ اتنی بولڈ ہو کر بھی ایسے توہمات کا شکار رہیں، حیرانی کی بات نہیں ہے کیا؟“

میرے سینے پر اُس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ ہولے سے کہا۔ ”نہیں شہریار! ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا جنم جس مٹی سے اُٹھا، وہاں قدم قدم پر ایسی سیکڑوں رسمیں

توہمات منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں مگر میرا کیس ان سے بہت مختلف ہے۔ جب میرے سامنے کچھ بھی نہیں تھا، تب مجھے ماموں رضوان نے ایک ننھے سے سیاہ دھبے کے اندر موجود واقعات کی لمبی قطار دکھائی تھی۔ تب میں نے بھی اسے واہمہ قرار دیا تھا مگر تم ہی بتاؤ، اَب جبکہ میں اس ننھے سے سیاہ دھبے سے بہت کچھ حاصل کر چکی ہوں، بہت کچھ دیکھ چکی ہوں، اِسے کوئی حیثیت کیسے نہ دوں؟ ماموں رضوان کو جھوٹا تب کہوں، جب میری زندگی میں وہ سب کچھ نہ ہوا ہو جو انہوں نے مجھے قبل از وقت موہوم انداز میں بتایا تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ جیسے شخص سے ملاقات کو کیا نام دوں؟ اجمل گیلانی کی ذات نے مجھے دنیا سے اُٹھتے ہوئے انتہائی غربت سے نکال کر امارت کے آکاش پر براجمان کر دیا، اُسے کیا تسلیم نہ کروں؟ سیاہ تل تمہاری آنکھ پر بھی جگمگا رہا ہے۔ کیا تم ’نہیں‘ ہو؟...... تمہارا کوئی وجود نہیں ہے؟...... مان لیا کہ تم میرے لیے اجمل گیلانی یا ڈاکٹر منور علی شاہ کی طرح نہیں آئے مگر کیا تم نے دریا کے بیلے میں مجھے نئی زندگی نہیں دی تھی؟“

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی طویل بات میں دخل دے سکتا تھا مگر بولنے سے سننا کہیں بہتر اور فائدہ مند تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

وہ تھوڑا توقف لینے کے بعد بولی۔ ”شہریار! تم نے وہ کچھ نہیں دیکھا، نہ بھگتا جو میں نے اپنے عام سے دیہاتی گھر سے نکلنے کے بعد دیکھا۔ تم اس عذاب سے نہیں گزرے جس عذاب سے مجھے قسمت نے گزارا۔ تمہیں سر منڈاتے ہی اولے نہیں پڑے بلکہ میرا اپنا بنایا سسٹم مل گیا۔ ہاں! تمہیں یہ موقع میسر نہ آتا تو تمہاری حالت بھی مجھ سے کسی طور مختلف نہ ہوتی۔ تب تمہیں پتا چلتا کہ دکھے ہوئے دل کو لاکھوں روپے کا فائدہ دینے والے محسن سے کہیں بڑا محسن وہ دکھائی دیتا ہے جو ڈھارس کے چند الفاظ موزوں انداز میں عطا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات پانی کا ایک گلاس اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ پلانے والے پر جان قربان کرنے کو دل کرتا ہے۔ ہاں! تم نے بھی شاید مجھے پانی پلایا ہے۔ مگر نہیں...... تم نے نہیں...... اِس نے!“

وہ اپنی انگلی کی پور میری آنکھ کے تل پر رکھے ہوئے تھی، جس پر اس نے تھوڑا دباؤ ڈالا اور پھر اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”اب کیا ہوا؟“

”کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اسی لیے تو ہنسنے لگی ہوں۔“ وہ یک بارگی علیحدہ ہو گئی۔ چند قدم پیچھے ہٹ

میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائٹنگ کریم (ہربل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔ قیمت =/150
یونانی کریم
گلیسی
قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔
☐ [illegible]
نوٹ:
آپ اگر اپنا علاج کرانا چاہتے ہیں تو انٹرنیٹ پر SKYPE آن لائن [illegible]
اپنی صحت کے بارے میں مفت [illegible] 0345-7000088
کریم گھر منگوانے کیلئے رقم ایزی لوڈ کروا کر اپنا ایڈریس SMS کریں۔
☐ بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528
[illegible] فون 2433682 [illegible] لاہور۔ فون 042-7666264
Cell: 0333-5203553, Website: wwwdevapk.com

کھڑی ہوگئی۔ دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، سرتا پا۔ پھر تحسین آمیز انداز میں بولی۔ ”تم دیہاتی ہو۔ تناور درخت کی طرح ٹھوس اور مضبوط...... بچے کی طرح سچے اور کھرے...... کسی الہڑ دیہاتی دوشیزہ کی طرح انتہا پسند...... ہے ناں! یہی سب تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ انسان کا رونے پر دل آئے تو جی بھر کر روئے۔ ہنسنے کو روح مانے تو قہقہے لگائے۔ لوگوں کی خوشنودی کے لیے نہیں، محض اپنے لیے...... اور وہ یہ سوچ کر نہ روئے کہ لوگ کیا کہیں گے، اور خواہش کے باوجود نہ ہنس پائے کہ لوگ برا مانیں گے تو وہ منافق ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی نہیں، دوسرے کے بے وقعت جذبات اور ترجیحات کا وقت گزارتا ہے۔ شہروں میں منافقوں کی نرسریاں موجود ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ سن کے سچے مل جاتے ہیں۔ کہیں کہیں، کوئی کوئی...... تمہارا کیا خیال ہے؟“

میں کچھ اور سوچ رہا تھا، بولا۔ ”میڈم! مجھے عجیب لگتا ہے کہ آپ دیہاتی ہونے کے باوجود شہری لڑکیوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں۔ زیادہ امپریسو...... دیہاتوں میں حسن ہوتا ہے مگر اتنا شوخ اور نازک نہیں۔ آپ کی زیادہ عمر تو بیٹ میں، پھر عذاب میں گزری جبکہ نہایت تھوڑا عرصہ شہر میں۔ مگر لگتا نہیں ہے۔“

وہ ہنستی ہوئی بیٹھ گئی۔ شوخی سے بولی۔ ”عورت اگر مزدور بن جائے تو نازک نہیں رہتی۔ مرد کی طرح سخت ہو جاتی ہے۔ دھوپ میں پسینا بہائے تو اس کی گوری اور ملیح جلد نہ صرف کھردری ہوجاتی ہے بلکہ سنولا بھی جاتی ہے۔ عورت کو نفیس اور خوبصورت بنانے کا سہرا تو مرد کو جاتا ہے جو اسے دیواروں میں اور پابندیوں میں جکڑ کر رکھتا ہے۔ محبت کے نام پر دھوپ، موسم اور تجربوں سے بچا کر نازک بنا دیتا ہے۔ حکومت کرنا چاہتا ہے ناں!...... بڑے انداز سے کمزور کرتا ہے پھر فتح پالیتا ہے۔ بائی داوے! مجھے ملتان میں رہتے ہوئے اتنا تھوڑا عرصہ بھی نہیں ہوا۔ ائرکنڈیشنڈ اور فراغت کے ساتھ ساتھ دولت نے مجھے سہارا دے رکھا ہے۔ اجلا اور خوب صورت بنا رکھا ہے۔ بیٹ میں خوبصورت تھی۔ ملتان میں خوب تر بن گئی ہوں۔“

اس نے درست کہا تھا۔ فرزانہ اور شبانہ جب نور پور میں رہا کرتی تھیں تو ان کی جلد کھردری اور رنگ پیدائشی گورا ہونے کے باوجود سنولایا ہوا تھا جبکہ ملتان کے چھوٹے سے مکان میں قید ہوتے ہی نہ صرف ان کا رنگ نکھر آیا تھا بلکہ زیادہ دیر چھاؤں میں رہنے کی بدولت جلد غیر معمولی نرم اور ملیح ہوگئی تھی۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ”کیا آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی خاکہ تیار کر رکھا ہے؟“

وہ کھڑی ہوگئی۔ میرے پہلو سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”انسان بہت کچھ سوچتا رہتا ہے۔“

”تو کیا آپ نے بھی ایسا کچھ سوچ رکھا ہے؟“

اس نے رُک کر اثبات میں سر ہلایا، بولی۔ ”ہاں تو...... مگر حالات ایسے بھی درپیش آسکتے ہیں کہ تمام عمر مارا ماری میں گزر جائے یا کسی دن کوئی گولی پلٹ کر میرا سینہ چھید جائے گی۔ ٹائیں ٹائیں فش!“

میرے لبوں سے نکلا۔ ”اللہ نہ کرے۔“

اس نے میری بے ساختگی سے لطف لیا۔ دروازے میں کھڑی باہر ہال میں دیکھنے لگی۔ کوئی موجود تھا جسے میو کے پیچھے جانے کا حکم صادر کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہیں پیا تمہارے گھر چھوڑ آتا ہے۔ اپنے گھر کی خبر لو۔ آج کی شب اور کل کا دن موج کرو۔ کل رات تمہیں اس کمینے نوروز بھٹی کی گردن ماپنے کے لیے موضع سمن میں جانا ہے۔ نگینہ بھٹی کے علاوہ کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ یعنی یہ مشن تمہیں سرانجام دینا ہے۔“

مجھے ایل ایچ وی عالیہ اور نگینہ یاد آگئیں۔ خوبصورت چہرے اور اسمارٹ وجود والی عورت مس عالیہ جس نے اپنے کلینک میں میڈم کا علاج معالجہ کیا تھا۔ پھر اپنی بے اولادی کا رونا رونے کے بعد رازدارانہ انداز میں نوروز بھٹی اور اس کے دو سفاک بیٹوں کے ظلم سے بھری داستان سنائی تھی۔ ہمارے ایما پر ایک نازک اندام دوشیزہ کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی تھی۔ مجھے بجن بھٹی، اس کے چھوٹے بھائی نوروز بھٹی اور نگینہ کے ناحق قتل ہونے والے بھائی سلامت بھٹی کے نام بھی یاد رہ گئے تھے۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! کیا یہ ضروری ہے کہ نگینہ بھی میرے ساتھ جائے؟“

وہ رُک کر پلٹی۔ مجھے سوالیہ نگاہوں سے گھورنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو میں زیادہ آسانی اور بے فکری سے نوروز بھٹی اور اس کے بیٹوں سے دو دو ہاتھ کر لوں گا۔ نگینہ کی موجودگی میں مجھے اس کی حفاظت بھی کرنا پڑے گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ایک ذرا مسکرائی، بولی۔ ”شہریار! تم نے رنگو قسائی کو اپنے ہاتھوں قتل کیا تو تمہیں قلبی سکون ملا۔ تمہارے دل پر چھائے ہوئے ماں باپ کے قتل کا دکھ کچھ ہی طرح نگینہ اپنے بھائی کے قاتل کو اپنے ہاتھوں بھی کرے گی یا اُسے تڑپتا ہوا دیکھے گی تو عمر بھر کے لیے نت ہوجائے گی۔ اسے وہاں سے کچھ کاغذات بھی اُٹھانا ہیں جو ظاہر ہے، تم تلاش نہیں کرسکو گے۔“

میں نے کہا۔ ”میڈم! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں پاتال سے بھی کاغذات نکال کر لاسکتا ہوں۔“

”بہرحال! نگینہ تمہارے ساتھ جائے گی۔ میں یہ فیصلہ کرچکی ہوں۔“

میں نے سرِ تسلیم خم کرلیا۔ یاد آنے پر مستفسر ہوا۔ ”کیا آپ اور نگینہ کے درمیان قیمت طے پا چکی ہے؟“

”قیمت؟“ وہ چونکی۔

”آپ نے اُس دن شجاع آباد سے واپسی پر لینڈ کروزر میں نگینہ سے کہا تھا کہ آپ اس سے اس کام کی اُجرت لیں گی۔“ میں نے یاد دلایا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ”نہیں...... مگر میں اس سے بغیر طے کیے ہی بہت کچھ وصول کروں گی۔ ایسے، کہ اُسے پتا بھی نہیں چلے گا اور میرا رانجھا بھی راضی ہوجائے گا۔ چھوڑو اس تذکرے کو، جاؤ...... اپنی نیند پوری کرو...... موج کرو۔“

ہر انسان کے اندر ایک رانجھا چھپا ہوتا ہے جسے وہ تمام عمر راضی کرنے کی تگ و دو کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی تو مہربان ہو جاتا ہے تو کبھی روٹھا روٹھا ملتا ہے۔ رنگو قسائی کا ستیاناس کرتے ہوئے میرے من کا رانجھا شانت ہوگیا تھا۔ برسوں سے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑ گئے تھے۔

میڈم سے جدا ہو کر پیا کے ساتھ شہر واپس آتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ آج کی رات گہری اور مطمئن نیند سوؤں گا۔ گھر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے موج دین عرف موجو، شانو اور فرزانہ کی جون ہی بدل گئی ہو۔ پہلے سے زیادہ خوش اور آسودہ دکھائی دیے تو مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ تبدیلی ان کے حلیوں اور چہروں میں نہیں، میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ میں خاصا تھکا ہونے کے باوجود تھکاوٹ محسوس نہیں کر رہا تھا اور چین کی بانسری بجانے کے لیے اہلِ خانہ سے حال احوال کے بعد بیڈ پر دراز ہوگیا۔ میری خوب صورت راوی نے میرے لیے چین لکھ دیا تھا۔

* * *

رات دس بجے کا عمل تھا جب سخی محمد سفید رنگ کی ٹویوٹا کار میں بیٹھ کر میرے گھر پہنچا۔ اس کے ساتھ نگینہ بھی آئی تھی جو اس وقت میرے سامنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر براجمان تھی۔ خاصی مضطرب اور بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے جادوئی حسن میں جان پڑ چکی تھی۔ جو بھی دیکھتا، وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی چمکدار سپید جلد میں شفافیت کی بدولت نیلگوں حلقے پڑ رہے تھے جو اس کے حسن دل آویز میں بے پایاں اضافہ کر رہے تھے۔ آنکھیں کسی کھلنڈرے بچے کی طرح شوخ اور چمکدار تھیں۔ ان میں بھی نیلاہٹ جھلک دیتی تھی۔ وہ میرے انہماک پر رُخ پھیر گئی۔

سخی محمد نے میڈم کا حکم سنایا کہ میں اور نگینہ آج رات کو ملتان سے سمن کے لیے نکلیں گے اور نوروز بھٹی پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ میں نے سخی محمد کی باتیں غور سے سنیں پھر قدرے چست لباس میں ملبوس نگینہ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔ ”سخی محمد! میڈم اسے میرے ساتھ سمن بھیجنے پر مصر ہیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کی عدم موجودگی میں بہتر انداز سے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ ہوگی تو بار بار میری توجہ اس کی حفاظت کی جانب مبذول ہوجائے گی۔“

سخی محمد نے کندھے اُچکائے۔ ”یہ مشورہ تو میں نے بھی دیا تھا مگر میڈم نہیں مانیں۔“

اب تک خاموش بیٹھی نگینہ پہلو بدل کر بولی۔ ”نہیں پلیز! میں ساتھ ضرور جاؤں گی۔ جب تک میں ان کتوں کو اپنے ہاتھوں قتل نہیں کروں گی یا کم سے کم اپنی آنکھوں سے انہیں تڑپتا ہوا نہیں دیکھوں گی، مجھے چین نہیں آئے گا۔“

اس کے لہجے پر انگریزی زبان کا بھرپور تاثر غالب تھا مگر اس دن سے قدرے بہتر انداز میں اُردو بول رہی تھی جس دن میں نے پہلی مرتبہ اسے مس عالیہ کے ہاں دیکھا تھا۔ اس کی آواز اشتعال کی وجہ سے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ میں نے اس لرزش کو اس کے خوف کا کرشمہ قرار دیا تھا مگر آج پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ اس کی آواز آج بھی لرز رہی تھی۔ یقیناً یہ قدرتی وصف تھا یا اس ہیجان کا اعجاز تھا جو اس کے رگ و پے میں سرایت کرچکا تھا۔ میں اس کے دکھ کو سمجھ رہا تھا۔ خوشیوں بھری زندگی ایک دم کانٹوں کی سیج میں تبدیل ہوجائے تو انسان پر سانسیں بھی بوجھ بن جایا کرتی ہیں۔ اس نے پیدا ہوتے ہی پرآسائش زندگی اور ناز و انداز بھرے رویے دیکھے تھے۔ والد، والدہ اور بھائی پر مشتمل اس کی مختصر سی کائنات اس کی آنکھوں کے سامنے اجڑی تھی۔ یوں کہ وہ سنبھلنے کے لیے ہاتھ پاؤں بھی نہ مار سکی

تھی۔ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا اس لیے قدرت کے کاموں پر صبر آ ہی جاتا ہے۔

میری نگاہیں نگینہ پر جمی ہوئی تھیں اور میں بہ ظاہر اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ سمن بستی میں پیش آنے والے متوقع حالات پر غور و خوض کر رہا تھا۔ یہ آسان مشن نہیں تھا اور نگینہ کی موجودگی کی بدولت کچھ زیادہ ہی مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔ میڈم کے حکم کے مطابق مجھے رفاقت بھٹی کو موت کے گھاٹ اُتار کر نگینہ کی سفری دستاویزات نکال لانا تھیں مگر مجھے اندازہ تھا کہ ان چھپے ہوئے کاغذات کا کھوج نکالنے تک مجھے تینوں باپ بیٹوں کی لاشوں کو پھلانگنا پڑے گا۔

سمن میرے لیے اجنبی جگہ تھی۔ وہاں خونخوار کتوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ بھی موجود تھا۔ میں نوروز بھٹی اور اس کے خاندان کے نہ صرف محلِ وقوع سے ناواقف تھا بلکہ ان کی طاقت کے بارے میں بھی کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی حویلی یا ڈیرے تک پہنچنے کے لیے مجھے نگینہ کی رہنمائی میں چلنا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر مجھے کامل رازداری اور غیر معمولی مستعدی سے اپنا کام سرانجام دینا تھا ورنہ میں اور نگینہ دیہاتیوں کی بربریت کا شکار ہو سکتے تھے۔

''ویپن؟'' میں نے سخی محمد سے پوچھا۔ بہ ظاہر میرا سوال ادھورا اور محض ایک لفظ پر مشتمل تھا مگر سخی محمد سمجھ گیا۔ بولا۔ ''دو سائیلنسرڈ پسٹلز...... ویسی ہی ایک خاموش شارٹ گن اور کے کے......''

تھوڑے توقف کے بعد نگینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ایک سلم نائف اس کی پنڈلی سے بندھا ہے۔ تم بھی لے لینا۔''

میں نے توصیفی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس مشن میں خاموش اسلحے کی ہی ضرورت تھی۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اور...... میں تمہارے لیے ارادتاً پیٹرول گاڑی لایا ہوں جس کا فیول ٹینک فل ہے۔ اس کی پک اَپ ایک دم زبردست ہے۔ فکر مت کرنا۔ یہ گاڑی اپنی نہیں، جہاں دل چاہے، چھوڑ کر اپنی جان بچانا۔ میڈم نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ سمن میں زور آور سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے کیونکہ وہ بھٹی برادران کا دوست ہے۔ وہاں جاتا رہتا ہے۔ اگر وہ رکاوٹ بنے تو رعایت نہ کرنا اور اسے شوٹ کر دینا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چائے پینے کے بعد سخی محمد جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھ کے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ گلی میں گاڑی کے قریب رُک کر رازداری سے بولا۔ ''میڈم نے حکم دیا ہے کہ اس کینیڈا پلٹ دوشیزہ کو بہ حفاظت واپس لانا ضروری ہے کیونکہ یہ سونے کی چڑیا ہے۔ کام آئے گی...... اور ہاں، میڈم نے تم دونوں کو اکیلے ہی اس مشن پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے مگر تم چاہو تو میں میڈم کی حکم عدولی کر کے تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم بہت بڑی مصیبت میں کودنے جا رہے ہو۔''

میں نے گاڑی کی چھت پر ہتھیلی ٹکائی اور مسکرا کر کہا۔ ''شکریہ دوست! مگر مجھے اکیلے ہی سمن جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ معمولی سی بات پر میڈم کو بدگمان کر لوں۔ تم فکر نہ کرو، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ مال پچھلی سیٹ کے نیچے پڑا ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔'' سخی محمد نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پیدل چلتا ہوا گلی کا موڑ مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ نگینہ اپنی بند مٹھی پر تھوڑی ٹکائے چائے کے خالی کپ کو گھور رہی تھی۔ ایسے میں اس کی داہنی ٹانگ مضطربانہ انداز میں فرش پر تھرک رہی تھی۔

''نگینہ!''

''یس سر!'' وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

''میں کچھ دیر گھر والوں کے ساتھ گزارنے چلا ہوں۔ ہم یہاں سے گیارہ کے بعد نکلیں گے۔ میں تب تک تیاری بھی کر لوں گا۔'' میں نے دانستہ طور پر اسے دیکھنے سے گریز کیا، پوچھا۔ ''تمہیں کچھ چاہیے؟''

''نو سر!'' اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

''دین ٹیک اے ریسٹ پلیز......'' میں نے کہا اور میں ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر کے اندر چلا آیا۔ فوجی اختر حسبِ معمول ہدایات دیں۔ ایسے ہی وقت میں شانو مجھے ٹی وی لاؤنج میں کھڑی دکھائی دی۔ جلدی سے قریب آئی۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر نامانوس سی شوخی سے بولی۔ ''بھائی! تمہاری مہمان تو بہت خوب صورت ہے۔ ہے ناں؟''

مجھے اس کا انداز قطعی اجنبی لگا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''تم نے کیسے دیکھ لیا اُسے؟''

اس نے شرارت بھرے انداز میں آدھ کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا، بولی۔ ''کیوں؟ میری آنکھیں نہیں ہیں کیا؟''

''تو؟''

''غصہ کیوں کرتے ہو بھائی؟ میں نے تو ویسے ہی کہا ہے۔'' وہ مصنوعی خوفزدگی میں بولی۔

''شانو! تم بڑی بدتمیز ہو گئی ہو۔''

''ایسے تو نہ کہو بھائی! میں نے کون سی بدتمیزی کی ہے۔ میں نے کوئی یہ تو نہیں کہہ دیا کہ تمہاری اور اس کی جوڑی بہت اچھی لگتی ہے؟''

میں نے تصنع آمیزی سے کام لیا۔ اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی اور کہا۔ ''فضول باتیں نہ کیا کرو۔ ہٹو۔ مجھے کام سے جانا ہے۔ کل لوٹ آؤں گا۔''

''اس کے ساتھ کام پر جانا ہے؟''

وہ شرارت سے باز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا اور پہلو تہی کرتا ہوا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا بے محل چھیڑنا مجھے نجانے کیوں بُرا نہیں لگا تھا بلکہ اس کے چہرے سے پھوٹنے والے قوسِ قزح کے رنگ میری آنکھوں کو بھلے لگے تھے۔ میں تھوڑے عرصے سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی زبان مجھے 'بھائی' کہتی تھی مگر اس کی آنکھیں اور باڈی لینگویج کچھ اور کہتی سنائی دیتی تھی۔ یہ اس کی الہڑ عمر کا تقاضا تھا یا دکھ کے گہرے اور طویل سائے سے نکلنے کے بعد اچانک جوانی کی برسنے والی برکھا کا احساس تھا کہ وہ شوخ ہو گئی تھی۔ شہروں میں لڑکیوں کو کھلائی جانے والی مرغن غذائیں انہیں بہت جلد بالغ نظر کر دیتی ہیں جبکہ دیہاتوں میں لڑکوں کو کھلی خوراک دی جاتی ہے اور ان کے مقابلے میں لڑکیوں کو کم اور غیر مرغن غذا کھانے کو دی جاتی ہے۔ شانو بھی دیہات کی فضا سے نکل کر شہر میں آن بسی تھی اور وہ کچھ سوچنے لگی تھی جس کی نور پور کی سادہ غذا سوچنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں جوتے اُتارے بغیر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ چھوڑے۔ شانو کے رویے پر کچھ دیر غور کرتا رہا۔ اس سوچ نے مجھے نور پور کی فضاؤں میں دھکیل دیا جہاں غزالہ دہلیز تھامے کھڑی میرا بے سود انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے اور اگر آ جائیں تو ویسے نہیں رہتے، جیسے جانے سے پیشتر ہوا کرتے تھے۔ اس نے شاید درست کہا تھا۔ میں نور پور سے نکلنے کے بعد خاصا بدل گیا تھا۔ خالدہ کے بدن کی صدا نہ سننے والا، سردار بخت خان کی بیٹی ملکہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنے والا شہریار شہر کی رانی، میڈم شکیلہ کی زلف کا اسیر ہو کر ناتے عزیز کو بھولنے لگا تھا۔ وقت نے تقسیم کا عمل سیکھ لیا تھا۔ [illegible] یاد تو آتی تھی مگر اس وقت جب میرے گرد کسی روشنی کا اُجالا نہیں ہوا کرتا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں میں نے غزالہ کو اس شدت سے نہیں یاد کیا تھا جو شدت ہمارے درمیان محبت کی اکائی کا درجہ رکھتی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ میں نے اسے یاد ہی نہیں کیا تھا۔ میرے دل کے کسی نہاں خانے سے بازگشت ابھری۔ ''شہرے خان! اب تم شہرے خان بھی نہیں رہے ہو۔ تم شہریار بن کر اپنی جان سے پیاری ہستی کو بھول بیٹھے ہو۔ جب اس نے تمہیں طعنہ دیا تھا کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے تو تم نے اس کی بات کو احمقانہ قرار دے کر جھٹلا دیا تھا۔ آج اس کے یقین کو کیا نام دو گے؟''

میں نے سر جھٹکا۔ ایک لمحہ کو ذہن تاریک ہوا مگر پھر سنبھل گیا۔ بے طرح یاد آنے والی نامراد لوٹ گئی تھی۔ میرا انہماک اس وقت پوری طرح بکھر گیا جب شانو چائے کا بھرا ہوا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اور نگینہ کے بارے بہت کچھ کہہ رہی ہو۔ اگر وہ مجھے میڈم کے ساتھ دیکھ لیتی اور ہماری گفتگو سن لیتی تو بہت جلد نتیجہ اخذ کر لیتی اور مختلف سوال کر کر کے میرا دماغ چاٹ لیتی۔

میں نے کہا۔ ''شانو! موجو کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''اب تو ٹھیک جا رہا ہے۔''

''اور تم؟''

''میں تو ایک دم زبردست ہوں۔ رہنے کے لیے نور پور کے بجائے یہ شہر اچھا ہے۔ یہاں سارا دن رونق رہتی ہے۔''

''کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہی ہو؟''

''ہاں تو...... ویسے بھی اب نور پور میں ہمارا بچا بھی کیا ہے جس کے لیے دل کو بُرا کیا جائے۔''

''چاچا اور چاچی یاد نہیں آتے؟'' مجھے ایک ذرا اچنبھا ہوا۔

''آتے ہیں...... جب انہیں یاد کرتی ہوں تو دل بھر آتا ہے اس لیے فوراً ہی کسی کام میں رُجھ جاتی ہوں۔''

''اور فرزانہ؟''

''وہ زیادہ وقت سنجیدہ رہتی ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ دکھی ہے یا ویسے ہی خاموش بیٹھی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''اور بھائی! وہ کھالے کا کیا بنا؟ کیا نور پور میں ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے؟''

''وہیں ہوگا، کہاں جائے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''آ جاتا تو نور پور کے بارے میں کچھ اتا پتا چل جاتا۔ کافی دنوں سے آیا نہیں اور بھائی! ڈاکٹر صاحب کا کچھ پتا چلا؟''

اس نے خالد عرف کھالے اور ڈاکٹر منور علی شاہ کی یاد

تازہ کردی تھی۔

”وہ تو کافی عرصہ پہلے نور پور چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔“

”کہاں؟“

”کوئی علم نہیں۔“

”نور پور کا کوئی بندہ بھی نہیں ملا۔ وہ نگوڑا درزی شاعر؟“

”نہیں…… کبھی جا کر ان لوگوں کا پتا کروں گا۔“ میں نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔ اس دوران چائے پی لی۔ انگڑائی لے کر اُٹھا۔ اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کیا اور عجلت کے ساتھ اس عجیب مشن کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی جب میں اور نگینہ ملتان سے نکلے۔ گاڑی نئی تھی۔ انجن اچھی حالت میں تھا۔ آدھا سفر طے ہوگیا۔ نگینہ میری طویل خاموشی سے اکتا گئی۔ بولی۔ ”سر! یو آر لوکنگ وری۔“

میں نے اپنے برابر بیٹھی ہوئی چست لباس میں قیامت ڈھاتی حسینۂ عالم کی طرف دیکھا، کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نوروز بھٹی کے بارے سوچ رہا ہوں۔“

وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بولی۔ ”وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے بارے سوچا جائے۔ وہ بہت ظالم اور لالچی شخص ہے۔ اس کی اولاد اس سے بھی چار ہاتھ آگے نکلتی ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سوچتے ہوئے کہا۔ ”نگینہ! میڈم نے تمہیں اسلحہ تھما دیا ہے۔ کیا تمہیں چلانا بھی آتا ہے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”جی سر! میں نے کینیڈا میں سیلف ڈیفنس کلاس جوائن کی تھی۔ وہاں مجھے لیڈی پسٹل چلانا سکھایا گیا تھا۔“

”اور کیا کچھ سیکھا وہاں؟“ میں نے دلچسپی لی۔

”کچھ خاص نہیں…… مگر آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گی۔ جیسا کہیں گے، ویسا ہی کروں گی اور…… اور آپ یہ یاد رکھیں گے کہ میں جیوں یا مروں، نوروز اور اس کے بیٹوں کو مرنا چاہیے۔ اگر میرے مرنے کے بعد بھی میرے بھائی کا انتقام لیا گیا تو بھی اگلے جہان میں مطمئن رہوں گی۔“

میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ نازک اندام لڑکی تھی مگر کسی سود و زیاں کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آدھا سامنے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں چمکتا ہوا اور آدھا ملگجے اندھیرے میں چھپا ہوا۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غصے میں لال اور دکھ میں گداز ہوکر اور بھی دل کش لگنے لگی تھی۔

دیکھے بھالے راستے پر چلتے ہوئے جب ہم شجاع آباد کے پہلو میں واقع اس موڑ پر پہنچے، جہاں سے ایک سڑک پوٹھہ کے راستے دریا کے بیٹ کی طرف جاتی تھی، تو میرے لبوں پر بے اختیار ایک گیت کے بول مچل گئے۔ ”لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے، یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے……“

مگر تب میرے پہلو میں میڈم شکیلہ براجمان تھی۔ نگینہ حسن میں اس سے کم تر نہیں تھی مگر میڈم کے حسن کو اس کا جاہ و جلال اور اختیار دو آتشہ بنا دیتا تھا۔ میڈم شکیلہ کی رام کہانی میں بھی اس موڑ کو خاصی اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس کا عاشق نامدار میر زادہ عمر حیات یہیں چندو ماہی کے اغوا کاروں کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوا تھا اور اتفاقات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسی مقام سے چھڑا تھا جو آج بھی جاری و ساری تھا اور چندو ماہی کو میڈم شکیلہ کا روپ دے کر کیا سے کیا بناتا جارہا تھا۔ میں نے بے اختیار گاڑی روک دی۔ دائیں طرف تھوڑے فاصلے تک دکھائی دینے والی سڑک کو گھورتا رہا، بولا۔ ”نگینہ! کچھ فاصلے پر پوٹھہ کا سرکاری اسپتال واقع ہے جس کے ایک کوارٹر میں مس عالیہ رہتی ہے جس نے تمہیں اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ نہیں معلوم، اس بے چاری کا کیا حال ہے؟ اگر کسی طرح بھٹی خاندان کو پتا چل گیا ہو کہ تم یہاں دو چار دن چھپی رہی ہو تو بے چاری کی شامت آگئی ہوگی۔“

نگینہ نے جھرجھری لی۔ زیر لب بڑبڑائی۔ ”او گاڈ ڈونٹ لائک دِس…… شی فیورڈ می دیٹ ٹائم!“

(اوہ! خدا ایسا نہ کرے۔ اس نے اس وقت مجھ پر احسان کیا تھا)

چونکہ اطراف میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا اور آنے والے وقت میں میسر آنے والی مہلت کے بارے میں بھی تعین نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے میں گاڑی سے اترا اور سیٹ کے نیچے سے اسلحہ نکالا۔ لوڈ کیا۔ نگینہ کو پسٹل اور تھمائی۔ اپنے ویپن پیروں میں رکھ لینے کے بعد بلا وجہ پھر ایک طویل سانس لے کر روانہ ہوگیا۔ مجھے علم تھا کہ نے اُسے بغیر ہلکی پھلکی تربیت دینے کے اسلحہ نہیں تھمایا تھا۔ پھر بھی میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ اُسے مختصراً چلانے کے بارے میں ہدایات دیں۔ یہ بھی سمجھایا کہ نوروز کے ہاں اُسے غیر معمولی برداشت اور حوصلے سے کام لینا ہے کوئی ایک ہی معمولی سا غیر دانشمندانہ اقدام ہم دونوں کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔

بقیہ رستے میں میرے استفسار پر وہ نوروز بھٹی کے گھر کا حدود اربعہ بتاتی رہی۔ دس منٹ بعد دریا کا سپر بند آگیا۔ اس نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا، بولی۔ ”اِدھر بائیں ہاتھ…… بند سے پہلے…… کچے راستے پر چلیں۔ رفتار کم کر لیں۔ بہت جمپ ہیں۔“

میں نے گاڑی موڑی۔ ناپختہ راستہ غیر معمولی چکنی مٹی کی دھول سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے کھڈے اور جمپ اس تنگ سے راستے میں موجود تھے جن پر گاڑی بے ہنگم انداز میں اچھلتی کودتی چلی جارہی تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے راجباہ یا بڑے کھال کی پٹڑی پر بنا ہوا تھا۔ اطراف میں آم کے باغات واقع تھے۔ آموں کے گھنے اور بلند قامت درخت چاندنی میں سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ ویسے بھی صحت مند درختوں کے پتوں کا رنگ گہرا سبز ہونے کی وجہ سے سیاہ دکھائی دیتا ہے۔

میرا جی چاہا کہ شیشہ اُتار کر اس فرحت افزا ماحول میں لمبی لمبی سانسیں لوں مگر گاڑی کے عقب میں اُڑتا ہوا گرد کا بادل مجھے اس حرکت سے روک رہا تھا۔ کوئی ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا زگ زیگ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ دائیں ہاتھ دو چار گھر واقع تھے جبکہ بائیں ہاتھ خاصی تعداد میں مکانات واقع تھے جو راجباہ کے پل کے ذریعے اس راستے کے ساتھ منسلک ہوتے تھے۔ بستی کے خوابیدہ کتے ہڑبڑا کر بیدار ہوگئے اور اپنے اپنے انداز میں احتجاج ریکارڈ کرانے لگے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی جب ان کا احتجاج شدت پکڑے بغیر دم توڑ گیا۔ ایسے ہی وقت میرے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ میں چونک گیا۔ میں نے اپنا سیل فون ڈیش بورڈ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اٹھایا، اسکرین پر نظر ڈالی اور میڈم شکیلہ کا نمبر دیکھ کر ایک ذرا نروس ہوگیا۔ میں نے اس کے واضح حکم کے باوجود موبائل فون مشن کے دوران اپنے پاس نہ صرف رکھ لیا تھا بلکہ آن بھی کر رکھا تھا۔

میں نے کال اٹینڈ کی اور 'جی' کہا تو جواب میں میڈم کی غصے بھری آواز کانوں پڑی۔ ”کیا تم ابھی تک گھر میں ہو؟“

”نہیں میڈم! ہم ٹارگٹ پر پہنچنے والے ہیں۔ ویری سوری…… میں موبائل فون ساتھ لانے کی غلطی کر بیٹھا ہوں۔“

میڈم نے درشت لہجے میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھو۔ مزید کوئی غلطی نہ کرنا اور نہ ہی اس مشن کو آسان لینا۔ زور آور کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں کہ وہ دس بجے کے لگ بھگ ملتان سے باہر نکلا تھا۔ کچھ دیر پہلے سخی محمد نے رپورٹ دی ہے کہ وہ یا تو نوروز بھٹی کی حویلی میں ہے یا وہاں کسی وقت پہنچنے والا ہے۔ اکیلا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اکیلا ہوتے ہوئے بھی تمہارے لیے یا کسی بھی شاطر کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ او کے!“

”یس میڈم!“ میں نے کہا اور کال منقطع کرتے ہی فون نہ صرف پاورڈ آف کر دیا بلکہ سیلولر ماڈیول نکال کر فون سیٹ پچھلی سیٹ کی طرف اُچھال دیا۔

اس دوران نگینہ کے ایما پر میں مڑے بغیر بستی سے آگے نکل آیا۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے پر اس نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا، بولی۔ ”سر! دِس از دیٹ مرڈرر پلیس!“

میرے اعصاب تن گئے۔ چند لمحے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھول کر ادھر دیکھا جس طرف نگینہ کی انگلی اشارہ کناں تھی۔ راجباہ کی پٹڑی سے ایک ایکڑ کے فاصلے پر آم کے گھنے درختوں میں سے جھانکتا ہوا بڑا سا سفید مکان دکھائی دے رہا تھا۔ مکان پر تازہ تازہ چونا پھیرا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اس مکان سے متصل کوئی مکان ہے؟“

اُسے میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے الفاظ بدل کر سمجھایا۔ سمجھ گئی۔ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولی۔ ”نو نو سر! ایدھر کوئی اٹیچڈ ہوم نہیں ہے۔“

”یہ سڑک آگے کس طرف جا نکلتی ہے؟“

”آئی ڈونٹ نو!“

”اس حویلی تک کوئی اور راستہ بھی آتا ہے؟“

اس نے بے بسی سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ وہ اس علاقے کو زیادہ نہیں جانتی تھی۔ چونکہ یہ بستی سپر بند کے بالکل قریب واقع تھی۔ اس لیے حویلی کے عقب میں اگر کوئی راستہ موجود بھی تھا تو وہ دریا کی طرف جاتا تھا۔ راستے میں کوئی اور بستی یا ڈیرا واقع ہوسکتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہمیں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس جانا تھا۔ یعنی جدھر سے آئے تھے، اُدھر ہی جاسکتے تھے۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ آم کے دو بڑے درختوں کے بیچ میں جگہ دیکھ کر گاڑی کو ریورس کر کے پارک کر دیا۔ میں نے یہ احتیاط مدنظر رکھی تھی کہ نوروز بھٹی کی حویلی سے ہنگامی طور پر نکلنے کی صورت میں ہمیں یہاں سے گاڑی نکالنے میں کوئی دِقت پیش نہ آئے۔

ایک بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ کسی بھی واردات

کے لیے یہ وقت انتہائی موزوں ترین قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ رات کا یہ دورانیہ گہری نیند کا ہوتا ہے۔ جونہی ہم نے گاڑی چھوڑ کر حویلی کی طرف پیش قدمی کی، وہ میرا بازو تھام کر قدرے دبے انداز میں بولی۔ ”گاڑی کی چابی آپ نے اگنیشن میں چھوڑ دی ہے۔“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”یس!“

اس نے وجہ دریافت نہیں کی، کہا۔ ”آلارج نمبر آف ڈاگز ہیئر...... بی کیئرفل سر!“

مجھے یہاں کتوں کی موجودگی کا یقین کی حد تک شبہ تھا مگر دیہاتی ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر پریشانی کی بات تھی کہ ابھی تک کتوں کے نہ تو غرانے کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ہمارا استقبال کیا تھا، ورنہ کتوں کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ انہیں فضا میں کسی کی موجودگی کی بُو بہت جلد خبردار کر دیتی ہے۔ وہ ابھی تک خبردار نہیں ہوئے تھے۔

چاند نکلا ہوا تھا مگر گھنے درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے اطراف میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں دبے پاؤں چلتا ہوا دم بہ دم حویلی کے قریب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حویلی کی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایستادہ موٹے تنے والے آم کے ایک درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ عین اس وقت مجھے کتے دکھائی دیے۔ وہ حویلی کے آخری سرے پر واقع بڑے سے برآمدے میں بچھی ہوئی بڑی چارپائیوں کے پاس مردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ وہ تعداد میں چھ یا سات تھے۔ ایک نظر دیکھتے ہی علم ہوگیا کہ وہ جرمن شیفرڈ اور رشین بل ڈاگ تھے۔ اپنے کندھے پر نگینہ کی گرم سانسیں محسوس کر کے بڑبڑایا۔ ”یہ تو خاصے خطرناک کتے ہیں۔“

نگینہ کی سانسیں تیز ہوگئیں۔ ایسے ہی وقت میں ایک کتے نے سر اُٹھایا۔ عادتاً فضا میں سونگھا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا اور مضطرب انداز میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُس کا رُخ اس پیڑ کی جانب ہوگیا جس کے عقب میں، میں اور نگینہ چھپے ہوئے تھے۔ ڈراؤنی غراہٹ فضا میں گونجی اور سبھی کتے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ میری تمام تر احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ نہایت خاموشی سے بھٹی برادران کے سر پر پہنچ جاؤں گا مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ کتوں کو ختم کیے بغیر خاموش نہیں کرایا جاسکتا تھا۔

کتے خوفناک انداز میں بھونکتے ہوئے ہماری جانب بڑھے۔ میں نے فی الفور فیصلہ کیا۔ نگینہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میرے اچانک سیدھا ہونے سے اس کی تھوڑی میرے کندھے سے ٹکرائی اور وہ ’اوغ‘ کی آواز نکال کر پیچھے لڑھک گئی۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر کندھے سے گن اُتاری اور کتوں پر تان لی۔

اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں تھا کیونکہ برآمدے میں نصب کیا گیا دو سو وولٹ کا بلب روشن ہوگیا تھا۔ یعنی کتوں نے اپنے مالک کو یا کسی پہرے دار کو ہوشیار کر دیا تھا جس نے فوری طور پر بلب روشن کر دیا تھا۔ وہ اب تب میں حویلی سے برآمد ہونے والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا، رات کے اس پہر وہ کسی بھی صورت اسلحے کے بغیر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں کرے گا۔

کتے مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور کسی آن حملہ آور ہونے والے تھے۔ ان کی تربیت اچھے انداز میں نہیں کی گئی تھی کیونکہ وہ ایک جتھے کی صورت میں میری طرف بڑھے تھے۔ اگر کسی مشاق شکاری نے انہیں سدھایا ہوتا تو وہ کبھی اکٹھے حملہ آور نہ ہوتے بلکہ میرے چاروں طرف پھیل جاتے۔

میں نے بلٹ کھینچا اور گن کو ’برسٹ موڈ‘ پر کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ’ٹھک ٹھک‘ کی آوازیں فضا میں گونجیں اور چار کتے اچھل کر زمیں بوس ہوگئے۔ ایک کتے کے حلق سے بہت تیز اور ڈراؤنی خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ اس کی آواز اطراف میں بہت دور تک سنی گئی ہوگی۔ گن کی نال پر جدید طرز کا سائیلنسر فٹ تھا مگر اس کے باوجود اتنے پرسکون ماحول میں ’ٹھک ٹھک‘ کی آواز بھی حویلی کے اندرونی کمروں تک ضرور پہنچی ہوگی۔

ایک کتے کی ٹانگ میں گولی لگی تھی یا گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ ڈر گیا اور بجائے واپس جانے کے، میرے داہنی جانب درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ دو کتوں نے دیوار کے ساتھ ساتھ حویلی کے آخری سرے کی طرف ڈُڑکی لگائی۔ وہاں شاید کوئی کھال واقع تھا جس میں اُتر کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ یہ وقتی خطرہ ٹل گیا تھا مگر اچانک فضا بارہ بور کے فائر کی خوفناک آواز سے تھرا اُٹھی۔ اس کم بخت گن کی نہ صرف آواز خطرناک ہوتی ہے بلکہ اس کی مار بھی نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی نال سے گولی کے بجائے چھرّوں بھرا کارتوس نکلتا ہے جس کے چھرّے بڑا دائرہ بنا دیتے ہیں۔ کئی چھرّے اس پیڑ کے تنے سے ٹکرائے جس کے عقب میں ہم موجود تھے، کئی زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتوں سے، جس سے مجھے بغیر کوئی وقت ضائع کیے پتا چل گیا کہ فائر ہم پر ہی کیا گیا تھا اور فائر کرنے والا ہماری پوزیشن سے آگاہ ہوگیا تھا۔ جس وقت میں نے کتوں پر فائر کیا تھا، اس چھپے ہوئے شخص نے نال سے نکلنے والے شعلوں کو دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اپنے عقب میں لہرایا۔ نگینہ کو کھینچ کر اپنے عقب میں کیا اور بہ احتیاط جھانکا۔ برآمدہ خالی تھا۔ حویلی کی دکھائی دینے والی چھت پر بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دیدے پھاڑ کر دیکھا مگر ناکام رہا۔ ایسے ہی وقت میں حویلی کے اندر بھی کئی بلب ایک ساتھ روشن ہو گئے۔ میں ابھی تذبذب میں تھا کہ ایک ساتھ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ بیسیوں گولیاں آم کے تنے میں پیوست ہوگئیں، کئی ایک ہمارے دائیں بائیں سے نکل گئیں۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں نے حملہ کرنے کے لیے کوئی پلان مرتب نہیں کیا تھا اور نہایت بھونڈے انداز میں یہاں چلا آیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم دونوں اس وقت بُری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔

میں نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے جھانکا مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ فائرنگ رُک گئی۔ اچانک ایک ہیولا دکھائی دیا۔ کوئی شخص کمرے کے دروازے سے نکل کر بجلی کی سی مستعدی سے برآمدے کے پختہ اینٹوں والے چوڑے ستون کی آڑ لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میرے پاس شارٹ گن تھی جس کی گولی اس ستون کو پھاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

اب یہ علم نہیں تھا کہ بارہ بور گن والا ستون کی آڑ میں آیا تھا یا آٹومیٹک گن والا۔ میں نے بہ وقت اپنی آواز کو معتدل رکھتے ہوئے کہا۔ ”نگینہ! میں اُس طرف جا رہا ہوں۔ تم اِدھر ٹھہرو۔ جونہی وہ ستون کے عقب سے نکلے، اس کا نشانہ لے لینا۔“

خدا جانے اُسے میری بات کی سمجھ بھی آئی تھی یا نہیں، سمجھانے کا وقت نہیں تھا، اس لیے میں ایک دم اُچھلا اور دائیں طرف کوئی پانچ سات قدموں کے فاصلے پر موجود آم کے درخت کی طرف دوڑ پڑا۔ اس عمل میں زیادہ سے زیادہ دو سیکنڈ وقت لگا تھا مگر ستون کی آڑ میں کھڑا شخص بہت پھرتیلا تھا۔ میں ابھی پوری طرح تنے کی آڑ لینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ بارہ بور گن کا ایک چھرّا میرے دائیں بازو کو چھو گیا۔ درد آمیز جلن کی لہر بدن میں اُتر گئی۔ گن بردار نے دو فائر کر لیے تھے۔ اب اسے مزید فائر کرنے کے لیے گن کو لوڈ کرنا تھا۔ میں اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر حویلی کی دیوار سے چند بالشت کے فاصلے پر ایستادہ کیکر کے پیڑ کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس مقام پر پہنچنے کا فائدہ یہ ہوا کہ گن بردار کے جسم کا کچھ حصہ مجھے نظر آگیا۔ میں نے شارٹ گن کو ’سنگل شاٹ موڈ‘ پر لیا اور فی الفور نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ عین اسی لمحے نشانے سے ہٹ گیا اور گولی برآمدے کی دوسری نکڑ والے ستون میں جا لگی۔

اعلانِ جنگ ہوگیا۔ فضا دو طرفہ فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اُٹھی۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ نگینہ کی طرف سے جوابی فائرنگ کا کامیاب سلسلہ چل رہا تھا۔ اچانک نگینہ کی گن کا سائلنسر پھٹ گیا یا کھل گیا، اس کی گن نے بھی گونج دار ڈراؤنی آواز نکالنا شروع کر دی۔

اس دوران میں یہ تعین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکی رائفل سے فائرنگ کرنے والا کس جگہ پر چھپا ہوا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ میں حویلی کی دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب اُترنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ستون کے پیچھے چھپا ہوا گن بردار نگینہ کی فائرنگ سے پسپا ہو کر ستون کے ساتھ اپنی پوزیشن بدلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میرے نشانے پر آگیا۔ میں نے نشانہ لینے اور بہ عجلت فائر کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی اور اس کی دردناک چیخ حویلی کی بلند دیواروں اور پیڑوں کے بیچ چکرا کر بازگشت پیدا کر گئی۔ وہ پہلے چارپائی پر گرا، پھر زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ معلوم نہیں کہ اُسے کہاں گولی لگی تھی۔ جونہی وہ ستون سے باہر نکلا، نگینہ کی طرف سے اوپر تلے کئی فائر ہوئے۔ میری دانست میں نگینہ کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے بھی کوئی ایک آدھ گولی اس کے بدن میں ترازو ہوگئی تھی۔ تبھی پختہ فرش پر تڑپتا ہوا وجود چند لمحوں میں ہی ساکت ہوگیا۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ یہ خوف دامن گیر تھا کہ فائرنگ کی آواز فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع بستی کے لوگوں کو اب تک بیدار کر چکی ہوگی اور بعید نہ تھا کہ وہ لوگ مسلح ہو کر حویلی کی جانب پیش قدمی کر دیں۔ ایسی صورت میں ہم دونوں اطراف سے گھیرے میں آجاتے جس کا نتیجہ ہماری بے بسی آمیز موت کی صورت میں نکلتا۔

میں نے گن کندھے پر ڈالی، پستول نکال کر دانتوں میں دبایا اور پوری قوت سے اُچھلا۔ حویلی کی چاردیواری کم و بیش نو فٹ بلند تھی مگر میرے ہاتھ اس کی منڈیر پر جا پہنچے۔ میں نے اپنے بدن کو اچھالا دیا اور لمحہ بھر میں دیوار پر چڑھ گیا۔ چونکہ دیوار کے اس حصے پر کیکر کی ایک بڑی شاخ

سایہ فگن تھی، اس لیے فوری طور پر میرے دیکھ لیے جانے کا احتمال نہیں تھا مگر مجھے رائفل بردار پہرے دار کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں تھا، اس لیے میرا خوف اپنی جگہ درست تھا۔

میں شاخ کی اوٹ لیے دیوار پر دبکا بیٹھا تھا۔ حویلی کا اندرونی حصہ میرے سامنے تھا۔ میرے داہنے ہاتھ پر حویلی کی بڑی سی دیہاتی نوع کی عمارت واقع تھی جبکہ میرے سامنے پچھلی دیوار تک صحن پھیلا ہوا تھا جس میں تھوڑا سا حصہ پختہ فرش پر مشتمل تھا جبکہ باقی حصے میں پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ دیسی ساخت کا باغیچہ جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔

برآمدے اور آموں کے باغ کے بیچ کھلی جگہ پر تین کتے جان کی بازی ہار چکے تھے۔ ایک سخت جان تھا جو ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ بچ جانے والے کتے خوفزدہ ہو کر کہیں دبک گئے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بھونکنے کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا فریضہ سرانجام دے چکے تھے۔ حویلی کے مکینوں کو اپنی جانوں پر کھیل کر خطرے سے آگاہ کر چکے تھے۔

برآمدے کے فرش پر چارپائیوں کے بیچ پڑی ہوئی لاش کسی پہرے دار کی تھی یا نوروز بھٹی کے کسی فرزندِ ارجمند کی، معلوم نہیں تھا۔ چونکہ میں نے حویلی کے کسی مکین کو دیکھ نہیں رکھا تھا، اس لیے میں اُسے قریب سے جا کر دیکھنے کے بعد بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا تاوقتیکہ نگینہ اس کی شناخت نہ کر دیتی۔

میری چھٹی حس نادیدہ خطرے کے سگنلز تسلسل کے ساتھ نشر کر رہی تھی۔ یعنی یہ وقتی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ حویلی کے اندر، صحن کے پار، عمارت میں کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گویا یہاں کوئی رہ ہی نہیں رہا تھا۔ چونکہ بیرونی دیوار پر، منڈیر سے فٹ ڈیڑھ فٹ نیچے کیپ شیڈ والے تین چار مرکری بلب روشن تھے جن کی وجہ سے چھت اور منڈیر گہرے اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی شخص چھت پر موجود تھا تو میری صحن میں پیش قدمی فی الفور اس کی نظروں میں آ سکتی تھی اور وہ مجھے اپنے نشانے پر لے کر لمحہ بھر میں بھون سکتا تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں عمارت تک پہنچنے اور اس میں داخل ہونے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ایک مشکل یہ درپیش تھی کہ اس حویلی اور حویلی کے مکینوں کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت اندر کتنے لوگ موجود تھے اور ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ تھا۔ اب تک ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ میری گولی کا نشانہ بننے والے کے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل گن تھی جو اب خاموش ہو چکی تھی۔ ایک مانوس سی تڑتڑاہٹ ڈبل کے گن کی تھی جبکہ زیادہ فائر سیون ایم ایم رائفل کی نال سے نکلے تھے۔ ایک آدمی بہ یک وقت دو گنیں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ کم سے کم دو پہرے دار محاذ پر موجود تھے۔

میں نے صحن میں کودنے کے ارادے کو قطعی احمقانہ قرار دیا اور نہایت آہستگی سے دیوار سے واپس اُتر آیا۔ دیوار کے سائے اور درختوں کی بدولت میں بہ آسانی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ بلی کی سی چال چلتا ہوا دیوار کی نکڑ تک آیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ نگینہ دکھائی نہیں دی۔ یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اسی درخت کے پیچھے چھپی کھڑی تھی یا اس نے اپنی پوزیشن بدل لی تھی۔ نکڑ کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ دیوار کی لمبائی کم و بیش سو فٹ تھی جس کے ساتھ کیکر کا بالن (ایندھن) چھوٹی بڑی ڈھیریوں کی صورت میں پڑا تھا۔

میں ان خارزار ٹہنیوں اور دیوار کے درمیان جھک کر حویلی کی عقبی سمت بڑھا۔ عین وسط میں بُلیوں والا چوبی دروازہ موجود تھا۔ چونکہ اس وقت اسے بند ہونا چاہیے تھا، اس لیے میں اُسے چھوئے اور دھکیل کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ عقبی نکڑ تک پہنچا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ دیر وہیں رک کر سن گن لینے کی کوشش کی مگر جھینگروں اور مینڈکوں کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ماحول ایک دم پرسکون تھا۔ چونکہ حویلی کے عقب میں کوئی درخت موجود نہیں تھا اور چاند کی روشنی براہِ راست چونا کی گئی دیوار پر پڑ کر منعکس ہو رہی تھی، اس لیے ماحول خاصا روشن تھا۔ مجھے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ ہنگامی حالت میں اس طرف چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ البتہ کوئی سو گز کے فاصلے پر آموں کا باغ واقع تھا جو اس وقت اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور خطرہ مول لیتے ہوئے دیوار کی جڑ میں اگی ہوئی جنگلی گھاس پر محتاط انداز میں چلنے لگا۔ میری رفتار خاصی سست تھی اور میں کوئی آہٹ پیدا نہیں کر رہا تھا۔

یہ سرگرمی غیر محفوظ تھی مگر میں دو چار منٹ بعد بہ حفاظت حویلی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ ایسے ہی وقت پھر گنوں کے دہانے کھل گئے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کہ فائرنگ چھت پر سے کی جا رہی تھی۔ دیوار پلستر شدہ تھی، قرب میں کوئی درخت ایستادہ نہیں تھا، اس لیے کمرے کی بلند دیوار

پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نکڑ کی دوسری جانب جھانک کر جائزہ لیا۔ یہ دیوار بھی سپاٹ تھی۔ سوچ میں پڑ گیا۔ چھت پر جانا بہت ضروری تھا اور میرے پاس وقت بھی کم تھا۔ حویلی کے اندر موجود لوگوں کو جتنی زیادہ مہلت مل رہی تھی، وہ اتنے زیادہ محتاط، محفوظ اور مضبوط ہو رہے تھے۔

میں ایڑیوں پر گھوما، کمرے کی بلند دیوار اور چار دیواری کے سنگم پر آیا۔ حسبِ سابق بندر کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھا۔ سر نکال کر صحن میں جھانکا۔ میدان صاف تھا۔ کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ دیوار پر چڑھتے ہی دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ دیوار سے اوپر چھت تک باہر نکلی ہوئی اینٹوں کا مخصوص دندانہ بنا ہوا تھا۔ اینٹوں کی یہ مخصوص کنگھی اس صورت میں بنا کر چھوڑ دی جاتی ہے کہ آنے والے وقت میں کبھی مزید تعمیر مقصود ہو تو اس دندانے کی مدد سے دیوار کا مضبوط جوڑ بنایا جا سکے۔ یہ دیہاتی پیش بینی میرے کام آئی اور میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے چھت تک اُٹھ گیا۔ احتیاط کا تقاضا نبھاتے ہوئے سر نکال کر چمکتے چاند تلے روشن طویل و عریض چھت کو دیکھا۔ ایک طویل سانس حلق سے برآمد ہوئی کیونکہ میری ریاضت بے ثمر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

برآمدے والی سمت مٹی سے بھری بوریوں والے دو بنکرز موجود تھے۔ اگر یہ 'ایل' شکل کے ہوتے تو ان میں چھپا ہوا دشمن اس زاویے سے مجھے صاف دکھائی دیتا مگر یہ 'یو' شکل میں بنائے گئے تھے۔ ایسا ہی ایک بنکر پچھواڑے والی اس نکڑ میں موجود تھا جس کے نیچے میں چند لمحے پیشتر کھڑا ہو کر دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ بنکر خالی تھا کیونکہ اس کے کھلے دروازے کا رُخ میری جانب تھا۔ چھت کے عین وسط میں اسپرنگ واشل کی شکل کا گول بنکر بنا ہوا تھا۔ میں مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ اندھا دھند انداز میں چھت پر جانا نہایت خطرناک کام تھا جبکہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنا بھی جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ عقب میں سمندر، سامنے کھائی۔ یہ کس انتہا پر قسمت نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں برآمدے کی جانب واقع داہنے بنکر پر گن کی نال [illegible] سا لشکارا ابھرا۔ لمحہ بھر بعد فائر کی خوفناک آواز سنائی دی۔ یہ فائر ڈبل کے گن کا تھا۔ کوشش کے باوجود نشانچی کا سر دکھائی نہیں دیا۔ پچھلے 'یو' شکل کے بنکر سے فائر کی آواز [illegible] چنگاریاں پھوٹیں۔ نشانچی کا سر دکھائی دیا مگر میں اس کا نشانہ لینے اور فائر کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

گول بنکر میں کوئی سرگرمی دکھائی نہ دی تو میں نے اس تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی دونوں مورچہ زن افراد فائرنگ کے بعد چھپنے کے لیے نیچے جھکے، میں اچھل کر چھت پر آ گیا۔ میں نے اپنی بہترین کوشش کر ڈالی کہ میرے وزن سے چھت میں دھمک پیدا نہ ہو۔ چونکہ دونوں مورچہ زن گن برداروں کی تمام تر توجہ حویلی کے اگلے حصے کے آموں کے باغ پر مرکوز تھی، اس لیے میں ان کی نظروں میں آئے بغیر چوپایہ کھسکتا ہوا آسانی سے گول بنکر تک پہنچ گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد بائیں ہاتھ گھومتا ہوا بنکر کے دروازے تک آیا۔ میری توقع کے عین مطابق بنکر خالی تھا۔ اس مورچے تک رسائی ازخود بہت بڑی کامیابی تھی۔

میں کئی لمحے ساکت بیٹھا رہا اور اپنا تنفس معتدل کرتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان دو افراد کے علاوہ حویلی میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ ایک حیرانی یہ بھی تھی کہ مجھے چھت پر سیڑھیوں کا دہانہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا ورنہ عموی طور پر یہ دیکھنے میں آیا تھا کہ اس طرز کے مکانوں کی سیڑھیوں پر چھوٹا سا کمرا تعمیر کر دیا جاتا ہے جس کے سبب سیڑھیاں اور سیڑھیوں سے متصل فرش بارشی پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ چھت سپاٹ تھی۔

میں نے گن سنبھالی۔ مٹی بھری بوریوں پر مخصوص انداز میں ٹکائی۔ محتاط انداز میں سر نکالا۔ اپنے ٹارگٹس کا جائزہ لیا۔ اس دوران فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ داہنے ہاتھ والے بنکر میں مورچہ زن شخص کا سر دکھائی دیا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا۔ ٹریگر دباتا ہی چاہتا تھا کہ آموں کے باغ کی طرف سے فائر ہوا۔ یوں لگا کہ گولی اس بنکر کی بالائی بوریوں میں دھنسی تھی۔ میرا ہدف چشم زدن میں اوجھل ہو گیا۔ نگینہ کی طرف سے آنے والی گولی نے مجھے وقتی طور پر نقصان دیا تھا مگر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میری توقع سے کہیں بہتر انداز میں شوٹنگ کر رہی تھی۔

پچھلے بنکر سے فائر ہوا۔ میں نے گن کا رُخ بدلا۔ جونہی سر دکھائی دیا، میں نے گن کی لبلبی دبا دی۔ امید کے برعکس کوئی چیخ سنائی نہیں دی۔ مجھے اپنے نشانے پر یقین تھا کہ میری گولی اس کی کھوپڑی میں دھنس گئی ہو گی جس کی وجہ سے اس کے حلق سے چیخ تک برآمد نہیں ہو سکی تھی۔ یعنی ایک دشمن کا منکا نکل گیا تھا اور اگلے بنکر میں موجود شخص کو اپنے ساتھی کی ہلاکت کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدستور وقفے وقفے سے سر نکالتا، فائر کرتا اور پھر جھک جاتا۔

پھر وہ بھی میرے نشانے سے محفوظ نہ رہ سکا اور چاند کی ناکافی روشنی میں، میں نے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں برسٹ موڈ کی تین چار گولیاں اُتار دیں۔ اس کے گرنے کی

ہلکی سی دھمک نگینہ کی طرف سے آنے والی گولیوں کی گھن گرج میں دب کر رہ گئی۔ میدان صاف ہو چکا تھا۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا پھر محتاط انداز میں مورچے میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے فائر کا خدشہ لاحق تھا۔ ہاتھ لہرایا۔ اپنے تئیں اسے بتانے کی کوشش کی کہ دشمن نہیں، اس کا ساتھی ہوں مگر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ نگینہ نے مجھ پر فائر کرنے میں چند لمحوں کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اس کا نشانہ خطا ہو گیا اور میں بال بال بچ نکلا۔ میرے جھکتے ہی یکے بعد دیگرے کئی گولیاں بینکر کی بوریوں میں آن دھنسیں۔ چند ایک اوپر سے گزریں۔

میں اسے اپنے بارے میں مطلع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ دشمن بھی میری لوکیشن سے آگاہ ہو سکتا تھا، جو ابھی تک نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا عقبی بینکر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اندر کی سن گن لی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، سخت جان تھا۔ ابھی تک ذبح شدہ مرغ کی طرح پھڑک رہا تھا۔ میں غیر معمولی مستعدی سے بینکر میں داخل ہوا۔ اسے تڑپتا پایا۔ اس کی گن ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گری پڑی تھی۔ میں نے اپنی گن لہرائی اور پوری قوت سے بٹ تڑپتے ہوئے قوی الجثہ شخص کے پہلو میں مارا۔ وہ تھوڑا اچھلا۔ حلق سے 'اوغ' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل بوریوں پر لڑھک گیا۔ چند لمحے جھٹکے لیتا رہا پھر ایک بوری پر آڑھا ترچھا چپک کر ساکت ہو گیا۔ میں نے جلدی سے گن کی نال اس کی چھاتی پر رکھی۔ دباؤ ڈالا مگر وہ کام آ چکا تھا۔

میں نے اپنی بیلٹ سے پنسل ٹارچ نکالی۔ سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا طویل قامت اور مضبوط جسم کا مالک عام دیہاتی بودوباش والا جوان رہا تھا۔ اس کے پاس سوائے گن کے کوئی اور اسلحہ موجود نہیں تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی کان کے قریب رخسار سے کچھ اوپر ننھا سا سوراخ کر چکی تھی جبکہ سر کی دوسری جانب کم و بیش دو انچ کا دائروی زخم بناتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ یقینی طور پر گولی نے اس کا بھیجا اڑا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر اپنی گن کو ری لوڈ کیا اور دوسرے بینکر کی طرف پیش قدمی کی۔

نگینہ کی طرف سے اکا دکا فائروں کا سلسلہ جاری تھا اور میں کوشش کے باوجود اس کی لوکیشن کو بھانپ نہیں پایا تھا۔ فائر تو ہو رہے تھے مگر گن کی نال سے نکلنے والا مخصوص شعلہ کہیں لپکتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ میری سوچ سے کہیں پختہ کار شوٹر ثابت ہو رہی تھی اور بہتر انداز میں اس ناگفتہ بہ صورت حال سے نبرد آزما تھی۔ اگلا بینکر خاصا بڑا تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی سیڑھیوں کے دہانے کا عقدہ کھل گیا۔ دو فٹ چوڑائی کی حامل سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ اگلی بوریوں پر سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کے لباس والا شخص رکوع کی سی حالت میں پڑا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم تلے کہیں دبی ہوئی تھی کیونکہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے بائیں جانب اس حالت میں تھا کہ اس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔

ایسے ہی وقت میں دور کہیں پولیس کے ہوٹرز کی ابھرتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ابھی کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا تھا کہ پولیس اطلاع پا کر حویلی کی طرف رواں دواں ہو گئی تھی۔ یہ غلط ہوا تھا مگر غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کو یہاں پہنچنے میں بہ وقت دس سے پندرہ منٹ کا وقت درکار تھا۔ اس مختصر وقت میں مجھے نہ صرف اپنا کام مکمل کرنا تھا بلکہ نگینہ کو یہاں سے نکالنا بھی تھا۔ یہی سوچ کر میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آن بھر میں نیچے اتر آیا۔ میں نے دل ہی دل میں براہ راست حملے کا فیصلہ کیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں سیڑھیوں سے ملحقہ بڑے سے ہال میں کھڑا تھا۔ ساخت کے اعتبار سے یہ ٹی وی لاؤنج تھا مگر یہاں نہ تو کوئی سٹنگ پورشن تھا اور نہ کسی دیوار پر ٹیلی وژن ہی نصب تھا۔ کسی گوشے میں ٹی وی ٹرالی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دودھیا بلبوں کی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چار کمروں کے دروازے اور ایک قدرے کشادہ گیلری کا دہانہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے طوفانی انداز میں چاروں کمرے کھول کر دیکھ لیے۔ وہ عام دیہاتی نوعیت کے رہائشی کمرے تھے جو اس وقت خالی تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں کئی لوگ موجود تھے جو فوری طور پر سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر یہاں سے نکل گئے تھے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ میں نے حویلی سے کسی کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ گیلری کی سمت والے کمرے میں عروسی بیڈ بچھا ہوا تھا اور بیڈ سے چھت تک چمک دار آرائشی لڑیاں آویزاں تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کمرا نوروز بھٹی کے بیٹے رفاقت کی کینیڈا پلٹ دلہن نگینہ بھٹی کے بالجبر عروسی سواگت کے لیے سجایا گیا تھا۔ ہائے! حسرت ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں نے اندھا دھند انداز میں ہاتھ چلائے۔ سرسری تلاشی لی۔ آف وائٹ کلر کا ایک وائٹ پرل والا پرس

کپڑوں کی دیوار گیر چوبی الماری سے ملا۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو نہ کھلا۔ اس کا میکنزم سمجھ میں نہ آیا۔ سائڈ زپ کھولی۔ ایک کریڈٹ کارڈ اور چند بورڈنگ سلپ ملیں جن پر انگریزی میں نگینہ نجن کا نام ٹائپ کیا گیا تھا۔ میں نے آس کی کیفیت میں پرس کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اوپر تلے کئی جھٹکے دیے۔ اس کا لاک پینل ٹوٹ گیا۔ چند لمحوں کی اتھل پتھل کے نتیجے میں ریٹرن ٹکٹ اور نگینہ کا پاسپورٹ مل گیا۔ اس کے بھائی کے کاغذات اور دونوں ایڈنٹٹی کارڈز وارڈ روب سے دستیاب ہوئے۔ کون سی چیز کارآمد ہے، کون سی نہیں، یہ طے کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے جو بھی میرے ہاتھ لگا، میں نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا۔

چھت کی کھلی فضا میں سائرن کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی مگر عمارت کے اندر پہنچتے ہی معدوم ہو گئی تھی۔ اب پھر سنائی دینے لگی تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ پولیس حویلی کے خاصی قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے حویلی کے مکینوں کا سراغ لگانے کے بجائے فوری طور پر یہاں سے نکلنے اور نگینہ کو لے کر کہیں چھپنے کا فیصلہ کیا۔ اسی خیال کے تحت دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر آیا۔ جلدی میں بھول گیا کہ ایک حسین شکاری میری تاک میں بیٹھا ہے۔ نگینہ چھت پر شست باندھے کہیں چھپی ہوئی تھی۔ جب اس کا خیال آیا، تب بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ خوف ناک آواز کے ساتھ ہی میرے دائیں بازو میں ایک سلگتا ہوا انگارا اُتر گیا۔ درد کی تیکھی لہر نے پورے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔ بہ وقت تمام میں اپنے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ کو روک پایا مگر بے اختیار بلند آواز میں کراہا۔ ”اوئے! یہ میں ہوں!“

اس کے باوجود دوسرا، پھر تیسرا فائر ہوا جو میرے دائیں بائیں سے گزر گئے۔ میں اپنی تکلیف کو بھول کر بجلی کی سی پھرتی سے بوریوں کی آڑ لینے میں کامیاب ہوا۔ میرے اور اس کے بیچ خاصا فاصلہ حائل تھا مگر اتنا بھی نہیں تھا کہ اس تک میری آواز نہ پہنچ پائی ہو۔ شاید جوش اور ہیجان کی وجہ سے وہ میری آواز کو پہچان نہیں پائی تھی۔ ایک اور روح فرسا خیال آیا کہ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھ پر نگینہ کے بجائے کسی اور نے فائرنگ کی ہو۔ کوئی دشمن بھی تاک میں ہو سکتا تھا۔

پولیس ہوٹر کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ موبائل پارٹی اب تب میں پہنچنے والی تھی۔ چونکہ چھت پر چھپنے کی جگہ نہیں تھی، اس لیے میرا چھت پر سے اُترنا اور حویلی سے دور ہونا نہایت ضروری تھا۔ میں ایک ہی وقت میں پولیس اور بجلی برادران کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میری قمیص خون میں تر ہو گئی تھی۔ درد دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ میڈیکل باکس گاڑی میں تھا۔ گاڑی کی طرف جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مارے تکلیف کے میرا جبڑا بھنچ گیا اور میں بوریوں کی آڑ لیتا ہوا پچھواڑے کی طرف بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں بستی کی جانب گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ روشنی کے متحرک دائرے خبر دے رہے تھے کہ پولیس دو گاڑیوں میں آ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بستی میں سے بھی کچھ بہادر طبع لوگ پولیس کی معاونت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے تھے کیونکہ گاڑیوں کے انجن کی آوازوں کے ساتھ کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی ماحول کا حصہ بن گئی تھیں۔

یہ غنیمت رہا کہ نگینہ کی گن خاموش ہو گئی تھی اور میں بہ خیریت منڈیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پہلے میرا ارادہ نگینہ کی طرف جانے کا تھا مگر ایک تو پولیس قریب آ گئی تھی اور دوسرا خطرہ نگینہ کی ہی طرف سے تھا جو مجھے پہچانے بغیر گولیوں پر گولیاں داغ رہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے میں چھت سے کود گیا۔ جونہی میرے پیروں نے زمین کو چھوا، میں حویلی کی مخالف سمت بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد میں کھیت میں تھا۔ کھیت میں فصل کے بجائے آموں کی نرسری لگی ہوئی تھی۔ پودے ابھی چھوٹے تھے۔ بہ مشکل گھٹنوں تک آتے تھے۔ کوئی سو گز کے فاصلے پر واقع آموں کا باغ میری منزل تھا۔ میں چند لمحوں میں ہی نرسری اور باغ کے درمیانی کھال کو پھلانگ کر باغ میں گھس گیا۔ عقب میں پولیس کی سرکاری دھمکی مائیکروفون سے پھوٹنے لگی۔ ”تم لوگ پولیس کے گھیرے میں آ چکے ہو۔ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“

اُردو کے بعد یہی اعلان سرائیکی زبان میں دہرایا گیا۔ مبادا کہ اَن پڑھ ڈاکو اُردو نہ جانتے ہوں اور اتنی اہم پیشکش سے فائدہ اُٹھانے سے محروم رہ جائیں۔ یہ رٹے رٹائے جملے شاید اہلکاروں کے نصابِ تربیت کا اہم ترین حصہ تھے۔ میں نے ایک ذرا پلٹ کر دیکھا۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پر آ گئی۔ چاروں طرف سے گھیر لینے والوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی پیشہ ورانہ کارگزاری کی تکمیل تک میں کئی کلومیٹرز کا فاصلہ اسی طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے طے کر سکتا تھا۔ پیا جی نے دو ایک [illegible] لیتے ہوئے کہا تھا کہ پولیس اگر پولیس مقابلے کے دوران محض اپنی مضحکہ خیز سرکاری اداکاریاں ہی ترک کر دے تو بہتر نتائج حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی بات صادق تھی۔ دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ پولیس نے شجاع آباد سے نکلتے ہی ہوٹر آن کر دیا تھا۔ جب وہ نہر کے پل پر پہنچی تھی، میرے کانوں میں سائرن کی آواز آن پڑی تھی اور میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ کسی بھی شخص کو چھپنے اور خود کو محفوظ کرنے کے لیے یا پولیس کے بھرپور سواگت کے لیے اور اپنے آپ کو تیار کرنے کے لیے یہ وقت کافی تھا۔

آموں کا گھنیرا باغ میری توقع سے کہیں زیادہ وسیع و عریض تھا۔ درخت پرانے تھے جس کی وجہ سے ان کے تنے اتنے موٹے ہو چکے تھے کہ انسان کی بانہوں کی لپیٹ میں نہیں آتے تھے۔ میں درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیوں اور جھاڑ جھنکاڑ میں راستہ بناتا ہوا، دوڑتا ہوا خاصا دور نکل آیا۔ سانس پھول گئی۔ ایک غیر معمولی بڑے اور گھنے درخت کا انتخاب کر کے چابک دستی سے اُس پر چڑھ گیا۔ خاصی بلندی پر جا کر ایک دوسانگھے میں پھنس کر بیٹھ گیا۔ دل کو ایک طرح کا اطمینان ہوا کہ اول تو کوئی اس طرف آنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ بفرضِ محال کوئی مجھے تلاش کرتا ہوا اِدھر آ بھی نکلا تو اسے میری موجودگی کا پتا نہیں چل سکے گا۔

ایک ذرا مایوسی ہوئی کہ میں خواہش کے باوجود نگینہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اب دھڑکا لگا کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہ آ جائے یا حماقت اور ناتجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہوئے پولیس پر فائر کھول کر اپنی موجودگی کی نشاندہی نہ کر بیٹھے۔ میں ایسی حالت میں اس کی مدد کو پہنچنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے سوائے دعا کے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

گھنے باغ کی وجہ سے مجھے حویلی نظر نہیں آ رہی تھی مگر پولیس والوں کے مائیکروفون سے برآمد ہونے والا اعلان سنائی دے رہا تھا۔ بھاری آواز والا اہل کار خاصی ڈراؤنی آواز میں بار بار وہی جملہ دہرا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں حویلی سے کم و بیش ایک میل دور نکل آیا تھا۔ اس دوران پولیس نہ صرف حویلی کا احاطہ کر چکی ہوگی بلکہ اپنی سالخوردہ بندوقیں اور ہولسٹروں میں گلنے سڑنے والے سرکاری پستول بھی نادیدہ ڈاکوؤں پر تان چکی ہوگی۔ میری توقع کے مطابق مائیکروفون کے خاموش ہوتے ہی ہوائی فائرنگ کا سلسلہ چھڑ گیا۔

اس لاحاصل ریاضت کے دوران میں نے پنسل ٹارچ کی مدد سے اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ میری قمیص خون سے تر ہو چکی تھی۔ بازو پر بہت سا خون جم کر پپڑی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہیں پہلے بارہ بور بندوق کی نال سے نکلنے والا ایک چھرا لگا تھا۔ یہیں گولی لگ گئی مگر یہ دیکھ کر کہ گولی ہڈی اور اعصاب کو چھوئے بغیر ماس کو پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی، دل کو ذرا اطمینان ہوا کیونکہ اب زخم میں زہر پھیلنے کا اندیشہ نہ رہا تھا۔ میں نے اپنی بنیان پھاڑی، پٹی بنائی اور دانتوں کی مدد سے بازو پر کس کر باندھ دی۔ ایسا کرنے سے درد میں کچھ افاقہ ہوا۔

پولیس اہلکاروں کی کارروائی کا دورانیہ بہ مشکل دس منٹ تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ انہیں نگینہ ملی تھی، یا نہیں، اندازہ نہیں ہوا۔ یہ بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ پولیس کی آمد پر کہیں چھپے ہوئے حویلی کے مکین باہر نکلے تھے یا نہیں۔ ہو سکتا تھا کہ پولیس جھک مار کر اگلی سرکاری کارروائی میں رُجھ گئی ہو پھر اس اعصاب شکن خاموشی میں نصف گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران شاید ہمیں تلاش کیا جاتا رہا تھا مگر اس باغ کی طرف، جہاں میں چھپا تھا، کوئی سپاہی نہیں آیا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ رخصت ہو گئے ہیں تو میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر حویلی کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ ابھی باغ کے اندر ہی تھا جب مجھے باغ اور حویلی کے درمیانی کھیت میں اُگی ہوئی آموں کی نرسری میں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی سرچ لائٹس کی روشنی دکھائی دی۔ میں تڑپ کر ایک موٹے تنے والے آم کے پیچھے دبک گیا۔ دو یا دو سے زیادہ لوگ اس طرف آ رہے تھے۔ میں نے ازراہِ احتیاط چند لمحوں میں ہی پیڑ پر چڑھ کر اپنے آپ کو گھنی شاخوں میں چھپا لیا۔ میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی باغ کی طرف آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ منٹ بھر کے بعد وہ باغ میں داخل ہوئے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے میری طرف چلے آئے۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ان کی آوازوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک ہم ڈاکوؤں کی تعداد چار، پانچ یا اس سے بھی زیادہ تھی اور ہم حویلی میں لوٹ مار کی غرض سے حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ سرائیکی میں بات کر رہے تھے۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پولیس والے تھے یا حویلی کے مکین، مگر وہ چند لمحوں بعد عین اسی پیڑ کے نیچے آن رُکے جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ میں چاہتا تو چند ٹہنیاں ہٹا کر انہیں دیکھ سکتا تھا مگر کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہ ہونے کی وجہ سے دُبکا بیٹھا رہا۔

ان میں سے ایک بولا۔ ”یار یہ باغ تو بہت بڑا ہے۔ اس میں دو چار بندے تو کیا، پوری کی پوری پلٹن چھپ سکتی

ہے۔ چلو واپس چلیں۔ یہ نہ ہو کہ مفت میں مارے جائیں۔ ان لوگوں کے پاس بہت جدید اسلحہ ہوتا ہے۔“

یہ یک طرفہ مکالمہ سنتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پولیس کے جری اہل کار تھے۔

دوسرا بولا۔ ”اور صاحب سے کیا کہیں گے؟“

اس کی آواز خاصی بھاری اور بیٹھی بیٹھی تھی۔

”کیا کہنا ہے؟“ پہلا استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”یہی کہنا ہے کہ وہ باغ میں چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کہیں اور دفعان ہو گئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمارے خوف سے دُم دبا کر ہوا ہو گئے ہیں۔“

بھاری آواز والے نے اسے کوئی جواب دیے بغیر بلند آواز میں للکارا۔ ”اوئے...... کوئی ہے باغ کے اندر...... پولیس نے باغ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو ورنہ تم سب بھون دیے جاؤ گے۔“

اس کے ساتھی کے حلق سے دبی دبی خوف زدہ سی ہنسی برآمد ہوئی۔ بولا۔ ”اوئے چھڈ کریم بخشا! اب ڈاکو ہماری دھمکیوں میں آنے سے رہے۔ دو مربعے کے باغ کو گھیرنے کے لیے پولیس لائن کی ٹوٹل نفری بھی کم پڑ جائے گی۔“

بھاری آواز والے نے شاید اس کی گدی پر ہاتھ مارا تھا۔ دھپ کی آواز سنائی دی پھر دبا دبا قہقہہ۔ ”یار! میں ڈاکوؤں کو ڈرا نہیں رہا بلکہ میں تو تیرے توندو افسر کو مطمئن کر رہا ہوں۔“

”اوہ کنجر ہیڈا اوی تاں افسر اے!“ (وہ تمہارا بھی تو آفیسر ہے!)

وہ دونوں سپاہی تھے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے افسر کا حکم مان رہے تھے اور نہ دکھائی دینے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ بھاری آواز والا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”بستی والے کہتے ہیں کہ آدھا گھنٹا فائرنگ ہوئی۔ ساڑھے تین کتے اور ایک بندہ مرا۔ بس...... باقی فائر پھوکے ہی تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھٹی لوگ اور ڈاکو فائرنگ کے بعد کدھر نکل گئے۔ ان سب کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہے نا عجیب بات!“

”میرا خیال ہے کہ ڈاکوؤں کو ہمارے آنے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ گھر والوں کو یرغمال بنا کر یہاں سے نکل گئے ہیں۔“

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ پولیس ہوٹر کی اتنی تیز آواز نشر کرنے کے بعد بھی وہ ’میرا خیال ہے‘ کہہ رہا تھا حالانکہ اسے اس بات کا یقین تھا۔

”گاڑی تو وہیں کھڑی ہے۔“

”چوری کی ہوگی، تبھی چھوڑ گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گاڑیوں میں آئے ہوں۔“

”مجھے تو کوئی بڑی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔“

”تجھے اس عمر میں بہت کچھ محسوس ہونے لگا ہے کریم بخشا یہاں سے سیدھا دماغ کے کسی سیانے ڈاکٹر کے پاس جانا۔“

”تیری تو......“ بھاری آواز والا، جس کا نام کریم بخش تھا، ایک بھرپور گالی دے کر بولا۔ ”کچھ دیر اور رکتے ہیں تا کہ وہ توندو سب انسپکٹر سمجھے کہ ہم باغ کی تلاشی لے رہے ہیں۔“

اس نے خاصے پتے کی بات کی تھی۔

”وڈا کوئی کھوتے دا پتر اے توندو خان...... آپ ڈردا پراں وَنج کھلوتا ہے تے ساکوں موت دے منہ وچ گھت مارس!“

(بڑا گدھے کا بچہ ہے توندو خان۔ خود تو ڈر کے مارے دور کھڑا ہے جبکہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے اس نے)

”تمہاری بات ٹھیک ہے پر مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

”دھت تیرے کی! بندوق ہاتھ میں ہے، جسم پر کالی وردی ہے، پھر بھی ڈر رہے ہو۔“

کریم بخش نے پھر ہاتھوں کا بھونپو بنایا اور اعلانیہ جملے ادا کیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے توندو افسر کو سنانے کے لیے بار بار اعلان کر رہا تھا کیونکہ اس کے منہ کا رُخ دونوں مرتبہ بجائے باغ کے اندرونی حصے کے، حویلی کی طرف ہوا تھا۔ ان کا افسر کوئی غیر معمولی بڑے پیٹ والا اسب انسپکٹر تھا جو اس ریڈ پارٹی کو لیڈ کر رہا تھا۔ اس کے ماتحت طنزاً اسے ’توندو افسر‘ کہتے تھے۔ دونوں چند لمحوں تک اس ناکام ریڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اپنے توندو افسر کی شان میں غلط گستاخیاں کرتے رہے۔ پھر جب انہیں حویلی کی طرف سے پکارا گیا تو انہوں نے فی الفور واپسی کا قصد کیا۔

ان کا افسر خاصا تند مزاج شخص واقع ہوا تھا۔ چند لمحے بھی صبر نہ کر سکا اور تیز چیختی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اوئے کتھے مر گئے وے؟ ولّاں دی رشتہ داری کڈھ گھدی وے ڈاکوؤں نال یا رشتہ ڈیون لگن کھڑ گئے ہوئے؟ اِڈے چے تھیوو!“

(اوئے! کہاں مر گئے ہو؟ ڈاکوؤں سے ننھیالی رشتہ داری نکال کھڑے ہو یا رشتے کا لین دین کر رہے ہو؟ اس طرف آؤ)

میں نے دونوں سپاہیوں کی آواز تو نہیں سنی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ انہوں نے زیرِ لب زوردار قسم کی گالیاں دی

گی اور اپنی رفتار بڑھالی ہوگی۔ نرسری اور باغ کے درمیانی کھال کو جب انہوں نے پھلانگا تو مجھے پتا چل گیا کہ وہ باغ سے نکل چکے تھے۔

اس دوران توندو سب انسپکٹر کسی اور پر چلا رہا تھا۔

”اوں موئے مردود کوں چاتے ڈالے وچ پاوو۔ نالے موقع ملاحظے دا فوٹو آتے نقشے بنا گھنو......“

(اس مردود کو اٹھا کر پولیس موبائل وین میں ڈالو۔ ساتھ میں موقع کے فوٹو گراف اور نقشہ بنا لو)

دریائی علاقے میں معمول کے مطابق پڑنے والی اوس نے رات کے پچھلے پہر کو خاصا خنک کر دیا تھا۔ چاند سرکتا ہوا چھپنے کا سامان کر رہا تھا۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا چار دیواری اور کمرے کے سنگم پر آیا۔ آس پاس دیکھ بھال کر دیوار پر چڑھ گیا۔ حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن خالی تھا۔ میں چند لمحوں بعد پھر چھت پر تھا۔ رینگتا ہوا گول بنکر تک پہنچا پھر سیڑھیوں والے بنکر تک آ گیا۔ بنکر میں گہرے رنگ کے لباس والے نشانچی کی لاش ہنوز رکوع کی حالت میں اوندھی پڑی تھی اور پولیس کی عمدہ پرفارمنس کا ثبوت بنی ہوئی تھی۔ پولیس والوں نے چھت پر چڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس سے بڑی کوتاہی یا کج فہمی کی اور کیا مثال ہو سکتی تھی۔

میں نے بنکر میں کھڑے ہو کر اطراف میں جھانکا۔ پندرہ بیس پولیس والے برآمدے کے باہر دکھائی دیے۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ کاغذی کارروائی میں مشغول تھے۔

موقع واردات کے فوٹوز اور جائے قتل کا نقشہ تیار کیا اور مفت میں ہاتھ لگنے والی لاش کو موبائل ویگن میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ ایسے ہی وقت میں منشی نے روزنامچہ تحریر ہونے کا اعلان کر دیا۔ موٹی توند والا اسب انسپکٹر کتوں کی اندوہ ناک موت سے نجانے کیا نتائج اخذ کرنے کے لیے ان کی لاشوں پر جھکا ہوا تھا۔ کوئی نتیجہ اخذ ہوا یا نہیں، اس نے سیدھا ہو کر واپسی کا اشارہ کر دیا۔ بڑھے ہوئے پیٹ اور گنجے سر پر مشتمل اس کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز تھا۔ عام حالات میں اسے دیکھ کر اپنی ہنسی پر قابو پانا خاصا دل گردے کا کام تھا۔

میرا اندیشہ نخو ہو گیا۔ نگینہ پولیس کے نرغے میں دکھائی نہیں دی۔ وہ یا تو کہیں دور نکل گئی تھی یا قریب رہ کر کسی پیڑ پودے کی آڑ لے رہی تھی۔

پولیس کی دونوں گھومتی بتی والی موبائل گاڑیوں کے عقب میں بیس کے قریب دیہاتی ایک جتھے کی صورت میں کھڑے آپس میں محوِ کلام تھے اور بڑی توجہ سے پولیس کی دفتری کارروائی کو بہ نظرِ اشتیاق ملاحظہ کر رہے تھے۔ اکثر نے ہاتھوں میں لمبی لمبی ڈانگیں تھامی ہوئی تھیں جبکہ دو چار کے کاندھوں پر لٹکی ہوئی رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ عرفِ عام میں انہیں کچی رائفلیں کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں پکی گولی کے بجائے چھروں والے کارتوس ڈالے جاتے ہیں۔

اونچی نیچی آوازوں کا ملا جلا شور ماحول میں رچا بسا تھا۔ تقریباً سبھی اس رائے پر متفق تھے کہ پولیس کے ڈر سے ڈاکو فرار ہو گئے ہیں۔ ایک بلند قامت دیہاتی اپنی بھاری آواز میں مختلف نظریہ پیش کر رہا تھا کہ ڈاکو پولیس کا ہوٹر سنتے ہی بھٹیوں کو یرغمال بنا کر کہیں چھپ گئے ہیں۔ ایک دو سپاہیوں نے اس کے نظریے کو توثیق دی مگر ایک نوکیلی مونچھوں والا دبلا پتلا دیہاتی سرائیکی میں مخاطب ہوا۔ ”نہیں سجنو! توروز بھٹی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکوؤں کی آمد کا پہلے سے ہی علم تھا۔ اس لیے وہ خیر محمد کو پہرے پر کھڑا کر کے اپنا خاندان ہونج میل کر (سمیٹ کر) کسی طرف نکل گیا ہے۔“

ایک اور دیہاتی بلند آواز میں مہرِ تصدیق ثبت کرنے لگا۔ ”توروز بھٹی کی حویلی میں ڈاکو کیا لینے آئیں گے۔ مجھے تو یہ کوئی پرانی دشمنی کا چکر لگتا ہے۔“

میرے دیکھتے ہی دیکھتے پولیس خیر محمد نامی پہرے دار کی لاش لے کر روانہ ہو گئی۔ راجباہ والے راستے پر پہنچ کر دونوں گاڑیاں رُک گئیں۔ دو سپاہی ڈالے سے اُترے۔ ان کا رُخ اس جانب تھا، جس جانب میری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے حلق سے کراہ جیسی سانس نکل گئی کہ چند ہی لمحوں بعد پولیس کی دونوں گاڑیوں کے درمیان میری سفید کرولا چلتی ہوئی بستی کی جانب بڑھ گئی تھی۔ کم بخت میری گاڑی اپنے ساتھ تھانے لے گئے تھے۔ میری واپسی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ حائل ہوئی تھی۔ میں جس شان سے مقتل کی طرف آیا تھا، اس شان سے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔

دیہاتیوں نے دو چار مرتبہ بلند آواز میں توروز بھٹی اور اس کے بیٹوں کو پکارا۔ ایک نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اعلان کیا، ”توروز بھٹی! اگر تم سن رہے ہو تو ڈرے بغیر باہر آ جاؤ۔ ہم تمام بستی والے تمہاری مدد کے لیے اسلحے سمیت باہر کھڑے ہیں۔“

اس کی آواز غیر معمولی طور پر طاقت ور تھی اور میری دانست میں میل بھر کا سفر طے کر گئی ہو گی۔ اس نے تین مرتبہ اپنا جملہ اسی انداز میں دہرایا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”منو بھاتویں نہ منو...... اُہ ذال بال گھن تے

دریاؤں نکل گیا ئے!"

(مانو خواہ نہ مانو۔ نوروز بھٹی اپنے اہل وعیال کو لے کر دریا کی طرف نکل گیا ہے)

وہ سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے بستی کی طرف چل دیے۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ محض اندازہ تھا کہ تین سے کچھ اوپر کا عمل تھا جب میں نے پہلے مدھم آواز میں، پھر قدرے بلند آواز میں نگینہ کو پکارا۔ جواب ندارد۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ بینکر میں کھڑا ہو گیا۔ حویلی کے اگلے باغ میں، جہاں میری دانست میں اسے چھپا ہونا چاہیے تھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ یہ سراسر اضطراری کوشش تھی وگرنہ اس کے یوں دکھائی دینے کا جواز نہیں تھا۔ وہ گھنے درختوں میں ہی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پھر پکارا مگر مایوس رہا۔ وہ یا تو کہیں دور نکل گئی تھی یا میری آواز کو پہچان نہیں رہی تھی۔

میں سیڑھیاں اُتر کر ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔ ایک بھاری مردانہ آواز سن کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ اعصاب ایک دم تن گئے اور میں بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیوں سے آگے نکلی ہوئی کمرے کی دیوار کی اوٹ میں دبک گیا۔ آواز بہ دستور سنائی دے رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جھانک کر لاؤنج میں دیکھا تو چونک گیا۔ گیلری کی جانب واقع عروسی آرائش والے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا حالانکہ میں نے تلاشی لینے کے بعد کسی بھی دروازے کو بند نہیں کیا تھا۔ باقی کمروں کے دروازے پہلے کی طرح چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ جو کوئی بھی تھا، وہ اسی نیم وا دروازے کے پرے یعنی تزئین یافتہ بیڈ روم میں ہی موجود تھا۔

میں نے گن اور پستول فائر پوزیشن میں تھامے اور دبے پاؤں چلتا ہوا بیڈ روم کے دروازے پر آیا۔ احتیاط سے اندر نگاہ ڈالی۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرے پورے بدن کو ایک دم سخت جھٹکا لگا۔ نگینہ بیڈ پر اوندھے منہ پڑی تھی جبکہ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس لمبا تڑنگا مرد بیڈ پر پیر رکھے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ قدرے نیچی آواز میں غرا رہا تھا۔ "کم ذات! سیدھی طرح بول دے ورنہ مار مار کر چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

میں اسی ایک جملے سے مکمل متن اپنے سیاق و سباق سمیت سمجھ گیا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص نوروز بھٹی کا بڑا یا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح نگینہ پر قابو پا لیا تھا اور اب اس سے اس کے ساتھی یا ساتھیوں کے بارے دریافت کر رہا تھا۔ نگینہ کو میں نے فوری طور پر اس کے لباس کی وجہ سے پہچانا تھا ورنہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے معطر ریشمی بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا جس سے اس کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کا جھٹکے لیتا بدن چغلی کر رہا تھا کہ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

میں نے ارد گرد دیکھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہم تینوں کے علاوہ حویلی میں بہ دستور کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ جس طرح رازداری سے وہ شخص کہیں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا تھا، ایسے ہی باقی لوگ بھی کسی لمحے جنوں بھوتوں کی طرح دیوار پھاڑ کر سامنے آ سکتے تھے۔ میرے اس یقین کو تقویت ملی کہ اس حویلی میں کسی سرنگ یا خفیہ تہ خانے کا دہانہ کھلتا تھا۔ میں نے پاؤں کی مدد سے دروازے کو بے آواز انداز میں دھکیلا اور آنِ واحد میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چونکہ نگینہ سے بازپرس کرنے والے کی پشت دروازے کی جانب تھی اور نگینہ اوندھے منہ بیڈ پر پڑی تھی، اس لیے دونوں کو ہی میری آمد کا پتا نہیں چلا۔ میں بجلی کی سی مستعدی سے طویل قامت کے عقب میں پہنچا اور گن کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ "کاربین بیڈ پر رکھ کر دونوں ہاتھ اُٹھا لو ورنہ تمہارا جسم چھلنی کر دوں گا۔"

میری نہایت سرد آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے اور وہ پلٹتے پلٹتے ایک دم رُک گیا۔ "تت...... تم کون ہو؟"

میں نے اپنی آواز میں مزید درشتی سموئی۔ "جو کہہ رہا ہوں وہ کرو ورنہ......"

اس نے سست انداز میں کاربین بیڈ کے میٹرس پر رکھ دی۔ میری آواز سن کر نگینہ رونا بھول کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنسو بھری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اس نے طویل قامت شخص کی رکھی ہوئی کاربین اُٹھانے اور اس پر تاننے میں بہ مشکل ایک سیکنڈ کا وقت لیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے طویل قامت شخص پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اسے گن کی نال سے دیوار کی جانب دھکیلا۔ وہ بے چوں چراں دیوار تک گیا اور میرے حکم پر ہاتھ سر سے بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ نگینہ بول پڑی۔ "یہ باسٹرڈ امانت ہے...... اسی کتے کے پلے نے میرے بھائی کو مارا تھا۔"

"اوہ!" میرے حلق سے ہنکارا برآمد ہوا۔ طویل قامت شخص بھنا کر بولا۔ "میں تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا حرامزادی...... تو مجھے جانتی نہیں ہے۔"

وہ کچھ اور بکنا چاہتا تھا مگر میری گن کی نال کے بڑھتے ہوئے دباؤ پر خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کہاں چھپے ہوئے تھے؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اکھڑ لہجے میں بولا۔ "گدھے کے بچے! زندگی کی خیر مناؤ اور ایک منٹ سے پہلے حویلی سے نکل جاؤ ورنہ چوہے کی طرح مارے جاؤ گے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔ میں تو اب تک تمہاری جوانی پر ترس کھا رہا ہوں ورنہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کے رکھ دوں۔"

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نگینہ میرے پہلو سے نکل کر سامنے آ گئی۔ میں نے اسے ایک لمحے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بے حد سپاٹ اور آنکھیں بے حد خون آشام تھیں۔ میں اس کی قلبی کیفیت سمجھ گیا مگر اسے روکنے میں دیر کر بیٹھا۔ اس نے دانت کچکچائے اور فائر کر دیا۔ کاربین کی گولی کمرے میں خوفناک گرج پیدا کرتے ہوئے امانت بھٹی کی کمر میں جا دھنسی۔ وہ تڑپ کر پلٹا۔ ایسے میں اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ میرا دھکا کھا کر کمر کے بل دیوار سے جا لگا۔ اس کا چہرہ فرطِ خوف اور تکلیف سے خاصا ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ جبڑا بھنچ جانے سے چہرے کے اعصاب ابھر آئے تھے۔ ایسے میں نگینہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں پڑی۔ "کمینے...... تم نے میرے انوسینٹ برادر کو گولی مارا...... تو تو...... تو مور بر-تھ یو بیو...... تو مور پینگ...... ہاہ! تین گولیاں...... اس معصوم کے سینے میں تم نے کسی جرم کے بغیر اتار دیں...... ہاہ!"

اس نے پھر دانت پیسے۔ کاربین کا ٹریگر دبایا۔ گولی نہیں نکلی۔ اس میں ایک ہی گولی تھی جو چل چکی تھی۔ دو تین مرتبہ ٹریگر دبانے کے بعد اس نے جھنجلا کر کاربین کو اس کے سینے پر کھینچ مارا۔ بلی کی طرح تڑپ کر میرے الٹے ہاتھ آئی۔ میرے ہاتھ سے ریوالور چھین کر غرائی۔ "ہماری پراپرٹی کے بھوکے...... تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتی...... تو مور بر-تھ یو بیوڈرٹی مین......"

میں نے ڈانٹا۔ "ہوش میں آؤ نگینہ!"

"یو شٹ اَپ!" وہ بھڑک کر بولی اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے ایک ہی سانس میں چار گولیاں امانت بھٹی کی چھاتی میں اُتار دیں۔ سائیلنسر لگے ریوالور کی مخصوص 'ٹھک ٹھک' کے بیچ میں امانت بھٹی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر حلق سے محض خرخراہٹ نکل سکی۔ آنکھیں خوف اور تکلیف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ میں چیخ کر نگینہ کی طرف بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فائر کرنا چاہتی تھی مگر امانت کو لہرا کر فرش پر گرتا دیکھ کر رُک گئی۔ چند ہی لمحوں میں فرش پر خون کا تالاب سا بن گیا۔ امانت بھٹی کے چھلنی بدن سے لہو بھل بھل کرتا ہوا نکل رہا تھا جو نگینہ کے سلگتے ہوئے ذہن پر پانی کے چھینٹے بن کر گر رہا تھا۔

میں نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ "اس سے کچھ پوچھنے تو دیا ہوتا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر......"

"سمجھو کہ یہ مر گیا ہے۔ یہاں سے نکل چلیں کیونکہ ہمارا کام مکمل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کاغذات......"

"وہ میرے پاس ہیں۔"

"اور ابھی رفاقت اور اس کا باپ باقی ہیں۔ میں ان کا مرڈر کرنا چاہتی ہوں۔"

"اوہ تو...... تمہارے بھائی کو اس مردود نے مارا تھا، تم نے بدلہ لے لیا۔ اب چلیں۔"

اس نے سختی سے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں سر! اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ جب تک وہ دونوں زندہ ہیں، میں واپس نہیں جا سکتی۔ کہا ناں! آئی کین نیور گو بیک......"

اس کے اس اٹل فیصلے کو سن کر میں کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ میں نے امانت پر سے نظریں ہٹائیں۔ نگینہ کو دیکھا۔ وہ کینہ توز نظروں سے فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے امانت بھٹی کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا تھا کہ رستے ہوئے خون کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور اسے اسی کیفیت میں چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج میں رُک کر کچھ سوچتا رہا۔ میرا پہلا کام اس مقام کو کھوجنا تھا جہاں بھٹی خاندان چھپا ہوا تھا۔ چاروں کمروں کو اس نقطۂ نظر سے کھنگالا۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ گیلری میں آیا۔ اس میں کچن اور اسٹور سمیت چار کمرے تھے۔ لاؤنج میں آیا۔ مہمان خانے کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر نگینہ کو دروازے میں کھڑے پایا تو رُک گیا۔ وہ بولی۔ "سر! آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

میں نے رُک کر اسے بتایا۔ "یہاں کوئی تہ خانہ ہے جس کا دروازہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں حیرت بس گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی حالت بہتر نہیں تھی۔ اسے خوب زدوکوب کیا گیا تھا۔ گالوں پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ گریبان تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "تم اس

مردود کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟"

وہ اپنی شکستہ، اردو اور انگریزی ملی جلی زبان میں بتانے لگی۔ "جب پولیس آئی، میں اُسی آم پر چڑھی ہوئی تھی جس کے نیچے آپ مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ پولیس کے جانے کے بعد میں نیچے اُتری اور حویلی میں داخل ہو گئی۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ یہ کمینہ نہ جانے کہاں سے نکل کر مجھ پر پل پڑا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"لاؤنج کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا؟"

"یس سر! پھر اس نے مجھ سے گن اور پسٹل چھین لیا اور مجھے چند منٹوں میں ہی مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ پھر مجھے گھسیٹ کر بیڈروم تک لایا تھا۔" وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔

"تم نے شور نہیں مچایا؟" میں نے اس خیال کے تحت دریافت کیا کہ میں نے اس کے چیخنے چلانے کی آواز نہیں سنی تھی۔

"نو سر! باہر پولیس والے جو موجود تھے۔"

"یعنی تمہیں اس وقت پولیس کی موجودگی کا احساس تھا؟" مجھے اچنبھا ہوا۔

"یس سر! پولیس والے اگر میری آواز سن لیتے تو آ کر مجھے پکڑ لیتے۔"

"پولیس زیادہ سے زیادہ تمہیں گرفتار کر لیتی جبکہ یہ درندہ تمہیں قتل کر سکتا تھا۔ اچھا خیر! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری گن اور پستول کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے دیکھا تو ہو گا کہ امانت نے تم سے اسلحہ چھین کر کہاں رکھا۔ جاؤ، اُٹھا لاؤ۔"

"اوہ یس! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اس نے میرے ویپن وہیں کمرے میں، بیڈ کے نیچے پھینک دیے تھے۔"

اس سے کئی باتیں پوچھنی تھیں مگر میں نے اس کا تفصیلی انٹرویو پھر کسی وقت پر ٹال دیا اور اسے بیڈ کے نیچے سے اسلحہ نکال لانے کا حکم دیا۔ وہ کمرے میں گھس گئی تو میں نے مہمان خانے کا رُخ کیا۔ بیرونی سمت واقع عمارت کا یہ حصہ دو بڑے کمروں، ایک کشادہ ٹوائلٹ اور خاصے وسیع و عریض برآمدے پر مشتمل تھا۔ اسی برآمدے کے نیچے خیر محمد میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس کا نام مجھے بستی والوں کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا۔ بھٹی خاندان کے چال چلن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور واردا تیا تھا یا قانون کو انتہائی مطلوب مجرم تھا جو قانون کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے لیے نوروز بھٹی کے ڈیرے پر بطور سکیورٹی گارڈ اپنی خدمات پیش کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نوروز بھٹی کا دستِ راست ہو اور ان لوگوں نے مل جل کر اپنا چھوٹا موٹا گروہ تشکیل دے رکھا ہو۔ دریائی علاقوں میں بہت کچھ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جو قانون سمیت پوری دنیا سے چھپا رہتا ہے۔

مہمان خانے کا ایک کمرا وی آئی پی مہمانوں کے لیے بڑے اہتمام سے آراستہ کیا گیا تھا جبکہ دوسرے میں موٹے پایوں والی روایتی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سبھی دیواریں اور فرش سپاٹ تھے۔ تھپتھپانے سے کہیں بھی کھوکھلا پن آشکار نہیں ہوا تو میں مایوس ہو گیا۔ میرے یقین کے مطابق حویلی کے نیچے تہ خانہ یا کہیں دور لے جانے والی سرنگ کا دہانہ موجود تھا جس تک میری رسائی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے اس یقین کو امانت بھٹی کی نہایت پراسرار انداز کی آمد نے تقویت دی تھی۔

میں برآمدے اور مہمان خانے کے درمیانی دروازے کو کھولنے ہی لگا تھا کہ عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ تڑپ کر پلٹا تو نگینہ کو حیرت و استعجاب کی مورتی بنے کھڑے پایا، پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"سر...... سر! وہ...... بیڈ کے نیچے سے تو کچھ بھی نہیں ملا حالانکہ اس کتے نے میری آنکھوں کے سامنے میری گن اور پسٹل بیڈ کے نیچے پھینکے تھے۔ تو سر...... تو سر...... ہاؤ اِز دِس پاسیبل؟"

وہ اپنی حیرت کا اظہار کر ہی رہی تھی کہ میں ایک جھٹکے سے بیڈروم کی طرف بھاگا۔ میں نے یہ سمجھنے میں لحظہ بھر دیر نہیں کی تھی کہ سرنگ یا تہ خانے کا دہانہ اسی بیڈ کے نیچے کھلتا تھا۔ بیڈ کے پاس پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھکا۔ فرش سپاٹ تھا۔ تھپتھپا کر دیکھا۔ کھوکھلا پن محسوس نہیں ہوا۔ فرش میں جوڑ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیڈ کو دائیں بائیں، اوپر نیچے ہلا کر دیکھا۔ دیوار پر نصب سوئچ بورڈ کے سبھی بٹن 'آف' اور 'آن' کر کے دیکھا۔ نہ بیڈ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ فرش ہی میں کوئی خلا پیدا ہوا۔ نگینہ دروازے میں کھڑی میری حرکات کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

میری تمام تر کوشش کے باوجود بیڈ ایک سنٹی میٹر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا تو میں آخری کوشش کے طور پر فرش پر لیٹا اور پہلو کے بل کروٹ بدل کر بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ کوئی کلیہ ہاتھ نہ لگا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کے نیچے نصب چوبی کڑی پر لگائے اور پوری قوت سے بیڈ کو اوپر اُٹھانا چاہا۔ بیڈ تو اپنی جگہ سے انچ بھر بھی نہ اُٹھا، البتہ میں فرش کے دو اڑھائی فٹ چوڑے حصے سمیت زمین میں دھنستا چلا گیا۔ میں نے سنبھلنے اور اُٹھنے میں غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کیا مگر دیر ہو گئی تھی۔ فرش کا ٹکڑا کم و بیش آٹھ فٹ نیچے جا کر لفٹ بکس کی طرح رک گیا۔ میرے بدن کو جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل اوپر اٹک گیا ہو اور بدن نیچے کھسک رہا ہو۔ ایسے ہی وقت میں سرد سی شے میری پسلیوں میں آن چبھی جسے محسوس کرتے ہی میرا جسم ساکت ہو گیا۔

یہ ایک گیلری نما کمرا تھا جس میں دودھیا بلبوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں فرش کے تختہ نما ٹکڑے پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور میری پسلیوں میں چبھنے والی سرد شے بندوق کی نال تھی۔ میں نے گردن موڑی۔ اپنے بہت قریب امانت بھٹی جیسی قامت اور حلیے والے شخص کو خون آشام نظروں سے گھورتے پایا۔ اسے دیکھتے ہی پہلا خیال ذہن میں یہی پیدا ہوا کہ وہ نوروز بھٹی کا بڑا بیٹا رفاقت تھا کیونکہ اس کے خال و خط میں اپنے چھوٹے بھائی امانت کی مکمل شباہت موجود تھی۔ اس کی انگلی ڈبل بیرل گن کے دہرے ٹریگر پر تھرک رہی تھی اور موٹی موٹی سرخی مائل آنکھوں میں جہان بھر کی خشونت بھری ہوئی تھی۔ میں نے کن اکھیوں سے اپنی گن کو دیکھا جو کندھے پر لٹکنے کے باوجود اس حالت میں نہیں تھی کہ اسے فی الفور حرکت میں لایا جا سکتا۔

"خبردار! ذرا بھر حرکت کی تو گولی سیدھی دل میں اتار دوں گا۔" طویل قامت رفاقت بھٹی کا لہجہ بڑا سنگین تھا۔

میری معمولی سی بے پروائی سے کام بگڑ چکا تھا۔ اس اُلجھے ہوئے ریشم کو فراست سے سہلایا جا سکتا تھا ورنہ اس جنگلی درندے سے ذرا بھر خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مستزاد یہ تھا کہ اس کا حقیقی بھائی اور ایک خاص کارندہ ہمارے ہاتھوں راہی اجل ہو چکے تھے۔

اس وقت میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے اس نئی صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسے میں میری پشت پر کوئی مضبوط گرفت والا شخص آیا اور اس نے چشم زدن میں میرے دونوں ہاتھ پوری قوت سے پیچھے کھینچ لیے۔ میرے سمجھنے سے پیشتر ہی اس نے میری کلائیوں کو باہم جوڑ کر کسی آہنی کلپ میں جکڑ دیا۔

رفاقت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سرخ ڈورے آنکھوں کی دہشت کو بڑھا رہے تھے۔ مجھے رسٹ کلپ پہنانے والے کو دیکھے بغیر سرد لہجے میں بولا۔ "زور آور! اسے اُتار لو۔"

ساتھ ہی اس نے آنکھوں سے میری گن کی طرف اشارہ کیا۔

زور آور کا نام سنتے ہی میری دھڑکن بڑھ گئی۔ اس کی یہاں موجودگی غیر متوقع نہیں تھی مگر زود ہضم بھی نہیں تھی کیونکہ وہ نہایت سنگ دل انسان تھا۔ لحظہ بھر میں ملتان کے نواحی مکان کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا جہاں میں نے اس کی خباثت اور درندگی عروج پر دیکھی تھی۔

اسی دوران زور آور نے گن کے بیلٹ کا اسٹرپ بکل کھولا اور میری گن اپنی تحویل میں کر لی۔ اپنے مخصوص انداز میں ہنس کر بولا۔ "بڑی خوب صورت گن ہے۔ اوہ! یہ تو سائیلنسر ڈ بھی ہے...... مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ جنگلی بلا اتنی آسانی سے قابو میں آ جائے گی۔ اس کی طرف میرے بڑے حساب نکلتے ہیں بھٹی! اس کے ہاتھوں پر میرے جان سے پیاروں کا خون چپکا ہوا ہے۔ دیکھنا! اس کے روئیں روئیں میں آگ بھر کر اسے نچاؤں گا۔"

میں کوئی جواب دے کر انہیں برانگیختہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ اوکھلی میں سر آ گیا تھا اور موسلے پوری قوت سے میرے سر پر سوار ہو چکے تھے۔ رفاقت کے ٹھہراؤ کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اسے ابھی تک خیر محمد اور امانت کی موت کا علم نہیں ہوا تھا وگرنہ وہ اتنا پرسکون نہ ہوتا۔ مگر یہ لاعلمی زیادہ دیر برقرار رہنے والی نہیں تھی۔ اسے جس لمحے علم ہوتا، وہ اُسی پل مجھے چھلنی کر دیتا۔ اس کی آنکھوں کے تاثر سے میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ وہ نہایت عجلت پسند اور انتقامی ذہن رکھنے والا جوان تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ اس دوران زور آور نے مشاقانہ انداز میں میری تلاشی لی اور نگینہ اور سلامت بھٹی کے کاغذات، میری پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر اور بیلٹ کا سامان نکال لیا۔ پاسپورٹ دیکھتے ہی رفاقت کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ اس نے ایک لمحہ کو اوپر دیکھا۔ گیلری کی چھت کے خلا میں سے بیڈ کا نچلا حصہ اندھیرے کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ "ہوں! تو یہ کتا ان کاغذات کی بو سونگھتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔"

زور آور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے داہنے پہلو میں کھڑا عجیب گھورتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا غیر معمولی بڑی جسامت والا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس کی نال کو ناخن سے کھرچتے ہوئے بولا۔ "بھٹی! میں اسے سنبھالتا ہوں۔ تم جا کر امانت کا پتا کرو۔ مجھے یقین ہے کہ شہریار یہاں اکیلا نہیں آیا ہوگا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہوں گے۔ ان

سے امانت نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تمھیں پہلے بھی کہا تھا کہ اسے باہر نہ جانے دو۔"

"او یار کچھ نہیں ہوتا...... تم امانت کو نہیں جانتے۔ وہ اس جیسے دس کتوں کے لیے اکیلا ہی کافی ہے۔ بہرحال! تم اسے نیچے اُتارو، میں اس کا پتا کر کے آتا ہوں۔" رفاقت کے لہجے کی رعونت مجھے بری لگی مگر خاموش رہا۔

زور آور نے مجھے کالر سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ میں نے خود کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو پیروں کے بجائے کولھوں کے بل سنگِ مرمر کے فرش پر گرتا اور خاصی چوٹ آ جاتی۔ وہ مجھے بے دردی سے گھسیٹتا ہوا گیلری میں سیدھا چلتا گیا پھر دائیں ہاتھ واقع ایک چھوٹے سے کمرے میں گھس گیا۔ کمرا ساز و سامان سے عاری تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لٹکتی ہوئی آہنی زنجیروں اور مضبوط کلپس کو دیکھ کر میرے حلق سے لمبی سانس خارج ہو گئی۔ وہ مجھے ٹارچر روم میں لایا تھا۔

بے دردی سے گھسیٹتا ہوا دیوار تک لایا اور کھڑا کر کے زنجیروں میں جکڑنے لگا۔ اس نے محض چند منٹ میں ہی ماہرانہ انداز سے مجھے یوں جکڑ دیا کہ میں انچ بھر حرکت کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے لفٹ نما تخت پر ہی ایکشن میں آ جانا چاہیے تھا اور دونوں سے دو دو ہاتھ کر لینا چاہیے تھا۔ اب بے بسی سے سوائے ان کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے اور اپنی چیخوں کو ہونٹوں کے پیچھے دبانے کے، میں عملی طور پر کچھ کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "زور آور! تم جانتے ہو کہ مجھے میڈم نے یہاں بھیجا ہے۔"

میں نے اس جملے میں نہ صرف اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں میڈم کے نزدیک کتنی اہمیت رکھتا ہوں بلکہ یہ باور بھی کرایا تھا کہ اس کی یہ حرکت میڈم کے نزدیک اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اُلٹے قدموں چلتا ہوا کمرے کے وسط میں چلا گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ نشے کی حالت میں تھا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ "واہ! ...... واہ! کیا ذکر چھیڑ دیا اس سرکش حسینہ کا...... پر اس کا نخرا اس کے قد کاٹھ سے کہیں بڑا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ ہائے! وہ غلط بھی تو نہیں سمجھتی ناں...... ٹھیک ہی تو سمجھتی ہے۔ پر جب میں تمھیں دیکھتا ہوں تو نہ صرف مجھے اپنے جان سے پیارے یار موبی اور صفی یاد آ جاتے ہیں بلکہ میرے دل میں رقابت بھی جاگ اُٹھتی ہے۔ چلو یہی ٹھیک سہی! آج یہ دونوں پرابلمز حل ہو جائیں گی۔ نہ بانس رہے گا اور نہ ہی کبھی دُکھ کی بانسری بجے گی۔"

نشے کی وجہ سے وہ بولتے بولتے اٹک رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ جسم پر سستی مسلط تھی۔ اس کے باوجود اس کی خونخواری میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس [illegible] آسان نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے تمھیں پہلے بھی کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں نے موبی کو قتل نہیں کیا تھا۔ ہاں! صفی کا قتل میرے ہاتھوں ہوا۔ یہ الگ بات ہے مگر اس وقت میری جگہ پر تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔ میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ میری اور تمھاری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ پھر تم میرے بارے میں اتنے انتہائی انداز سے کیوں سوچتے ہو؟"

"ہاں! میں سوچتا ہوں انتہائی انداز سے، مگر میں کیا کروں، میری فطرت ہی ایسی ہے۔ اچھا چھوڑو اس پرانی کہانی کو، یہ بتاؤ، تمھارے ساتھ سخی محمد آیا ہے یا پیا جی؟"

میں نے ایک لمحے کو سوچا، پھر کہا۔ "وہ دونوں بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکا۔ "تم کتنے لوگ یہاں آئے ہو؟"

میری توقع کے مطابق اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیریں ابھر آئی تھیں۔

میں نے اسے مزید کھسکانے کی کوشش کی۔ "ایک لڑکی سمیت چھ آدمی باہر موجود ہیں۔"

"لڑکی؟" وہ ایک بار پھر ٹھٹکا۔ "کیا رفاقت کی بیوی نگینہ بھی ساتھ آئی ہے؟"

"یس! امانت مارا جا چکا ہے۔ خیر محمد بھی۔ چھت پر دو لڑاکے بینکروں میں موجود تھے۔ ان کی آخری رسومات سخی محمد نے سرانجام دی ہیں۔ رفاقت کی قسمت بھلی ہوئی تو زندہ سلامت واپس آ جائے گا اور اگر اس کے دن گردش میں ہوئے تو پیا جی یا فیروز کے ہاتھ لگ چکا ہو گا اور اس وقت عالمِ بالا کی سیر کر رہا ہو گا۔"

اس دوران میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دے کر محسوس کر لیا تھا کہ ان مضبوط آہنی زنجیروں سے گلوخلاصی میرے بس سے باہر تھی۔

"تمھیں میڈم نے نگینہ کے ساتھ کیوں بھیجا؟ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔" وہ بغیر کسی وجہ کے ریوالور مجھ پر تان کر، سوچتے ہوئے بولا۔ "مگر تم اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس جانے کے بجائے تہ خانے میں کیوں آئے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تو کیا ہوا؟ میں سمجھائے دیتا ہوں۔ ان پیپرز کی دستیابی کے بعد میڈم کا حکم مانتے ہوئے نوروز بھٹی اور اس کے دونوں بیٹوں کو ٹھکانے لگانا ابھی باقی تھا۔ اس لیے یہاں آیا ہوں۔"

"کیا تم لوگوں کو معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں؟"

"ہاں! مگر ہمیں نہیں، میڈم کو تمھاری یہاں آمد کا پتا تھا۔ ہمیں میڈم نے یہ حکم دیا تھا کہ تم سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں تمھیں نہ مارا جائے۔"

"چاہے میں تمھیں اُڑا کر رکھ دوں۔ ہوں؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میڈم نے حکم دیا تھا کہ تمھیں ہر ممکن صورت میں زندہ رکھا جائے۔ اگر تم رکاوٹ بنو تو تمھیں زخمی کر کے اپنے ساتھ لایا جائے۔"

"کیا تم میں کوئی ایسا شہ زور موجود ہے جو اس زور آور کو زخمی کر کے اپنے ساتھ لے جائے؟" اس نے بھڑک کر اپنا سینہ ٹھونکا۔

"زور آور! ہمارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ پولیس یہاں سے خیر محمد کی لاش لے جا چکی ہے۔ اب وہ دن چڑھے یہاں آئے گی اور اپنی باقی ماندہ کارروائی ڈالے گی۔ دن چڑھنے میں دیر ہی کیا ہے؟ ...... اور امانت مر چکا ہے...... اور اب تب میں رفاقت بھی مرنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہی تم ان چار لوگوں کے قتل کے الزام میں دھر لیے جاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہماری راہ میں حائل ہونے کے بجائے اپنی خیر مناؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔"

چونکہ وہ نشے میں تھا اور میرا پختہ لہجہ سچائی کا غماز تھا، اس لیے وہ اندر سے ہل گیا۔ بہ ظاہر بے پروائی اور رکھائی سے بولا۔ "کیا نگینہ بھی میڈم شکیلہ گینگ جائن کر چکی ہے؟"

"ہاں!" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

ایسے میں کہیں دور سے فائر کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں چونک گئے۔ باہر، حویلی میں دو جانی دشمن موجود تھے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان میں سے ایک کام آ گیا تھا۔ کون؟ رفاقت یا نگینہ؟ ...... یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنا اندرونی اضطراب چھپا کر سنگین لہجے میں کہا۔ "زور آور! جلد فیصلہ کر لو کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ مجھے مارنے کے بعد تم پیا جی، فیروز اور سخی محمد کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ وہ مجھے مردہ حالت میں دیکھتے ہی میڈم کے حکم کی [illegible] کریں گے۔"

"تم اس تہ خانے کے رموز و اسرار کو نہیں جانتے اس لیے بڑھ چڑھ کر بول رہے ہو۔ ان میں سے کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ حتیٰ کہ تم بھی ہماری مرضی کے بغیر یہاں نہیں آ سکتے تھے۔"

"تو میں کیسے یہاں آ گیا؟"

"تم دہانے کو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ تمھاری کوششوں کو سراہا جائے۔ سراہنے کے لیے تمھیں نیچے بلایا۔ تم اس غلط فہمی میں ہو کہ تم نے مین وے کھولا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمھاری ان باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ پیا جی یہاں تک پہنچ جائے گا۔"

اس نے ہونٹ چڑھائے اور نفی میں سر ہلایا۔

"دیکھو زور آور! تمھارے بھتیجوں کا کانٹا نکل چکا ہے۔ رہا ان کا باپ...... آج نہیں تو کل وہ بھی انٹاغفیل ہو جائے گا۔ کاغذات کی فکر نہیں ہے۔ نئے بن جائیں گے، ڈپلی کیٹ۔ یعنی ہمارا مشن مکمل ہو چکا ہے اور میرے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میری سرد آواز نے اسے خیر منانے پر مجبور کر دیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے اپنے مخصوص جابرانہ انداز میں کھڑا مجھے گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میرا بدن زنجیروں نے آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا تھا کہ پہلی ہی کوشش میں پتا چل گیا کہ ان سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ میرے بازو دُہری بندش میں جکڑے ہوئے تھے اور زنجیروں کے تمام قفل میری پشت پر تھے جن تک رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے کھلنے کے میکانزم کو سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ کم بخت زور آور نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ جلد ہی لوٹ آیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔ "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "نہیں تو......"

"دیکھ لو!"

"دیکھ لیا۔ میں نے یقیناً تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس کا ہاتھ چشمِ زدن میں اُٹھا اور ایک بھرپور تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گالیوں کا فوارا ابل پڑا۔ ذرا دم لے کر بولا۔ "سچ سچ بتاؤ ورنہ ابھی شوٹ کر دوں گا۔"

میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ وہ اپنی جون میں لوٹ آیا تھا۔ نہ جانے کون سا عمل اس کے اشتعال کا سبب

بنا تھا، میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ "میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ اب تم نے جو کرنا ہے، کھل کر کرو۔"

اس نے ریوالور کی نال میری آنکھوں کے درمیان پیشانی پر رکھی۔ تھوڑا دباؤ ڈالا۔ دانت پیسے۔ میں نے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کوشش میں میرے بدن کی آدھی جان ہوا ہو گئی۔ زورآور کی شکل میں بھیانک موت میرے سامنے تھی جس کا ہاتھ روکنے اور اپنا دفاع کرنے کی مجھے قدرت حاصل نہیں تھی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر لرزی مگر اچانک ہی کایا پلٹ گئی۔ اس کے چہرے پر ثبت درشتی اور تناؤ ایک دم رخصت ہو گیا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی اور اس نے بڑے انداز سے ریوالور ہٹا لیا۔ کسی تیز رفتار فلم کا ولن دکھائی دیا۔ کچھ کہے بغیر میرے پہلو میں آیا اور زنجیروں کے لاک کھولنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ باہر سے مجھے نہ مارنے اور میرے راستے میں حائل نہ ہونے کا فیصلہ کر کے آیا تھا اور محض میری سچائی کھوجنے کے لیے بن رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ میرے بیان کی حقانیت کو پرکھنے کے لیے مائل بہ تشدد دکھائی دیا تھا ورنہ سچ یہ تھا کہ وہ برے انجام سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں آزاد تھا۔ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "زورآور! تمہارا شکریہ! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جو جذبات تمہارے بارے میں میڈم شکیلہ رکھتی ہیں، وہی تمہارے دل میں بھی موجود ہیں۔ تم نے جذباتی ہونے کے باوجود اچھا فیصلہ کیا ہے۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ میں کسی کو نہیں، اپنے فائدے کو مدنظر رکھ کر چلتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ!"

بندشوں کی وجہ سے اعضا شل ہونے لگے تھے۔ خون کی روانی متاثر ہوئی تھی۔ میں نے جسم کو ہلا جلا کر گرم کیا، دورانِ خون بحال کیا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا گیلری کے اس گوشے میں آ گیا جہاں تہ خانے کا دہانہ کھلتا تھا۔ چھت کا وہ ٹکڑا جو لفٹ کی طرح نیچے آیا تھا، وہ اب چھت میں موجود تھا۔ اس کے نیچے اس کی حرکت کا مکمل میکنزم موجود تھا جو دو بڑے اسپرنگ شاکس، ایک بڑی الیکٹرک موٹر اور چند ملے جلے پرزوں پر مشتمل تھا۔ مجھے اس دور افتادہ دریائی علاقے میں نصب کیے گئے اس برقی نظام پر حیرانی ہوئی۔ اس سے پہلے میں میڈم کے خفیہ اڈے "سی ٹو" میں، یاران حویلی کے تہ خانے میں اور سائیں دل جیت کے ایسے عجائب کدے دیکھ چکا تھا۔ میرا انہماک زورآور کی سخت آواز نے توڑا۔ "ادھر تمہارا سامان پڑا ہے، سمیٹ لو۔ اس الماری میں تمہارا اسلحہ دھرا ہے، وہ بھی اُٹھا لو۔"

میں نے دیوار کی جڑ میں بکھرے پڑے کاغذات سمیٹ کر جیبوں میں ٹھونسے، باقی ماندہ سامان لباس کی مخصوص جگہوں میں فٹ کیا اور اس کی بتائی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اسے کھولا تو اپنی گن کے ساتھ ساتھ نگینہ کی گن اور پستول بھی دکھائی دیا۔ میں نے اسلحہ سنبھال لیا تو اس نے کہا۔ "اب تمہیں یہاں سے فوری طور پر نکل جانا چاہیے۔"

مجھے اس کے رویے نے حیران کیا۔ اس کے پاس ایک ریوالور تھا جو اس وقت فائر پوزیشن میں نہیں تھا جبکہ میرے ہاتھ میں جدید ساخت کی مہلک گن پکڑی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو اسے گولیوں سے بھون سکتا تھا۔ اس وقت میری حالت ہرگز دوستانہ نہیں تھی مگر اس کے باوجود وہ بڑا بے پروا، پُراعتماد اور بے خوف انداز میں میرے سامنے تنا کھڑا تھا۔

میں نے کندھے اُچکائے۔ "نوروز بھٹی کہاں چھپا ہے؟"

"اس کا دھیان چھوڑو، اپنی فکر کرو اور یہاں سے چلتے بنو۔ جو کر چکے ہو، وہی بہت ہے۔ اسی کو اپنی فتح قرار دو اور اپنی جان بخشی کا جشن مناتے ہوئے ملتان کی راہ پکڑو۔" اس کا لہجہ خاصا تضحیک آمیز تھا۔

میں نے کہا۔ "جہاں تم نے اتنا تعاون کیا، وہاں یہ دم بھی نکال ہی دو میرے دوست!"

"نہیں...... وہ، اس کی بیوی اور بیٹیاں اسی تہ خانے میں ہیں۔ چاہوں تو تمہیں ایک منٹ میں ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ بس تم یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔" اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔

میں نے پوچھا "اور تم؟"

"میں...... میں یہیں رہوں گا۔"

"پولیس تمہیں اریسٹ کر لے گی۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"کس جرم میں؟" وہ ہنسا پھر ہاتھوں کو عجیب انداز میں لہراتے ہوئے دیوار تک چلا گیا۔ سوئچ بورڈ پر نصب بٹنوں میں سے ایک کو دباتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ڈر گیا ہوں۔ تم سے اور تمہاری میڈم سے۔ بڑی شہ زور ہے۔ ہے ناں؟ اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ کتیا میرے بارے میں خاصے نرم جذبات رکھتی ہے۔ ہے ناں؟...... ایسا ہی سہی۔ فضول قسم کی ہمدردیاں مت جتاؤ۔ دوست بننے کی کوشش نہ کرو اور میری کمزوری اور خوف کا فائدہ اُٹھا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ پلٹ کر نہ آنا ورنہ زورآور بدلا ہوا یعنی پہلے کی طرح پتھر جیسا سخت ملے گا۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کے مخصوص لب و لہجے اور بے خوف اظہار نے میرے اندازوں کو بچگانا ثابت کر دیا۔

اسی اثنا میں چھت پر نصب آر سی سی لنٹل کا ٹکڑا بڑی آہستگی سے نیچے آنے لگا۔ جب میں اس پر موجود تھا تو یہ بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا۔ میرے وزن کی وجہ سے یا پھر اس کے نظام میں رفتار کی کمی بیشی کا آپشن بھی موجود تھا۔

جب وہ فرش سے تین چار فٹ کی بلندی پر آ کر رُک گیا تو زورآور نے مجھے اس پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس پر چڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سمجھوں! تم نے مجھ سے یہ تعاون کیوں کیا؟"

اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہنسی میں شکست کا اعتراف، اپنے یار رفاقت بھٹی کی موت کا دُکھ اور کچھ بے عنوان جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ فرش کا ٹکڑا اوپر اُٹھنے لگا۔ رفتار خاصی کم تھی۔ جب نصف اٹھان ہو گئی تو زورآور کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "اس سوال کا جواب اُدھار رہا۔ ضرور دوں گا...... مگر کوئی مناسب وقت آنے پر...... تم بھی سوچ رکھنا۔ ویسے تم اتنے ذہین نہیں ہو کہ اس راز کی تہ تک پہنچ سکو۔ ہاں! یہ ضرور سمجھ لینا کہ انسان کوئی بھی کام بلاوجہ نہیں کرتا۔ ہر کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اپنے نفع اور نقصان کا شمار کرتا ہے...... لیٹ جاؤ احمق انسان...... ورنہ سر بیڈ میں لگے گا...... ہری اَپ!"

میں ایک دم کمر کے بل گر گیا۔ زورآور کی آواز آنی بند ہوئی اور "کھٹاک" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ فرش اپنی جگہ پر آ کر رُک گیا۔ میں نے پہلے کی طرح اپنے ہاتھ اور پاؤں بیڈ کے نچلے حصے پر ٹکائے اور پوری قوت سے فرش کو نیچے دھکیلنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میری غلط فہمی دور ہو گئی کہ تہ خانے کا دہانہ میری کوشش سے کھلا تھا۔ اسے رفاقت بھٹی یا زورآور نے تہ خانے کے اندر سے کھولا تھا۔ ضرور یہ راستہ اس کمرے سے بھی کھولا جا سکتا تھا مگر مجھے وہ کلید ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اس دوران مجھے فوری طور پر احساس ہوا کہ [illegible] آسمانی رنگ کے پیراہن میں ملبوس امانت بھٹی کی خون سے لتھڑی ہوئی لاش کے کمرا خالی تھا۔ چونکہ میں نے ٹارچر روم میں بندھے وقت ایک فائر کی آواز سنی تھی اس لیے میری دانست کے مطابق یہاں ایک اور لاش بھی ہونی چاہیے تھی۔ رفاقت یا نگینہ کی...... مگر نہیں تھی۔ میں یہی سوچتا ہوا خاصے محتاط انداز میں بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ کمرا واقعتاً خالی تھا۔ اچھل کر کھڑا ہوا اور بجلی کی سی تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

ٹی وی لاؤنج کو بھی کمرے کی طرح خالی پا کر میری دھڑکن بڑھ گئی۔ نہیں معلوم کہ میں نے کیوں یہ طے کر لیا تھا کہ نگینہ نے رفاقت بھٹی کو شوٹ کر دیا ہے ورنہ یہ خطرہ بھی پوری سنگینی کے ساتھ موجود تھا کہ نگینہ اس کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئی ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اب تک نگینہ کو خاص اہمیت نہیں دی تھی اور اسے ماہر فائٹر سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ اب دل میں ہول اُٹھنے لگا تھا۔ نگینہ کے بغیر واپس پہنچا تو میڈم کے غصے کا سامنا کرتے ہوئے مجھے کئی جھوٹ تراشنا پڑیں گے۔

میں نے بہ عجلت تمام کمرے دیکھے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تو میں پریشانی کے عالم میں صحن کی طرف بڑھا۔ ابھی لاؤنج کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر رفاقت کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ میرے سینے میں پلنے والا اندیشہ خوف ناک سانپ کی صورت اختیار کر کے میری آنکھوں میں لہرانے لگا تھا۔ رفاقت کے پھیلے ہوئے بازوؤں پر نگینہ کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے دیکھ کر فوری طور پر جو خیال دل میں جاگزیں ہوا وہ یہی تھا کہ اسے گولی لگی تھی اور وہ کسی پل جان کی بازی ہارنے والی تھی۔

ایسے ہی وقت میں رفاقت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر تھم گیا۔ میری یہاں موجودگی اس کے لیے نہایت حیران کن تھی۔ اس کی ڈبل بیرل بندوق اس کے کاندھے پر لٹک رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اچانک مجھے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول دکھائی دیا اور میں غیر ارادی طور پر دائیں طرف ہٹ گیا۔ اگر مجھے لحظہ بھر کی دیر ہو جاتی تو گولی میرے سینے میں اُتر جاتی۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی گولی دروازے کو پھاڑتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کے اندر چلی گئی۔ یہ وقت معاملہ فہمی کا نہیں، برق رفتار حرکت کا تھا۔ میں پنجوں کے بل اُچھلا اور چند قدم دور پہنچ گیا۔ دوسری گولی عین اس جگہ دیوار پر لگی جہاں میں ایک پل پہلے کھڑا تھا۔

میں نے زمین کو چھوتے ہی زمین پر گرنے میں ایک

لمحے سے بھی کم وقت لیا۔ گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں ہتھیلیوں کے بل اچھلا اور دروازے کی طرف پہلو کے بل گرا۔ چوتھی گولی فرش پر عین اس جگہ لگی جہاں میں چند لمحے پہلے پڑا ہوا تھا۔ میری سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ پانچویں فائر کا انتظار کرنے کے بجائے میں نے پھر جگہ بدلی۔ 'ٹرچ' کی مخصوص آواز نے اعلان کر دیا کہ رفاقت کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں غیر معمولی پھرتی سے اُچھلا اور لگ بھگ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر رفاقت کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ میری گن کا رُخ اس کی جانب تھا۔ ''بس بھٹی! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اسے نیچے لٹا دو۔''

وہ ابھی تک حیرانی کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے تجربے میں شاید ایسی انسانی پھرتی کبھی نہیں آئی تھی کہ کوئی شخص پستول سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود رہ کر نشانہ خطا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہو۔ اس نے اچانک بازو پیچھے کھینچ لیے۔ ایسا کرنے سے نگینہ دھپ سے زمین پر گری۔ اس کے بدن کو تیز جھٹکا لگا اور حلق سے کم بلند چیخ نکل گئی۔

میں غرایا۔ ''بھٹی! اپنی گن کی طرف ہاتھ مت بڑھاؤ۔ میری انگلی ٹریگر پر ہے۔''

وہ غیر محسوس انداز میں کندھے سے گن اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری للکار سن کر چابی کے کھلونے کی طرح جہاں کا تہاں رُک گیا۔ اس دوران سنبھل بھی چکا تھا۔ چہرے پر پیدا ہونے والے حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات غائب ہو گئے اور عجیب درشتی اور بے خوفی چہرے پر ہویدا ہونے لگی۔ میرا اور اس کا پہلی مرتبہ ٹکراؤ ہوا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا علم نہیں تھا مگر یہ اندازہ ضرور تھا کہ زور آور ایسے ہی اُس پر جان نچھاور نہیں کرتا تھا۔ وہ اس سے دو گام آگے نہ سہی، شانہ بشانہ چلنے والا شخص ضرور تھا۔ دوستی تبھی نبھ رہی تھی۔

میں چند قدم چل کر اور نزدیک ہو گیا، کہا۔ ''بھٹی! چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔''

وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ رک گیا، بولا۔ ''زور آور کہاں ہے؟''

میں نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''اس کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اپنی فکر کرو۔ بتاؤ، تمہارا باپ کہاں ہے؟''

اس کے چہرے پر مایوسی چھائی۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔ ہاں! فائز...... فائز!''

اس نے میرے کندھے کے اوپر دیکھ کر بڑے بے ساختہ انداز میں کہا۔ میں بے اختیار پہلو کے بل لڑھک گیا مگر توقع کے مطابق فائر کی آواز سنائی نہیں دی۔ پیروں پر کھڑا ہو کر پلٹا، کسی کو نہ دیکھ کر اپنی حماقت پر رہ گیا۔ رفاقت مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہی وقت میں میرے عقب میں کھٹکا ہوا۔ میں بجلی کی سے پلٹا اور میں نے ٹریگر دبانے میں سیکنڈ کا دسواں صرف کیا۔ میری گن سے نکلنے والے برسٹ کی گولیاں رفاقت کے جسم کے بالائی دھڑ میں پیوست ہو گئیں۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گن کندھے سے اُتار لی تھی اور اگر مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو اس کی گن سے نکلنے والے ایل جی کے کارتوس کے چھرے میرے جسم کو چھلنی کر جاتے۔

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا اور چند ہچکیاں لینے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کا بغیر چیخے یوں بے حرکت ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ گولیوں نے اس کا سینہ چھید دیا تھا۔ ایک یا دو گولیاں اس کے دل کو پھاڑ چکی تھیں۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نگینہ کی خبر لی۔ وہ پہلو کے بل لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر سختی سے باندھے ہوئے تھے اور دوہری ہو رہی تھی۔

میں نے جھک کر پکارا۔ ''نگینہ!''

اس نے سر اُٹھایا مگر فوراً ہی ڈھے گیا۔ کراہی۔ ''آئی ایم ڈائنگ...... ہی شوٹڈ می......''

مجھے سمجھ نہ آئی کہ اسے کہاں گولی لگی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں گولی لگی؟''

اس نے آنکھیں کھولیں۔ سر اُٹھانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔ میں نے فوری طور پر سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نبض چل رہی تھی۔ میں نے اُسے سیدھا کیا۔ زیادہ جہت نہیں کرنی پڑی اور پتا چل گیا کہ اسے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اس کی شرٹ کا اگلا حصہ خون سے تر تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ پورچ میں کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی۔ یہ غیر متوقع بات تھی۔ اتنی بڑی حویلی اور حویلی کے بدقماش مالکان کے پاس گاڑی کا نہ ہونا بعید از قیاس تھا۔ میں نے نگینہ کو چھوڑا، ایک زوردار لات رفاقت بھٹی کے آڑے ترچھے پڑے وجود کو رسید کی اور ٹی وی لاؤنج کی طرف بھاگا۔ کمرے میں آ کر تہ خانے کا دروازہ کھولنے کی ازسرِنو کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اضطراری انداز میں فرش کو ٹھوکا۔ مبادا زور آور متوجہ ہو جائے مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو میں دانت بھینچ کر عمارت سے نکل آیا۔ مہمان خانے کی طرف جا کر گاڑی یا موٹر سائیکل تلاش کرنا فضول تھا کیونکہ میں پہلے اس طرف جا چکا تھا۔ وہاں میری مطلوبہ شے موجود نہیں تھی۔

میں ایک بار پھر عمارت میں گیا۔ پانی کا گلاس بھر لایا۔ چند چھینٹے نگینہ کے چہرے پر مارے۔ وہ آہ بھر کر ہوش میں آ گئی۔ گلاس کا لبوں پر لمس محسوس کر کے چند گھونٹ پی گئی۔ نقاہت بھری آواز میں بولی۔ ''آ...... آئی ایم ڈائنگ سر!''

مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ رات کا گہرا اندھیرا رخصت ہو رہا تھا اور صبح کا ملگجا اجالا وارد ہو رہا تھا۔ اب تب میں ہی صبح ہونے والی تھی۔ میں اس علاقے سے ناآشنا تھا اور قرب و جوار میں کوئی ایسی جگہ معلوم نہیں تھی جہاں زندگی کی بازی ہارتی ہوئی نگینہ کو لے جاتا اور اس کے پیٹ میں دھنسی ہوئی گولی نکلواتا۔ دیر ہونے کی صورت میں زہر پورے بدن میں پھیل سکتا تھا۔

اسے مرتے دیکھنا بھی سوہانِ روح تھا۔ ایسے ہی وقت میں دوسری اُفتاد آن پڑی۔ میرے کانوں میں پولیس کے مخصوص سائرن گونجنے لگے۔ پولیس رات کا خطرناک پہر گزار کر پھر یہاں پہنچنے والی تھی۔

رات کی خنکی تلخی میں بدل چکی تھی اور میرا ذہن بحرِ بیکراں سے کوئی سوچ کھنگالنے کی جہت میں خطرناک رفتار سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔ پولیس کے سائرن کی آواز قریب آ رہی تھی۔ مجھے کچھ بھی نہ سوجھا تو سرِدست اس موقع محل سے دور چھپنے کے لیے نگینہ کو کندھے پر لاد کر بھاگتا ہوا حویلی کے عقبی دروازے سے نکلا اور کیکر کے بالن کے بیچ بنا ہوا تنگ سا راستہ عبور کرتا ہوا ناک کی سیدھ میں چلتا گیا۔ دائیں ہاتھ پر واقع آم کے وسیع و عریض باغ کا ایک سرا اسی سیدھ میں ایک ایکڑ کے فاصلے پر اندھیرا لیے موجود تھا اور میں پولیس کے حویلی تک پہنچنے سے پہلے اس میں جا کر چھپ جانا چاہتا تھا۔

میں نرسری سے گزر کر چارے کے کھیت میں داخل ہو گیا۔ اونچی نیچی جگہ پر ہچکولا لگتا تو نگینہ کے حلق سے کراہ خارج ہو جاتی۔ میرے بازو کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا جس کی سرِدست مجھے کچھ زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ ساری رات بے آرام اور بھوکا رہنے کی وجہ سے مجھ پر خاص نوع کی نقاہت طاری ہو رہی تھی اور نگینہ کا بہ مشکل پچاس کلوگرام کے لگ بھگ وزنی وجود اس وقت بھاری لگ رہا تھا۔ چونکہ حویلی سے ایک لاش اُٹھائی جا چکی تھی، چار لاشیں ابھی موجود تھیں جو دن کے اجالے میں پولیس کو بغیر کسی مشکل کے نظر آنے والی تھیں، اس لیے پولیس سے کسی رعایت کی توقع عبث تھی۔ ایک تجسس یہ بھی ذہن میں ہلکورے لے رہا تھا کہ دیکھا جائے کہ پولیس اور زور آور کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں مگر یہ دیکھنے کے لیے قریب رہنا یا حویلی کے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔

بھلا ہوا کہ میں پولیس کے حویلی تک پہنچنے سے پہلے باغ میں گھس گیا۔ نگینہ کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھایا تو وہ زیادہ کراہنے لگی۔ پیٹ دہرا ہونے سے اس کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی پھولی ہوئی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سانسوں کو معتدل کیا۔ ہانپتے ہوئے وجود کو سہلایا۔ چند لمحے اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس کو حسبِ سابق اُٹھا کر دوسرے کندھے پر ڈالا اور تیز تیز قدموں سے درختوں کے بیچ چلنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”نگینہ! کیا تم جانتی ہو کہ اس طرف کون سا گاؤں ہے؟“

”آ......ہ......!“ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کہہ نہ پائی۔ آہ بھر کر خاموش رہ گئی۔ میں نے اس سے مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی رفتار ممکنہ حد تک بڑھا لی۔ ایک اور اندیشہ سانپ کی طرح ذہن میں کلبلانے لگا۔ اس وقت جوان اور زخمی لڑکی کو اُٹھائے، اسلحہ سے لیس، مشکوک حلیے میں کسی کی نظروں میں آنا بہت خراب اور نقصان دہ نتائج کا شاخسانہ بن سکتا تھا۔ مجھے اس حالت میں کوئی بھی دیکھتا تو پکڑ لیتا۔ یا ڈر جاتا تو فوراً پولیس کو اطلاع دینے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دیہاتی بعض اوقات وہ ردِعمل بھی ظاہر کر دیتے ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ بھینس کی طرح جس سے ڈرتے ہیں، اسی پر حملہ بھی کر دیتے ہیں۔

راستے کے متوازی بغیر ستائے چلتے ہوئے میں کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر گیا اور تھک کر رُک گیا۔ میں کئی باغ عبور کر آیا تھا۔ کئی کھیتوں کی شبنم سے گھٹنوں تک پینٹ گیلی ہو گئی تھی۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ کاشت کار بیدار ہو کر کھیتوں کا رُخ کرنے والے تھے۔ ایسے حالات میں میرا کسی کی نظروں میں آئے بغیر سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ایک یہ احساس بھی بڑا تکلیف دہ تھا کہ میں تاجار ملتان اور شجاع آباد سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا جو نگینہ کی زندگی کے لیے بہتر نہیں تھا۔ میں جہاں رُکا تھا، یہاں دیسی گلاب کے پودے فصل کے مانند اُگے ہوئے تھے۔ شاید گل قند بنانے کے لیے گلاب کاشت کیے گئے تھے۔ ٹہنیاں ننھے ننھے کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ ایکڑ بھر کا کھیت تھا جسے عبور کر کے ہی میں دوسری طرف جا سکتا تھا۔ بائیں ہاتھ ایک آدھ ایکڑ کے فاصلے پر راجباہ والا راستہ تھا جبکہ دائیں ہاتھ تاحدِ نگاہ فصلیں اور آموں کے باغات دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی تک کوئی رہائشی عمارت دکھائی نہیں دی تھی۔

میں نے نگینہ کو نیچے لٹایا تو وہ اپنا بدن نہ سنبھالتے ہوئے لڑھک گئی۔ بے ہوش ہو گئی۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش بے سود تھی اس لیے میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اس کی شرٹ اوپر کھینچی۔ زخم دیکھا۔ دائیں پہلو میں پسلیوں کے نیچے خون میں چھپا ہوا زخم موجود تھا۔ میں نے اپنی پھٹی ہوئی بنیان سے مزید پٹی اور ایک ننھا سا گولا (گاز) بنایا۔ گاز کو زخم پر رکھ کر پٹی کو کس کر باندھ دیا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے احساس ہوا کہ نگینہ اس قدر خوب صورت جسم کی مالک تھی، جس قدر انسان زیادہ سے زیادہ کسی جاگتے ہوئے حسن کے بارے سوچ سکتا ہے۔ اس کا بدن گلاب کے پھول کی طرح نازک اور جلد ریشم کی طرح ملیح تھی۔ کینیڈا کے ماحول اور موسم نے اس کی جلد کو غیر معمولی حد تک سپید اور سرخ بنا دیا تھا۔ موت کی سی گہری بے ہوشی میں لپٹا ہوا چہرہ بھی محض خوابیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند لمحوں سے زیادہ اسے بہ غور نہ دیکھ سکا اور اپنی توجہ آئندہ کے لائحہ عمل پر مرکوز کرنے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر ستانے کے بعد میں نے نگینہ کو ایک مرتبہ پھر اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور راجباہ والے راستے کی طرف چل دیا کیونکہ بے تحاشا کانٹوں کی وجہ سے گلابوں کی اتنی چوڑی پٹی کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ راجباہ والے راستے پر ابھی آمد و رفت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا مگر ہونے والا تھا۔ میں نے تیز تیز قدموں سے اندازے کے مطابق اتنا فاصلہ طے کیا کہ گلابوں کا کھیت عبور ہو گیا تو راستہ چھوڑ کر فصلوں میں چلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے ایک کاشتکار کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے جانور سے مخاطب ہو کر پیار بھری گالیاں دے رہا تھا۔ اکیلے میں زمیندار اپنے پالتو جانوروں سے بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی کر رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو فصل میں لٹایا اور جلدی سے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا۔ راستے پر ایک بیل گاڑی چلی آ رہی تھی۔ اس کا رُخ بستی سمن کی جانب تھا۔ سفید رنگ کے بڑے کوہان والے دیسی نسل کے بیل کو ایک ادھیڑ عمر ہانک رہا تھا اور اس سے محوِ کلام بھی تھا۔ قریب آیا تو میں ادھر اُدھر دیکھ کر درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے مخصوص آواز نکال کر بیل کو روکا اور حیرانی سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ”اوئے جوان! خیر تاں ہوی؟ لہولہان تھیا ودیں؟“

(اوئے جوان! تم خون سے تر ہو۔ خیر تو ہے؟)

بیل رُک گیا۔ میں نے قریب پہنچ کر عمومی حلیے والے کاشت کار کو سرائیکی میں مخاطب کیا۔ ”لالہ! مشکل میں ہوں۔ مجھے بتاؤ، ادھر کوئی قصبہ ہے؟“

میرا اشارہ اس طرف تھا، جس طرف سے وہ آ رہا تھا۔

اس نے مجھے سر تا پا بہ غور دیکھا۔ آنکھوں میں تشکیک کے سائے لہرائے، بولا۔ ”پر خیر تاں ہے؟“

(مگر خیر تو ہے؟)

میں نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خیر ہوتی تو میں اس حال میں تمہیں دکھائی دیتا۔ خیر نہیں ہے۔ میں جلد از جلد کسی قصبے میں پہنچ کر اسپتال یا تھانے جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے بلاوجہ ارد گرد دیکھا، بولا۔ ”ادھر کوئی چار میل پریت سلانوالی کا پتن آتا ہے۔ دریا پار کر کے علی پور شہر جایا جا سکتا ہے۔“

دریا سے علی پور کا فاصلہ میرے علم میں تھا۔ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”نہیں لالہ! کوئی اور راہ دکھاؤ۔ میں علی پور نہیں پہنچ سکتا۔“

”مگر تم دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہو۔ یہ خون کہاں سے لگا ہے؟“

میں نے بازو کی طرف دیکھا۔ اپنا لباس دیکھا۔ نگینہ کے زخم سے رسنے والے خون نے میرا لباس تر کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”پٹی باندھنے سے پہلے اس زخم سے خون نکلا تھا۔“

اس نے یقین کیا یا نہیں، سر کو تفہیمی انداز میں ہلایا اور کہا۔ ”تولا ڈس! میڈے کیتے میں کیا کر سکدا ہاں؟“

(تو بتاؤ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟)

”تم مجھے کسی اسپتال میں پہنچا سکتے ہو۔ اپنی اس گڈ پر۔ جتنا کہو گے، میں اتنا کرایہ دوں گا۔“

گڈ مقامی زبان میں ریہڑی کو کہا جاتا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں...... مجھے نوروز خان کے ڈیرے پر جانا ہے۔ اس نے کل شام کو مجھے علی الصباح ڈیرے پر پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔ ناراض ہو گا۔“

میرے حلق سے طویل سانس نکلی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ نوروز بھٹی کے ڈیرے کی حالت اب وہ نہیں رہی تھی کہ اس سے باز پرس کی جاتی۔ میں نے کہا۔ ”لالہ! یہ زندگی کا معاملہ ہے۔ تم اگر نوروز خان کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کر لو تو ایک زندگی بچ جائے گی۔ سچ کہتا ہوں۔ میں اور میری بیوی ادھر آ رہے تھے۔ راستے میں ڈاکو مل گئے۔ انہوں نے ہمیں گولیاں ماریں اور ہماری کار لے کر رفو چکر ہو گئے۔ میری بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔“

اس کی آنکھیں فرطِ حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اُچھل کر بولا۔ ”جت...... حیڈی ڈو...... ڈال تھا اے؟“

(تمہاری بیوی کہاں ہے؟)

میں نے اشارہ کیا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیا، بولا۔ ”تم مجھے کرایہ کتنا دو گے؟“

میں نے کہا، ”سو روپیہ!“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے جلدی سے اپنی بتائی ہوئی رقم دگنی کر لی۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ”یہاں سے سلانوالی والا اسپتال چار میل دور ہے۔ میں اگر تمہیں وہاں چھوڑنے جاتا ہوں تو پھر خان کے رقبے پر دیہاڑی نہیں کر سکوں گا۔ دیہاڑی تین سو روپے ہے۔ تم مجھے پانچ سو دو تو میں خان کی ناراضی مول لے سکتا ہوں۔“

میں نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ اچھل کر ریہڑی سے اُترا اور بیل کی لگام پکڑ کر اُسے موڑنے لگا، بولا۔ ”جوان! اپنی ذال کوں اڈاہیں گھن آ...... فصلاں وچ گڈ نہ ویسی......“

(جوان! اپنی بیوی کو ادھر ہی لے آؤ۔ فصلوں میں ریہڑی نہیں جائے گی)

میں نے عافیت کی سانس لی اور بھاگ کر نگینہ کے پاس آیا۔ اسے اُٹھا کر دوڑتا ہوا گڈ کے پاس پہنچا۔ اسے اٹھائے واپس آیا۔ ریہڑی پر سیدھا لٹا دیا۔ بیل کی لگام تھامے کھڑے کو جوان نے اپنی پگڑی اُتار کر میری طرف اُچھال دی۔ ”ایں کوں بج ڈے جوان! ایندھی بے پردگی تاں نہ تھیوے ناں...... شودھی بچ تاں ویسی ناں؟“

(اسے ڈھانپ دو۔ اس کی بے پردگی تو نہ ہو ناں۔ یہ بے چاری بچ تو جائے گی نا؟)

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا، کہا۔ ”تمہاری مہربانی لالہ! پہلے تو آس نہیں تھی۔ اب دل کو آس لگ گئی ہے کہ اسپتال پہنچ جائے گی اور بچ بھی جائے گی۔“

میں نے پگڑی کو کھولا اور نگینہ پر پھیلا دیا۔ وہ کافی حد تک چھپ گئی۔ دیہاتی کے اشارے پر میں ریہڑی پر نگینہ

سے جڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیل کو ہشکارا، چند قدم اس کے ساتھ چلا پھر مخصوص انداز میں اچھل کر ریہڑی کی نکڑ پر ٹک گیا۔ گاہے گاہے گردن گھما کر مجھے اور سفید رنگ کی میلی پگڑی میں چھپی ہوئی نگینہ کو دیکھ لیتا۔ جب بیل اپنی رفتار پکڑ چکا تو وہ بولا۔ ''جوان! کہاں رہتے ہو اور ادھر کس کے پاس آئے تھے؟''

میں اس دوران ایک جھوٹی کہانی گھڑ چکا تھا، بولا۔ ''ہم دونوں میاں بیوی سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ سرکار کے حکم پر پرائمری اسکولوں کو چیک کرتے ہیں۔ ہمیں شکایت ملی تھی کہ اس علاقے میں ایک اسکول ایسا ہے جس کے ہیڈ ٹیچر نے اسکول کے اندر اپنی رہائش رکھی ہوئی ہے اور بچوں کو سردی گرمی میں کھلی جگہ پر بٹھاتا ہے۔ اسے رات کو چیک کرنا ضروری تھا اس لیے ہم آدھی رات کے بعد اسے چیک کرنے آئے تھے۔ مگر راستہ بھٹک گئے۔ ادھر آ نکلے۔ چند لوگ بندوقیں لے کر راستے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ہم سے گاڑی چھین لی۔ میری ذال کے تمام زیور بھی اُتار لیے اور ہم دونوں کو گولیاں مار کر اپنی طرف سے مردہ کر کے پھینک گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنی بیوی کو اُٹھا کر اس طرف چل دیا۔ آگے تم مل گئے۔''

میں نے اسے بڑے پُراعتماد انداز میں یقین دلا دیا کہ میں نے جو کہا تھا، وہ سچ پر مبنی تھا۔ وہ ان پڑھ معلوم ہوتا تھا۔ ایسے لوگ جلد یقین کر لیتے ہیں۔ اس نے بھی یقین کر لیا۔ تاسف بھرے لہجے میں ان دیکھے ڈاکوؤں کو اس طرح کوستا رہا جیسے وہ اس کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہوں۔ راستہ ناہموار تھا۔ ریہڑی کو ہچکولے لگ رہے تھے۔ چند جھٹکوں نے ہی نگینہ کی بے ہوشی کو توڑ دیا۔ وہ کراہنے لگی۔ میں نے چہرے سے تھوڑا سا کپڑا ہٹایا۔ تکلیف کے آثار دیکھ کر پچکارا۔ ''فکر نہ کرو نگینہ! ہم تھوڑی دیر بعد اسپتال پہنچ جائیں گے جہاں تمہارا علاج ہوگا اور تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

اس کی آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرانی ابھری، بولی۔ ''ویئر آئی ایم؟...... یہ درخت پیچھے کیوں جا رہے ہیں؟''

اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ کس چیز پر سوار تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے انگریزی میں سمجھاؤں۔ ''ہم بیل ریہڑی پر ہیں اور اسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔ تین چار میل کا سفر ہے۔''

میں اٹک اٹک کر بول رہا تھا کیونکہ انگریزی بولنا میری مشق میں شامل نہیں تھا۔ وہ میری بات سمجھ گئی۔

میں نے مزید کہا۔ ''جیسے بھی ممکن ہو، ہم دونوں انگریزی میں بات کریں گے تاکہ ریہڑی بان کو ہماری گفتگو کی سمجھ نہ آئے۔''

اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ پھر کراہی۔ ریہڑی بان نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ سمجھا کہ میں بہت پڑھا لکھا ہوں، پوچھا۔ ''سائیں! تیڈی ذال انگریزنی ہے؟''

(سائیں! تمہاری بیوی انگریز ہے؟)

میں نے کہا۔ ''ہاں! کیا یہ ریہڑی مزید تیز نہیں چلائی جا سکتی؟''

اس نے کہا۔ ''چلائی تو جا سکتی ہے پر جھٹکے زیادہ لگیں گے اور تمہاری بیوی کو تکلیف ہوگی۔ ہم پندرہ بیس منٹ تک سرکاری اسپتال پہنچ جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔''

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر رستے پر اِکا دُکا کاشت کار دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ اپنے معمول کے کاموں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ جو ہمیں دیکھ لیتا، وہ حیران ہو جاتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ریہڑی بان سے دریافت کرتا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ 'وَل ڈسیساں' (پھر بتاؤں گا) کہہ کر ٹال دیتا۔ تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا۔ اس کا نام مراد علی تھا۔ دیہاتی روایت کے مطابق 'مرادا' کہلاتا تھا۔ کم گو تھا۔ شاید ہم سے مرعوب بھی تھا کیونکہ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا اور نہ ہی روایتی چرب زبانی سے کام لیا تھا۔

وہ اپنی توجہ ہم سے ہٹا کر بڑی خوش گلوئی سے خواجہ فرید کی کافی گانے لگا۔ اس کا گلا اچھا تھا۔ منجھا ہوا گلوکار لگ رہا تھا۔ صبح کے پُرسکون ماحول میں اس کی آواز بہت دور تک جا رہی ہوگی۔

ایسے ہی وقت میں جب وہ کافی کا ایک مصرعہ بار بار گانے لگا تھا، مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر نگینہ کی گرفت محسوس ہوئی، چونکا۔ دیکھا، وہ اپنا ایک ہاتھ زخم پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی اور چمک دار آنکھوں سے مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں نے چہرے پر ثبت تکلیف کے آثار کچھ کم ہو گئے تھے۔ میں نے انگریزی میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

وہ بولی۔ ''کیا رفاقت اور امانت مر گئے ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا میرا چچا بھی ہلاک ہو گیا ہے؟''

میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر جھوٹ بولا۔ ''ہاں وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''اور کاغذات؟'' اس کے چہرے پر ایک دم تکلیف کے آثار محو سے ہو گئے اور قلبی خوشی ہویدا ہونے لگی۔

''وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔''

''کیا میں بچ جاؤں گی؟ مجھے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ زخم اتنا بڑا نہیں ہے۔''

یہ غلط تھا۔ اس کا زخم خطرناک تھا مگر اسے سنگینی کا احساس دلانا مایوس کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت اگر وہ مایوس ہوتی تو اس کی قوتِ مدافعت خاصی کمزور پڑ جاتی۔

''واقعی؟ میں بچ جاؤں گی ناں؟''

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ''اگر میں بچ گئی تو پھر میں کینیڈا نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کے ساتھ شادی کروں گی۔'' اس کی آنکھوں میں زندگی کی طلب ہلکورے لینے لگی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ بات بنائی۔ ''یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تم میری ٹرانسفیریشن کا شکار ہو۔ نارمل ہونے کے بعد تمہیں اپنی یہ بات بچگانہ محسوس ہوگی۔''

''نو...... ناٹ ایٹ آل...... آئی ایم نارمل۔ ناؤ اینڈ آل کمنگ ٹائم۔'' اس کا لہجہ رومانس سے بھرپور تھا۔

''محبت جذباتی ہوتی ہے۔ تمہاری عمر بھی ایسی ہے مگر شادی کا فیصلہ جذباتی انداز میں نہیں کیا جاتا۔ تمہیں واپس جانا ہے۔''

''کیا آپ نے صرف میڈم کے حکم پر مجھے بچائے رکھا؟''

''یس...... میں میڈم کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔''

''یعنی آپ کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے؟''

''ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تم بہت کیوٹ ہو۔'' میں نے اس کی دل آزاری سے پہلو تہی کی۔

''جس دنیا میں خون کے رشتوں نے میرے بھائی کو قتل کر دیا، مجھے قتل کرنا چاہا صرف اس لیے کہ میری جائداد حاصل کر لیں، اس دنیا میں آپ کا ہونا عجیب...... ویری اسٹرینج...... میں سچ کہتی ہوں۔ میں آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ اپنے درد کو دانتوں تلے روک کر جاذبیت بھری نظروں سے مجھے ٹٹول رہی تھی۔

''ابھی تم اپنے دماغ پر زور مت دو۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتی رہی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی۔ پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم [illegible] کے نیچے گئے تھے تو میں نے دیکھا تھا کہ فرش کا چوکور ٹکڑا نیچے دھنس گیا تھا۔ میں سمجھی کہ تم گر کر زخمی ہو جاؤ گے۔ زخمی نہیں ہوئے۔ وہاں کیا تھا؟'' وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی اور اٹک بھی رہی تھی۔

میں نے اسے تہ خانے کے اندر ہونے والی جنگ کے بارے میں بتایا۔ جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے نوروز بھٹی کی بھیانک موت کی خوش خبری سنائی۔

وہ خوش ہو گئی۔ پوچھنے لگی۔ ''آپ نے تہ خانے میں میری کزنز اور آنٹی کو بھی دیکھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... وہ کہیں اور چھپی ہوئی تھیں۔ چونکہ ان سے ہمیں کوئی مطلب نہیں تھا، اس لیے میں نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

اس نے آنکھیں موندیں، بڑبڑائی۔ ''کاش! میں اپنے ہاتھوں سے سب کو ہلاک کرتی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری آدھی آرزو پوری ہو چکی ہے۔ امانت کو تم نے اپنے ہاتھوں سے گولی ماری ہے۔''

''ہاں مگر رفاقت اور چچا۔''

''کوئی بات نہیں۔ رفاقت، جو تمہارا اصل مجرم تھا، کو تم نے اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا ہے۔ دوسرے کی موت کی خبر تم تک پہنچ گئی ہے۔ یہ سب کم تو نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......'' اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایسے میں دو ننھے ننھے آنسو اس کی پلکوں پر لرزے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی نم گرفت سے نکالا۔ آنسو پونچھے، کہا۔ ''غم نہ کرو۔ تم نے اپنے بھائی کا بھرپور انتقام لے لیا ہے۔ اب اس کے لیے آنسو مت بہاؤ۔''

وہ سسکی، بولی۔ ''آئی لو یو شہریار! آپ نے میرا دُکھ غلط کر دیا۔ آپ میرے محسن ہو۔ میں آپ کو اور میڈم شکیلہ کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ آئی لو یو!''

اس نے ہونٹوں کو مخصوص انداز میں جوڑا۔ پھر کھولا اور ایک بوسہ میری جانب اُچھال دیا۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ بھی، اس کی دلبرانہ ادا بھی...... زندگی ایسی ہی ہوتی ہے...... لبھانے والی! ستانے والی!

میرے مزید استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ میرے تہ خانے میں جانے کے بعد اسی بیڈ روم میں موجود رہی تھی۔ پھر جب اس نے فرش کو نیچے جاتے دیکھا تو اس اندیشے کے تحت کہ آنے والا شہریار کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے، وہ پہلے ٹی وی لاؤنج میں آئی پھر لان میں نکل گئی اور مور پنکھوں میں چھپ گئی تھی۔ اس کے پاس میرا پستول تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب اسے تلاش

کرتا ہوا رفاقت بھٹی اس کے عقب میں آیا اور اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ رفاقت نے اسے سنبھلنے سے پیشتر ہی اپنی فولادی بانہوں میں جکڑ کر لان سے باہر گھسیٹ لیا۔ وہ مچلی۔ مضبوط مردانہ گرفت سے نہ نکل سکی تو اس نے اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔

جواباً رفاقت نے اسے چھوڑ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کی درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ اُچھلی اور موقع پا کر اس سے دور ہونے کے لیے دوڑی۔ رفاقت نے اسے وارننگ دی پھر گولی مار دی۔ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے پلٹی تھی جس وقت گولی اس کے پیٹ میں دھنس گئی اور وہ اپنی چیخ نہ روک پاتے ہوئے لہرا کر زمین پر آن گری۔

وہ اپنی کہانی سناتے ہوئے روتی رہی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ پیٹ میں ہر لگنے والے جھٹکے پر بیدار ہونے والے درد کی وجہ سے رو رہی تھی ورنہ اس کا انتقام پورا ہو چکا تھا اور اس کا من پوری طرح شانت ہو چکا تھا۔ انتقام بھی کیا عجب جذبۂ انسانی ہے۔ اس کے تحت انسان کسی کی جان لے کر کتنا خوش ہوتا ہے۔ یہ وہی جانتا ہے جو دراز عرصہ تک انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے آپ کو جلائے رکھتا ہے۔ اس آگ سے نکلتے ہی وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ بھی پرسکون ہو چکی تھی۔

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی توجہ پولیس کے سائرن کی طرف مرکوز کی۔ چونک گیا۔ ابھی تک خاموش رہنے والے سائرن پھر کیوں بیدار ہو گئے تھے۔ کان لگائے۔ محسوس ہوا جیسے سائرن کی آواز دم بہ دم قریب ہوتی جارہی تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔

میری بے چینی کو نگینہ نے بھانپ لیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے مستفسر ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''میں سائرن کی آواز سے پریشان ہوں۔''

''کیا پولیس قریب آرہی ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

ریہڑی بان مرادے کے کانوں میں سائرن کی آواز اور نگینہ کے منہ سے نکلنے والا لفظ 'پولیس' پڑا تو وہ پلٹ کر بولا۔ ''چلو اچھا ہوا کہ پولیس ادھر آرہی ہے۔ کسی ذریعے سے پولیس والوں کو تمہارے ساتھ ہونے والی واردات کا علم ہو گیا ہوگا۔''

میں نے اس کی بات نظرانداز کی، پوچھا۔ ''اسپتال کتنی دور ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''ایک ڈیڑھ میل تو ہوگا ہی۔ اگر پیدل چلیں تو اسی سیدھ میں فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نہر کے پل کی وجہ سے یہ راستہ اوپر سے گھوم کر آتا ہے۔''

میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چند نوٹ نکالے۔ بغیر گنے ریہڑی پر رکھے اور اچھل کر ریہڑی سے اُتر آیا۔ پگڑی میں لپٹی ہوئی نگینہ کو بہ تکلف اُٹھایا اور متحیر کھڑے ریہڑی بان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لالہ! پولیس کو ہمارے بارے میں بالکل نہیں بتانا۔ اوکے؟''

اس نے ہونقوں کی طرح مجھے دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے ریہڑی پر نگینہ کا خون دکھائی دیا۔ میں نے ریہڑی بان سے کہا۔ ''نہیں...... بلکہ تم پولیس کو بتانا کہ ہم نے تم سے ریہڑی چھینی تھی مگر نوروز خان کی حویلی کے قریب ریہڑی چھوڑ کر بستی سمن کی طرف چلے گئے تھے۔ یہ نوٹ چھپا لو ورنہ پولیس چھین لے گی۔''

اس کے منہ سے مارے حیرت اور خوف کے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ریہڑی پر بیٹھ کر آگے جانے کا حکم دیا اور دوڑتا ہوا راستے کے کنارے اُگے ہوئے خودرو سرکنڈوں میں گھس گیا۔ یہ سرکنڈے ایک دیوار کی صورت میں راستے کے ساتھ ساتھ دور تک جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ تین چار فٹ کی اس دیوار کے پار فصلوں کا تاحدِ نگاہ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قریب ہی پرانے آم کا گھنا پیڑ دیکھ کر میں اس کی طرف بھاگا۔ سائرنوں کی آواز قریب سے قریب ہوتی جارہی تھی اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

پیڑ کے نیچے پہنچتے ہی میں سرعت سے پیڑ پر چڑھنے لگا۔ نگینہ کے جھولتے ہوئے وجود کو سنبھال کر درخت پر چڑھنا بہت دشوار کام تھا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ میرے بازو کا زخم میری گرفت مضبوط نہیں رہنے دیتا تھا۔ زندگی میں بارہا سنا تھا کہ چیتا اپنے شکار کو اُٹھا کر درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ آج سمجھ میں آ گیا کہ کسی کو اُٹھا کر درخت پر چڑھنا کتنا دشوار اور سکت طلب کام ہے۔ میرے بازو میں درد کی تیز ٹیس بار بار اُٹھ رہی تھی۔ جیسے تیسے کر کے پیڑ کی ایک شاخ تک پہنچ گیا۔ نگینہ کو قدرے افقی شاخ پر لٹا دیا۔ سہارا دے کر بیٹھ گیا۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں سے سوال کیا۔ میں نے دبی آواز میں کہا۔ ''پولیس آرہی ہے۔ اس لیے کوشش کرو کہ تمہارے منہ سے کوئی آواز

برآمد نہ ہو۔''

اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ میں نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ ایسے ہی عالم میں پولیس میرے اندازے کے مطابق ریہڑی بان تک پہنچ گئی۔ انجن کی گھر گھراہٹ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پولیس والے ایک ہی گاڑی میں سوار ہو کر ادھر آئے تھے۔ سرکنڈوں کی وجہ سے راستے پر ہونے والی نقل و حرکت دیکھی نہیں جا سکتی تھی مگر آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن کو سمجھنا ممکن نہیں تھا۔

میرا حلق بار بار خشک ہو رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں کو زبان سے گیلا کر رہا تھا۔ مجھے ریہڑی بان نے ہاتھ کے اشارے سے اسپتال کی لوکیشن سمجھائی تھی۔ اگر میں یہیں سے راجباہ پار کر کے ناک کی سیدھ میں فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کر لیتا تو اسپتال تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر تھا کہ اگر مرادے نے پولیس والوں کو بتا دیا کہ میں زخمی عورت کو اُٹھا کر اسپتال جا رہا تھا تو وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر پکٹ لگا لیتے اور جونہی مجھے دیکھتے، اریسٹ کر لیتے۔ میں نے اپنی قوتِ سماعت کو بہتیرا امتحان میں ڈالا مگر گفتگو واضح طور پر سنائی نہ دی۔ پانچ منٹ کے انٹرویو کے بعد پولیس والوں نے گاڑی آگے کی سمت بڑھا دی۔ میرا خدشہ مزید توانا ہو گیا کہ مرادے نے انہیں بتا دیا تھا کہ میرا رُخ اسپتال کی طرف تھا۔ تبھی وہ واپس جانے کے بجائے آگے چل دیے تھے۔

میں ابھی اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ پولیس کی گاڑی کے انجن کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ گاڑی بستی سمن کی طرف چلی گئی۔ چند لمحوں بعد مطلع صاف ہو گیا۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ گاڑی کو یوٹرن کرنے کے لیے انہیں کھلی جگہ درکار تھی، اس لیے وہ آگے گئے تھے۔ اب لوٹ کر حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے نگینہ کو سنبھالا اور بہت سست رفتار سے پیڑ سے اُترنا شروع کر دیا۔ پاؤں زمین پر لگے تو ایک بار یوں محسوس ہوا جیسے میرا بدن مسلسل جنگ کی وجہ سے حوصلہ ہار چکا تھا اور تھکن کا شکار ہو چکا تھا۔ اب تب میں ہی کہیں دغا دینے والا تھا۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی یکجا کی اور جبڑا بھینچ کر راستے کی طرف بڑھ گیا۔

سورج کی پہلی کرنوں نے زمین کا رُخ کر لیا تھا۔ اندھیرا مکمل طور پر چھٹ گیا تھا۔ میں جونہی سرکنڈوں سے نکل کر راستے پر آیا، ریہڑی بان کچھ فاصلے پر حویلی کی جانب جاتا دکھائی دیا۔

میں نے اُسے آواز دی۔ ''مرادے! لالہ!''

اس نے آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ہاتھ لہرایا اور اسپتال کی طرف اشارہ کیا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا اور رُخ پھیر لیا۔ صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مزید کوئی تعاون کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے مزید پکارنا موزوں تصور نہیں کیا اور راجباہ کی پٹڑی پر چڑھ گیا۔ راجباہ کی چوڑائی بہ مشکل پانچ فٹ تھی اور وہ پانی سے لبریز تھا۔ رات کا بہتا ہوا پانی صبح دم بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی گہرائی زیادہ بھی ہوئی تو بہ دقت چار فٹ ہوگی۔ اسے عبور کرنا تکلیف دہ مگر نہایت ضروری تھا کیونکہ مجھے فصلوں کے پار سرخ اینٹوں والی مخصوص طرز کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دیہاتی اسپتال یعنی بنیادی مرکز صحت تھا۔ وہاں ڈاکٹر یا ڈسپنسر یا مس عالیہ کی طرح کوئی ایل ایچ وی میسر آ سکتی تھی جو نگینہ کو ابتدائی طبی امداد دے سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نوع کے چھوٹے اسپتالوں میں پیٹ کے آپریشن کی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اگر اسپتال کا ڈاکٹر بہت قابل سرجن بھی ہو تو بھی آپریشن تھیٹر کی صورت حال بڑے آپریشن کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں اسپتال پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ وہاں فرسٹ ایڈ مل سکتی تھی اور فرسٹ ایڈ کے دوران میں کسی سے موبائل فون لے کر میڈم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اسے اپنی موجودہ کیفیت اور پریشانی سے آگاہ کر کے مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔

میں نگینہ کو اُٹھائے ہوئے کنارے پر بیٹھا۔ ٹانگیں ٹھنڈے پانی میں ڈالیں۔ سردی کی لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ جونہی اچھل کر کھڑا ہوا، میرے پاؤں پھسل سے اٹی ہوئی زمین پر لگے۔ پانی نے میری رانیں اور نگینہ کی پنڈلیاں گھٹنوں تک بھگو دیں۔ نگینہ کے نیم بے ہوش جسم کو جھٹکا سا لگا پھر شانت ہو گئی۔ راجباہ کی پھسل بہت چکنی تھی، پاؤں پھسلنے کا شدید خطرہ تھا، اس لیے سنبھل کر چلتا ہوا راجباہ عبور کر گیا۔

راجباہ کے پار فصلوں اور باغوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس سبز وادی کے بیچ اسپتال کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ایک مشکل یہ آن پڑی کہ فصلوں میں کئی کاشتکار اپنے معمول کے کاموں میں مگن دکھائی دے رہے تھے جن کی نظروں میں آئے بغیر میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے یہ خطرہ مول لینا تھا اس لیے ہر انجام کو بالائے طاق رکھ کر شبنم زدہ فصل میں اُتر گیا۔

میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ میں فصلوں میں کام کرنے والے کسی بھی شخص کے اتنا قریب سے نہ گزروں کہ

وہ میری طرف متوجہ ہو جائے یا اسے ہمارے جسموں پر چپکا ہوا خون دکھائی دے۔ کوئی فصل کو پانی لگا تھا، کوئی گوڈی کر رہا تھا تو کوئی چارہ کاٹ رہا تھا۔ ایسے میں غیر معمولی فاصلے کے باوجود وہ آپس میں براہِ راست رابطہ کیے ہوئے تھے۔ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں پگڈنڈیوں پر سنبھل کر چلتا ہوا اسپتال کے قریب پہنچ گیا۔ پتا چلا کہ یہ اسپتال کا عقبی رُخ تھا۔ مجھے اس کے گیٹ تک پہنچنے کے لیے ابھی چار دیواری کا چکر کاٹنا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ چل پڑا۔ گھوم کر سامنے آیا۔ ایک پختہ سڑک اسپتال کے چھوٹے سے گیٹ تک آتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ آٹھ فٹ چوڑی شکستہ حال سڑک یہیں اختتام پذیر ہو جاتی تھی۔ اس سڑک پر صرف وہی شخص سفر کرتا تھا جس نے اسپتال آنا ہوتا تھا۔

اسپتال کا بڑا آہنی گیٹ کھلا ہوا تھا جسے عبور کر کے میں احاطے میں داخل ہوا۔ ایک دبلا پتلا منحنی وجود شخص سولنگ پر جھاڑو دے رہا تھا۔ اس کا ایک بھائی بند اسپتال کے برآمدے میں پڑے بنچوں پر کپڑا مار رہا تھا۔ ان دو افراد کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے دیکھتے ہی منحنی وجود والے کے ہاتھ رُک گئے۔ جھاڑو گھسیٹتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مستفسر ہوا۔ ”کیا ہوا اسے؟“

میں نے کہا۔ ”چھت سے گر گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں؟“

اس نے اسپتال کی کالونی کی طرف دیکھا، بولا۔ ”نہیں بادشاہو! اتنی جلدی ڈاکٹر صاحب نے یہاں آ کر کرنا بھی کیا ہے۔ تم ادھر اسپتال میں لے جاؤ اپنی بیوی کو اور دائیں ہاتھ والے کمرے میں بیڈ پر ڈال دو۔“

میں نے پوچھا۔ ”کوئی اور ہے؟“

اس نے مجھے سرتاپا گھورا، پوچھا۔ ”تم اس علاقے کے تو نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے کالونی کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کالونی میں کوئی رہتا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں جی! یہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ کوٹھی پر ہوتے ہیں...... اپنی فیملی کے ساتھ۔ پر وہ ادھر کسی مریض کو نہیں دیکھتے۔“

میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور کوٹھی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ لپک کر میرے سامنے آ گیا۔ بولا۔ ”میں نے کہا جو ہے کہ وہ کوٹھی پر کسی کو نہیں دیکھتے۔“

میں نے جھوٹ سے کام لیا۔ ”پرے ہٹو۔ ڈاکٹر صاحب میرے دوست ہیں۔“

اس نے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور ناچار راستہ چھوڑ دیا اور ساتھ چلنے لگا۔ بتانے لگا کہ ڈاکٹر صاحب مزاج کے بہت سخت ہیں۔ وہ اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔ انہیں جگایا جائے تو سخت ناراض ہوتے ہیں...۔ وہ چوکیدار یا نائب قاصد تھا، خاکروب بھی ہو سکتا تھا، اسے اپنی نوکری کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں ڈاکٹر کا غیظ و غضب اس کا مقدر نہ بن جائے تبھی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں جبکہ منزل دو چار گام ہی رہ گئی تھی، کہیں قریب سے پولیس کے سائرن بجنے کی آواز سنائی دی۔ کم بخت کسی اور طرف سے گھوم کر اسپتال کی طرف آ رہے تھے۔ میرا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور چند لمحوں میں ہی ڈاکٹر کی کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں پہنچ گیا۔ بڑے سے چوبی دروازے کو بے دردی سے دھڑ دھڑا دیا۔ لاشعوری طور پر میں پولیس سے پہلے نگینہ کو ڈاکٹر کی کوٹھی میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں یہاں غیر محفوظ تھا۔ ابھی سائرن کی آواز دور ہی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

دروازہ سرخ اور گلابی لباس میں ملبوس لڑکی نے کھولا تھا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا اور کانوں میں گونجنے والی پولیس کے ہوٹر کی خوفناک آواز کہیں دب کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے میرے قدموں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہو اور میری زبان حلق سے چپک گئی ہو۔

”تو......!“

میرے لبوں سے نکلنے والا یہ ایک لفظ میرے چار سو گونجنے لگا اور میرے کندھے پر اُٹھی ہوئی نگینہ سرک کر میرے پیروں میں فرش پر گر گئی۔ مجھے اس کے گرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر میں کسی چلتی ہوئی اسٹین گن کے دہانے کے سامنے آن کھڑا ہوتا تو بھی میری یہ قلبی و ذہنی کیفیت نہیں ہو سکتی تھی جو دروازہ کھولنے والی لڑکی کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

ایک بوری کھجور کی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

اگر دنیا میں کسی کی ہمت اور اخلاص کو دیکھنا ہو تو کسی بے بس اور مفلس کے حوصلے کو پرکھ لیا جائے... جو اپنی قدرت سے بڑھ کر دوسروں کا حق ادا کرنے اور کسی کا احسان اتارنے کے لیے انتہائی بے چین دکھائی دیتا ہے اور جیسے ہی قسمت اسے موقع عنایت کرتی ہے وہ بن موسم برسات کی طرح برس جاتا ہے... کچھ ایسا ہی حال ان افلاس زدہ لوگوں کا تھا، جن کے دلوں پر کسی کی مہربانی ایک بوجھ بن گئی تھی... مگر انہوں نے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

بے بسی کے دائرے میں محبت و خلوص کی بے مثال کہانی

بوڑھے ڈاکٹر نے سگریٹ کا بھرپور کش لیا اور پھر انسا شروع کر دیا۔ کھانسی آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی گئی، ی تیز کہ کانوں کو بری لگنے لگی۔ میں پانی کا گلاس لے کر ر پہنچا تو کھانس کھانس کر بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھیں سوؤں سے بھر گئی تھیں، اس کی تشکر بھری آنکھوں نے ے خوش آمدید کہا۔

”بابا سگریٹ بھی نہیں چھوڑو گے اور مرو گے بھی ں۔“ میرے دل نے جیسے سرگوشی کی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے مگر یہ تکلیف، یہ دکھ، یہ جسم کا عذاب، یہ سی کا جہنم تو ایک مستقل تکلیف بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے ان س طرح سے کھانسنے پر شدید تکلیف ہوتی تھی۔

”اپریل بھی ختم ہو جائے گا۔“ انہوں نے پانی کا س ختم کر کے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ اپریل سے پہلے اپریل کا انتظار تھا اور اب جب اپریل کے دن بھی سے گزر رہے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان کی جان انہی ں میں پھنسی ہوئی ہے۔

”ہاں بابا، اپریل بھی نکل رہا ہے لیکن آپ فکر نہ کرو، کا اچھا انتظام ہے۔ بجلی جاتی رہے گی مگر جنریٹر اور آپ رہا ہے، آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔“

”نہیں، موسم کا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے گرمی میں ہی زندگی گزاری ہے۔“ انہوں نے بڑی بڑی مگر سوکھی ہوئی آنکھوں کو پورا کھول کر بڑے زور سے کہا تھا۔ ”گرمی کیا کرلے گی میرا، یہ تو ہر سال آتی ہے اس سال بھی آئے گی چلی جائے گی۔ بس اپریل گزر جائے تو پتا چل جائے گا۔“

میرے چہرے پر ان کی نگاہ رک گئی پھر آہستہ آہستہ انہوں نے انگلی کو میرے چہرے کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔ ”وہ بوڑھا ہو گیا ہوگا میری طرح سے۔ نہ جانے زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ میں تو زندہ ہوں، شاید وہ بھی زندہ ہو۔“

ڈاکٹر کی عمر 70 سال سے اوپر ہی ہوگی۔ تمام عمر انہوں نے اس صحرا میں لگا دی تھی۔ کسی بڑے شہر سے آ کر یہاں رہ گئے تھے، اس وقت جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اسپتال، نہ دواخانے اور نہ ہی ڈاکٹر۔ میں اکثر سوچتا کہ اس بوڑھے کو برسوں پہلے، جب شہر میں بھی ڈاکٹروں کی شدید کمی تھی، نہ جانے اس صحرا میں، اس چھوٹے سے شہر میں، گاؤں میں دھول چاٹنے سے کیا مزہ ملا تھا۔ شہر میں تو آج بھی ڈاکٹروں کی کمی ہے اور آج سے پچاس سال پہلے تو اور بھی کمی ہوگی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔

مہینے میں دو دفعہ ڈاکٹر کی بیٹیاں باری باری آتی تھیں،

ایک پہلے ہفتے میں، دوسری تیسرے ہفتے میں۔ ضرورت کا سارا سامان لے کر، کبھی اپنے شوہر کے ساتھ کبھی اپنے بچوں کے ساتھ۔ پورا دن وہ لوگ بابا کے پاس ہوتے، ساتھ کھاتے، ساتھ پیتے، صبح سے شام تک ان چند گھنٹوں میں ڈاکٹر جیسے کسی پھول کی طرح کھلا کھلا ہوتا۔

امجد بڑی خدمت کرتا، بالکل صاف ستھرا تیار رکھتا تھا انہیں، لیکن دونوں لڑکیاں پھر بھی آکر ایک ایک چیز دوبارہ صاف کرتی تھیں۔ باپ کو نہلاتیں، ساتھ ساتھ گھومتیں، ان کے ذاتی کام کرتیں۔ صرف بیٹیاں ہی باپ کے ساتھ ایسا کرتی ہیں۔ پھر دن نکل جاتا اور شام ہوجاتی اور وہ گلے لگ کر بھاری قدموں سے، اپنے بابا سے نہ چاہتے ہوئے بھی رخصت ہوجاتیں۔ امجد کو بار بار ہدایات ملتیں۔ ایسا ہوجائے تو ایسا کرنا، یہ گھر کا نمبر ہے، یہ موبائل کا نمبر ہے، یہ آفس کا نمبر ہے، نہ جانے کیا کیا اندیشے ہوتے ہوں گے دونوں کے دلوں میں۔ ہر دفعہ ان کی رخصت کے وقت میرے دل پر بھی بوجھ سا بڑھ جاتا تھا۔

امجد بوڑھے ڈاکٹر کا پرانا ملازم تھا۔ اسے بہت اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔ شہر میں سند یافتہ ڈاکٹروں کو بھی اتنے پیسے نہیں ملتے جتنے پیسے امجد کو دیے جارہے تھے۔ ڈاکٹر کے بچوں کا خیال شاید صحیح تھا کہ اب عمر کے آخری برسوں میں زیادہ سے زیادہ آرام دینے کے لیے جتنا بھی خرچ کیا جائے کم ہے، اچھا نوکر، اچھا گھر، جنریٹر، ایئر کنڈیشنر، پنکھا اور ضرورت کی سب چیزیں۔ میرے دل میں بوڑھے کے بچوں کے لیے بہت اچھے جذبات تھے۔

میں خود یہاں تھوڑے ہی مہینوں کے لیے آیا تھا۔ اقوام متحدہ کے صحت کے ادارے ڈبلیو ایچ او نے مجھے اس صحرا میں پائے جانے والے سانپوں کے متعلق کچھ بنیادی تحقیقی کام کرنے بھیجا تھا۔ اس علاقے میں اموات کی دو بنیادی وجوہات تھیں، ایک ملیریا اور دوسرے سانپ کا کاٹنا۔ صحرا میں سانپ تھے اور صحرا میں موجود نخلستانوں میں ملیریا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ دنیا بہت آگے بڑھ گئی تھی، شہروں میں آسمان کو چھو لینے والی عمارتیں تھیں، سڑکیں ایسی تھیں کہ کاروں پر سفر کرتے ہوئے لگتا تھا جیسے پانی پر پھسلتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ ایئرپورٹ ایسے تھے کہ جیسے خود چھوٹے موٹے شہر ہوں مگر ہزاروں برسوں سے بسنے والے ان گاؤں، دیہاتوں کے لوگ ویسے ہی پسماندہ تھے، ویسے ہی بیمار جیسے اوپر والے نے انہیں ہزاروں سال پہلے بنایا تھا۔

ڈامر کی لمبی چوڑی چکراتی ہوئی چار لائنوں، چھ لائنوں والی سڑکوں، بڑی بڑی عمارتوں، خاکی، دھلی دھلائی استری شدہ وردی پہنے ہوئے باوقار سپاہی، جنرل، آسمان پر اڑنے والے ایف سولہ جیسے جہاز اور دھرتی کو ہلا دینے والے ایٹم بم کے دھماکوں کے باوجود یہ زمین بانجھ تھی۔ یہاں کے لوگ غریب تھے، سانپ کے کاٹے ہوئے، بیمار، مچھروں کے مارے ہوئے۔ میرے دل میں غصہ، انتقام اور نفرت کا سمندر ابلنے لگتا، ان زمینی خداؤں کے خلاف جو موت اور بدحالی کے آقا بن کر رہ گئے تھے۔ غریبوں، دھرتی کے بیٹوں، جوان بچیوں، ماؤں اور بہنوں کی قسمت میں کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں کی خیرات، یو ایس ایڈ کی امداد، جاپان، سویڈن اور دوسرے ممالک کی جانب سے آنے والی گرانٹ اور ان کے قرضوں سے دی جانے والی خوراک۔

ڈاکٹر سانپوں اور ملیریا کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میں سب سے پہلے اسی سے آکر ملا۔ ڈاکٹر نے مجھے اپنے مکان میں ہی جگہ دے دی اور کہا کہ کوئی گھر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہیں اپنا ہیڈکوارٹر بنا لو چند مہینوں کی بات ہے۔ یہ گھر تو خالی ہی پڑا ہے۔

میں نے بھی خوشی سے ہامی بھر لی تھی۔ نہا دھو کر پہلے دن جب میں ڈاکٹر کے ساتھ کھانا کھا کر امجد کی بنائی ہوئی چائے کے مزے لے رہا تھا تو ڈاکٹر نے پوچھا کہ کون ہے تمہارا ڈبلیو ایچ او میں جس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''ارے کوئی جاننے والا ہوگا ڈبلیو ایچ او میں جس نے تمہیں یہاں کچھ پیسا بنانے بھیج دیا ہے۔ کوئی رشتے دار، دوست ہوگا کبھی ناں۔ ارے بھائی ہر تین چار سال کے بعد یہی ہوتا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کے ہیڈکوارٹر میں ایسی رپورٹیں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ پھر کوئی نیا افسر آتا ہے، نئے پلان بناتا ہے اور پھر نئے لوگ بھرتی کیے جاتے ہیں بڑی تنخواہوں پر۔ نئی رپورٹیں بنتی ہیں اور ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر نیا آنے والا پرانی رپورٹوں کو الگ رکھ دیتا ہے۔ اقوام متحدہ بھی سرکار کی طرح ہے۔ یہ چھوٹی سرکار، وہ بڑی سرکار، دونوں بے حساب، دونوں بے کار۔''

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس لی اور مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔ بات تو شاید صحیح ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ میرا کوئی جاننے والا ڈبلیو ایچ او میں ہے۔ میں نے تو اخبار میں اشتہار دیکھ کر درخواست بھیجی تھی اور جب انٹرویو کے بعد میرا انتخاب ہوگیا تو مجھے پتا چلا کہ ایسے سروے پہلے

بھی ہوئے ہیں۔ دل میں تو آیا تھا کہ میں منع کردوں لیکن یہ سوچ کر کہ انتخاب کے اتنے پیچیدہ طریقوں سے گزرنے کے بعد ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ شاید میں کوئی بہتر رپورٹ لکھ سکوں، اچھا کام کر سکوں شاید اس کا کوئی فائدہ ہوجائے۔

ڈاکٹر نے میری بڑی مدد کی، ان کے پاس گزشتہ پچاس برس کا تجربہ تھا، صحرا کے ہر ذرے سے ان کی شناسائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں لوگ ان کو پوجتے تھے۔ انہوں نے ان گنت جانیں بچائی تھیں۔

مجھے ان کی عزت کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں ان کے ساتھ چند جگہوں پر گیا۔ جیپ کے رکتے ہی قصبوں، دیہاتوں، گاؤں میں جیسے کرنٹ دوڑ جاتا، جوق در جوق لوگ ان کی پذیرائی کے لیے چلے آتے تھے، کوئی ہاتھ ملاتا کوئی گلے ملتا، کوئی ہاتھ چومتا، کوئی پیروں پر جھک جاتا۔ ایسا لگتا جیسے ہر کوئی مقروض ہے ان کا۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ ڈاکٹر اپنی بیٹیوں کے گھر پر شہر جا کے کیوں نہیں رہتے ہیں۔ کیا تھا شہر میں ان کے لیے۔ دو بیٹیوں کے عالیشان مکانات، دو بہت معروف داماد، اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے نواسے، صبح سے شام تک زندگی جھنجھانے میں نہیں گزاری جاسکتی ہے، ڈاکٹر کی زندگی تو یہاں تھی۔ مٹی کے بنے ہوئے گوشت پوشت کے انسانوں کے درمیان۔ جنہیں سانپ کاٹتے، جو خون کی الٹیاں کرتے ہوئے آتے اور ڈاکٹر کے ایک انجکشن کے بعد ہنستے ہوئے گھر چلے جاتے تھے۔ مچھروں کے ڈسے ہوئے بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں، بخار اور کپکپاتے ہوئے جسم کے ساتھ موت اپنی آنکھوں میں لے کر آتے اور ڈاکٹر کے علاج کے بعد دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ جاتے جاتے جو جس کے بس میں ہوتا وہ ڈاکٹر کی نذر کرتا، مانگے بغیر بہت اصرار کر کے فیس دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے ساری زندگی یہاں کام کیا، یہیں کی آمدنی سے شہر میں گھر رکھ کر اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو پڑھایا، انہیں ذمے دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنایا۔ بیٹا انگلینڈ گیا اور وہیں کا ہوگیا، اب سال کے سال باپ کو دیکھنے آتا ہے۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد ڈاکٹر کی بیوی بھی صحرا کے اس جھونپڑے سے شہر میں رہنے کو آگئی تھی۔ سال بھر پہلے یکایک اسے دل کا دورہ پڑا اور انتقال ہوگیا تھا۔ تب سے ڈاکٹر اکیلا تھا اپنے نوکر امجد کے ساتھ۔

میرے سروے کے دوران لوگوں نے مجھے ڈاکٹر کے بارے میں بتایا تھا۔ گاؤں کے چوراہے پر، چائے خانوں میں، پان کی دکانوں پر، کنوئیں سے پانی نکالنے والے لوگوں نے، قصبوں کے بازاروں کی دکانوں میں، کہ کیا کیا تھا اس ڈاکٹر نے۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی بانٹی تھی۔ ان کے درد کو سہا تھا، جہاں سرکار نہیں تھی وہاں ڈاکٹر تھا، جہاں صرف دعائیں تھیں وہاں وہ اپنے انجکشن لگا لگا کر دماغی ملیریا اور سانپ کے کاٹے کا علاج کرتا رہا، اس نے اپنی تصویریں نہیں چھپوائیں اخباروں میں، کوئی عام سا آپریشن کر کے ٹیلی وژن پر انٹرویو نہیں دیا، سرکار سے کوئی تمغہ نہیں لیا، پی آر کی فرموں اور ایجنسیوں سے گٹھ جوڑ کر کے جعلی نام نہیں بنایا۔ ذلتوں کے مارے ہوئے غریب لوگوں کی سانسوں میں سانس ملائی، ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر انہیں کھڑا کردیا، ان کے زخموں کو اپنا زخم سمجھا، حکومتیں، وزارتیں، بین الاقوامی ادارے اور سماج کے ٹھیکے داروں کے لیے یہ کوئی کام نہیں تھا۔

امجد نے مجھے بتایا کہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر کی صحت خراب ہوتی جارہی ہے، اب بھی اس خراب صحت کے باوجود صبح ہوتے ہی مریض آنا شروع ہوجاتے اور ڈاکٹر اپنے کمپاؤنڈر اور امجد کی مدد سے صبح سے شام تک مریضوں کو دیکھتا رہتا۔ سگریٹ پی پی کر، کھانس کھانس کر اپنے وجود کو ہلکان کرنے کے باوجود۔ لگتا تھا ڈاکٹر کی طاقت میں تو کمی آگئی ہے، جنون میں نہیں۔

میرا کام تقریبا ختم ہونے کو تھا۔ میں نے پورے صحرا کا ایک سروے کیا تھا، مختلف قسم کے سانپوں کی درجہ بندی کی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ زیادہ تر سانپ زہریلے نہیں تھے۔ چند قسمیں ایسی تھیں جن میں بلا کا زہر تھا اور جن کے کاٹے کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ جلد از جلد زہر کے خلاف انجکشن لگائے جائیں۔

حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں تھا، بنیادی صحت کے سارے مراکز خالی پڑے تھے۔ صرف عمارتیں، دیواریں، چھتیں، میز اور کرسیاں جن کی چوکیداری کے لیے عام طور پر ایک آدمی ہوتا۔ کسی جگہ پر ڈاکٹر نرس یا مڈوائف بھی موجود نہیں تھی۔ بڑے قصبوں کے سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹر ضرور تھے مگر زیادہ تر اپنے پرائیویٹ کاموں میں معروف، غریب مریض کے لیے زندگی کو سنبھالنا ایک مسئلہ ہی تھا۔ صحرا کے بیچوں بیچ ڈاکٹر کا ٹھکانا جلتے جہنم میں جنت کی ٹھنڈی چھایا تھی اور ڈاکٹر کا نہ تھکنے والا وجود کنوئیں کا میٹھا پانی تھا۔ دور دور سے لوگ گدھا گاڑی، بیل گاڑیوں پر سوار یا پیدل، اپنے کندھے پر مریضوں کو بٹھائے ہوئے کسی پہر بھی چلے آتے۔ مجھے ڈاکٹر سے الفت سی ہونے لگی تھی اور یہ سوچ

سوچ کر تکلیف ہوتی تھی کہ اب میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔

ایک روز ڈھلتی شام میں، میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا کہ وہ یہاں اس صحرا میں کیوں آئے تھے۔

”قسمت۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا، رکے پھر بولے۔ ”میری بیوی اور میں اس جگہ نہیں آئے تھے۔ صحرا کے شروع ہوتے ہی یہاں کا پہلا شہر ہے وہاں ڈپٹی کمشنر سے ملنے آئے تھے ہم دونوں۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ میں میڈیکل کالج چلا گیا اور وہ مقابلے کے امتحان کے بعد سرکاری ملازم ہو گیا۔ میں جب ڈاکٹر بنا تو وہ یہاں کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے مجھے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر بلایا کہ شہر سے دور اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آرام کر لوں۔ یہاں آ کر پھر میں واپس نہیں جا سکا، بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔“

بوڑھے ڈاکٹر نے ورانڈے کے جھروکوں سے آسمان کو تکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے ایک سگریٹ جلا دو۔“

میں نے سگریٹ جلا کر انہیں دیا، انہوں نے ایک لمبا کش لے کر جیسے دھواں اپنے جسم کی ایک ایک اور تک پہنچایا پھر آہستہ آہستہ وہ دھواں ان کی ناک سے اور منہ سے بادل کی طرح آسمان کی طرف چل دیا، ساتھ ہی انہوں نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

”وہ دوسری رات تھی جب وہ آدمی اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو لے کر آیا۔ ہم لوگ سوئے ہوئے تھے مگر وہ نہ جانے کس طرح سے چوکیداروں کی منت سماجت کرتا ہوا ڈاک بنگلے میں پہنچ گیا۔ نوکروں کے جگانے پر جب میں نے باہر نکل کر اس بچے کو دیکھا تو اس کا جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ تھرتھراہٹ سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ اس کی ماں اسے بار بار سنبھال رہی تھی مگر بچے کو کسی پل چین تھا نہ آرام۔ وہ میرے پیروں پر گر گیا تھا۔ یہ میرا چوتھا بیٹا ہے ڈاکٹر، تین پہلے ایسے ہی مر چکے ہیں۔“

یہ سن کر جیسے زمین میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی تھی۔ یہ کیا انصاف ہے، میں نے سوچا۔

میرے بیگ میں ملیریا کے انجکشن موجود تھے، میں نے بچے کو لٹایا، انجکشن لگایا، ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھوائی، ڈاک بنگلے کے برآمدے کے فرش پر لیٹے لیٹے چند گھنٹوں میں ہی بچہ سنبھل گیا تھا۔ اس دم جتنی خوشی مجھے ہوئی وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جس دن وہ لوگ واپس جا رہے تھے تو نہ جانے کس کس طرح انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا، الفاظ، آنسو اور چہرے پر شکرانے کی برسات۔ ان کے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں تھا، نہ روپیا، نہ زیور، نہ چاندی۔ پہلی دفعہ مجھے لگا تھا کہ میں کتنا اہم ہوں اور یہ غریب لوگ کتنے لاچار اور مجبور ہیں۔ پھر پورا ہفتہ میں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ ایک طرف شہر تھا، انگلینڈ جانے کی تیاریاں تھیں، خوب صورت زندگی تھی، میڈیکل کالج میں طلبہ کو پڑھانے کا کام، شہر کے بڑے بڑے لوگوں سے یارانہ۔ دوسری طرف تکلیف دہ صحرا کے گاؤں، غربت کے مارے ہوئے لوگ۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا یہاں تک کہ ہمارے جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت جب ہم لوگ سرکاری گاڑی میں سوار ہو رہے تھے کہ ہم لوگوں نے دور سے بھاگتے ہوئے، ہاتھ ہلاتے ہوئے اسی آدمی کو دیکھا۔ اسی بچے کا باپ۔ اس کے بدن کے سارے کپڑے پسینے سے شرابور تھے، اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور اپنے کاندھے پر رکھی ایک کھجور کی بوری میرے قدموں پر رکھ دی۔ اپنے گاؤں سے یہ بوری اٹھائے ہوئے وہ ساری رات چلتا ہوا ڈاک بنگلے پہنچا تھا، اپنے ڈاکٹر کو فیس دینے کے لیے۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ میں شہر میں نہیں رہوں گا۔ انگلینڈ نہیں جاؤں گا۔ میڈیکل کالج میں نہیں پڑھاؤں گا۔ میری ضرورت یہاں ہے۔ ان لوگوں کو، کھجور کی وہ ایک بوری مجھے ایسی لگی جیسے قارون کا خزانہ ہو، ہیرے جواہرات، سونے کے ڈلوں سے بھرا ہوا۔ ایک ماہ کے اندر ہی ہم لوگ یہاں آ گئے اور پہلے دن سے ہی مریضوں کا تانتا بندھ گیا۔ ملیریا کے بیمار، سانپ کے کاٹے ہوئے لوگ، آنے کے چند ہی دنوں کے بعد وہ آدمی دوبارہ آیا تھا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ۔ مجھے دیکھ کر اس نے میرے پیر چھوئے۔ اپنے اس چھوٹے سے بچے کو میرے سامنے کھڑا کر دیا، وہ بچہ مجھے تکتا رہا جیسے میں آسمان سے آیا ہوں۔ اس کی ماں مجھے دیکھتی رہی جیسے میں کوئی انسان نہیں دیوتا ہوں۔ بھگوان ہوں اور وہ ایسے ہی گڑگڑایا جیسے میں اس کا خدا ہوں۔ چھیالیس سال گزر گئے کوئی اپریل ایسا نہیں گزرا جب مجھے کھجور کی ایک بوری نہیں ملی ہو۔ قارون کے خزانے سے بھری ہوئی۔ صحرا کی ریت میں رات بھر پیدل چل کر لانے والے کاندھے کی خوشبو لیے ہوئے، اس کے پسینے میں بھیگی ہوئی سونے کی ڈلیاں ایسی کھجور مجھے کہیں بھی نہیں ملے گی، خلوص، محبت، اعتقاد کی گرمی لیے ہوئے ہر سال میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے ڈوبتے ہوئے سورج کی جانب غور سے دیکھا، سگریٹ کا ایک اور بھرپور کش لیا، زور کی کھانسی تھی، اس کی آواز پھنس گئی۔ ”شاید یہ آخری اپریل ہو۔“

اشرف الاولیا

ضیا تسنیم بلگرامی

سفر چاہے زندگی کے دنوں کے شمار کا ہو یا اعمال کی ادائیگی کے معیار کا... گزر ہی جاتا ہے... نتائج اور مرتبوں کی باری تو سب سے آخر میں آتی ہے اور ان مرتبوں کی تقسیم کا اختیار صرف اور صرف اس قادرِ مطلق کو ہے جو اس کل کائنات کا تنہا مالک و مختار ہے... اور جس نے اپنے اس مالک کو پہچان لیا گویا اپنی آخرت کو سنوار لیا... کچھ دیدہ ور ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف اپنی ذات اور آخرت کو بچا لیا بلکہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو بھی اندھیری غاروں سے نکال لیا... ایسے بزرگانِ دین کے ذریعے ہی اس کائنات میں بھلائی کا سلسلہ چلتا رہا ہے... کہ آخر اُس مالکِ کل کو اپنی اس مخلوق سے حد درجہ پیار ہے... اسی لیے ان کی رہنمائی کے لیے کبھی بھی اور کہیں بھی اپنے ولیوں کو ظاہر کر دیتا ہے... انہی ولیوں میں سے ایک ولی کی عبرت اثر روداد

درجہ بہ درجہ اوصاف کریمانہ کے حامل اولیائے کرام کا سبق آموز سلسلہ

عراق کے علاقہ سمنان پر جو حاکم برسر اقتدار تھا، اس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام محمد اشرف تھا، دوسرے کا محمد سلطان۔ یہ سادات گھرانا تھا۔ باپ کی اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ تھی۔ ان میں محمد اشرف غیر معمولی ذہین تھا۔ ذہانت کے ساتھ بردباری، تحمل اور حلم بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس میں ہر بات غیر معمولی تھی۔ ابھی سات سال کا تھا کہ پورا قرآن مجید حفظ کر لیا۔ کچھ اور عمر بڑھی تو منقولات اور معقولات سے بھی فارغ ہو گیا۔ والدین بہت خوش تھے۔ باپ

اس لیے خوش تھا کہ اس کے بعد اس بیٹے کو سمنان کی حکومت سنبھالنا تھی۔ ماں اس لیے کہ بیٹے میں اپنی ماں کا احترام غیر معمولی تھا اور وہ اپنی خواہش اور مرضی پر اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کو ترجیح دیتا تھا۔

حاکم باپ اپنے دونوں بیٹوں کا وقتاً فوقتاً امتحان لیتا رہتا۔ ایک دن وہ دربار سے اٹھ کر محل کے اندر پہنچا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ ایک ایسا مقدمہ اس کے سامنے پیش ہوا تھا جس کا ایک فریق نہایت بااثر اور چالاک شخص تھا۔ اس کے حاکم سے ذاتی تعلقات بھی تھے اور دوسرا فریق ایک گمنام اور معمولی شخص تھا۔ اس کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ گمنامی کے علاوہ اس میں ایک اور کمزوری بھی پائی جاتی تھی۔ وہ کم گو بھی تھا، زیادہ باتیں نہیں بنا سکتا تھا۔ چالاک شخص نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا اور دلیلوں اور جعلی ثبوتوں سے اس پر اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ کمزور شخص اپنا حق ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ حاکم یہ محسوس تو کر رہا تھا کہ کم گو اور گمنام شخص سچا ہے مگر وہ دلائل اور فرضی ثبوت اس کی تردید کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرے، لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ کمزور اور کم گو فریق کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ متذبذب اور فکر مند دربار سے اٹھ کر محل کے اندر پہنچا تو اس کے سامنے پہلا شخص جو آیا وہ اس کا بیٹا محمد اشرف تھا۔ بیٹے نے فکر اور پریشانی کے آثار اپنے باپ کے چہرے پر دیکھے تو سوال کیا۔ ''باواجان! خیریت تو ہے؟ آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

حاکم باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے اشرف! تو میری پریشانیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ تو خود حکومت نہ سنبھال لے۔ حکومت اپنی جگہ ایک دردسری ہے۔''

بیٹے نے سن کر عرض کیا۔ ''باواجان! اگر یہ بات ہے تو اس دردسری سے پیچھا چھڑائیے۔''

حاکم باپ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس دردسری میں ایک مزہ بھی ہے۔ حکومت اور اختیار، بادشاہت اور اقتدار بڑے مزے کی چیز ہے۔ اس مزے پر دردسری قربان، یہ احساس کہ میں اپنی سلطنت اور حدودِ سلطنت کا سب سے بڑا اور سب سے باعزت شخص ہوں مجھے ایک نشہ اور سرور بخشتا ہے۔ اس نشے اور سرور پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔''

بیٹے نے باپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، کہا۔ ''باواجان! میری یہ مجال نہیں کہ آپ سے اختلاف کروں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اقتدار اور اختیار کا نشہ کیسا اور کیا ہوتا ہے، لیکن اپنی ناقص عقل سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نشہ کوئی سا بھی ہو حرام ہے کیونکہ ہر قسم کا نشہ عقل وخرد اور تمیز اور شعور پر حاوی آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ زہد و ورع کا نشہ بھی، ابلیس کا نشہ ہی تو تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے روک دیا۔ نشہ میں تکبر اور غرور کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی چیز اس کو حرام قرار دیتی ہے۔''

باپ بیٹے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ''اشرف! مجھے تیری باتوں نے بہت متاثر کیا، لیکن تجربے نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اقتدار اور اختیار سے اس کے نشہ اور سرور کو دور کر دیا جائے تو حاکم بادشاہ نہیں رہ جاتا، درویش بن جاتا ہے۔ حکومت رعب اور دبدبے کا تقاضا کرتی ہے۔ بادشاہت اور حشم و شکوہ لازم و ملزوم ہیں۔''

بیٹا بھی باپ سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ جواب دیا۔ ''سادگی، فروتنی، عدل اور حق پر قائم رہنے کا عزم اور ارادہ ان سے زیادہ رعب اور دبدبہ کس بات میں ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا جلال کن باتوں سے قائم ہوا تھا۔ وہاں رعب و شکوہ اور دبدبہ کن ستونوں پر کھڑا ہوا تھا۔ رعب اور دبدبہ، جو حشم و عزم اور شان و شکوہ کے ستونوں پر قائم کیا جائے، مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتا۔ اپنے شاندار اور سچے کردار کا شکوہ اور دبدبہ ہی ایسی چیز ہے جو جھوٹ اور تکبر کو پاس نہیں آنے دیتا۔''

باپ کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی جو کسی قیمتی شے کے پا لینے سے پیدا ہوتی ہے، بیٹے سے پوچھا۔ ''تو تو خاصا عالم، عاقل اور دلائل و براہین کا خزینہ نظر آتا ہے، ذرا یہ تو بتا حکومت کی بنیاد کن چیزوں پر قائم ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''عدل و انصاف پر، لوگوں کا خیال ہے کہ عدل کی آنکھیں نہیں ہوتیں اس لیے یہ کسی سے مرعوب یا متاثر نہیں ہوتا۔ جو بھی اس کی زد میں آجاتا ہے، عدل کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔''

باپ نے شوخی اور فخر کے ملے جلے جذبے سے پوچھا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ عدل و انصاف کی آنکھیں نہیں ہوتیں مگر تو کیا کہتا ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں کہتا ہوں کہ عدل و انصاف کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ تیز اور باطن میں اتر جانے والی نظریں جو سچ اور جھوٹ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عدل و انصاف کا کوئی کنبہ نہیں ہوتا، کوئی خاندان نہیں ہوتا اس لیے جو بھی اس کی زد میں آجاتا ہے اس کے لطف و فیض سے محروم نہیں رہتا۔ اس کی دسترس سے باہر نہیں ہوتا، اس کے سامنے حق دار شاداں و فرحاں اور غاصب لرزاں و ترساں رہتا ہے۔''

باپ نے اپنے بیٹے کے سامنے اپنا مقدمہ رکھ دیا۔ وہ مقدمہ جس کا ایک فریق چالاک اور باتونی ہے اور دوسرا فریق کمزور، گمنام اور کم گو۔ ساری تفصیل بیٹے کے گوش گزار کر دی اور آخر میں پوچھا۔ ''بیٹے تو ہی بتا کہ مجھے اس مقدمہ میں کیا کرنا چاہیے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باواجان! آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وہ قول ہمیشہ یاد رکھیں، جو آپ نے خلافت سنبھالتے ہی ارشاد فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ امیر المومنین ہو جانے کے بعد ان کی نظر میں طاقتور کمزور ہے اور کمزور طاقتور۔ طاقت ور معاشرے میں کتنا ہی اونچا اور شاندار مقام کیوں نہ رکھتا ہو، اگر وہ حق پر نہیں ہے تو میری نظر میں کمزور ہے۔ معاشرے کا وہ شخص جو نادار، غریب، کمزور اور گمنام ہے مگر ساتھ ہی حق کی طاقت رکھتا ہے تو وہ میری نظر میں طاقتور ہے۔ حضرت صدیقؓ کے اس قول میں اقتدار و اختیار اور عدل و انصاف کا ابدی اور دائمی منشور موجود ہے۔ انمٹ اور ناقابل تسخیر، آپ بھی اس کو مشعل راہ بنائیے، کبھی دھوکے یا خسارے میں نہیں رہیں گے۔''

باپ نے خوشی میں بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ ''تو شاندار بیٹا ہے، میں تجھ پر فخر کرتا ہوں، میں تیرا باپ ہوں لیکن تیری باتوں نے مجھے بتایا کہ میں تیری رہنمائی میں شاندار حکومت کر سکتا ہوں۔''

بیٹے نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''باواجان! میری رہنمائی میں نہیں، یہ فرمائیے کہ میرے صلاح و مشوروں سے۔ آپ کے سابقہ تجربے ہیں جبکہ میں ان سے محروم ہوں۔ ایک بادشاہ کو اپنے عدل و انصاف کے لیے اور بہت سی چیزیں بھی درکار ہوتی ہیں اور ان کا حاصل ہونا تجربوں کا رہین منت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آپ وسیع تجربات کے حامل اور مالک ہیں۔''

باپ نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تو شاندار حکومت کرے گا مثالی اور قابل تقلید۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باواجان! حکومت دردسری ہے اور میں اس دردسری سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

باپ نے کہا۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے، تو تو میرا ولی عہد ہے اور میرے بعد تجھی کو اقتدار سنبھالنا ہے، کل سے تو میرے ساتھ رہے گا اور کاروبار سلطنت میں میری مدد کرے گا۔''

بیٹے نے عرض کیا۔ ''میں حاضر ہوں اور یہ میری مجال نہیں کہ آپ سے اختلاف کروں لیکن اندر سے میرا دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''جب تو عملاً میرا شریک کار ہو جائے گا تو تیرا دل بھی لگنے لگے گا۔''

اس کے بعد دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر دونوں کے دل الگ الگ خوشیوں، خیالوں، فکروں اور اندیشوں سے معمور تھے۔ حاکم باپ خوش تھا کہ اس کا ولی عہد نہایت لائق و فائق اور دانا و بینا نوجوان ہے اور بیٹا فکر مند اور اندیشوں و وسوسوں میں گھر گیا تھا۔ وہ حکومت اور اقتدار کو ایک مصیبت اور عذاب سمجھ رہا تھا جو اس کی طمانیت اور سکون کو برباد کرنے کے درپے تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کس طرح پیچھا چھڑائے؟ کس طرح نجات حاصل کرے؟

◆ ◆ ◆

دوسرے ہی دن باپ نے بیٹے کو اپنے پاس بٹھا لیا، معاملات حکومت اور امورِ سلطنت میں بیٹے کے مشورے شامل ہو گئے، بیٹے محمد اشرف کو پہلے ہی دن یہ محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر رکھ دیا گیا ہے اور وہ اس بوجھ میں دبا چلا جا رہا ہے، اس بوجھ نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف کر دی تھی اور اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کسی اور طرف دیکھ سکتا۔ وہ اوراد و وظائف اور ذکر و فکر جن سے دل و دماغ کو ایک خاص قسم کی روشنی عطا ہوئی تھی، عدیم الفرصتی کی نذر ہو گئے، اشرف نے اپنے اس کرب کو کئی دن تک چھپائے رکھا اور اس دکھ کو جھیلتا رہا لیکن جب یہ محسوس کیا کہ آنے والے دنوں میں روشنی اور ہدایت کے ان ماخذوں سے مستقل ہی محروم ہو جانا پڑے گا تو ایک دن باپ سے عرض کیا۔ ''باواجان! ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں، اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں!''

باپ نے خوشی خوشی جواب دیا۔ ''کہو کہو، میں ناراض نہیں ہوں گا، تیرے جیسے عقل مند اور سعادت مند بیٹے سے کون ناراض ہو سکتا ہے؟''

بیٹے نے عرض کیا۔ ''باواجان! اصل بات تو یہ ہے کہ میں کاروبارِ سلطنت کے بکھیڑوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں، کیا یہ

مناسب نہیں ہے کہ آپ اپنے ساتھ بھائی سلطان کو بٹھائیں اور مجھے... اوراد و وظائف اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے دیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں ذکر و فکر اور اوراد و وظائف کی مخالفت نہیں کروں گا لیکن ولی عہد تو ہے اس لیے یہ حکومت تجھی کو سنبھالنا ہے، سلطان تیرے بعد ہے، اوراد و وظائف اتنے ضروری نہیں ہیں جتنی حکومت۔"

بیٹے نے عرض کیا۔ "باواجان! یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو مجھے آپ سے دور اور مختلف رکھتا ہے۔ میں آپ کی بات کو یوں دُہراؤں گا کہ حکومت اتنی ضروری نہیں ہے جتنے اوراد و وظائف اور ذکر و فکر، فرق اپنے اپنے نقطۂ نظر اور انداز فکر کا ہے۔ یہ حکومت یا اقتدار کوئی چیز نہیں۔ انہیں روشنی اور شعور کہاں سے ملتا ہے؟ اس مخرج اور منبع کو زیادہ اہمیت حاصل ہے حکومت اور اقتدار کے مقابلے میں۔"

باپ فکرمند ہو گیا۔ سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا۔ "میں تجھ سے اختلاف نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ بیٹے، بادشاہی اور درویشی دو الگ الگ چیزیں ہیں، یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

بیٹے نے جواب دیا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن میرا اپنا کچھ اور ہی خیال ہے درویشی میں شاہی تو سما سکتی ہے مگر شاہی میں درویشی نہیں سما سکتی۔"

باپ نے بیٹے سے زیادہ بحث نہیں کی، لیکن بیٹے کے فطری اور طبعی رجحان نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔

اب باپ نے دوسرا ہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ بیٹے کو زیادہ تر اپنے ہی پاس رکھتے تا کہ اس پر جاہ و مرتبے اور حکومت کا رنگ چڑھ جائے اور وہ اقتدار اور اختیار کے نشے میں مبتلا ہو جائے۔ اشرف نے دلچسپی بھی خوب لی اور بڑی محنت، دیانتداری اور لگن سے باپ کا ہاتھ بٹایا لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ان کا اپنا رنگ مستقل اور گہرا تھا جس پر اور کوئی رنگ نہیں چڑھ رہا تھا۔

باپ کا انتقال ہو گیا۔ سمنان کی حکومت محمد اشرف کے حصے میں آئی۔ انہوں نے کاروبارِ سلطنت پر پوری توجہ دینے کی کوشش کی لیکن دل بار بار اچاٹ ہو جاتا۔ آخر اپنے چھوٹے بھائی محمد سلطان کو بھی کاروبارِ سلطنت میں شریک کر لیا اور اس سے کہا۔ "سلطان! تو پوری آزادی اور توجہ سے میرا ہاتھ بٹا کیونکہ بہت ممکن ہے کہ آخرکار میرے حصے کا کام بھی تجھی کو انجام دینا پڑے۔"

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے حکم پر عمل کیا اور حکومت کے کاموں میں منہمک ہو گیا۔ اشرف نے ایک بار پھر خود کو ذکر و فکر اور اوراد و وظائف میں مشغول کر لیا۔ پورے سمنان میں ایک بات مشہور تھی وہ یہ کہ ہر طرف امن و امان اور عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ طاقتور خوفزدہ تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ طاقت کے نشہ میں کسی کمزور پر ہاتھ ڈال دیں، کمزور خوش اور اکڑے پھر رہے تھے کہ وہ ظالموں اور سرکشوں سے محفوظ تھے۔

ایک رات وہ سوئے تو گہری نیند نے غلبہ کر لیا۔ فجر کی اذان سے ذرا پہلے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی سفید پوش جس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی ان کے پاس کھڑا کہہ رہا ہے۔ "اشرف اٹھ! سمنان کو چھوڑ دے!"

انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ "سمنان کو کیوں چھوڑ دوں؟ یہاں میری حکومت ہے، یہ کام کس پر چھوڑوں؟"

سفید پوش نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، یہ میرا حکم نہیں ہے، حکم ربی ہے۔ سمنان کی حکومت کو لات مار دے اور ہندوستان چلا جا۔ وہاں تیرا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

انہوں نے پوچھا۔ "ہندوستان میں کہاں؟ اور وہاں کون میرا انتظار کر رہا ہے؟"

سفید پوش نے تنبیہ کی۔ "جب یہ کہہ دیا گیا کہ یہ حکم ربی ہے تو تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ تو یہ پوچھے کہ ہندوستان میں میرا کون انتظار کر رہا ہے؟"

یہ ڈر گئے، بولے۔ "اے شخص میں تجھ کو نہیں پہچانتا لیکن اب سوال جواب کا سلسلہ بند، تو میرے رب سے کہہ دے کہ اس کا حکم میں نے سن لیا اس پر کل ہی عمل درآمد ہو گا۔"

سفید پوش نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کر کے جب انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور سفید پوش کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پورے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگے۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ کمرے میں ہر طرف سناٹا تھا، خاموشی تھی لیکن

پورے کمرے میں خس کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ اشرف نے زور زور سے سانس کھینچی اور خوشبو سونگھنے لگے۔ کچھ دیر تو یہ خوشبو رہی اس کے بعد آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی۔

انہوں نے اٹھ کر فجر کی نماز ادا کی اور سیدھے ماں کے پاس پہنچ گئے۔ ماں کو سلام کر کے عرض کیا۔ "مادر محترم! میں سمنان کی حکومت سلطان کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اجازت مطلوب ہے۔"

ماں نے حیرت سے سر سے پاؤں تک اشرف کو دیکھا اور پوچھا۔ "بیٹے! کسی تمہید کے بغیر تو نے اتنی بڑی بات کہہ دی، خیریت تو ہے؟"

اشرف نے جواب دیا۔ "میں اس وقت تک رکا رہوں گا جب تک کہ آپ مجھے اجازت نہ دے دیں گی کیونکہ میں کوئی کام بھی آپ کی اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

ماں نے پوچھا۔ "اچھا پہلے یہ بتا کہ یہ ایک دم ہجرت کا خیال کیونکر آ گیا تیرے دل میں؟"

اشرف نے جواب دیا۔ "مادر محترم! یہ میرا خیال نہیں ہے، حکم ربی ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس کو ٹال جاؤں۔"

ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ دیر بیٹے کی صورت دیکھتی رہیں' پوچھا۔ "کیا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ تجھے جو حکم ملا ہے وہ حکم ربی ہی ہے؟"

اشرف نے جواب دیا۔ "مادر محترم! مجھے جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل میں شر اور فساد مضمر نہیں ہیں۔ بس اس بات نے یہ باور کرا دیا ہے کہ یہ واقعی حکم ربی ہی ہے۔"

ماں کو بے حد افسوس تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا۔ لیکن حکم ربی کے خلاف کچھ بول بھی نہ سکتی تھیں، جواب دیا۔ "جب خدا کی مرضی یہی ہے کہ تاج و تخت سے دستبردار ہو جائے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں، الحکم الا اللہ (اللہ کے حکم کے سوا کوئی حکم نہیں) تجھے جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کر۔"

اشرف نے اپنے چھوٹے بھائی محمد سلطان کو سمنان کی حکومت سونپی اور ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ ماں نے اشک آلود آنکھوں اور جگر سوختہ کیفیت میں اشرف کو مخاطب کیا۔ "بیٹے! اب کہاں ملاقات ہو گی؟ قیامت میں یا اسی دنیا میں دوبارہ کبھی؟"

اشرف نے جواب دیا۔ "مادر محترم! مجھے کچھ پتا نہیں لیکن دلوں کی قربت ہمیں ہمیشہ قریب رکھے گی۔"

ماں نے شدتِ غم سے منہ پھیر لیا۔ اشرف نے ہندوستان کے بجائے ماوراء النہر کا رخ کیا۔ وہاں سے بخارا گئے پھر سمرقند پہنچ گئے۔ وہ ان مقامات میں موجود بزرگوں سے ملے اور مزارات مقدسہ پر حاضری دی۔ سمرقند سے ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اور اوچھ (ملتان) میں قیام کیا، یہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سید اشرف کو خوش آمدید کہا اور چند دن ان کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ پھر دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور اپنے رب کے حکم پر بہار روانہ ہو گئے۔ بہار کے قصبے منیر میں قیام کیا۔ یہاں مشہور بزرگ شرف الدین یحییٰ منیری کا جنازہ ان کے انتظار میں تھا، آپ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی اور ان کے مزار پر مراقبہ فرمانے لگے۔ اس کے بعد بنگال کا رخ کیا۔

آپ جہاں بھی رکے، لوگوں پر اپنے اثرات چھوڑے اور انہیں اپنا گرویدہ کر لیا۔

ان دنوں بنگال میں مشہور چشتی بزرگ شیخ علاؤ الدین علاء الحق تشریف فرما تھے۔ یہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس میں بھی لوگ حکومت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے، شیخ علاء الدین علاؤ الحق علمی حیثیت سے اتنے بڑے آدمی تھے کہ بڑے سے بڑا منصب حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھا اور ٹھکرا دیا۔ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کی خانقاہ سے ہزاروں آدمی روزانہ اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

شیخ علاؤ الدین کے مریدوں میں ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے اپنے شیخ کی زیارت اور خلافت حاصل ہو لیکن آپ خاموش رہتے اور اگر اس کا ذکر بھی ہوتا تو سکوت اختیار فرماتے۔

ایک مرید زہد و ریاضت میں سب پر فضیلت رکھتا تھا اس لیے اس کو زعم ہو گیا تھا کہ اس کو اپنے شیخ کی جانشینی کا شرف

حاصل ہوگا لیکن جب اپنے پیرومرشد کے رویے پر غور کرتا تو مایوس ہو جاتا۔ اس نے سوچا یوں تو پیرومرشد خاموش ہیں اور اپنی خلافت اور نیابت کے سلسلے میں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں کہتے اس لیے اگر بات کرکے کریدا جائے اور ان سے وضاحتیں حاصل کرلی جائیں تو کیا ہرج ہے۔ چنانچہ وہ ساری رات کی بے چینی، کرب اور اضطراب کے بعد اپنے پیر کی خدمت میں جا کھڑا ہوا۔ شیخ علاؤ الدین نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

مرید کچھ دیر کھڑے رہ کر اپنے پیرومرشد کی توجہ کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا، اپنے مرشد کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں آپ کی توجہ کے انتظار میں کھڑا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”توجہ کے انتظار میں کھڑے رہنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ روشن ضمیر ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ توجہ سے میری مراد کیا ہے؟“

علاؤ الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے تجھ پر کب توجہ نہیں دی؟“

مرید نے اصرار کیا۔ ”حضرت! وہ توجہ جس کا میں طالب ہوں، ابھی تک نہیں ملی اور نہ ہی آپ کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ ملا جس سے میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھ پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہیں جتنے کا میں امیدوار ہوں۔“

آپ نے افسوس سے کہا۔ ”اے شخص! افسوس کہ تو جس شے کا طالب ہے وہ طلب کرنے سے نہیں ملتی۔ اگر تجھے اپنی عبادت اور ریاضت پر کچھ زعم ہے اور اس کی وجہ سے تو یہ سمجھنے لگا ہے کہ تو تصوف میں کسی بلند مرتبے کا مستحق ہوگیا ہے تو یہ تیری بھول ہے کیونکہ تیرا یہ زعم مرتبہ و مقام کے حق میں زہر ہے۔ اس قسم کا زعم تھا جس نے معلم الملکوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار کردیا۔ جو کچھ ملنا ہے مل جائے گا۔ مطالبہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تو اس کو اپنا حق سمجھ کر زبردستی حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

مرید نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ”یہ میرا اپنا ہی خیال نہیں ہے، میرے جملہ مرید بھائیوں کا یہی خیال ہے کہ آپ کی نیابت اور خلافت کا مجھ سے بہتر کوئی دوسرا امیدوار نہیں ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”مشیت ایزدی تیری یا تیرے مرید بھائیوں کی تابع تو نہیں، حکم ربی کیا ہے اور کس کے لیے ہے کوئی نہیں جانتا اور جس بات کا انسان کو علم نہ ہو اس میں خاموشی اور تسلیم و رضا بہتر ہے۔“

مرید بہت دل برداشتہ ہوا کیونکہ اپنی باتوں سے پیرومرشد نے یہ بات واضح کردی تھی کہ وہ اپنے اس مرید کو اپنی خلافت اور نیابت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ دل برداشتہ ہو کر عرض کیا۔ ”تب پھر اسے پیرومرشد میں یہ سمجھ لوں کہ میں آپ کی خلافت اور نیابت کا مستحق نہیں ہوں؟“

پیرمرشد نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ بات تو نہیں کہی۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت آپ نے واضح طور پر تو یہ بات نہیں کہی لیکن گفتگو سے مترشح یہی ہوتا ہے۔“

مرشد نے جواب دیا۔ ”انتظار کر، انتظار کر۔ مجھے جس شخص کا انتظار ہے وہ بس آیا ہی چاہتا ہے۔“

مرید کو یہ بات ناگوار گزری۔ ”کیا کوئی شخص باہر سے آرہا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں بہت دور سے، عراق سے، وہ ماوراء النہر، بخارا، سمرقند، ملتان، دہلی، بہار کے قصبے شہر سے گزر کر ہمارے پاس آرہا ہے، خدا عالم الغیب ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون کس مرتبے کا ہے اور کس کا کون سا منصب ہے۔“

اب تو مرید بالکل ہی مایوس ہوگیا، آہستہ سے بولا۔ ”تب پھر تو میری ساری عبادت اور ریاضت بیکار گئی۔“

مرشد نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”اگر شب و روز عبادت اور ریاضت کے بعد بھی میں آپ کی خلافت اور نیابت حاصل نہ کرسکا تو میں اس کے سوا اور کیا سمجھوں گا کہ میری ساری عبادت اور ریاضت بیکار گئی۔“

مرشد علاؤ الدین ناراض ہوگئے، جواب دیا۔ ”اگر تیرے اپنی عبادت اور ریاضت کے بارے میں یہ احساسات اور خیالات ہیں تو فضول اور بے بنیاد ہیں اور میں بھی یہی کہوں گا کہ تیری ساری عبادت اور ریاضت بیکار گئی۔“

مرید دل برداشتہ ہو کر چلا گیا۔ باہر دوسرے مریدوں کو جب اس گفتگو کا علم ہوا تو وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آخر وہ کون شخص ہے، جو عراق سے چل کر ان کے پیرومرشد کی نیابت اور خلافت سنبھالنے آرہا ہے۔

ایک دن صبح سویرے علاؤ الدین ہشاش بشاش اپنے حجرے سے نکلے اور مریدوں کو اپنے آس پاس جمع کرلیا، ان میں وہ مرید بھی تھا جس کو اپنے زہد و ورع پر بڑا ناز تھا۔

شیخ علاؤ الدین نے ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور آنکھیں بند کرکے نہایت انہماک سے کچھ سوچتے رہے پھر مریدوں سے پوچھا۔ ”لوگو! ذرا غور تو کرو، ہوا میں سونگھو اور بتاؤ کہ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟“ جملہ مریدوں نے پورے انہماک اور یکسوئی سے ہوا میں سونگھا اور غور کرنا شروع کردیا اور جب وہ کچھ بھی محسوس نہ کرسکے تو اعلان کیا۔ ”پیرومرشد! ہمیں تو کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔“

مرشد نے اپنے...... اس مرید کو مخاطب کیا، جو خلافت و نیابت کا امیدوار تھا۔ ”تو کیا کہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے بھی کچھ محسوس نہیں ہو رہا!“

مرشد نے مسکرا کر کہا۔ ”ارے بھائی! مجھے تو ہواؤں میں بوئے دوست محسوس ہو رہی ہے۔ میرا دوست، میرا خلیفہ، میرا نائب، میرا جانشین آرہا ہے، تیزی سے بڑھا چلا آرہا ہے، آؤ ہم سب اس کے استقبال کو چلیں۔“

مریدوں نے حیرت اور تعجب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کیا۔

انہوں نے کہا۔ ”ایک دوسرے کی شکلیں نہ دیکھو، میرے ساتھ چلو، اس کی سواری شہر کے قریب آچکی ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ شہر میں داخلے سے پہلے ہی اس کے استقبال کو پہنچ جائیں۔“

مریدوں کو اپنے پیرومرشد کے حکم کی تعمیل میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا، فوراً ساتھ ہو لیے لیکن مریدِ خاص بے دلی اور بے رغبتی سے سب کے پیچھے رہا۔

شہر سے نکلتے ہی انہوں نے مغرب سے اٹھنے والے گرد و غبار کو دیکھا۔ علاؤ الدین نے اپنے مریدوں کے ساتھ آم اور نیم کے درختوں کے سائے میں قیام کیا اور گرد و غبار پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ یہ گرد و غبار جو صبح کی سنہری دھوپ کو دھند سے آلودہ کر رہا تھا، آہستہ آہستہ کم ...... ہونے لگا اور اس میں سے اکا دکا آدمی، مویشی اور گھوڑوں پر سوار مسافر نمودار ہونے لگے۔ آپ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میرا دوست اس قافلے میں شامل مجھ سے ملنے آرہا ہے۔“

مریدوں کا اشتیاق بڑھا اور قافلے کے استقبال کو آگے بڑھے پھر ایک مرید نے واپس آکے پوچھا۔ ”پیرومرشد! آپ جس کے استقبال کو نکلے ہیں اس کا نام کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کا نام معلوم کرکے کیا کرو گے؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ اس کے آنے سے پہلے ہم اس قافلے میں پہنچ جائیں اور اس سے مل کر یہ خوشخبری پہنچا دیں کہ تو وہ خوش قسمت شخص ہے جس کے استقبال اور پیشوائی کو حضرت پیرومرشد تشریف لا رہے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس کا نام شیخ محمد اشرف سمنانی ہے اور عراق کے علاقہ سمنان پر اس کے آباؤ اجداد حکومت کرتے رہے وہ خود حکومت کو لات مار کر ہمارے پاس آرہا ہے۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”کیا نام بتایا؟ شیخ محمد اشرف سمنانی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں اس کا یہی نام ہے۔“

مریدوں میں سے ایک نے پوچھا۔ ”اور یہ بھی درست ہے کہ اس نے اپنی حکومت کو لات مار دی ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس نے اپنی آبائی حکومت کو لات ماردی اور رشد و ہدایت کی خاطر ہندوستان چلا آیا۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”تب پھر میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو اس شاندار اور قابلِ تعظیم شخص کا استقبال سب سے پہلے کرے گا۔“

آپ نے خوشی کا اظہار کیا، فرمایا۔ ”خدا جس کو توفیق دے، وہ سرخ رو اور کامران ہوتا ہے۔“

مرید تیزی سے آتے ہوئے قافلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ قافلے تک پہنچنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ قافلے میں داخل ہوتے ہی اس نے بہ آواز بلند دریافت کیا۔ ”میں اشرف سمنانی کے استقبال کے لیے حاضر ہوا ہوں لیکن صورت آشنا نہ ہونے کے سبب میں ان کے پاس خود سے نہیں پہنچ سکتا، اس لیے میری رہنمائی کی جائے۔“

مرید نے قافلے میں اس سرے سے اس سرے تک بار بار یہی آواز بلند کی تو اشرف سمنانی نے اسے اپنے پاس بلایا اور

عاجزی سے عرض کیا۔ ”اے شخص! تجھ کو جس کی تلاش ہے وہ میں ہوں، لیکن یہ تو بتا کہ میری آمد کا علم تجھ کو کس طرح ہوا؟ میرا غائبانہ تعارف کس نے کرایا؟“

مرید نے آپ سے مصافحہ کیا اور دونوں ہاتھوں کو پیشانی سے لگا کر چوم لیا، عرض کیا۔ ”حضرت! میں شیخ علاؤالدین چشتی کا ایک حقیر سا مرید ہوں، میرے پیرومرشد نے اپنے تمام مریدوں کو مطلع کیا کہ ان کا ایک دوست آرہا ہے تو ہم سب آپ کے مشتاق ہوگئے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تمہارے پیرومرشد نے تمہیں کیا بتایا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”انہوں نے بتایا کہ ہوا میں بوئے دوست شامل ہے، ایک دوست سمنان سے چل کر ماوراءالنہر، بخارا، سمرقند، ملتان اور منیر ہوتا ہوا ان کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سب چلو تاکہ اس کا استقبال کیا جائے۔“

سید اشرف بہت متاثر ہوئے، بے چینی سے پوچھا۔ ”پھر؟ پھر کیا ہوا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”پھر وہ اپنے مریدوں کے ساتھ شہر کے باہر آگئے۔ میں نے سوچا کہ استقبال تو سب ہی کریں گے، میں اس سعادت میں فضیلت کیوں نہ حاصل کروں، چنانچہ سب کو منتظر چھوڑ کر آپ کے پاس آگیا، اب میں خوش ہوں کہ میرا مقصد مجھے حاصل ہوگیا اور میں ہی وہ پہلا شخص کہلاؤں گا جس نے شرف ملاقات حاصل کرنے میں پہل کی اور سبقت لے گیا۔“

سید اشرف نے فرمایا۔ ”خدا تجھے ہمیشہ سرخرو رکھے، میں خوش ہوں کہ میں جس شخص کی تلاش میں ایک عرصے سرگرداں اور پریشان ہوں، بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا۔“

مرید نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا شک۔“

اس کے بعد یہ دونوں ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے شہر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ مرید نے دور ہی سے شیخ علاؤالدین چشتی اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”حضرت! وہ رہے اپنے پیرومرشد، مریدوں کے نرغے میں، دیکھیے کتنی بے چینی سے آپ کا انتظار کررہے ہیں۔“

سید اشرف نے شیخ علاؤالدین کو دور سے دیکھا تو سواری چھوڑ دی اور نیچے آگئے، مرید اور سید اشرف پیادہ پا شیخ علاؤالدین چشتی کی خدمت میں روانہ ہوگئے، دوسری طرف سے پیرومرشد اپنے سب مریدوں کو لے کر ان کی طرف بڑھے اور ایک جگہ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے، دونوں ایک دوسرے کو پرشوق نظروں سے کچھ دیر دیکھتے رہے اس کے بعد شیخ نے اپنے مہمان کو سینے سے لگالیا۔ فرمایا۔ ”سید اشرف تو بہت تھک گیا ہوگا، گھوڑے کو کہاں چھوڑ دیا اس پر سوار ہوجا۔“

سید اشرف نے جواب دیا۔ ”پیرومرشد! آپ کو دیکھتے ہی میری ساری تکان دور ہوگئی، میں تو آپ کے ساتھ پیدل ہی چلوں گا اور اس سے اپنی تکان دور کردوں گا۔“

شیخ چشتی نے فرمایا۔ ”سید اشرف تکلف نہ کر، میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا تو اپنے گھوڑے پر سوار ہوجا۔“

لیکن سید اشرف نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑلی اور شیخ چشتی کے ساتھ پیدل ہی چل کر تکان دور کرنے لگے۔

◆ ◆ ◆

اس دن خانقاہ میں بڑا جشن رہا، ہر طرف سے خوشی ہی خوشی ابل رہی تھی، ہر کوئی خوش تھا لیکن وہ مرید جس کو اپنی عبادت پرناز تھا افسردہ اور ملول سا وہاں سے چلا گیا۔

شیخ چشتی نے سید اشرف کو غسل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد صاف ستھرے کپڑے پیش کیے اور ہلکا سا کھانا کھلانے کے بعد فرمایا۔ ”آج آرام کرو۔“

سید اشرف نے فرمایا۔ ”حضرت! میں یہاں آرام کرنے نہیں آیا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جنہیں خدا اپنے کسی خاص کام کے لیے مقرر فرمادیتا ہے انہیں چھٹی نہیں دیتا۔“

شیخ علاؤالدین بہت خوش ہوئے اور سید اشرف کو اسی وقت سے ریاضت اور مجاہدے میں مشغول کردیا۔

سید اشرف کو جو سکون اور طمانیت شیخ علاؤالدین سے حاصل ہوئی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں بارہ سال گزار دیے۔ اس دوران شیخ چشتی نے انہیں جہانگیر کا لقب دیا اور یہ سید اشرف جہانگیر کہلائے جانے لگے۔ اپنے پیرومرشد کے حکم پر سید اشرف جونپور کے نواح میں چلے گئے اور اعظم گوٹھ کے قصبے محمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے لوگوں نے آپ کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضری دی۔ ان میں عام لوگوں کے علاوہ وہاں کے نامی گرامی علما بھی شامل تھے۔ محمد آباد سے ظفر آباد چلے گئے۔ آپ کی باتوں میں ایک سحر تھا۔ اس سحر میں وہ لوگ بھی مبتلا ہوجاتے جو علمیت اور دولت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، چنانچہ ظفر آباد کے شیخ کبیر سرورپوری بھی آپ کے مریدوں میں شامل ہوگئے۔ جبکہ شیخ کبیر اپنی دولت مندی اور علمی فضیلت میں کوئی جواب نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے سید اشرف کی خدمت میں رہ کر وہ مقام حاصل کیا کہ بعد میں ان کے خلیفہ قرار پائے۔

ظفر آباد میں کچھ دن قیام کرکے جونپور واپس چلے گئے اور وہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں ان کی ملاقات اس عہد کے جید عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ہوگئی، یہ ملاقات گہرے تعلقات میں تبدیل ہوگئی۔ یہ غزنی کا رہنے والا عالم مدتوں دولت آباد دکن میں رہنے کی وجہ سے دولت آبادی مشہور ہوگیا تھا۔ دولت آباد سے دہلی چلا گیا اور جب تیمور کے حملے سے افراتفری مچی تو یہ شخص جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی کے پاس چلا آیا۔ ابراہیم شرقی نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا۔ قاضی شہاب الدین جن کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں ان میں شرح کافیہ، بدیع البیان، ارشاد در نحو اور قرآن پاک کی فارسی تفسیر بحر المواج بہت مشہور ہیں۔

سید اشرف اپنے دوست قاضی شہاب الدین کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے، وہ اکثر ان کے ساتھ رہنے لگے۔ سید اشرف نے انہیں روحانی مدارج کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بعد میں سید اشرف نے انہیں خرقۂ خلافت عطا کیا اور ملک العلما کا خطاب بھی دیا۔

ایک دن قاضی شہاب الدین آپ کی خدمت میں اداسی اور فکرمندی سے داخل ہوئے۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیوں قاضی کیا بات ہے، چہرے پر اداسی اور فکرمندی کیوں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”حضرت! سلطان ابراہیم شرقی آپ کی خدمت میں آنے کے لیے بے چین ہے۔ خادم نے سوچا کہ چلو آج میں آپ سے ملاقات کرلوں، اور کل جب سلطان ابراہیم شرقی آئے گا تو میں اس کے ساتھ بھی حاضری دوں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ میری نظر میں تو زیادہ اہم اور مرتبے والا ہے۔ سلطان تجھ سے بہتر نہیں ہے اگر بادشاہ آتا ہے تو آتا رہے اس کو کسی نے منع تو نہیں کیا۔“

اس دن قاضی نے آپ کی صحبت میں بہت وقت گزارا اور ہنسی خوشی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن باادب باملاحظہ کی آوازیں گونجنے لگیں اور حاکم شہر اپنے حشم و خدم کے ساتھ آپ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ ان کے ساتھ قاضی شہاب الدین بھی آئے۔

بادشاہ نے قاضی سے کہا۔ ”آپ اندر جا کر پیرومرشد کو مطلع فرمادیں کہ خطاکار حاکم جونپور اذنِ باریابی چاہتا ہے۔“

جب قاضی نے یہ پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ جزبز ہوئے۔ سید اشرف نے جواب دیا۔ ”اے قاضی شہاب الدین! میں بادشاہ کو تو اذنِ باریابی دے سکتا ہوں لیکن مجھے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کے ساتھ آنے والوں میں خواتین کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ میں ان سب کو قریب آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

قاضی شہاب الدین باہر نکلے اور حاکم شرقی سے کہا۔ ”حضور والا! اندر چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ مجھ سے مشورہ لیں تو میں کچھ عرض کروں۔“

حاکم شرقی نے کہا۔ ”فرمائیے، میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”حضور والا! جہاں آپ تشریف لے جارہے ہیں وہ فقیر کی کُٹیا ہے۔ آپ اگر اس کُٹیا میں اپنے حشم و خدم کے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو یہ فعل پیرومرشد کو گراں گزرے گا لیکن اگر آپ اندر تنہا تشریف لے جائیں گے تو پیرومرشد کو بڑی خوشی ہوگی۔“

حاکم شرقی نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ پیرومرشد کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔ حشم و خدم اندر نہیں جائیں گے۔“

اس کے بعد حاکم شرقی اپنے گھوڑے سے نیچے آگیا اور قاضی کے ساتھ اندر آپ کے پاس چلا گیا۔ اس نے سید اشرف

کی خدمت میں پہنچ کر جس ادب اور احترام کا ثبوت دیا اس سے سید اشرف بہت متاثر ہوئے۔ حاکم شرقی نے گزارش کی۔ ''حضور! کچھ عرصہ پہلے میں نے قلعہ جنادہ کی تسخیر کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تھا، وہ ابھی تک واپس نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ملی۔ آپ خدا سے دعا کیجیے کہ میں کوئی منحوس خبر نہ سنوں۔''

سید اشرف نے جواب دیا۔ ''ابراہیم تو فکر مند نہ ہو، اللہ نے چاہا، تو تو عنقریب خوش خبری سنے گا۔''

حاکم شرقی خوشی سے پھولا نہ سمایا، بولا۔ ''حضرت میں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی حکومت کی حدود میں، میں شرعی نظام نافذ کردوں گا گوکہ یہ کام بہت دشوار ہے۔''

سید اشرف نے فرمایا۔ ''اگر تو اپنے عہد میں سچا ہے تو میں بھی تجھ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ تو الجھنوں سے نکل جائے گا اور فتح و کامرانی سے شادکام ہوگا۔''

آپ کی دعائیں لے کر حاکم شرقی واپس چلا گیا۔ ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ بھیجے ہوئے لشکر کی طرف سے فتح و نصرت کا پیغام آ گیا۔ بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوش خبری کے دوسرے دن وہ ایک بار پھر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا اور دروازے پر کھڑا ہو کر اذن باریابی طلب کیا۔ قاضی شہاب الدین بادشاہ کی نمائندگی کررہے تھے۔

قاضی نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔ ''حضرت بادشاہ شرفِ ملاقات کا خواہش مند ہے۔ حاضری کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''ابھی تین دن پہلے تو وہ آچکا ہے۔ اس وقت حاضری کا کوئی خاص سبب؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''بادشاہ کے بھیجے ہوئے لشکر نے کامیابی حاصل کرلی ہے۔ بادشاہ کا عقیدہ ہے کہ یہ فتح و نصرت آپ کی دعاؤں سے ملی ہے۔ بادشاہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بادشاہ سے کہہ دو شکریہ کس بات کا؟ اور کس کا شکریہ...... میرا؟ شکریہ اپنے رب کا کرے اور مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس پر عمل کرے۔''

قاضی نے عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ آپ سے ملے بغیر واپس نہیں جائے گا۔''

آپ نے زور دے کر کہا۔ ''قاضی شہاب الدین، بادشاہ کے پاس جاؤ اور فتح و نصرت پر میری طرف سے مبارک دو۔ اسے کہو کہ وہ بند دروازے کھول دے، بار بار کی ملاقات کا حاصل؟''

قاضی چپ چاپ باہر چلا گیا اور آپ کا پیغام بادشاہ کے گوش گزار کردیا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ''یہ بند دروازے کھول دینے کا کیا مطلب ہوا؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''مطلب صاف اور واضح ہے یعنی نظام شریعت کے نفاذ کا در کھول دیا جائے۔''

بادشاہ وارفتہ و آشفتہ آگے بڑھا اور آپ کے حجرے میں داخل ہوگیا۔ آپ بادشاہ کو دیکھ کر لیٹنے سے اٹھ بیٹھے اور بادشاہ کو اپنی پائنتی بٹھالیا۔

بادشاہ نے والہانہ عقیدت مندانہ عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کی کرم فرمائی اور نوازش کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟ غلام تو آپ کا مرید تھا ہی، اب غلام زادے بھی شرف بیعت سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نظام شریعت کا نفاذ، ارکان اسلام پر خلوص دل سے عمل، بس میری تو یہی سب سے بڑی آرزو ہے اگر پوری ہوجائے تو کیا کہنے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''آپ کی یہ خواہش ضروری پوری ہوگی۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔''

اس کے بعد بادشاہ نے آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلیاں بطور نذرانہ پیش کیں، لیکن آپ نے لینے سے انکار کردیا اور فرمایا۔ ''میں ان اشرفیوں کا کیا کروں گا۔''

بادشاہ نے درخواست کی۔ ''میری خواہش ہے کہ آپ انہیں قبول فرمالیں، میری خوشی ہوجائے گی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میری خوشی اس میں ہے کہ تم انہیں واپس لے جاؤ۔''

جب بے حد اصرار کے بعد بھی آپ نے اشرفیاں نہیں لیں تو بادشاہ نے انہیں واپس رکھ لیا۔

* * *

ایک ہندو جوگی کو آپ کے ذکر سے چڑ ہوتی تھی۔ جب وہ یہ دیکھتا کہ سید اشرف جہانگیر نامی ایک مسلمان درویش ہندوؤں کو متاثر کرکے مسلمان کررہا ہے تو تلملا کر رہ جاتا۔ وہ آپ کے پاس گیا اور کسی مرید سے آپ کو مطلع کیا کہ ''اپنے پیر سے کہہ دو کو بھدونڈ جوگی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

جب آپ کو یہ اطلاع پہنچائی گئی تو فرمایا۔ ''اس سے کہو اپنے شعبدے دکھاتا رہے، ہم درویشوں سے اس کا کیا کام؟''

جوگی نے جواب میں کہلایا۔ ''میں سارے سوال جواب انہی سے کروں گا۔ ملاقات کی اجازت دی جائے۔''

آپ نے جوگی کو اندر بلالیا اور دیکھتے ہی فرمایا۔ ''شریمان جی تم اپنا کام کیے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں اس میں پریشانی کس بات کی۔''

جوگی نے جواب دیا۔ ''میں کہنے آیا ہوں کہ تم جو کچھ کررہے ہو اس سے باز آجاؤ، یہ رام اور لچھمن کی سرزمین ہے، یہ کرشن بھگوان کا علاقہ ہے تم یہاں کے لوگوں کا دھرم خراب کررہے ہو ہم اسے نہیں برداشت کرسکتے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''کرشن بھگوان کون؟ اگر بھگوان کا مطلب خالق اور مالک سے ہے تو ایک انسان، انسانوں کا خالق و مالک نہیں ہوسکتا۔ میں اس گمراہی سے نجات دلانے آیا ہوں۔''

جوگی جھنجلا کر بولا۔ ''تم میں کیا بات زیادہ ہے؟ تم کس بات میں فضیلت رکھتے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے گمراہ انسان! تو پڑھا لکھا شخص ہے خوب جانتا ہے کہ کیا برا ہے کیا اچھا ہے، تیرے کرشن نے عمل کی یہ تعریف کی تھی کہ جب انسان سوچنا شروع کرتا ہے تو اس کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جب تو نے میری بابت یہ سوچنا شروع کیا کہ مجھ میں کیا زیادہ ہے اور تجھ میں کیا کمی ہے یا یہ کہ اسلام کس بات میں فضیلت رکھتا ہے اور کفر کس بات میں اس سے کمتر ہے تو گویا تجھے اسلام اور کفر کی برتری اور کمزوری کا احساس ہوگیا۔ اب خوامخواہ وقت ضائع کرنے سے حاصل۔ مسلمان ہوجا اور دنیاوی بڑائی اور اخروی نجات حاصل کر۔''

جوگی شرمندہ ہو کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ''تم نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں نے اسلام کو برتر اور اپنے دھرم کو کمتر سمجھ لیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ تو اپنے دھرم کے مستقبل سے مایوس ہوگیا ہے اور اس مایوسی نے تجھ کو میرے پاس آنے پر مجبور کردیا ہے۔ میں نے تو تجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے چہرے پر تجھ کو جو طمانیت اور سکون ملے گا، تیرا چہرہ اس سے محروم ہے۔''

جوگی پریشان ہوگیا۔ باتوں میں تو اس کو مات ہوگئی تھی، کہنے لگا۔ ''بابا جی، ذرا اپنا کوئی کمال تو دکھاؤ۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی کمال نہیں کہ میں لاتعداد خداؤں سے نجات دلا کر ایک خدا کے در پر جھکا دیتا ہوں۔''

جوگی نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو کوئی کمال نہیں، آؤ، میں تمہیں اپنا کمال دکھاؤں۔''

آپ نے گہری نظروں سے جوگی کی طرف دیکھا جوگی نے بڑی کوشش کی کہ کوئی کمال دکھائے، کسی فوق العقل شعبدے کا مظاہرہ کرے لیکن ناکام رہا، آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''حکم ربی کے بغیر کوئی بھی کام ممکن نہیں۔''

جوگی بہت پریشان اور دل برداشتہ نظر آیا۔ آپ نے تسلی دی۔ ''اے شخص! تو یہاں خود سے نہیں آیا، میں نے تجھ کو بلایا تھا، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اسلام قبول کرلے گا اور میرے ساتھ اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام کرے گا۔''

جوگی کی قوت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔

آپ نے فرمایا۔ ''کیا سوچ رہا ہے آگے بڑھ اور کلمہ پڑھ، اللہ کو تجھ سے کام لینے ہیں۔''

جوگی آپ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ آپ نے اس کو تسلی دی اور مسلمان کرلیا۔ نہ صرف وہ مسلمان ہوا بلکہ اس کے ساتھ اس کے چیلوں نے بھی اسلام قبول کرلیا اور اس نے جوگی بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔

* * *

اب آپ نے ادھر ادھر کا دورہ شروع کردیا اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرتے رہے، ردولی، جائس بنارس اور ان سے متعلقہ قصبات اور دیہات میں آپ نے وہ کام کیا جو آج تک یادگار ہے۔

بنارس میں آپ کو ہندوؤں نے بحث ومباحثہ اور مناظرے پر مجبور کیا۔ آپ نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی اور ہندوؤں کو مسلمان کیا۔

جونپور کے حاکم ابراہیم شرقی نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا اس پر پورا پورا عمل کیا، علما کی کوشش سے قاضی شہاب الدین کی نگرانی میں فتاویٰ ابراہیم شاہی کی ترتیب عمل میں آئی اور پورے علاقہ میں شرعی قوانین نافذ کردیے گئے۔

آپ نے بڑے بڑے عالموں کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرلیا۔

چونکہ آپ نے سمنان پر حکومت کی تھی اور باپ کے ساتھ بھی حکومت میں شامل رہے تھے۔ اس لیے آپ نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے ایک ہدایت نامہ تیار کیا جس میں وضاحت سے بتایا کہ ایک بادشاہ یا حکمران کو کیا کیا کرنا چاہیے، آپ نے ہدایت کی۔

''بادشاہ اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیں، صبح کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں اس کے بعد علما اور صلحا کی صحبت میں رہیں اور پھر چاشت کے وقت تک علما سے ان آیات کی تشریح اور تفسیر معلوم کریں جو عدل وانصاف پر نازل ہوئی ہیں۔ یہاں ندیموں اور وزیروں کو بھی بلالیں ان سے ملکی اور فوجی معاملات پر باتیں کریں اور احکامات...... دیں جب دربار عام منعقد ہو اس میں رعایا اور مسلمانوں کے مقدمات پیش ہوں اور ان کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جائے...... قیلولہ کے وقت آرام کریں، پھر نماز پڑھیں۔ ظہر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی جائے۔

پوری زندگی اس کا خیال رکھا جائے کہ کوئی کام شریعت کے خلاف نہ انجام دیا جائے۔ عدل وانصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے زندگی اور حکومت دونوں ہی میں اختلال پیدا ہوجاتا ہے۔''

اس طرح آپ نے ارکان دولت اور اعوان مملکت کو بھی ہدایات اور نصیحتیں کیں۔

اب آپ نے مستقل سکونت روح آباد میں اختیار کرلی تھی یہی روح آباد بعد میں کچھ... شریف کہلایا اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ آپ اپنے کام اور اس کے نتائج سے مطمئن ہوکر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مدینۂ منورہ کی زیارت کے بعد نجف اشرف، کربلائے معلا اور روم گئے، اس کے بعد دمشق میں فخر الدین عراقی کے مزار پر حاضری دی، یہاں سے مکۂ معظمہ چلے گئے۔ یہاں سے بغداد چلے گئے اور بغداد سے سمنان چلے گئے۔ سمنان میں انہیں اپنا ماضی یاد آیا۔ یہاں کی ایک ایک چیز آپ کی شناسا تھی اور ایسا لگتا تھا گویا آپ کو اشتیاق سے دیکھ رہی ہے، یہاں ان کی اپنی بہن سے ملاقات ہوئی۔ بہن بھائی کے شانے سے لگ کر روتی رہی۔

یہاں سے مشہد علی رضا کے مزار پر گئے اور اعتکاف کیا۔ یہیں تیمور گورگانی سے ملاقات ہوئی اور اسی نے آپ سے نصیحتیں حاصل کیں۔

ماوراء النہر میں شیخ علاؤ الدین نقشبندی کی صحبت میں کچھ عرصہ گزارا اور ہندوستان واپس آگئے۔ اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دے کر گلبرگہ میں خواجہ گیسو دراز کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور یہاں سے کچھ... واپس چلے گئے۔

اس کے بعد ایک بار پھر سیاحت کو نکلے اور کافی عرصہ باہر رہ کر کچھ... شریف واپس تشریف لے گئے۔

آپ زندگی کے آخری دنوں میں فکر کی حالت میں رہنے لگے تھے، کسی کسی وقت ہوش آجاتا، وفات سے پہلے ہی اپنے مریدِ خاص سید عبدالرزاق جنہیں آپ نے نورعین کا لقب عطا فرمایا تھا، انہیں اپنا جانشین بنادیا اور بزرگانِ چشت کے جملہ تبرکات ان کے حوالے کردیے۔

آخر 27 محرم 808 ہجری کو یہ آفتاب رشد وہدایت اور مہر علم وفضل غروب ہوگیا۔ آپ کا مقام علمی لحاظ سے بھی بہت بلند تھا۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص اس وقت تک ولیِ کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ظاہراً، باطناً، فعلاً، اعتقاداً اور حالاً شرح کا پابند نہ ہو۔

ماخذات

سفینتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

بزدل

مریم کے خان

جو لوگ دولت کو دو جمع دو چار کرنے کے ماہر ہوتے ہیں وہی اکثر لاشعوری طور پر اپنی ذات کی نفی بھی کررہے ہوتے ہیں... اگرچہ اس بات سے لاعلمی انہیں خود فریبی میں مبتلا رکھتی ہے مگر درحقیقت وہ خود کو مٹا کر دوسروں کو بنانے کے جنون میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا، جسے جرائم کی دنیا سے نفرت تھی... جس کے نزدیک دھوکا دینا گناہِ کبیرہ تھا... اور جب اسے خود شناسائی کا احساس ہوا تو اپنے ہی تمام اصولوں کی دیواروں کو گراتا چلا گیا جن کے درمیان اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ تب اسے ادراک ہوا کہ وہ کس قدر طاقتور انسان ہے۔

قید سے رہائی پانے والے ایک پنچھی کا

خوشگوار تجربہ

سبینا صبح سے خوش تھی اور گنگناتے ہوئے گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ یہ تعجب کی بات تھی ورنہ عام طور سے وہ سوائے کھانے پینے، آرام کرنے اور ٹی وی دیکھنے کے کچھ نہیں کرتی تھی۔ مزاج بھی بس پھاڑ کھانے والا ہوتا تھا۔ جب اس نے سرِشام ہی ٹرکی بنانے کی تیاری شروع کی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ لیا۔ ''ڈیئر کیا بات ہے، آج کوئی خاص دن ہے؟''

اس پر دن میں پہلی بار اس کا موڈ خراب ہوا اور اس

نے غرا کر کہا۔ ”بھلا تمہیں کہاں یاد ہوگا؟“

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن مجھے ایسا کوئی دن یاد نہیں آیا۔ سینا جون میں پیدا ہوئی تھی اور ہماری شادی جولائی میں ہوئی تھی جب کہ یہ مئی چل رہا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات بھی دسمبر میں ہوئی تھی۔ جب میں نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا تو اس نے دوبارہ سے مسرور ہوتے ہوئے اطلاع دی۔ ”مورس آج رہا ہوا ہے اور وہ کچھ دیر میں یہاں آنے والا ہے۔“

یہ سن کر بے ساختہ میری کراہ نکل گئی اور میں نے دل میں کہا۔ ”اوہ نہیں...“

سینا نے مجھے گھورا۔ ”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ سن کر...“

میں نے فریج سے بیئر کی بوتل نکالی اور باہر برآمدے میں آ کر اپنا غم غلط کرنے لگا۔ گھر کے سامنے اجاڑ سا لان تھا۔ جب کہ یہاں تمام مکانوں کے سامنے خوب صورت لان تھے۔ سینا کو گھر سنوارنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باقی گھر کا حشر بھی لان جیسا ہی تھا۔ پانچ سال پہلے جب میری سینا سے ملاقات ہوئی تو اسے دیکھ کر مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا مورس جیسا کوئی بھائی بھی تھا۔ مورس کا دیدار مجھے ہنی مون سے واپسی کے فوراً بعد نصیب ہوا اور اسے دیکھتے ہی میری چھٹی حس مجھے عجلت میں شادی کے فیصلے پر ملامت کرنے لگی تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مورس عمر میں سینا سے چھ سال بڑا تھا جب کہ مجھ سے قد میں تین انچ اور وزن میں پچاس پونڈز زیادہ تھا۔ جسامت مضبوط اور چہرہ سخت تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ دو دن بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ جب وہ میرے اور سینا کے ساتھ ایک گیس اسٹیشن تک گیا۔ اس نے اندر جانے سے پہلے مجھ سے کہا۔

”ٹینک فل کر لو اور کار اسٹارٹ رکھنا۔“

”کیوں؟“ میں نے سوال کیا اس پر وہ غرایا تھا۔

”ڈیئر۔“ سینا نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔ ”بحث مت کرو جیسا مورس کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو۔“

مورس کار سے اتر کر گیس اسٹیشن کے دفتر کی طرف جانے لگا تو میں نے دیکھا وہ اپنی جیکٹ تلے عقب میں پستول بیلٹ میں لگا رہا تھا، میں نے گھبرا کر سینا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اس وقت تک وہ اپنے اصل روپ میں نہیں آئی تھی اس لیے میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ”سینا یہ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں ڈیئر، اصل میں مورس کا ہاتھ تنگ ہے اور بہن یا بہنوئی سے رقم لیتے ہوئے اسے شرم آتی ہے اس لیے وہ ذرا کیش کا بندوبست کرنے گیا ہے۔“

یقیناً مورس کے لیے یہ کوئی نیا کام نہیں تھا کیونکہ مشکل سے دو منٹ بعد وہ اندر سے برآمد ہوا اور ٹہلنے کے انداز میں آ کر کار میں بیٹھ گیا، میں نے اس کی ہدایت کے مطابق انجن اسٹارٹ رکھا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں نے بدحواسی میں کار آگے بڑھائی اور وہ پمپ سے ٹکرانے سے بال بال بچی۔ مورس نے مجھے تسلی دی۔ ”آرام سے... آرام سے۔“

باقی راستہ میں نے آرام سے طے کیا لیکن گھر پہنچ کر میں آرام سے نہیں رہا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا بس یہ غضب ہو گیا، دونوں بہن بھائی مجھے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ بہن تو زبان سے فائرنگ کر رہی تھی لیکن اس کا بھائی سچ مچ کی فائرنگ پر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ بار بار پستول نکال کر اسے انگلیوں میں نچا رہا تھا اور نال کا رخ میری طرف تھا، ظاہر ہے میری ہوا خراب تھی کیونکہ میں نے کبھی گن سے واسطہ نہیں رکھا تھا۔ میرا غصہ کب کا اتر چکا تھا اور اب میں اپنے لیے فکر مند تھا۔ کئی بار مورس نے بہن کو بیوہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر اس لیے ملتوی کر دیا کہ اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور مورس کے خیال میں ابھی اسے زندگی انجوائے کرنا چاہیے تھی۔ بیوہ ہونے کے لیے بہت وقت پڑا تھا۔ بالآخر سینا کی سفارش پر اس نے پستول واپس رکھا اور مجھ سے کہا۔

”آئندہ میرے کسی کام پر اعتراض کرنے سے پہلے سوچ لینا، میں ایک ہی غلطی دوبارہ معاف نہیں کرتا ہوں۔ اب بھی تم کو سینا کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔“

”میں معذرت خواہ ہوں۔“ میں نے سچ مچ ندامت سے کہا اور اصل ندامت مجھے سینا سے شادی کرنے پر تھی۔ میں اندر ہی اندر پچھتا رہا تھا کہ کاش شادی سے پہلے سینا کے خاندان کے بارے میں چھان بین کر لیتا۔ مگر سانپ نکل گیا تھا اب لکیر پیٹنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ بھائی کیا آیا سینا بھی اپنے اصل روپ میں آ گئی تھی۔ اس نے میری پروا کرنا چھوڑ دی تھی اور ہمہ وقت خود میں مگن رہنے لگی تھی۔ اسے اصل میں ایک کاٹھ کا الو درکار تھا جو اسے رہنے کے لیے گھر اور کھلا خرچ دے سکے۔ بدقسمتی سے میں دونوں چیزیں دے سکتا تھا اور شاید اسی لیے اس نے میرا انتخاب کیا تھا ورنہ بہت حسین و جمیل سینا کے مقابلے میں، میں عام نوجوان تھا۔ البتہ میرے پاس ایک اچھا کیریئر تھا۔ میں الیکٹریکل انجینئر تھا اور ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا، تنخواہ اچھی خاصی تھی اور سینا سے شادی سے پہلے میں نے خاصی بچت بھی کر لی تھی۔ اسی سے یہ مکان اور اچھی گاڑی لی تھی۔ بس بیوی کے معاملے میں مار کھا گیا۔ صرف صورت شکل دیکھ کر سینا پر مر مٹا تھا۔

مورس نے اس ڈاکے میں تقریباً دس ہزار ڈالرز حاصل کیے تھے جو اس نے بہت تیزی سے صرف ایک مہینے میں ختم کر دیے۔ اس نے کھل کر عیاشی کی تھی۔ ایک مہینے بعد جب وہ دوبارہ خالی جیب ہوا تو مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ وہ پھر مجھے کسی واردات میں شامل کر لے گا۔ میں نے ہمت کر کے سینا سے صاف کہہ دیا۔ ”اب میں تمہارے بھائی کی کسی واردات میں مدد نہیں کروں گا۔ میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔“

سینا نے حقارت سے مجھے دیکھا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم بزدل ہو۔“

یہ حقیقت تھی اگر میں بزدل نہ ہوتا تو اب تک پولیس کے پاس جا چکا ہوتا، مگر میری بزدلی نے مجھے روکا ہوا تھا۔ ”چلو ایسا ہی سمجھ لو، میرا ایک کیریئر ہے اگر میں پکڑا گیا تو جیل جاؤں گا اور پھر تمہارے یہ سارے عیش و آرام ختم ہو جائیں گے۔“

سینا سوچنے پر مجبور ہو گئی اور پھر شاید اس نے اپنے بھائی سے کچھ کہا، اس نے آئندہ مجھے اپنے کسی جرم میں شامل نہیں کیا۔ البتہ آئے دن وہ خود کسی نہ کسی چکر میں ملوث رہتا تھا۔ ڈاکے یا رہزنی سے رقم حاصل کرتا اور پھر اسے بارز اور کال گرلز پر لٹا دیتا۔ چھ مہینے بعد وہ جیل گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اسے دو سال کی سزا ہوئی تھی لیکن وہ پونے دو سال بعد رہا ہو گیا اور سیدھا میرے گھر آیا تھا، اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ دونوں بہن بھائی دل کھول کر میری کمائی پر عیش کرتے تھے اور میں سوائے جلنے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کئی بار میں نے سینا سے الگ ہونے کا سوچا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اول تو وہ میری نصف آمدنی لے جاتی بلکہ جو کچھ میرے پاس تھا اس کا بھی نصف اسے ملتا۔ پھر وہ دونوں بہن بھائی میرے دشمن ہو جاتے۔ وہ دونوں سخت کینہ پرور تھے، بس یہ سوچ کر طلاق سے باز رہا۔

خوش قسمتی سے اس بار مورس کو زیادہ عرصے باہر رہنے کا موقع نہیں ملا ایک بار میں جھگڑے کے دوران اس نے ایک شخص کے سر پر بوتل مار کر اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس بار اسے ڈھائی سال کی سزا ہوئی تھی۔ اگرچہ مورس کے جانے سے مجھے کچھ زیادہ سکون نہیں ملا تھا کیونکہ سینا کا رویہ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا اور اس نے مجھے شوہر سے زیادہ زر خرید غلام سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی کسی چیز میں ذرا سی کمی پر وہ مجھ پر چڑھ دوڑتی۔ چیختی چلاتی اور چیزیں توڑتی پھوڑتی تھی۔ یہ گھر جو میرے باپ نے میرے لیے چھوڑا تھا اور میں نے اسے مزید خوب صورت بنایا تھا اس نے اس کا حشر کر دیا تھا اور اب یہ انسانوں سے زیادہ بھوتوں کے رہنے کی جگہ لگنے لگتی تھی۔ خود سینا چڑیل لگنے لگی تھی۔ شادی سے پہلے وہ بہت خوب صورت تھی لیکن تن آسانی اور حد سے زیادہ شراب نوشی نے اس کا سارا حسن غارت کر دیا تھا۔ وہ بے ڈول اور بے کشش ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ گھر سے بھاگ جاؤں، کسی ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں سینا نہ پہنچ سکے لیکن اس صورت میں مجھے اپنی نوکری اور اپنی شناخت بھی چھوڑنا پڑتی۔ اگر میں اپنی سوشل سیکیورٹی، ڈرائیونگ لائسنس اور بینک اکاؤنٹس استعمال کرتا رہتا تو پولیس جلد مجھ تک پہنچ جاتی۔ اس لیے گھر سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں مجرم ذہن نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی مجھ میں ہمت تھی ورنہ سینا کو قتل کرنے کا سوچتا۔ بیئر پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بہن نے پہلے ہی اس گھر کو جہنم بنا دیا تھا اب دیکھو بھائی آ کر کیا کرتا ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک خستہ حال پک اپ ڈرائیو وے میں داخل ہوئی اور اس سے مورس اترا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہٹا کٹا اور خطرناک صورت ہو گیا تھا یعنی اس کے چہرے پر کچھ زخموں کے نشانات کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے سر صاف کرا رکھا تھا اور اس کے وسط میں سورج کا ٹیٹو بنوا رکھا تھا۔ اس کے بازوؤں پر بھی ٹیٹوز تھے اور میرا اندازہ تھا کہ باقی جسم بھی ٹیٹوز سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اتر کر سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا اور بولا۔

”ہائے ول... تم کمزور ہو گئے ہو۔“

”جسے تمہاری بہن جیسی چڑیل چمٹی ہو اسے کمزور تو ہونا ہے۔“ میں نے دل میں کہا اور منہ سے بولا۔ ”بس آج کل کام کچھ زیادہ ہے اور آرام کا موقع کم ملتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تمہاری مالی حالت ٹھیک ہے۔“

اس نے اپنا بیگ اٹھا کر اندر جاتے ہوئے کہا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ میں نے بڑی کوشش سے سینا سے بچا کر کچھ رقم جمع کی تھی اور اب اس کا بھائی آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اندر

سے دونوں بہن بھائی کی مسرور آوازیں آنے لگیں۔ سینا نے پچھلے پانچ سالوں میں مجھ سے اتنی محبت سے بات نہیں کی تھی جتنی اس نے پانچ منٹ میں مورس سے کی تھی۔ وہ اس پر صدقے واری ہو رہی تھی جیسے اس کا بھائی جیل سے نہیں محاذ جنگ سے ہیرو بن کر آیا ہو۔ میں باہر بیٹھا کڑھ رہا تھا اور وہ دونوں بھی مجھے بھول کر اپنی باتوں میں مگن تھے بالآخر کھانے کے وقت سینا کو یاد آیا کہ اس کا شوہر بھی ہے جسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس نے مجھے چیخ کر آواز دی۔ ”ول آجاؤ، کھانا لگ گیا ہے۔“

کھانے کے دوران مورس مسلسل اپنے جیل کے تجربات سناتا رہا جن کا خلاصہ یہ تھا کہ اس نے کتنے قیدیوں سے لڑائی کی اور ہر بار وہ فاتح رہا۔ نیز اس نے جیل حکام کو کس طرح زچ رکھا اور ایک وارڈن کا جبڑا اتنی چالاکی سے توڑا کہ اس کا الزام کسی دوسرے قیدی پر آگیا۔ سینا یوں خوش ہو رہی تھی جیسے مورس کوئی بہت اعلیٰ کام کر کے آیا ہو۔ کھانے کے خاتمے پر اس نے وہسکی کی بوتل اپنی طرف کر لی اور اس سے براہ راست پیتے ہوئے آس پاس دیکھا۔ ”تم لوگ ابھی تک اسی کھنڈر مکان میں رہ رہے ہو۔“

میں نے بڑی مشکل سے خود کو کہنے سے روکا کہ شکر کرو یہاں رہ رہے ہیں ورنہ تمہاری بہن نے مجھے فٹ پاتھ پر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ البتہ مورس کے سوال پر سینا نے یوں منہ بنایا جیسے وہ محل کی مستحق شہزادی ہو اور میں نے اسے اس کھنڈر میں رکھا ہو۔ ”یہ شخص اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے، اس میں ہمت نام کی چیز ہی نہیں ہے۔“

”میں اپنی سی پوری کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے صفائی پیش کی۔

مورس نے سرد نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کوئی بات نہیں اب میں آگیا ہوں بس کچھ عرصے کی بات ہے ہمارے حالات بدل جائیں گے۔“

میرا خون ایک بار پھر خشک ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مورس کے حالات کس طرح بدل سکتے ہیں البتہ سینا نے فوراً دلچسپی لی۔ ”وہ کس طرح؟“

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے بس اسے مکمل کر لوں پھر بات کروں گا۔“

”مجھے تو معاف رکھنا۔“ میں نے پیشگی انکار کی تمہید باندھی۔ لیکن مورس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

”فکر مت کرو تمہیں براہ راست کچھ نہیں کرنا ہوگا۔“

”میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔“ اس بار میں نے ہمت کر کے قطعی انکار کیا۔ ”میں جیل جانا اور اپنا کیریئر برباد کرنا نہیں چاہتا۔“

اس پر مورس غرا کر اٹھا لیکن سینا نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ”تم فکر مت کرو، میں اسے سمجھا لوں گی۔“

حالانکہ سمجھنے کی ضرورت ان دونوں بہن بھائی کو تھی۔ اگر مجھے نوکری کی فکر نہ ہوتی تو شاید میں پولیس کو اطلاع دینے کی سوچتا لیکن اس کے بعد یہ سب میڈیا پر آتا اور میری نوکری چلی جاتی، آج کل نوکریوں کا ویسے ہی کال تھا جو ایک بار اپنی نوکری سے ہاتھ دھو لیتا اسے دوبارہ ویسی نوکری مشکل سے ہی ملتی تھی۔ بلکہ اکثر تو بے روزگار پھر رہے ہوتے تھے۔ بہر حال وہ دونوں سمجھنے والے نہیں تھے۔ چند دن بعد میں دفتر سے آیا تو مورس میرا منتظر تھا۔ سینا نے کہا۔ ”مورس تمہارا شکاری کیبن دیکھنا چاہتا ہے۔“

امریکی ریاست وائیومنگ کے وسط میں واقع گیم ریزرو میں میرا کیبن تھا یہ بھی والد کی طرف سے ملا تھا اور یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں تھکا ہوا تھا لیکن مورس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ انکار سننے کے موڈ میں نہیں ہے اس لیے مجھے جانا پڑا۔ سینا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ گرمیوں کے طویل دن تھے اور شکار بند تھا اس لیے ریزرو میں خاموشی تھی۔ کیبن جنگل میں عام راستوں سے خاصا ہٹ کر تھا۔ یہاں بجلی کی سہولت تھی۔ مورس نے پہلے کیبن کا باہر سے جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا شکار کا موڈ تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ ”یہاں شکار کے لیے پرمٹ لینا پڑتا ہے اور وہ خاصا مہنگا ہوتا ہے۔“

”مجھے شکار نہیں کرنا ہے۔“ مورس نے جواب دیا۔

مجھے فکر لاحق ہوگئی کہ جب اسے شکار نہیں کرنا تھا تو وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اس نے اندر سے بھی کیبن کا معائنہ کیا۔ یہ دو کمروں والا کیبن تھا۔ ایک بیڈ روم تھا اور ایک لاؤنج جس میں کچن بھی تھا۔ مورس نے سینا سے کہا۔ ”یہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”کس لیے ٹھیک ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا لیکن یہاں کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی اور تم میرا ساتھ دو گے۔“ مورس نے کہتے ہوئے پستول نکال کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ یقیناً اشارہ تھا کہ میں بلا چوں چرا کیے اس کے حکم کی تعمیل کروں۔ واپسی میں اس نے ایک بڑے سپر اسٹور پر رکنے کو کہا اور ہم اندر آئے۔ مورس نے ایک بڑی ٹرالی لی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا۔ ڈرل مشین، اسکرو، کیلیں، آریاں، ربر لائننگ، منقش ربر شیٹ، دھات کی کئی چیزیں، ایک عدد تہ ہو جانے والا گدا، تکیہ، ہتھکڑیاں، رسیاں، مضبوط دھاتی بیڑیاں، تالے اور ایسی ہی کئی چیزیں لی تھیں۔ لکڑی کے چار بائی چار کے بڑے تختے لیے تھے۔ آخر میں اس نے دو عدد اوور آل لیے۔ یہ پتلون اور جیکٹ سمیت پہن لیے جانے والا ایک ہی لباس تھا۔ ہاں اس نے ربر کے آسانی سے پہن لیے جانے والے جوتے اور دستانے بھی لیے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی بڑے کام کی تیاری کر رہا تھا۔ گھر آنے کے بعد میں نے پوچھا۔

”مورس تم کیا کرنے جا رہے ہو، مہربانی کر کے پستول نکالے بغیر مجھے صاف صاف بتا دو۔“

☆☆☆

میں ایئر پورٹ کی پارکنگ میں نروس کھڑا ہوا تھا اور مورس عقب میں ایک وین کا لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا بالآخر اس نے کامیابی حاصل کی۔ پھر اس نے چابیاں آزما کر انجن اسٹارٹ کیا اور میں تیزی سے اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ مورس نے وین نکالی اور وہاں سے روانہ ہو گیا جب ہم ایئر پورٹ کی حدود سے نکلے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وین ایک ویرانے میں روک کر ہم نیچے اترے۔ میرے پاس ربر شیٹ اور دوسرا سامان تھا۔ ہم نے عقبی خانے میں ربر شیٹ مکمل طور پر بچھائی اور دیواروں پر لگائی اب اندر سے وین کا یہ حصہ بالکل بدل گیا تھا۔ دروازے پر بھی اندر ربر شیٹ لگائی۔ ڈرائیونگ کمپارٹ اور عقبی حصے کے درمیان والی کھڑکی پر لکڑی کا تختہ لگا کر اسے کیلوں سے فکس کر دیا۔ آخر میں فولادی کلپس دیواروں پر فکس کیے۔ اس سے ایک دن پہلے ہم نے شکاری کیبن میں کام کیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے فکس کیے اور ربر لائننگ کی مدد سے اسے ساؤنڈ پروف کر دیا۔ پھر دیواروں پر ربر شیٹ چڑھائی، فرش پر سادہ ربر شیٹ بچھائی۔ لکڑی کے بیڈ کے پائے ایل کلپس کی مدد سے فرش میں پیوست کیے سرہانے کی طرف دیوار میں کلپس لگا کر ان سے ہتھکڑیاں منسلک کیں اور بیڈ پر نیا گدا بچھایا جس پر نئی سفید بیڈ شیٹ ڈالی۔ بیڈ روم کے دروازے پر باہر کی طرف دو نئی کنڈیاں اور ایک تالے کی جگہ بنائی۔ یہ لکڑی کا بنا بہت مضبوط دروازہ تھا اور اب اسے کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ ایسی ہی کنڈیاں اور تالے باہر والے دروازے پر فکس کیے البتہ تالے کے ہک باہر کی طرف لگائے گئے تھے۔ اس وقت میں اس کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔

وین تیار کر کے اور اس کی نمبر پلیٹ بدل کر اسے ایک جگہ کھڑا کر دیا۔ مورس نے اسے جان بوجھ کر کیچڑ والی جگہوں سے گزارا تھا تا کہ وہ میلی ہو جائے۔ اس سے اگلے دن ہم صبح سویرے نکلے اور وین لے کر روانہ ہوئے۔ مجھے منزل کا علم نہیں تھا کیونکہ صرف مورس جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ ہمیں ایک لڑکی کو اغوا کرنا ہے۔ مورس نے مجھے اس کام کے لیے کس طرح راضی کیا یہ میں ہی جانتا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ انکار کی گنجائش نہیں تھی، اگر میں نے انکار کیا تو وہ مجھے بلا تکلف قتل کر دے گا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ سینا پوری طرح اس کی ہمنوا تھی اس لیے مجبوراً میں بھی راضی ہو گیا۔ مورس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی آخری واردات تھی اس میں کامیابی کے بعد اسے دوبارہ بھی جرم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ ڈھائی ملین ڈالرز کی رقم کے ساتھ جنوبی امریکا کے کسی ملک جا بستا۔ جی ہاں، اس کا منصوبہ پانچ ملین ڈالرز کا تھا جس میں سے ڈھائی ملین ڈالرز مجھے اور سینا کو ملتے۔ اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب ہوگا اور وہ پانچ ملین ڈالرز حاصل کر سکے گا دوسرا شبہ مجھے یہ تھا کہ اگر وہ کامیاب رہا تو ڈھائی ملین ڈالرز مجھے دے گا۔

روانہ ہوتے وقت میں نے اس سے کہا۔ ”ایک بار پھر سوچ لو، اغوا پر آج کل ساری عمر کے لیے جیل ہو جاتی ہے۔“

”سوچ لیا ہے ویسے ناکامی کا امکان نہیں ہے لیکن اگر ناکام رہے تو پھر معاش کی فکر باقی نہیں رہے گی۔ لیکن تم فکر مت کرو اگر میرے منصوبے کے مطابق عمل کیا تو ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔“

آدھے گھنٹے بعد وین ایک چھوٹے قصبے میں داخل ہوئی۔ یہاں چھوٹے گھر تھے اور یہاں عام لوگ بستے تھے۔ مورس نے وین ایک گلی میں روک دی جس میں دونوں طرف دو منزلہ مکانات تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تیار ہو جاؤ لڑکی کسی وقت بھی آنے والی ہے۔“

چند منٹ بعد ایک نوجوان لڑکی جینز اور ٹی شرٹ میں اندر سے برآمد ہوئی، اس کے سنہری بال پونی ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے اور شانے پر ایک ہینڈ بیگ تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہم دونوں نے چہروں پر ایسی سیاہ اونی ٹوپیاں چڑھا لیں جن کی آنکھوں والی جگہ کاٹ کر سوراخ کیے گئے تھے۔ میں اتر کر وین کے عقبی حصے میں آیا۔ لڑکی اسی طرف آ رہی تھی جیسے ہی وہ پاس پہنچی میں اچانک سامنے آیا، وہ

دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہوئی اور اس نے چلانے کی کوشش بھی کی لیکن عقب سے آنے والے مورس نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اس نے کلوروفارم سے بھیگا رومال اس کے چہرے پر رکھا اور وہ لمحوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی۔ میں نے وین کا دروازہ کھولا اور مورس نے اسے اندر ڈال دیا۔ اس نے پھرتی سے اس کے منہ پر بال والی اسٹرپ چڑھائی تاکہ وہ ہوش میں آ کر آواز نہ نکال سکے۔ پھر اس کے منہ پر ایک غلاف چڑھایا اور آخر میں اس کے دونوں ہاتھ وین میں لگے کلپس سے باندھ دیے۔ یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کے فوراً بعد ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس وقت مجھے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ سینا ٹھیک کہتی تھی میں بزدل تھا مجھ میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ مورس کو انکار کر سکتا۔ میں پوری فرمانبرداری سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہم نے اپنے نقاب اتار دیے تھے۔ صبح کے وقت پورا قصبہ سنسان تھا اور کسی نے ہمیں یہ واردات کرتے نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا تھا تب بھی پولیس کو سوائے اس کے کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ ایک وین میں دو افراد نے لڑکی کو اغوا کر لیا۔ اس کے باوجود میں وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ جب ہم قصبے سے دور نکل آئے تو میرے حواس ٹھکانے آئے تھے اور میں نے مورس سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”ایملی بارمین۔“

”میرا خیال ہے یہ کم عمر ہے، شاید بیس برس کی ہے۔“

”چوبیس برس کی۔“ مورس نے تصحیح کی۔ ”بہ ظاہر لڑکی لگتی ہے لیکن اس کی اصل عمر چوبیس برس ہے۔ ایک آرٹ شاپ میں جاب کرتی ہے، اس وقت ملازمت پر جانے کے لیے نکلی تھی۔“

مورس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے ایملی کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔ ”اس کا تاوان کون دے گا؟... بہ ظاہر تو یہ دولت مند خاندان کی نہیں لگتی ہے۔“

”اس کا باپ...“ مورس نے جواب دیا۔ ”وہ اسٹاک بروکر ہے اور اس کے پاس خاصی دولت ہے وہ آرام سے پانچ ملین ڈالرز دے سکتا ہے۔“

”وہ یہاں رہتا ہے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”نہیں، اس کی تو اسٹیٹ ہے۔ ایملی گھر سے بغاوت کر کے نکلی ہے وہ یہاں ایک شخص کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ بھی دو نمبر آدمی ہے اور اس رقم کے چکر میں ایملی کو ساتھ رکھے ہوئے ہے جو اس کا باپ کبھی کبھی اسے دیتا ہے۔“

”کبھی کبھی رقم دینا الگ بات ہے اور پانچ ملین ڈالرز تاوان دینا الگ بات ہے۔ خاص طور سے جب وہ بیٹی سے ناراض ہو۔“

”اکلوتی بیٹی ہے۔“ مورس نے ایک بار پھر تصحیح کی۔ ”لیکن وہ تاوان دے گا۔“

مجھے لگا کہ ایملی کا باپ تاوان کے بجائے پولیس کو اطلاع دے گا اور ہمیں گرفتار کرانے کی پوری کوشش کرے گا۔ مورس کا منصوبہ خوش فہمی پر مبنی تھا۔ لیکن بہرحال ہم ایک جرم کا ارتکاب کر چکے تھے اور اب مورس بھی چاہتا تو اسے واپس نہیں لے سکتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وین شکاری کیبن کے سامنے رکی۔ ہم نے نقاب پہنے اور اتر کر عقبی دروازہ کھولا۔ ایملی جس طرح بھڑکی تھی اس سے لگ رہا تھا وہ ہوش میں آ گئی تھی ویسے بھی مورس نے کلوروفارم کی مقدار بہت کم رکھی تھی کیونکہ اس کی زیادہ مقدار خطرناک بھی ہو سکتی تھی اور اگر کسی کو سانس کا مرض ہو تو اس کے لیے جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔ مورس جس طرح کا مجرم تھا اس سے مجھے کسی ایسے منصوبے کی توقع نہیں تھی، وہ ایک ایک چیز کا خیال رکھ کر چل رہا تھا، اس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ایملی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔

مورس نے اس کے ہاتھ کھولے اور پھر ہم اسے بنڈل کی طرح اٹھا کر کیبن میں لائے۔ بیڈ روم میں لا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر اسے بیڈ پر ڈال کر سب سے پہلے اس کے دونوں پاؤں رسیوں سے باندھے اور پھر اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے باندھ دیے۔ یہ کام کر کے ہم نے اس کے کپڑے کاٹ کر اتارے۔ تمام کپڑے اتارنے کے بعد باری باری اس کے پاؤں اور ہاتھ کھول کر اسے ایک اونی ٹراؤزر اور پوری آستین کی گرم شرٹ پہنائی۔ اس دوران میں وہ مسلسل مزاحمت کرتی رہی اور ناک سے آوازیں نکالتی رہی، جب اس کے کپڑے اتارے تو اس کا انداز دہشت زدہ ہو گیا تھا شاید وہ سمجھی کہ ہم کسی اور مقصد کے تحت اس کے کپڑے اتار رہے ہیں۔

اسے دوسرے کپڑے پہنا کر مورس نے ڈیجیٹل کیمرا نکالا اور پہلے اس کی غلاف کے ساتھ تصویریں لیں اور پھر مجھے اشارہ کیا تو میں نے ایملی کے چہرے سے نقاب اتارتے ہوئے اس کا رخ زبردستی مورس کی طرف کیا اور اس نے اس کے چہرے کی تصویریں لیں۔ وہ بہت خوف زدہ تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تصویریں لیتے ہی اس کے چہرے پر دوبارہ غلاف چڑھایا اور ہم باہر آ گئے۔ ایملی کے اتارے کپڑے ایک بیگ میں ڈال رکھے تھے۔ باہر آ کر ہم نے اپنے کپڑے اور جوتے بھی اتارے جو اس واردات میں استعمال کیے تھے پھر ہم نے اوور آل پہن لیے۔ میں نے صرف اوور آل پہنا تھا لیکن مورس نے اس کے نیچے پتلون اور ٹی شرٹ بھی پہنی تھی۔ پیروں میں آسانی سے چڑھ جانے والے جوتے پہنے۔

”بھوک لگ رہی ہے؟“ مورس نے میری طرف دیکھا۔

”ہاں لگ رہی ہے۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”تب کھانا گرم کر لو۔“

ہم کھانے پینے کی تمام اشیا لائے تھے۔ ایک مائیکرو ویو بھی تھا جس میں تیار کھانا بس گرم کرنا تھا۔ میں نے کھانا گرم کیا اور مورس نے ڈٹ کر کھایا اور پھر تصویریں کیمرے سے لیپ ٹاپ میں منتقل کیں۔ پھر انہیں ایڈٹ کرنے لگا۔ وہ اس کام میں بھی ماہر لگ رہا تھا۔ شاید اس نے جیل میں رہ کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ پہلے وہ بے پروا اور سڑک چھاپ قسم کا بدمعاش تھا لیکن اب وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ایڈیٹنگ کے دوران میں اس نے تصویروں سے ہر ایسی چیز نکال دی جس سے یہاں کے بارے میں کوئی موہوم سا اشارہ ملتا ہو۔ پھر اس نے تصویریں ایملی کے باپ جرمی بارمین کے ای میل پر بھیج دیں۔ میں کچھ مضطرب تھا۔ ”کیا اس کا باپ تاوان دے گا؟“

”بالکل دے گا۔“ وہ یقین سے بولا۔

تاوان وصولی کے لیے مورس نے ایک انوکھا طریقہ سوچا تھا۔ ہم نے ایک ویران انڈسٹریل ایریا کے پاس ایک جنگل میں گڑھا کھودا تھا اور اس پر تختہ رکھ کر ڈھانپ دیا تھا۔ مورس نے جی پی ایس پر لوکیشن دیکھ لی تھی اور جرمی بارمین بعد میں جی پی ایس کی مدد سے اسی لوکیشن پر آ کر وہاں تاوان کی رقم گڑھے میں رکھ جاتا۔ ہم جا کر وہاں سے رقم نکال لیتے۔ مجھے ایملی کا خیال آ رہا تھا اور ترس بھی آ رہا تھا، اسے بے دردی سے کسی جانور کی طرح باندھ رکھا تھا۔ ”سنو ہم اس طرح اسے غیر معینہ مدت کے لیے بستر سے باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔ انسان کو بھوک پیاس کے علاوہ بھی کچھ حاجات ہوتی ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟“

”اس کا بندوبست ہے۔“ مورس نے کہا اور ایک کونے میں رکھا شاپر اٹھایا۔ اس میں ایک چھوٹا سا جدید قسم کا پورٹیبل کموڈ تھا۔ اسے بہ آسانی استعمال کیا جا سکتا تھا اور پھر اسے صاف بھی کیا جا سکتا تھا۔ ”جب اسے ضرورت ہوگی تم اسے یہ دے دو گے اور پھر اس کا کیا دھرا باہر پھینک آؤ گے۔“

یہ سوچ کر ہی مجھے ابکائی آنے لگی تھی۔ میں نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ لیکن مورس نے کہا تھا تو مجھے کرنا ہی تھا۔ کموڈ کے ساتھ ہی ٹشو پیپر کا رول بھی تھا۔ میں نے پوچھا ”اسے آزاد کرانا ہوگا؟“

”نہیں صرف ٹانگیں اور ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھولنا ہوگی ایک ہاتھ کی بندھی رہے گی۔“ مورس نے حکم دیا۔ ”ہم دونوں باری باری آرام کریں گے اور نگرانی کریں گے۔“

میں چونکا۔ ”یعنی جب تک یہ معاملہ نہیں نمٹ جاتا، ہمیں یہیں رہنا ہوگا؟“

”بالکل، یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے مورس کی ہدایت کے مطابق دفتر سے چار دن کی چھٹی لے لی تھی اور اس میں سے دو دن گزر گئے تھے۔ دو دن بعد اتوار تھا یعنی مجھے تین دن بعد دفتر جانا تھا اس لیے فی الحال دفتر کی فکر نہیں تھی۔ مورس نے ایک ای میل آئی ڈی بنائی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک پرانا استعمال شدہ لیپ ٹاپ ایسی شاپ سے لیا تھا جہاں اسے کوئی شناختی چیز نہیں دکھائی پڑی تھی وہ اصل میں چوری کے سامان کی خرید و فروخت کا مرکز تھا یعنی اگر کسی طریقے سے لیپ ٹاپ کا سراغ مل جاتا تب بھی ہم سے اس کا تعلق نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ انٹرنیٹ کے لیے ایک ایسی ہی ڈیوائس استعمال کر رہے تھے جس کی مدد سے ہمارا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ البتہ ہم اسے زیادہ استعمال کرتے تو پولیس اس کی مدد سے اس جگہ کا سراغ بھی لگا سکتی تھی اس لیے صرف ای میل کے لیے انٹرنیٹ استعمال کیا گیا اور پھر ڈیوائس بند کر دی تھی۔ یہ پاکٹ سائز یو ایس بی ڈیوائس تھی۔ رات ہم دونوں ہی آرام کر چکے تھے اس لیے کسی کو سونے کی خواہش نہیں تھی جب کھانا گرم کیا تو مناسب سمجھا کہ کھا بھی لوں ورنہ دوبارہ گرم کرنا پڑے گا۔ وقت گزاری کے لیے مورس نے برانڈی اور میں نے بیئر کی بوتل سنبھال لی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تم نے جیل میں ہی یہ منصوبہ سوچ لیا تھا؟“

”ہاں زیادہ دولت حاصل کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ بینکوں میں آج کل اتنی رقم رکھی نہیں جاتی اور پھر وہاں سیکیورٹی بہت ہوتی ہے۔ کیمرے اور پتا نہیں کون کون سے آلات ہوتے ہیں۔ اطلاع ملتے ہی پولیس حرکت میں آ جاتی ہے۔ پھر اس میں دو افراد سے کام نہیں چلتا کم سے کم چار پانچ آدمی ہوں تو بینک میں ڈاکا مارا جا سکتا ہے۔ ذرا سی غلطی گرفتار کرا دیتی ہے۔ کامیابی کے

بعد بھی دو ڈھائی ملین سے زیادہ کی رقم نہیں ملتی ہے۔"

"پکڑے جانے کا امکان تو یہاں بھی ہے؟"

"ہاں، لیکن حالات ہمارے قابو میں ہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہم اچھی طرح سوچ سکتے ہیں۔ تم فکر مت کرو میں نے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔"

اب میری بھی خواہش تھی کہ جرمی بارمین تاوان ادا کرے لیکن مجھے ایملی سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ "لڑکی دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتی ہے پھر باپ سے الگ کیوں رہتی ہے؟"

"جرمی اسے اپنے کاروبار میں شامل کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے بعد بھی یہ بزنس چلتا رہے لیکن ایملی کو بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس نے آرٹ کالج میں داخلہ لے لیا اس پر باپ نے اس کی فیس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ایملی ناراض ہو کر گھر سے نکل گئی بعد میں معاشی حالات کی وجہ سے وہ تعلیم بھی مکمل نہ کر سکی اور منشیات کے چکر میں بھی پڑ گئی۔ اب ملازمت کر رہی ہے۔"

ایملی خوب صورت لڑکی تھی۔ بے شک اس کے چہرے سے مشکل حالات جھلک رہے تھے لیکن وہ صحت مند تھی۔ منشیات استعمال کرنے والے اتنے صحت مند نہیں ہوتے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تاوان وصول کرنے کے بعد مورس اس کا کیا کرے گا؟ میں نے دل کڑا کر کے اس سے یہ سوال کر لیا، اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "کیا کرنا ہے؟... اسے آزاد کرنا ہے، آخر ہم اتنے سارے پاپڑ کس لیے بیل رہے ہیں۔ اس کا پورا خیال رکھنا ہے۔ بلکہ ہوشیار رہنا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی طرح سے خودکشی کر لے اور اس کی لاش ہمارے گلے پڑ جائے۔ اگر وہ مر گئی یا واپس نہ گئی تو پولیس اس کھیل میں شامل ہو جائے گی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ مورس کہیں تاوان وصول کر کے ایملی کو مار نہ دے۔ ہم اسے دس بجے یہاں لے آئے تھے۔ مورس نے طے کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں ہر آٹھ گھنٹے بعد اسے کھانا پینا اور دوسری ضروریات سے فارغ ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ پہلا موقع اسے دوپہر تین بجے دیا جاتا۔ اس لیے تین بجے تک ہم آرام کرتے رہے۔ تین بجتے ہی ہم نقاب پہن کر اندر آئے اور روشنی کی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ کلبلانے لگی تھی۔ مورس اس کے پاس گیا اور بدلی ہوئی غراتی آواز میں کہا۔ "لڑکی، تم میری آواز سن رہی ہو؟"

وہ ساکت رہی تو مورس نے اس بار اس کے بالکل پاس سر لے کر اپنا سوال دہرایا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہوئی لیکن اس جگہ زیادہ گنجائش نہیں تھی وہ بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ مورس نے کہا۔ "میری بات غور سے سنو، تمہیں بھوک ہوگی تو تم سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی دکھاؤ گی اور پیاس لگے گی تو دو انگلیاں، اسی طرح تمہیں پی آئے گی تو تم الٹے ہاتھ کی ایک انگلی دکھاؤ گی اور دوسرے مسئلے کی صورت میں دو انگلیاں، کیا تم میری بات سمجھ گئی ہو؟"

ایملی نے پھر سر ہلایا۔ "گڈ، اب بتاؤ تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟"

اس نے فوراً سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں بلند کیں یعنی اسے پیاس لگ رہی تھی۔ مورس نے میری طرف دیکھا تو میں اس کے لیے پانی کی بوتل لے آیا۔ یہ ڈھائی سو ایم ایل والی منرل واٹر کی بوتل تھی۔ مورس نے اس کے سر سے غلاف اتارا۔ اس کا منہ کھولنے سے پہلے اسے خبردار کیا۔ "شور مت کرنا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا البتہ نقصان ہوگا، تمہیں پانی نہیں ملے گا اور نہ دوبارہ تمہارا منہ کھولا جائے گا۔ جب تک تم یہاں رہو گی بھوکی پیاسی رہو گی۔"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ وہ شور نہیں کرے گی۔ مورس نے اس کا منہ بھی کھول دیا اور میں نے آگے بڑھ کر بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ترس آ رہا تھا، وہ روتی رہی تھی اس کی آنکھوں کا مسکارا پھیل گیا تھا اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ پانی کی بوتل منہ سے ہٹتے ہی اس نے سوال کیا۔ "تم لوگ کون ہو مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"ہم لوگ کون ہیں یہ تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ تمہیں تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تاوان... وہ کون دے گا؟"

"تمہارا باپ جرمی بارمین۔"

ایملی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ میرے بدلے ایک ڈالر بھی نہیں دے گا۔"

"تم فکر مت کرو، تاوان وصول کرنا ہمارا مسئلہ ہے۔ اب ہم آٹھ گھنٹے بعد آئیں گے، تم آرام کرو۔" مورس نے کہتے ہوئے اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ غوں غاں کرتی رہ گئی۔ روشنی بند کر کے ہم باہر آئے۔ میں نے نقاب اتارتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اس کا باپ تاوان نہیں

ے گا۔"

"وہ دے گا۔" مورس نے کہا اور اپنا اوور آل تارنے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ سب ٹھکانے لگانے۔" اس نے ایملی اور مارے اتارے کپڑوں کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ "پھر جرمی بارمین سے بات کروں گا۔" اس نے اوور آل اتار کر بستر پر پڑا تالا اٹھایا اور باہر جانے لگا۔ میں نے اسے روکا۔

"ایک منٹ...... کیا تم باہر سے تالا لگا کر جاؤ گے؟"

"ہاں یہ ضروری ہے تاکہ اگر کوئی اس طرف آئے تو اسے کیبن بند ملے تم بھی اندر سے کنڈیاں لگا لو۔" اس نے جواب دیا اور اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی سوال کرتا وہ جا چکا تھا۔ اس نے باہر سے تالا لگایا اور رخصت ہو گیا۔ میں نے اندر سے کنڈیاں لگا لی تھیں۔ اب اس کیبن میں ایملی کے ساتھ میں بھی قید تھا۔ مجھے لگا کہ مورس نے مجھ پر مکمل اعتماد نہیں کیا تھا، شاید اسے خوف تھا کہ کہیں میرا حوصلہ جواب نہ دے جائے اور میں پولیس کے پاس دوڑ جاؤں۔ حالانکہ اب ایسا کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے برابر تھا۔ پولیس مجھے بھی گرفتار کرتی اور مجھے بھی سزا ہوتی۔ لیکن اس طرح بند ہونے سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں ٹہلنے لگا اور جب تھک گیا تو کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پہلے بیئر کی بوتل اٹھائی لیکن پھر اسے رکھ کر کافی بنائی۔ مورس کو گئے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے جینا کا خیال آیا جو اپنے بھائی سے زیادہ پرجوش تھی۔ وہ تو ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن مورس نے منع کر دیا کہ ایک عورت کی موجودگی کے بارے میں جب بعد میں پولیس کو پتا چلتا تو اسے ایک نقطہ اور مل جاتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مورس نے اسے منع کر دیا لیکن اب میں بور ہو رہا تھا اور مجھے خیال آیا کہ وہ ساتھ ہوتی تو وقت اچھا نہ سہی کسی قدر رے انداز میں گزر ہی جاتا۔

جب تیسرا گھنٹا بھی گزر گیا تو میں اٹھا اور نقاب پہنتے ہوئے ایملی والے کمرے میں آیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ کلبلائی تھی۔ میں نے روشنی کی تو وہ جلدی جلدی الٹے ہاتھ کی ایک انگلی اٹھانے لگی۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ یہ مرحلہ بھی آنا تھا۔ اگرچہ مورس نے کہا تھا کہ ایسے کسی موقع پر ہم دونوں ہی موجود ہوں گے تاکہ اسے آزادی کا ذرا بھی موقع نہ ملے لیکن اس وقت وہ جتنی بے تابی کا مظاہرہ کر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ اسے موقع نہ دیا گیا تو وہ بستر ہی گندا کر دے گی۔ میں نے مجبوراً کہا۔ "اوکے، میں انتظام کرتا ہوں۔"

میں پورٹیبل کموڈ لایا۔ بستر کے پاس رکھ کر میں نے اس کے الٹے ہاتھ کی ہتھکڑی کھولی۔ پھر اس کے دونوں پیروں کی رسیاں بھی کھول دیں اور آخر میں اس کے سر سے غلاف اتار دیا، اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کا منہ بھی کھول دیا۔ وہ نیچے اتری اور میری طرف دیکھا تو میں نے منہ پھیر لیا۔ میرے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا صرف ایک بٹن سے کھلنے والا چھوٹا چاقو تھا اور پستول مورس کے پاس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں کیونکہ پستول چلانا نہیں آتا ہے اس لیے تم چاقو رکھو ویسے بھی عورتیں پستول سے اتنا خوفزدہ نہیں ہوتی ہیں جتنی کہ تیز دھار والے آلات سے۔"

ایملی نے اپنا کام کیا اور کھڑی ہوئی تو میں نے اسے بستر پر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی لیکن لیٹی نہیں اور لجاجت سے بولی۔ "پلیز اس طرح لیٹے لیٹے میں مر جاؤں گی کیا تم کچھ دیر کے لیے مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، اس طرح مستقل بندھے رہنا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے ترس آنے لگا اور میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔"

"تم نے غلط شخص کو اغوا کیا ہے، یقین کرو میرا باپ میرے عوض تاوان نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

وہ پھٹ پڑی۔ "میرا باپ ایک بے حس اور خودغرض شخص ہے۔ میں اس کی ایک بیٹی ہوں لیکن اسے ہمیشہ میرے مقابلے میں اپنا بزنس عزیز رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے مرنے کے بعد اس کے بزنس کی غلام بن کر خدمت کرتی رہوں۔ لیکن مجھے اس کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں آرٹ پڑھنا چاہتی تھی۔ میں نے آرٹ کالج میں داخلہ لیا تو اس نے میری فیس دینے سے انکار کر دیا۔"

"یقیناً اس نے اچھا نہیں کیا اور اب اسے اس کی سزا ملے گی۔" میں نے سر ہلایا۔ "تم جس شخص کے ساتھ رہ رہی ہو وہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟"

"تم چاہو تو ایسا سمجھ لو لیکن ہمارے درمیان ضرورت کا رشتہ ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں اور وہ میری ضروریات پوری کرتا ہے۔ میں جہاں ملازمت کر رہی ہوں وہاں سے اتنا نہیں ملتا کہ میں گزارا کر سکوں۔"

مجھے افسوس ہوا کہ اتنے دولت مند شخص کی اکلوتی بیٹی

اپنے سامان کے ساتھ ان کے کمرے میں شفٹ ہو گئیں۔ یہ کام حشمت بیگ نے اس لیے کیا کہ ثریا۔۔۔ خانم اور صبوحی پھاٹک کی طرف کے کمرے میں نہ رہیں۔ یہ صبوحی کو محفوظ کرنے کے لیے پہلا اقدام تھا۔

سامان کی شفٹنگ آسان نہیں تھی لیکن کسی طرح ہو گیا۔ گھر کے سب لوگوں نے مل جل کر کیا۔ ان لوگوں میں صبوحی شامل نہیں تھی۔ پپو نے حشمت بیگ اور راشد کا خاصا ہاتھ بٹایا تھا۔

صبح ہوئی تو اشرف علی کے ملازم سرور کے ساتھ الیکٹرک کا کام کرنے والے آ گئے جنہوں نے برقی قمقموں کی جھالروں سے سارے گھر کو ڈھک دیا۔ ویسے تو شادی کا بندوبست ایک میرج ہال میں کیا گیا تھا لیکن گھر کی آرائش حشمت بیگ نے اس لیے ضروری سمجھی تھی کہ شادی کی تشہیر فوری طور پر اچھی طرح ہو جائے۔

پاس پڑوس کے لوگ حیران رہ گئے۔ کئی خواتین استفسار کے لیے آئیں۔ پپو نے عشرت جہاں کی اجازت سے ان کے لیے پھاٹک کھولا تھا۔

شام کو دعوت نامے بھی چھپ کر آ گئے اور دوسرے دن تقسیم بھی کروا دیے گئے۔ یہ سب کچھ اشرف علی کے دفتری ملازمین کر رہے تھے۔ بہت سے لوگوں کو حشمت بیگ نے فون بھی کیے اور معذرت کی کہ وہ خود دعوت نامے دینے نہیں آ سکے۔

فون پر ہی حشمت بیگ نے کسی نہ کسی طرح اپنے کلائنٹس کو بھی چار دن کے لیے ٹال دیا تھا۔ دو تین کیسز میں عجلت کی ضرورت تھی لیکن حشمت بیگ نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ معاملات سنبھال لیں گے۔

اسی شام سے گھر میں سامان بھی آنا شروع ہو گیا۔ راشد کے کمرے کے پرانے فرنیچر کی جگہ نئے فرنیچر نے لی۔ کپڑوں کے تھان بھی آئے جن میں سے انتخاب عشرت جہاں نے کیا۔ ثریا خانم ان کی بس ہاں میں ہاں ملاتی رہیں، صبوحی کے پیروں کا ناپ دے دیا گیا اور اگلے دن اس کے لیے سینڈلز، چپلیں اور زیورات بھی آ گئے۔

اتنی تیزی سے سب کچھ ہوتا جا رہا تھا کہ راشد کو حیرت ہو رہی تھی، وہ خوش بھی تھا کہ اس کی شادی صبوحی سے ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں اب صبوحی کی محبت کا دھارا بہنے لگا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ صبوحی کے چہرے کے تاثرات دیکھے لیکن اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ صبوحی اب کمرے سے باہر نکل ہی نہیں رہی تھی۔ کھانا بھی وہ کمرے ہی میں کھاتی۔ حشمت بیگ نے ثریا خانم سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبوحی کے ساتھ کھایا کریں۔

دو موقعوں پر جب ثریا خانم، عشرت جہاں اور حشمت بیگ سے بڑے کمرے میں باتیں کر رہی تھیں تو راشد نے سیل فون پر صبوحی سے رابطہ کرنا چاہا لیکن صبوحی نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ پھر راشد نے ایس ایم ایس کے ذریعے پوچھا تھا کہ وہ اس کی کال کیوں نہیں ریسیو کر رہی ہے لیکن اس کا بھی جواب نہیں ملا۔ راشد نے دوسرا ایس ایم ایس بھیجا۔ ''تم کال کیوں ریسیو نہیں کر رہی ہو؟''

اس کا بھی جواب ندارد!

راشد نے دوسرا ایس ایم ایس بھیجا۔ ''اچھا اتنا تو بتا دو، تم اس شادی سے خوش تو ہو؟''

اس مرتبہ جواب آیا لیکن صرف ایک لفظ میں۔ ''جی۔''

راشد نے پھر ایس ایم ایس کیا۔ ''میں تمہیں پسند بھی ہوں؟''

''جی۔'' وہی مختصر جواب!

راشد اتنے مختصر جواب پر تھوڑا سا کھسیایا، پھر ہنس پڑا۔ اس رات وہ اپنی غزل مکمل کرنے لگا جس کا مطلع وہ کہہ چکا تھا۔ ایک شعر اسے خود اتنا اچھا لگا کہ اس نے وہ بھی صبوحی کو ایس ایم ایس کے ذریعے بھیجنا چاہا لیکن اسی وقت اس نے ثریا خانم کے قدموں کی آہٹ سن لی جو بڑے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں جا رہی تھیں جو اب ان ماں بیٹی کی خواب گاہ بن گیا تھا...... اس موقع پر راشد نے ایس ایم ایس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

◆

اگلے دن شام کو بڑے کمرے میں عشرت جہاں نے حشمت بیگ سے کہا۔ ''ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

''ہاں ہاں، پوچھو! کوئی خاص بات؟''

''سچ سچ بتائیے گا!''

عشرت جہاں کے انداز اور لہجے سے حشمت بیگ نے سمجھ لیا کہ سوال کیا ہوگا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''میں سمجھ گیا، تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ پوچھو! میں بالکل سچ سچ جواب دوں گا۔''

''تو بتائیے!...... آپ مجھ سے پہلے کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے نا؟''

''ہاں۔''

''تو اس سے شادی کیوں نہیں ہوئی آپ کی؟''

''لڑکی کے والد نے کسی اور کو پسند کر لیا تھا۔ وہ اپنے

''یہ نہیں ہوسکتا بابا!'' فہیم نے قدم آگے بڑھایا۔

ان دونوں کی باتوں نے فہیم کے پیچھے آنے والوں کو بھی دم بہ خود کردیا تھا۔ تاہم انہوں نے اپنے ریوالور نہیں نکالے تھے۔

''میں تجھے گولی ماردوں گا فہیم!''

''تم اپنے بیٹے کو گولی نہیں مار سکتے۔'' فہیم ہنسا۔ ''جوان ہونے کے بعد تو میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ تم جیل سے رہا ہوکر آئے ہو۔ تم مجھے گولی نہیں مار سکتے۔''

''مار سکتا ہوں۔'' فیروز خان نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

اندر سے عشرت جہاں اور ثریا خانم کے رونے اور چیخنے کی آوازوں کے ساتھ ایسی آواز بھی آرہی تھی جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ وہ راشد تھا جو اپنے کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔

''رک جا کمینے!'' فیروز خان نے ریوالور کی نال فہیم کے سینے پر رکھ دی۔ ''یقین کر...... ! میں تجھے ماردوں گا...... یہ لڑکی......''

فیروز خان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فہیم نے اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر یہ کامیابی اسے اس وقت ملی جب گولی اس کے سینے میں پیوست ہوچکی تھی۔

فہیم جھٹکا کھا کر گرا تو اس کے کندھوں پر لدی ہوئی صبوحی بھی گری لیکن کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اٹھی۔

''باباجان!'' وہ چیخ پڑنے کے ساتھ ہی ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی تھی۔

''نکلو یہاں سے۔'' زنجانی نے فہیم کے پیچھے آنے والوں سے کہا۔ ''یہ گرو ہیں ہمارے!''

اب وہ دونوں بھی چونکے......

''دفع ہوجاؤ۔'' فیروز خان نے کہا۔ ''تم لوگوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔'' زنجانی اور باقی دونوں دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

حشمت بیگ کچھ بولے بغیر صبوحی کو تھپکیاں دیے جارہے تھے اور صبوحی روئے جارہی تھی۔ فیروز خان محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ اس کی جان لیوا غفلت تھی۔

فہیم کی جان فوراً نہیں نکلی تھی اور اس نے فرش پر پڑے پڑے ریوالور نکال کر گولی داغ دی تھی جو فیروز خان کے سینے پر لگی۔ فیروز خان گرا لیکن اس کی موت بھی فوراً واقع نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے ریوالور سے فہیم پر ان گنت کئی گولیاں جھونک دیں۔ ان میں سے ایک گولی فہیم کے سر پر لگی اور وہ ہمیشگی کی نیند سو گیا۔

حشمت بیگ فیروز خان کو پکارتے ہوئے اس کی طرف جھپٹے اور صبوحی چیختی ہوئی اندر چلی گئی۔

''فیروز خان!'' ہانپتے ہوئے حشمت بیگ نے فیروز خان کا سر اپنی گود میں لے لیا۔

''رخصت...... ہو رہا ہوں...... حشمت بیگ!'' فیروز خان بہ مشکل بول سکا مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کپکپا رہی تھی۔

دروازے پر بے ہوش پڑے ہوئے اشرف علی کو اب ہوش آیا تھا جب ایک خونی کھیل اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ وہ دروازے میں ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ وہاں فہیم کی لاش پڑی تھی اور حشمت بیگ، فیروز خان کا سر اپنی گود میں لیے ہوئے تھے۔

''میری آخری خواہش...... پوری ہوگئی حشمت بیگ!'' فیروز خان نے بڑی کوشش کرکے بولنا شروع کیا۔ ''میں نے...... دیکھ...... دیکھ لیا...... اپنی بیٹی کو...... مگر...... اب اسے...... بتانا نہیں...... کہ...... اس کا باپ...... سزا یافتہ تھا...... ثریا...... ثریا میری لاش دیکھے گی...... تو...... تو مجھے پہچان لے گی...... اسے سمجھا...... سمجھا دینا کہ وہ...... کہ...... وہ صبوحی کو بھی......''

غالباً وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ثریا خانم بھی اپنی بیٹی کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتائے، لیکن موت نے اسے بات مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

اندرونی دروازے سے وحشت زدہ ثریا خانم اور عشرت جہاں روتے ہوئے اندر آئیں۔ ان کے پیچھے راشد اور صبوحی بھی تھے۔ صبوحی نے ہی ان کے کمروں کے دروازے کھولے تھے۔

حشمت بیگ نے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے فیروز خان کی کھلی رہ جانے والی آنکھیں بند کردیں۔ اس وقت خود ان کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

اسی وقت کسی پولیس کار کے سائرن کی آواز تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ حشمت بیگ کو بعد میں معلوم ہوا کہ راشد نے سیل فون سے پولیس کو اس واردات سے آگاہ کردیا تھا۔